عالمگیر
لاہور
۱۹۳۸ء
خاص نمبر
قیمت خاص نمبر ایک روپیہ چار آنہ
قیمت سالانہ چار روپے چار آنہ

یہ ناممکن ہے پھر کہنا کہ کوئی غم بھی ممکن ہے
بڑھاپے میں شکستہ عضو ہو جانا بھی ممکن ہے
علالت سے بدن بیکار ہو جانا بھی ممکن ہے
اثاثہ گھر کا چوری میں چلا جانا بھی ممکن ہے
یکایک ذریعۂ روزی کا چھٹ جانا بھی ممکن ہے
مصیبت جو نہ آئی تھی وہ آجانا بھی ممکن ہے
اجل نے گر اچانک سر پہ شمشیر برّاں رکھدی ،
تڑپنے کیلئے بیوی کی قسمت میں فغاں رکھدی
ضعیف العمر ماں کے دل پہ غم کی اک چٹاں رکھدی
فلک نے گرچہ بچوں پر یتیمی بے گماں رکھدی
فغاں میں کس کی بیوہ نے قلم کرکے زباں رکھدی
تِلک میں زندگی کا بیمہ کر بے خوف و غم ہو جا ،
ہر اک آفت کو دھمکا کر حریفِ صد ستم ہو جا
فضولیات، لغویات اور فیشن میں کم ہو جا
تِلک کے بیمہ داروں میں تجھے میری قسم ہو جا
یہ ناممکن ہے پھر کہنا کہ کوئی غم بھی ممکن ہے
مفصّل حالات برائے بیمہ و ایجنسی پتہ ذیل سے طلب فرمائیں
تِلک انشورنس کمپنی لمیٹڈ نیو دہلی
پوسٹ بکس نمبر ۴۸
ٹیلیفون نمبر ۳۹۷۵
تار کا پتہ "ویرستان"

فرانسیسی انشا پرداز گستیو فلابیئر کا شہ پارہ

سلامبو

اُردو میں منتقل ہو گیا ہے ہندوستان کے بہترین مترجم مولانا عنایت اللہ دہلوی بی-اے

سابق ناظم دارالترجمہ حیدرآباد دکن نے اپنی مخصوص سادہ پرکار نثر میں سلامبو کا ترجمہ کیا ہے

سلامبو میں مصنف نے اب سے دو ہزار سال پہلے کے قرطاجنہ کی تصویر پیش کی ہے اور اس خوبی کے ساتھ کہ تہذیب، معاشرت، حاکم و محکوم، رزم و بزم، امرا و غربا، مذہبی پیشوا، سپہ سالار، عقیدے اور رسمیں وغیرہ سب کی تفصیل دیکھ لیجیے۔ اس تاریخی پس منظر پر حسین سلامبو اور شہزور ماتو کی داستان عشق مرتب کی ہے۔ محلات کی چمک دمک، فضا میں حسن و عشق کی آویزش، وحشی سپاہ کی بغاوت، جنگ کے بھیانک مناظر، قتل و غارتگری کی دل ہلا دینے والی روداد، اس زمانہ کے آلات حرب اور خوفناک لڑائی کے طریقے، بھوک اور فاقوں سے سپاہ کا اس درجہ مجبور ہو جانا کہ پہلے گندے اور ناپاک جانوروں کو کھانا اور پھر اپنے ہی مُردوں کو کھا جانا۔ مولخ کے بت پر معصوم بچّوں کو کس طرح قربان کیا جاتا تھا۔ غرض اس زمانے کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر مصنف نے روشنی نہ ڈالی ہو۔

سلامبو کے متعلق نقادانِ ادب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ قرطاجنہ قدیم کے متعلق اس سے بہتر اور کوئی کتاب کسی زبان کے لٹریچر میں پیدا نہیں ہے اور جو کچھ فلابیئر نے اب سے ایک صدی پہلے تحقیق کر کے لکھ دیا ہے اُس میں اب تک نہ تو اضافہ ہو سکا ہے اور نہ ترمیم۔

مولانا عنایت اللہ صاحب کا یہ ناقابل فراموش احسان اُردو زبان پر ہے کہ ایسی نادر کتاب کا اضافہ ہماری زبان میں کر دیا ہے۔ ترجمہ دو جلدوں میں شایع ہوا ہے۔ مجموعی ضخامت ۵۰۰ صفحات۔ کتابت و طباعت اعلیٰ درجہ۔ کاغذ عمدہ اور دبیز۔ قیمت ہر دو حصص صرف تین روپے علاوہ محصولڈاک۔

ملنے کا پتہ:- **عالمگیر بکڈپو - لاہور**

"Alamgir Book Depot, Bazar Said Mitha
Lahore,

عالمگیر ہندوستان بھر کے علمی ادبی باتصویر رسائل میں سب سے زیادہ چھپتا ہے

عالمگیر خاص نمبر ۱۹۳۸ء

جلد ۲۸ نمبر ۱

فہرست مضامین!

ارشاداتِ عالیہ

از:-
عالیجناب استاذ السلطان نواب فصاحت جنگ حضرت جلیل مدظلہ

پہلو میں تیرِ ناز ترا آ کے رہ گیا
دل چل دیا تڑپ کے وہ تڑپا کے رہ گیا

بلبل کا عشق قہر ہے گلزار کیلئے
جو گل کھلا وہ آہ سے مرجھا کے رہ گیا

سیلابِ اشک سے مجھے تسکین تو کیا ہوئی
کچھ اور آگ سینے میں بھڑکا کے رہ گیا

اے چرخ کتنے خاک سے پیدا ہوئے حسیں
تو ایک آفتاب کو چمکا کے رہ گیا

چلتے ہوئے چمن سے وہ بادِ صبا کے ساتھ
میں ساتھ اُن کے نقشِ کفِ پا کے رہ گیا

اتنا تو میکشوں کی دعا نے کیا اثر
میخانے پر اک ابرِ سیہ چھا کے رہ گیا

رندوں نے پی شراب تو جام و سبو کی طرح
مستی میں ایک ایک سے ٹکرا کے رہ گیا

لایا گلِ مراد نہ جھونکا نسیم کا
دامن میں ہر بہار میں پھیلا کے رہ گیا

میں خوش ہوا کہ درد اٹھا اب بلا ٹلی
جاتا مگر کہاں مجھے تڑپا کے رہ گیا

صورت جو محتسب کی نظر آ گئی مجھے
پینا کجا شراب کا غم کھا کے رہ گیا

تعریفِ حشر اُس نے جو پوچھی تو میں جلیل
قصّہ شبِ فراق کا دُہرا کے رہ گیا

ایک آرزو

ایک دلچسپ رومانی مضمون

از:-
جناب مولنٰنا یوسف سلیم صاحب چشتی بی۔ اے۔ پروفیسر

آبادی سے دور، بہت دور جہاں شہر کے بناوٹی انسانوں اور سماج کے غلاموں کا گزر نہ ہوسکے۔ ان عالی شان محلات سے دور، بہت دور جن میں گناہوں کی تصویریں حرکت کرتی ہیں، اور موجودہ سوسائٹی کی چہل پہل سے بھی دور، بہت دور، جس کے افراد اکثر اپنی مرضی کے خلاف زندگی بسر کرتے ہیں، القصہ ان سب سے دور، بہت دور۔ ایک نئی ہوا میں، ایک پاکیزہ فضا میں، فطرت کے زیر سایہ۔ بہتے دریا کے کنارے جس کے دونوں طرف سبزہ لہلہاتا ہو، ایک مختصر سی مگر صاف ستھری جھونپڑی ہو جس کے ہر گوشہ سے پریم کی خوشبو آتی ہو، اس میں میں اور میرے دل کی ملکہ یعنی میری دیوی دونوں آنند کے ساتھ رہتے ہوں۔ بظاہر دو نظر آتے ہوں لیکن دونوں کی روحوں میں کامل اتحاد پیدا ہو گیا ہو اور اس لئے بباطن دیوی اور پجاری دونوں ایک ہوں۔

میں ہر روز صبح کو اس جھونپڑی میں جو میری نگاہ میں مندر سے بھی بڑھ کر ہو سکتی ہے۔ جنگل کے پکشیوں کے ساتھ بیدار ہوں جبکہ تارے جھلملا رہے ہوں اور زہرہ فلک پر اپنا آخری جلوہ دکھا رہی ہو، اپنی دیوی کی یاد میں مگن دریا کے کنارے پر جاؤں اور پانی کے گاگر بھر کر لاؤں دیوی غسل کرے اور چندن لگا کر سنگھاسن پر براجمان ہو۔ میں دوتارہ لیکر اس کے سامنے بچھی ہوئی صاف زمین پر دوزانو بیٹھوں، اور ایک میٹھا پریم راگ شروع کر دوں جس کا رس قریب کے درختوں پر بیٹھے ہوئے پرندوں کو بھی متوالا بنا دے۔ میری دیوی پاک جسم اور پاک لباس میں نور کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اس طرح معلوم ہوتی ہو گویا جنت کی کسی حور نے میرے اندر ایمان پیدا کرنے کیلئے عورت کا روپ اختیار کر لیا ہے میری طرف دیکھکر آنکھوں سے مسکرا رہی ہو اور نور کے بادل برسا رہی ہو۔

اس کے سنہرے بالوں سے اشنان کی بوندیں ٹپک رہی ہوں میری آنکھوں سے آنسوؤں کی بوندیں ٹپک رہی ہوں یہاں تک کہ بیخودی کے عالم میں ساز میرے ہاتھ سے چھوٹ جائے اور میں اپنی دیوی کے قدموں میں گر کر دنیا و مافیہا سے بیخبر ہو جاؤں اور جب مجھے ہوش آئے تو میں دیکھوں کہ میرا سر میری دیوی کی آغوش میں ہے۔ وہ مجھے پریم رس پلا رہی ہے۔ میں اسے دیکھوں اور وہ مجھے دیکھے۔ پھر ہم ایک دوسرے کے دیکھنے کو دیکھیں اور روحوں میں رنگ اتحاد محسوس کریں۔

شام کے وقت ہم دونوں ندی کے کنارے پانی میں پاؤں لٹکا کر بیٹھیں سبز مخملیں فرش ہمارے نیچے اور نیلگوں آسمان ہمارے سروں پر ہو دیوی پانی میں اپنا عکس دیکھے اور میں اس کی پریم بھری متوالی آنکھوں میں اپنا عکس دیکھوں۔ شام کی خوشگوار ہوا اس کی زلفوں سے اٹھکھیلیاں کرے اور اس کی خوشبو سے تمام جنگل بسا دے جب دیوی مسکرائے تو پانی کی مچھلیاں تیرنا بھول جائیں اور ساکت رہ جائیں جب وہ انگڑائی لے تو سامنے سے گزرنے والے ہرن اپنی چوکڑی بھول جائیں۔

آفتاب غروب ہو رہا ہو اور اس کی کرنیں میری دیوی کے نورانی چہرے سے کچھ نور آفتاب کیلئے لینے آئیں تاکہ اسے اپنے رات کے سفر میں اپنا زاد راہ بنا سکے۔

دیوی اپنا سر پجاری کے کاندھے پر رکھے ہوئے پرماتما کی لیلا سے اپنا دل بہلا رہی ہو اور اتصال جسمانی سے پجاری کی رگ رگ میں بجلی دوڑ رہی ہو پھر دفعتہً وہ اپنا پاک پیارا پاکیزہ پریم سے بھرپور سر ایک خوبصورت ادا سے اٹھا کر پجاری کی آنکھوں میں آنکھیں اور گلے میں باہیں ڈالکر پریم بھرے لہجہ میں پوچھے "پجاری کیا دیکھ رہے ہو۔" اس کے جواب میں پہلے میں اپنی روح اپنی آنکھوں میں کھینچکر لاؤں اور پھر اسے دیکھوں، ایسے کہ اس کی آتما بھی تڑپنے لگے اور پھر اس سے کہوں "دیوی! تمہیں دیکھ رہا ہوں، تمہیں کو دیکھ رہا ہوں۔ ہر شے میں تمہیں نظر آ رہی ہو میرے نینوں میں تمہیں بسی ہوئی ہو۔ ان میں اب دوسرے کی گنجائش نہیں ہو سکتی" یہ سن کر میری دیوی بیخود ہو جائے اور جب اسے ہوش آئے تو دیکھے کہ اس کا سر میری

جذباتِ عالیہ

از جناب
اعتبار الملک حضرت ضمیر دل شاہجہانپوری

یہ مانا مٹنے والے کی نظر کچھ اور کہتی ہے ہوائے کوچۂ جاناں مگر کچھ اور کہتی ہے
سُنایا جس نے شب بھر جلوۂ رنگیں کا افسانہ وہ شمعِ انجمن وقتِ سحر کچھ اور کہتی ہے
گریباں پھاڑنا [illegible] جنوں میں رنگ لائیگا یہ عادت اے دلِ وحشت اثر کچھ اور کہتی ہے
تبسم خون رلوائیگا [illegible] لوٹ جائینگے مرے زخموں کی حالت چارہ گر کچھ اور کہتی ہے
[illegible] تجھسے سُن لیگا مگر قسمت مری اے نامہ بر کچھ اور کہتی ہے
تری ہمت [illegible] مصیبت ہے شدتِ غم میں لبِ فریاد آہِ بے اثر کچھ اور کہتی ہے
ستم ہے مسکرا کر آفتِ جاں قہر کے تیور ادا کچھ اور کہتی ہے نظر کچھ اور کہتی ہے
نہ سمجھوں فیصلہ اپنے مقدر کا تو کیا سمجھوں تری ترچھی نظر او فتنہ گر کچھ اور کہتی ہے
[illegible] پھیر [illegible] بیان کا مفہوم کیا سمجھے؟ سرِ بالیں نگاہِ چارہ گر کچھ اور کہتی ہے
تری نظروں میں ہیں نقش و نگارِ حال و مستقبل مگر خاموشیٔ دیوار و در کچھ اور کہتی ہے
سنبھل بیٹھو ذرا اے غافلو ہشیار ہو جاؤ زبانِ حال سے شمعِ سحر کچھ اور کہتی ہے
سمجھ لوں شدتِ گریہ جو پہنچیں اشک دامن تک یہ رنگینی مگر اے چشمِ تر کچھ اور کہتی ہے

ضمیرِ سادہ دل تا چند شغلِ محفل آرائی،
زمانے کی روش اے بے خبر کچھ اور کہتی ہے

عمر خیام کی ایک رباعی (انگریزی تخیل)

اُردُو زبان کی مختصر تاریخ

حکیم برہم مرحوم ایڈیٹر اخبار "مشرق" گورکھپور
کا

ایک غیر مطبوعہ مضمون

اردو زبان پر بہت بڑی بحث کی ضرورت میری رائے میں نہیں ہے اس لئے کہ چند ورقوں میں اس کی تاریخ بیان کی جا سکتی ہے ہندوستان میں آرین قوم کے وسط ایشیا سے آنے سے پہلے اس ملک میں قدیم ہندوستانی قومیں آباد تھیں۔ یہ پتہ لگانا کہ ان کی مذہبی اور سوشل زندگی کیونکر بسر ہوتی تھی بہت مشکل ہے۔ تاہم یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ اس ملک میں مختلف زبانیں بولی جاتی ہونگی۔ کیونکہ آج بھی ہندوستان کے اندر سینکڑوں بولیاں بولی جاتی ہیں۔

آرین قوم چونکہ فاتح قوم تھی اس نے قدیم اقوام کی زبان کو پراکرت اور اہل ملک کو ملکش کا خطاب دیا۔ پراکرت غیر مہذب اور "ملکش" گونگے کو کہتے ہیں۔ جس طرح عرب غیر عرب کو عجم کہتے تھے۔

قدیم زمانہ سے یہ دستور چلا آتا ہے کہ فاتح قوم کا اثر ملکی معاشرت اور زبان پر بہت زیادہ پڑتا ہے اور وہ مفتوحہ اقوام کی زبان اور تہذیب کو حتی الوسع مٹانے کی کوشش کرتی ہے مگر آرین قوم اس قدیم ہندوستانی زبان پر صرف یہ اثر ڈال سکی کہ آگے چل کر یہ پراکرت ایک دوسری زبان بن گئی۔ یعنی برج بھاشا بنی اور برج بھاشا سے اردو۔

پراکرت زبانیں برابر ملک میں بولی جاتی رہیں اور ان کے مٹانے کی کوششیں ناکام رہیں۔

مہاتما گوتم بودھ کے زمانہ میں جب راجہ پرجا ایک ہو رہے تھے تو یہی پراکرت زبانیں درباری اور عوام کی بول چال میں کام آتی تھیں آخرکار یہی پراکرت زبان راجہ بھرت کے عہد حکومت میں برج بھاشا بن گئی۔ اور برج بھاشا میں تصنیف و تالیف ہونے لگی۔ عام و خاص میں برج بھاشا مہذب زبان سمجھی جانے لگی۔

سنسکرت کو دیوبانی یعنی الٰہی زبان آرین کہتے تھے گو اس کا پتہ لگانا بہت مشکل ہے کہ یہ زبان کب پیدا ہوئی۔ مگر یہ معلوم ہوتا ہے کہ سنسکرت ہی کے مثل کوئی زبان یہ قوم بولتی ہوگی۔

آرین کی تاریخ کا جہانتک پتہ لگا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قوم کی شاخیں وسط ایشیا سے نکل کر جیحون و سیحون کو طے کرتی ہوئی ہندوستان۔ مصر۔ یونان۔ روما کو گئیں اور اپنے ساتھ ملکی خصوصیات میں بت تراشی اور زبان کو بھی لیتی گئیں اور انکی اصلی زبانیں جس ملک میں یہ پہنچے بدل گئیں۔ جیسا کہ یورپ۔ مصر۔ یونان۔ روما اور ہندوستان میں صاف نظر آ رہا ہے کہ ملکی زبان اور معاشرت سے یہ ہر جگہ مغلوب ہو گئے۔

فارسی۔ سنسکرت۔ لاطینی۔ انگریزی زبانوں کے الفاظ آپس میں بہت ملتے جلتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم ایرانی زبان اور سنسکرت کا تعلق بہت گہرا ہے۔ ہندوستان آکر آرین قوم نے اپنی زبان کو بہت محفوظ رکھا اور یہاں تک ضابطہ اور قاعدہ بنا دیا کہ اگر کوئی غیر آرین اس کو سیکھتا یا پڑھتا تو اس کو سخت سزا دی جاتی۔

باوجود اس سختی و پابندی کے آرین پراکرت سے اپنی زبان کو ملنے سے بچا نہ سکے اور پراکرت میں آرین قوم کی زبان اس قدر مل گئی کہ

اُس نے ایک دوسری زبان پیدا کردی جس کا نام برج بھاشا ہوگیا۔

مسلمانوں کی آمد چھٹی صدی عیسوی یا پہلی صدی ہجری سے ہندوستان میں شروع ہوئی اور وہ سب سے پہلے غازی محمد قاسم خلیفہ ثالث کے عہد خلافت میں سندھ تک آئے اور یہاں کچھ روز قیام کیا۔ گویا پہلے پہلے عرب کے مسلمان ہندوستان آئے۔ ان عربوں کی آمد کا پتہ موپلا قوم سے چلتا ہے مگر موپلا قوم کی زبان جنوبی ہند کی قدیم پراکرت سے اس قدر مغلوب ہوئی کہ اس عرب نژاد قوم نے جس کے باپ دادا بالیقین حضرموت کے عرب تھے۔ اپنی زبان ہی نہیں بدلی اپنے نام بھی بدل ڈالے اور معاشرت بھی بدل گئی۔ ماں کا اثر اولاد پر ہوتا ہے۔ یہ فلسفہ نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

غرضکہ عربوں اور سندھیوں کے تبادلۂ خیالات سے ایک مخلوط زبان پیدا ہوئی۔ گیارھویں صدی عیسوی سے جب مسلمان ایران اور افغانستان کی طرف سے حملہ آور ہوئے اور ہندوستان میں ان کا دور دورہ ہوا تو ہندوؤں سے میل جول بھی ہونے لگا۔ اور فارسی اور بھاشا دونوں میں قدرتی طور پر اس قدر اتحاد پیدا ہوگیا کہ تیسری زبان اُردو کی بنیاد پڑگئی۔ اس طرح گویا دو بچھڑی ہوئی بہنیں ہندوستان میں مل گئیں کیونکہ فارسی اور سنسکرت آرین زبانیں کہلاتی ہیں اور برج بھاشا سنسکرت کی لڑکی کہی جاتی ہے۔ فارسی اور بھاشا کا ملنا اور ان سے اُردو کا پیدا ہونا ایک ہی خاندان کا سلسلہ توالد و تناسل ہے۔ در اصل مسلمانوں کا صرف اسقدر لگاؤ ہے کہ اُن کے ذریعہ سے فارسی ہندوستان میں آئی ورنہ صحیح یہ ہے کہ فارسی اور بھاشا اور سنسکرت سب آریہ زبان سے نکلتی ہیں اور اس وقت بھی اردو زبان میں اسماء و صفات کے سوا عربی فارسی قواعد ضوابط کا عمل نہیں ہے اور جن لوگوں نے فارسی عربی کے قواعد کا پابند اردو زبان کو کیا ہے۔ انہوں نے سخت غلطی کی ہے بلکہ اردو کے قواعد برج بھاشا کے قواعد ہونا چاہئے۔ اور میرا خیال ہے کہ مولوی عبدالحق صاحب بی اے ناظم تعلیمات اورنگ آباد دکن نے اسی اصول پر قواعد اردو بنائے ہیں۔

فیلن صاحب جو ایک مشہور ماہر فن لغت تھے اور جن کی یادگار ایک ضخیم ڈکشنری اردو و انگریزی کی موجود ہے۔ اپنی کتاب طبقات الشعراء میں لکھتے ہیں کہ

> "گیارھویں صدی عیسوی کے قبل تمام ہندوستان میں ویدک زبان کے خلاف ایک اور زبان مروج تھی (پراکرت) اور راجہ بھرت کے عہد حکومت میں بھاشا کو فروغ ہونا شروع ہوا۔ ہنوز بھاشا نشو و نما کی حالت میں تھی اور اس کی تکمیل نہیں ہوئی تھی کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر متواتر حملے شروع کردیئے۔ حتیٰ کہ بارھویں صدی میں پٹھانوں نے ہندوستان میں اپنی حکومت قائم کرلی اور اقتضائے وقت کے حکمران دو اجنبی قوموں کے درمیان بات چیت۔ لین دین۔ خرید و فروخت اور دوسرے معاملات کے افہام و تفہیم کے لئے ایک جدید اور مرکب زبان کی بنیاد پڑی اور تیمور کی فتوحات سے اُسے ترقی اور استحکام ہوا"۔

لیکن یہ ملحوظ رہنا چاہیئے کہ مسلمانوں کی زبان اس وقت فارسی تھی اور جس طرح ہم آج انگریزی زبان میں دستگاہ اور کمال پیدا کرنے کو فخر اور ضروری سمجھتے ہیں یہانتک کہ آج کل بغیر انگریزی دانی کے معاملات زندگی ادھورے اور بے لطف رہ جاتے ہیں۔ اُس ابتدائی زمانے میں یہی کیفیت ہندوؤں کی تھی۔ یعنی بطور قاعدہ کے قوم مفتوح کو ضرورتاً فاتح کی زبان سیکھنے پر مجبور ہونا پڑتا ہے۔ اس طرح ہندوؤں نے فارسی سیکھنے کی کوشش کی اور اردو جس کا بیج محض زمین میں دبایا گیا تھا۔ اب اُس نے چند فیٹ کا قد حاصل کیا اور اس وقت اُسے دیکھ کر یہ صحیح پیشین گوئی کی جاسکتی تھی کہ کچھ عرصہ میں یہ ایک تناور اور عظیم سایہ دار درخت ہوجائے گا۔ تیمور کے زمانے میں ہندو مسلمانوں کے ربط و ضبط اور روزانہ مراسم نے جنوبی ہند میں بھی ایک زبان کی بنیاد ڈالی جسے آج "دکھنی" کے لفظ سے یاد کرتے ہیں۔

اس بیان میں اس قدر تشریح اور ضروری سمجھتا ہوں جس سے

اردو کی بنیادی نسل صاف صاف ظاہر ہو جائے گی اور اس کے لئے بہتر طریقہ یہ ہے کہ ایک انگریزی محقق کے حوالہ جات کا اقتباس کر کے اردو کی اصل واضح کر دی جائے۔ اس سے معلوم ہوگا کہ بہت سی زبانوں کی ماں آریہ زبان ہے اور اُن میں سے ایک اردو بھی ہے جو تیسری پشت میں داخل ہے اس لئے یہ ہرگز قابل نفرت نہیں ہے۔ نہ اسے صرف مسلمانوں سے مخصوص کرنا صحیح ہے بلکہ آریا کی شاخوں میں اردو بھی شامل ہے اور جو لوگ ہندی کو محبت کی نظر سے دیکھتے ہیں ان کا فرض اول یہ ہے کہ اس کی اس نسل سے بھی الفت کریں۔ اس لئے کہ ہندستان میں نواسے کی بہت بڑی عزت کی جاتی ہے حتیٰ کہ مشروط حالتوں میں وہ تمام جائداد کا وارث ہو جاتا ہے۔ پس اس کے ساتھ معاندیت کا برتاؤ درحقیقت اس کی ماں سے بے پروائی کو ظاہر کرتا ہے جو ہندوستانی روایات کے خلاف ہے۔

پس آریہ زبان نہایت قدیم اور بہت سی زبانوں کی مورث اعلیٰ ہے اس کو زیادہ تفصیل کے ساتھ سمجھنے کے لئے ذیل کا شجرہ بہت کارآمد ہوگا۔

آریا

سنسکرت — ایرانی — مملوکی — کلٹک (قبطی) — ہلنگ (یہاڑی) — اٹالین — ٹیوٹنک

سنسکرت: ہندوستانی (اردو) — پالی — آسامی — اوڑیا — مرہٹی — گجراتی — سیلونی — سندھی

ایرانی کی شاخ

ژند — پہلوی — فارسی — پشتو — ارمنی

مملوکی شاخ

روسی — اسیرین (کوہ قاف کے شمال کی زبان)

کلٹک کی شاخ

گالک — کرک

گالک: آئرش — اسکاچ — مکینین — ویلش — برٹش

ہلنگ کی شاخ

یونانی — رومی قدیم

اٹالین کی شاخ

لاطینی

لاطینی: ہسپانیہ — اٹلی مال — پرتگیزی — فرانسیسی

ٹیوٹنک کی شاخ

گاتھک — جرمنی طبقہ اعلیٰ — اسکنڈی نیوین — جرمنی طبقہ ادنیٰ

جرمنی طبقہ اعلیٰ: جرمنی موجودہ

ڈنمارک — سوئیڈن — ناروےجین — البرگ

چنانچہ معنی الفاظ کی صراحت ذیل میں درج ہے۔ جس سے آریا زبان کی نسل کا حال کھلتا ہے:۔

فارسی	سنسکرت	لاطینی	بنگالی	انگریزی
پدر	پتر	پیٹر	پتری	فادر
برادر	بھراتر			
پور	پتر			
دختر	دوہتر			
مادر	ماتر			
زانو	جانو			
بار	بھار			
بوم	بھوم			
اسپ	اشو			
انگشت	انگشٹ			
پا	پاؤ			
بیم	بھئے			
ثماشاک	کشیا			
استاد	استھا	اسٹو	استھان	اسٹینڈ
یاد	ود	ودیو	ودیا	وٹ
دو	ڈوئی	ڈوز	دوئی	ٹو
یکسو	یسوگا	یکم	یاگ	یوک

میں نے اوپر بیان کیا ہے کہ برج بھاشا راجہ بھرت کے عہدِ حکومت میں بنی اور پہلی طرح بنی جس طرح فاتح مسلمانوں کی آمد اور میل جول سے فارسی اور بھاشا ملکر اردو بنی۔ یا آج بنگال میں (۳) حصہ اور اردو پنجابی وغیرہ زبانوں میں بکثرت یورپ کی زبانوں کے اسماء صفات مل رہے ہیں۔ مسلمانوں نے تو اس کا خیال کبھی نہ کیا کہ فارسی زبان ہندوستان کی ملکی زبان بنائی جائے۔ نہ انگریزوں نے یہ خیال کیا کہ فارسی زبان اردو کو خارج کرکے انگریزی ملکی زبان بنا دی جائے مگر آرین نے دور اندیشی اور قابلیت سے کام لیا اور اقوام ہند کو غلام بنانے کی یہ تدبیر سوچی

کہ ہندوستان کی قوموں کے چار برن کر دیئے اور یہ حکم دیا کہ ہماری خاص زبان آریا قوم کے سوا دوسرا نہ پڑھے نہ دیکھے نہ سُنے۔ اس تہدید پر بھی خود ہی مجبور ہو کر پراکرت زبان میں اپنی دیوبانی زبان کے الفاظ داخل کرکے برج بھاشا بنائی اور یہ تبدیلی اصولی تھی اسکو کوئی قوم روک نہیں سکتی زبانیں خود بنا کرتی ہیں اور جب بن جاتی ہیں تو ان کے نام رکھے جاتے ہیں۔ درباری سرکاری عدالتی فوجی محکموں کا کام انہیں ملکوں سے لینا پڑا اور باوجود چار برن بنا دینے کے بھی وہ اپنی زبان کو محفوظ نہ رکھ سکے مسلمان فاتح آئے تو میل جول اقوام سے بڑھا اور ایسا بڑھا کہ فارسی زبان کا تعلق بھاشا سے ہو گیا۔ دونوں ایک ماں کی اولاد تھیں۔ اس لئے برج بھاشا پر فارسی کا اثر غالب آ گیا اور جیسا اوپر لکھا گیا ہے بارھویں صدی میں ایک نئی زبان بننے لگی اور فارسی کا اثر اس زبان پر اتنا زبردست اور جلد ہوا کہ دنیا کی کسی زبان نے اس قدر جلد اپنا نقشہ نہیں جمایا۔

تقریباً آٹھ سو برس کے بعد پراکرت زبان کی ترقی یافتہ بہن برج بھاشا اردو زبان میں تبدیل ہو گئی اور آج اس کی بولنے والی اور سمجھنے والی ملک میں (۳) حصہ آبادی موجود ہے۔ ہندوستان کی کسی سمت میں نکل جایئے اردو زبان بولنے والا ہر شہر ہر قصبہ ہر دیہات میں اپنا کام نکال لیتا ہے۔ اور دوسرا اجنبی شخص جو اردو میں پوری قابلیت نہیں رکھتا ہے اردو بولنے والے کا مطلب سمجھ جاتا ہے۔

گو اب یہ کوشش سیاسی نقطۂ نظر سے ہو رہی ہے کہ آئندہ مردم شماری کے وقت ۱۹۴۱ء میں اردو زبان کا لفظ ہی نکال دیا جائے۔ اور باشندگان ملک کی زبان ہندی لکھوائی جائے۔ جیسا کہ ۱۹۳۱ء میں مردم شماری کے وقت ضلع بارہ بنکی میں جہاں تک ہو سکا اردو کی جگہ ہندی زبان لکھوائی گئی اور ہم نے اس پر کچھ لکھا بھی تھا۔ ہمارا خیال ہے کہ مسلمان اس معاملہ میں غفلت نہ کریں گے اور برٹش قوم کی موجودگی میں ہم کو یہ امید نہیں ہے کہ اردو کے دشمن اپنی حکمت عملی میں کامیاب ہونگے۔

دراصل مسلمان بادشاہوں نے اردو کی ترقی میں کچھ بھی کوشش نہیں کی جس طرح تبلیغ اسلام میں انہوں نے توجہ نہیں کی اور [illegible] جو نظر رکھی ورنہ آج چودہ کروڑ اچھوت مسلمان نظر آتے۔ اسی طرح اگر [illegible]

ترقی شاہانِ مغلیہ چاہتے تو آج اردو مدارج اعلیٰ پر نظر آتی۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو کی ترقی دینے اور اردو کے قواعد بنانے میں انگریزوں نے سبقت کی اور انگریزی حکومت ہی نے اردو کی کتابوں پر مصنفین کو انعام دے کر حوصلہ افزائی کی۔ ہم کو امید ہے کہ ہماری یہ توقع پوری ہو کر رہے گی۔ کہ ہندو سبھا کے پروپگنڈے کے موافق اردو کو ہندی مردم شماری کے ہندو عمال نہ بنانے پائیں گے۔

گئو رکھشا۔ ہندی زبان کی ترقی۔ یہ دو چیزیں ہندو سبھا کے پیش نظر ہیں اور ان سے ایک ہندو بھی غافل نہیں ہے۔ چالیس برس کے اندر جتنی اولاد ہندوؤں کی پیدا ہوتی ہے۔ اس میں پچانوے فیصدی وہ لوگ ہیں جو فارسی اور اردو کا ایک حرف لکھنا اور پڑھنا نہیں جانتے مگر اردو زبان میں گفتگو نہایت شائستگی سے کرتے ہیں۔

میرے سیاسی عقائد ہندوستان میں وہ نہیں ہیں جو لالہ ہردیال ایم اے اور ان کے ہمخیال ہندوستانی لیڈروں کے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مسلمانوں کو ہندوستان میں ہندو بن کر رہنا ہوگا اُن کو اپنے اسلامی نام بدل کر ہندوانی نام رکھنے ہوں گے۔ عبادت وہ کسی طرح کریں مگر مسجدوں کو مندر کہنا ہوگا۔ ہندوستان کے باہر جو مسلمان سلطنتیں ہیں اُن سے کسی قسم کا تعلق ہمدردی و محبت کا نہیں رکھ سکتے۔

یہ طریقہ جو بتلایا گیا ہے اسی اصول پر ہے جس کو ہندوستان میں آکر آرین نے اختیار کیا تھا کہ ہندوستان کی قدیم قوموں کو ذلیل کر کے غلام بنا دیا اور خود سردار بن گئے۔ اور آج چودہ کروڑ قدیم باشندے اچھوت بنے پھر رہے ہیں۔ ان کو آرین مندروں اور سڑکوں پر آنے جانے کی اجازت نہیں ہے مگر لالہ ہردیال اور اُن کے ہم خیال یہ بات بھول گئے ہیں کہ مسلمان قدیم اقوام ہند میں نہیں ہیں یہ بحیثیت فاتح ہندوستان میں آئے اور ان کو معلوم ہوا کہ ان سے پہلے جو فاتح آئے تھے۔ اُن کی معاشرت اور حسن سلوک قدیم اقوام سے اچھا نہیں رہا اور باشندگانِ ہندوستان کی روش کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہ جس ملک پر قابض ہوتے اس کی حفاظت نہیں کر سکتے کہ چند ہزار مسلمانوں نے کروڑوں کی تعداد پر قبضہ کر لیا اور اچھوت کو اپنے حال پر چھوڑ دیا۔ اسلام میں زبردستی جائز نہیں۔ اور ایسا ہی ہو رہا ہے کہ سارے ملک میں مسلمانوں کو دبانے کی کوشش ہر ممکن طریقہ سے کی جا رہی ہے لیکن مسلمان ایک زندہ مذہب رکھنے والے ہیں ان کا دبانا بہت مشکل ہے۔

اگر ہندو لیڈروں میں کچھ بھی سمجھ ہوتی اور ان کا زاویۂ نظر ملک کی حفاظت ہوتا تو سب سے پہلے یہ کوشش کرتے کہ ہندوستان کی مشترکہ زبان اردو بنا دی جائے۔ کیونکہ جب تک زبان ایک نہیں ہوتی دل بھی ایک نہیں ہو سکتے اور یہ ظاہر ہے کہ بغیر مسلمانوں کو ساتھ لئے ہوئے ملک کو نجات غیر قوم سے نہیں دلوا سکتے۔

جن لوگوں کو اب تک یہ نہیں معلوم ہوا ہے کہ برج بھاشا اور فارسی ایک ماں کی اولاد ہیں اور ان دونوں کا جوڑا ملکر اردو زبان پیدا ہوئی ہے اس سے نفرت کرنا اور بھارت ماتا کی محبت کا دعوےٰ کرنا حماقت ہے۔ اُن کی یہ سیاسی چالیں کوئی مہذب قوم پسند نہیں کرے گی اس کے ساتھ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ہندوستان میں بکثرت ایسے مسلمان موجود ہیں۔ جن کے آبا و اجداد کو آرین قوم نے چھتری کا خطاب دیا اور انہیں کی بدولت برہمنوں نے اس ملک پر حکومت کی ہے۔ اُس کو آج یہ بزدل سمجھ کر غلام بنانا چاہتے ہیں وہ اس ننگ کو کیونکر گوارا کر سکتے ہیں۔ یہ ظاہر ہے بہادر چھتری ہی زیادہ تعداد میں مسلمان ہوئے اور یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ مسلمانوں کی تلوار ان کو دائرہ اسلام میں لائی ہے یہ کہنا ایک بہادر قوم کی شرافت کی توہین ہے۔ پس جس طرح مسلمان آرین قوم چھتری سے مل کر ایک ذات ہو گئے کہ اگر ان کی جسم کی تشریح کی جائے تو ایک قطرۂ خون بھی ایسا نہیں نکلے گا جو ہندو مسلمان کا تجزیہ کر سکے۔ اسی طرح بلکہ اس سے کہیں زیادہ بھاشا اور فارسی مل کر اردو بنی ہے جس کا ذکر ہم نے اوپر اچھی طرح کر دیا ہے اور اسکو نہ سمجھنا سراسر انصاف کا خون کرنا ہے۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ اردو زبان کی اصلیت کو بگاڑنے میں اس وقت ہندو مسلمان دونوں برابر کا حصہ لے رہے ہیں۔ اسکی تفصیل کے لئے بہت وقت درکار ہے اور یہ اوراق اس کے متحمل بھی نہیں ہیں تاہم مختصر طور پر ہم بتلا دینا چاہتے ہیں کہ سب کے پہلے ہندوؤں نے

یہ کوشش شروع کی کہ سنسکرت کے غیر مانوس الفاظ اخبارات اور اپنی تقریروں میں بھرنا شروع کئے اور دیکھا دیکھی مسلمانوں نے عربی کے بہت غیر مانوس الفاظ اردو میں داخل کرنا شروع کر دیئے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک معمولی پڑھا لکھا ہندو ہو یا مسلمان دونوں کے اخبار و تقریر پڑھنے اور سمجھنے سے مجبور ہو جاتا ہے۔

بہرحال مسلمانوں کو اس بات کے سمجھنے کی ضرورت ہے کہ اگر ان کو اردو کی حفاظت کرنا ہے تو وہ نثر اور نظم اردو زبان میں وہ رنگ اختیار کریں جو منشی امیر احمد صاحب امیر مینائی رحمۃ اللہ علیہ نے اختیار کیا ہے۔ کیونکہ اردو نے جس تہذیب و شائستگی سے نشو و نما پائی ہے اس کا یہ تقاضا ہے کہ وہ اسی طرح دونوں قوموں کے ہاتھوں سے پھولتی پھلتی رہے۔

ہندوستان کی قدیم پراکرت سے بھاشا بنی اور بھاشا کی ترقی یافتہ لڑکی اردو ہے۔ فارسی کو اگر آپ باپ کہتے ہیں تو بھاشا ماں ہے۔ اور یہ دونوں آریہ کے نسل سے ہیں۔ مسلمانوں کو صرف اسی قدر اس پر حق ہے کہ دونوں کو ہزاروں برس کے بعد ملا دیا اگر یہ حق کچھ قوت رکھتا ہے تو ہندوؤں سے ہم کو یہ کہنا ہے۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرساں

غزل

(از جناب نازش حیدری دہلوی)

آیا ہوں ایک حکم مشیت لئے ہوئے
یعنی وفا کا بار امانت لئے ہوئے

اُٹھی ہے آنکھ جلوۂ صورت لئے ہوئے
ہر گوشۂ نگاہ میں جنت لئے ہوئے

نازاں ہے اپنے بخت پر آئینہ خیال
اک شاہکار خامۂ قدرت لئے ہوئے

کعبہ بھی اور دَیر بھی ہے دیدنی مگر
آیا ہوں اک نگاہ کی فرصت لئے ہوئے

ہر طرح مطمئن ہوں میں ہنگام اضطراب
ہر غم ہے تیرے لطف کی غایت لئے ہوئے

یہ خاکداں بھی تاروں بھری رات کی طرح
آغوش میں ہے جلوے بکثرت لئے ہوئے

اُس انجمن میں شوخ نگاہوں کے سامنے
رہنا ذرا مجھے مری حیرت لئے ہوئے

آغوش دل سے جلوے تڑپ کر نکل گئے
میں رہ گیا خیال کی وسعت لئے ہوئے

اے چشم شوق اب سوئے برق جمال اُٹھ
لیکن بقدر دید بصارت لئے ہوئے

یہ گل نہیں ہیں باغ میں کچھ اہل قبر نے
واپس کئے ہیں داغ محبت لئے ہوئے

نازش حضور قلب سے نکلی ہے بار ہا
اک آہ لاکھ سجدوں کی غایت لئے ہوئے

صبح بنارس

(ایک اثر خیز و دلگداز نظم)

(از حضرت خیر بھوروی صاحب)

لے گیا "صبح بنارس" کا تخیل ایک بار
مجھ کو گنگا کے کنارے کھینچ کر بے اختیار

آسماں کے "سرد انگارے" فروزاں تھے ابھی
عکس بھی سوئے ہوئے پانی میں لرزاں تھے ابھی

تھا ابھی "سویا ہوا گنگا کی لہروں کا وقار"
تھی ابھی سوئی ہوئی "صبح بنارس" کی "بہار"

آ رہی تھی دور سے "درماندہ کوئل" کی صدا
اور چوروں کی طرح تھم تھم کے چلتی تھی ہوا

دھوپ اور چندن کی خوشبو کا فضا میں راج تھا
چاندنی کا سر پہ گنگا کے سنہرا تاج تھا

صبح کی کچی سفیدی ہو رہی تھی جلوہ گر
"شام غم" کی تھی اداسی لیکن اب تک گھاٹ پر

دھرم کیا گنگا کا ہے اور پھول کا مذہب ہے کیا؟
کر رہا تھا غور اس پر اک طرف بیٹھا ہوا

دفعتاً لہریں ہوئیں بیدار کھا کر پیچ و تاب
سن کے "ساز حسن" جیسے جاگ اٹھتا ہے شباب

دیکھتا کیا ہوں کہ اک "جان بنارس" "نازنین"
"سرخ بیندی" سے ہے خالی جسکی "صندل سی جبیں"

نذر گنگا کر رہی ہے اس طرح حسن و شباب
کروٹیں لیتا ہے جیسے "مست لہروں میں گلاب"

ڈوبتا تھا "حسن کاشی" "رونق بزم حیات"
ہو رہا تھا درہم و برہم نظام کائنات

کس طرح خاموش رہتا، دیکھ کر ایسا سماں
وہ بھی مجھ سا حسن کی رنگینیوں کا قدرداں

گود سے گنگا کی چھینی "حسن کاشی" کی اساس
گھاٹ سے کچھ فاصلے پر کشتیوں کے آس پاس

جسم پر بھیگی لٹیں پھیلی ہوئی تھیں اس طرح
ناگنیں صندل کی شاخوں میں ہوں لپٹی جسطرح

صبح کے اس سانحے سے روح تھی خاموش سی
میں تھا کچھ مدہوش سا اور وہ تھی کچھ بے ہوش سی

ہوش میں آئی تو پوچھا میں نے اے "جانِ بہار"!
نذر گنگا کر رہی ہے کیوں "جوانی کا سنگار"؟

"پھول" ہیں تیرے لئے کلیوں کا رس "تیرے لئے"!
رونقیں بزمِ دو عالم کی ہیں بس تیرے لئے!

"نازشِ فطرت" ہے تو "سرمایۂ قدرت" ہے تو!
مختصر سی بات تو یہ ہے کہ اک عورت ہے تو!

سن کے یہ "اشکوں کی گنگا" آنکھ سے جاری ہوئی
روح پر اس کی بلائے بےکسی طاری ہوئی

شرم سے گردن جھکا کر "جانِ کاشی" نے کہا
آپ سچ کہتے ہیں۔ لیکن ہے یہ ان کا تذکرہ

"چوڑیاں زندہ" ہیں جنکی۔ جنکا "زندہ ہے سہاگ"
جنکی زندہ ہیں بہاریں جاگتے ہیں جن کے بھاگ

راندھوں میں رانڈ ہے میری "جوانی کا سہاگ"
سو گئی ہے میری قسمت، سو گیا ہے میرا بھاگ

مجھ سے نالاں ہے زمانہ، میں زمیں پر بار ہوں
اس لئے اس زندگی سے اور بھی بیزار ہوں

دولھنیں کرتی ہیں نفرت بھاگتی ہیں لڑکیاں
دیکھ کر چہرے پہ میرے بیوگی کی زردیاں

رات دن طعنے یہ دیتی ہیں مری نندیں مجھے
میرے ہی بھائی کو کھا جانا تھا اے ڈاین تجھے!

میرا منہ بھی صبح کو اب دیکھنا ہے ناگوار
ٹوکا کرتی ہے مجھے بوڑھی پڑوسن بار بار

مر چکی ہیں میری ماتا۔ ہیں پتا جی ہردوار
گھر میں اک چھوٹی سی لڑکی تھی "پتی کی یادگار"

رات وہ بھی ہو گئی مجھ سے خفا اور چل بسی
گود میں آرام سے پرماتما کی سو گئی

کون تھا سنسار میں اب میرا گنگا کے سوا
جس کو یہ بپتا سناتی۔ اور دکھ کا ماجرا

کہتے ہی یہ اس کی "آوازِ حزیں" بھرا گئی
روح رخصت ہو گئی چہرے پہ زردی چھا گئی

دیکھتے ہی دیکھتے "صبحِ بنارس" کی بہار
بن گئی "شامِ الم" کی مستقل اک یادگار

خیر بھوروی۔ گورکھپور

پرائی اولاد

ایک بہترین افسانہ

از: (جناب حسن عزیز۔ جاوید)

پورن کے چچا نے اس کی پرورش میں کچھ کوتاہی نہیں کی تھی۔ منگل اور بتیا کھو کی طرح ہمیشہ اسے بھی اپنا ہی لڑکا سمجھا۔ ایک ساون میں جب منگل کی ماں کو اپنے میکے سے واپسی کے وقت ساونی ملی تھی۔ اور اس ساونی میں منگل اور بتیا کھو کے واسطے دو لال کنارے کی دھوتیاں اور دھوتیوں کے سرے میں بندھے ہوئے پاؤ پاؤ بھر بتاشے بھی آئے تو ہرلال نے لال پیلی آنکھیں نکالی تھیں۔ عورت کے مارنے کو لوہے کی شام لگا ہوا لٹھ بھی نکال لیا تھا۔ اور دو دو دن تک نہ کھایا نہ کھانے دیا تھا۔ اس لئے کہ پورن کے واسطے ان لوگوں نے ساونی میں دھوتی کیوں نہیں بھیجی؟ کیا پورن ہرلال کا بھتیجا نہیں تھا؟ منگل اور بتیا کھو کی ماں کو اسکی بڑی تاکید رہتی تھی کہ پورن کی اچھی خبرگیری کرے۔ جس دن کوئی پکوان پکتا تھا تو ہرلال اپنے رسوئی گھر میں خود آبیٹھتا اور گہری تحقیقات کرتا کہ آیا پورن کو بتیا کھو اور منگل سے ایک آدھ پوری۔ برے۔ یا مال پوا کم تو نہیں ملا ہے۔ منگل اور بتیا کھو کی قابل تعریف ماں جس کا رواں رواں خدا کے خوف سے کانپتا رہتا تھا۔ بھلا کس طرح اپنے متوفی دیور دیورانی کی اکلوتی ایک نشانی پورن ـــ کے ساتھ غیریت کا برتاؤ کر سکتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ایسے موقعوں پر ذرا سے تجسس کی تاب نہ لا سکتی تھی اور جھلا کر منہ بنا کر۔ غصہ بھری آنکھیں چمکا کر پکوان کے ٹوکرے اپنے شوہر کے سامنے کھسکا دیتی کہ دو چار تلن پرن زمین پر بھی گر پڑتے اور آواز بلند کہتی ـــ لو! لو! اب تم اور اپنے ہاتھ سے پورن کو دیدو!"

پورن کیا تھا؟ میاں بیوی کے درمیان فساد کی زبردست چنگاری۔ سمرن اہیر۔ جھابیر کیوٹ یا بھگوت دھوبی جب رام رام کرتے ہوئے۔ اس کے چبوترے کے سامنے سے نکلتے اور ہرلال بہت مختصر رام رام کر کے انہیں آنے۔ آکر بیٹھنے اور بیٹھ کر چلم پینے کے لئے مدعو نہ کرتا تو وہ ضرور تصور کرتے تھے کہ آج کچھ دال میں کالا ہے۔ اسی لئے وہ از رہِ ہمدردی چلم پینے اور اسی سے تمباکو مانگ کر اس کی چلم میں بھر کر اسے پلا کر خود بھی صرف چند کش لینے کے لئے اس کے آنگن میں آجاتے تھے۔ "آج کیسے اداس ہو؟" یہ کبھی نہیں پوچھتے تھے۔ کیونکہ عاقل کو اشارہ کافی ہوتا ہے اور وہ بھی آخر عاقل ہی تھے! اسی لئے وہ جب مسکرا کر ہرلال کی بیوی کو اندر سے "بھابھی!" کہہ کر آواز دیتے اور صرف چلم میں بھرنے کے لئے انگارہ منگنے کو بلانے۔ اور اس کے غصے سے انگارہ دہکتے اندر بھاگنے پر اٹے آڑے ہاتھوں لینے تو ہرلال کا بھی منہ کھل جاتا تھا۔ اور وہ پورن کے ساتھ اپنی بدسلوکی کی جدید ترین قسم بیان کرنے لگتا تھا۔ ان کی بھابی بھی بالکل بگولے کی طرح اندر سے نکل آتی۔ اور اکیلی نہیں نکلتی تھی بلکہ پورن کو بھی کھینچ لاتی تھی اور ان ثالثانِ بالخیر کے سامنے کھڑا کر کے کہتی تھی ـــ بھیا! مجھ ابھاگی پر جھوٹے الزام لگائے جاتے ہیں۔ یہ پورن کھڑا ہے۔ اسی سے پوچھو۔" چھوٹا سا پورن نجانے کیوں صرف آنسو بہایا کرتا تھا اور تھر تھر کانپتے ہوئے صرف اتنا کہتا تھا کہ ـــ بڑی دائی نے نہیں مارا! مجھے نہیں مارا"

پورن کی شہادت۔ صداقت کی کسوٹی سے کسی طرح کم نہیں تھی۔ چنانچہ کوئی اس پر صاد کرے یا نہ کرے ہرلال کی بیوی اپنے شوہر پر برستی تھی ـــ زبردستی کا صبر تو نہ سمیٹا کرو! بال سفید ہونے لگے۔ دانت گرتے جا رہے ہیں۔ تین چار بچوں کے باپ ہو چکے۔ اب تو مجھ دکھیاری کو نہ ستاؤ"

اس وقت سمرن۔ جھابیر۔ اور بھگوت دھوبی کا فرض ہوتا تھا۔ کہ خوب قہقہے لگائیں اور ہرلال کو ہنسانے کے لئے مخاطب کریں ـــ "بھابی سچ کہتی ہے بڑے بھیا! تمہارے دانت گرتے جا رہے ہیں مگر اب تک عقل نہیں آئی۔" اس طرح ہرلال کا غصہ فرو کرایا جاتا تھا۔ اور اسے زبردستی کھانے کی تھالی کے پاس لیجا کر بٹھایا جاتا تھا۔

گاؤں کی تمام عورتیں اور لڑکیاں ہرلال کی بیوی کی منہ بولی

قرابت دار تھیں۔ بڑی بوڑھیاں جو تھیں تو کوئی خالہ لگتی تھی۔ کوئی پھوپھی کوئی بڑی ماسی تھیں۔ کوئی چھوٹی نانی۔ ہمسن جو تھیں وہ کوئی سگی لگتی تھی توکوئی گوتیاں۔ کوئی آپاتھی۔ کوئی جیٹھانی۔ کوئی دیورانی۔ کوئی بھاوج کوئی نند اور جو چھوٹی لڑکیاں تھیں وہ بتدریج بھانجی۔ بھتیجی۔ بیٹی۔ بہو تھیں۔ وہ ان تینوں قسم کے نسوانی طبقوں میں بیٹھکر ہرلال اور پورن کے سلسلے میں اپنی بے گناہی کے مفصل بیانات دہراتی رہتی تھی۔ اور سب سے داد خواہ رہتی تھی۔ چنانچہ ایک سرے سے دوسرے سرے تک گاؤں کا نسوانی حلقہ اس کے منہ پر ضرور اسے بے قصور اور معصوم صفت ہونے کا حلفیہ اقرار کرلیتا تھا۔ اور اس کا دل بھر دیتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی لڑکیاں بھی جھوٹے منہ اسے قصور وار کہتے ڈرنے لگی تھیں۔ کیونکہ دانی ٹولے سے بیاہ کرلائی ہوئی ہرچھیٹ کورمی کی بہو نے کہیں کہدیا تھا۔ کہ "بیاکھو کی ماں ایسی تمہارا بھی قصور ہے" تو بیاکھو کی ماں نے ندی کے گھاٹ ہی پر نہانا چھوڑ دیا تھا۔ کپڑے دھونے بند کردیئے تھے۔ بلکہ گیلی ساری کا آنچل گھونگھٹ کے منہ پر ڈال کر ایسے دلدوز پیرائے میں رونا پیٹنا مچایا تھا کہ گویا اُس دن بستی کا کوئی عزیز ترین آدمی مرگیا ہو! پھر بجائے اس کے کہ دانی ٹولہ والی نئی بہو کو کوئی تو اچھا کہتا۔ سب نے اسی کو برا بھلا کہا۔ اور بیاکھو کی ماں! چپ رہ چپ رہ! اری پاگل یہ نئی نواری لڑکی ہے۔ بھلا اسے اس بڈھے کھوسٹ کے ظلم کا کیا حال معلوم ہے۔ اور اس پورن کے کرتوت یہ کیا جانے جس کے پیٹ میں دانت ہیں۔ دیکھنا تو سہی بڈھے کو پورن ایک نہ ایک دن ضرور دھوکہ دے گا۔ بھلا پرائی اولاد کہیں اپنی ہوئی ہے" اس وقت بیاکھو کی بچاری ماں کے غمناک سرد سینے ہوگئے تھے۔ مگر بالکل بند اسوقت ہوئے تھے جب ہرچھیٹ کورمی کی نئی دلہن نے خود ہی اپنی لاعلمی کا واسطہ دلاکر اظہارِ افسوس کیا تھا اور مخلصانہ معذرت چاہی تھی۔

اس دن بیاکھو کی ماں نے ایک قابلِ ذکر بات اور کی تھی کہ پانی کا گھڑا لاکر تپائی پر فاتحانہ شان سے رکھا تھا۔ گیلی ساری کو صحن کے گرداگرد کی کانٹوں کی باڑھ پر پھیلایا تھا تو یہ بھی کہا تھا کہ — سنتے ہو! اے جی ذرا سننا! تمام گاؤں کی عورتیں آج گھاٹ پر پکارے گلے پھاڑ رہی تھیں کہ پرائی اولاد اپنی نہیں ہوتی ہے۔ دیکھنا بیاکھو نے باپ کو پورن ایک دن کیسا دھوکہ دیتا ہے"

بیاکھو کے باپ نے جھلاکر جواب دیا تھا — "چل دور ہو! بک بک کررہی ہے۔ کہنے دے!"

پھر خبر نہیں کیوں تامل کرکے اٹھ کھڑا ہوا۔ ہاتھ پکڑ کر گھسیٹنے لگا کہ — اچھا چل تو مقابلہ کرا۔ کون کون عورتیں کہتی تھیں"۔

لیکن دفعتاً پٹواری جی کے اپنے نقشے خسرے بغل میں دبائے ہوئے نمودار ہوجانے کے سبب مقابلہ ہوتے ہوتے رک گیا!

(۲)

پورن نے کتنے ہی ساونوں کے تلن پرن خوب شکم سیر ہوکر کھالئے کتنے ہی گنیش جی کی پوجا کے ناریل ہضم کرلئے۔ چیت میں فصل کی کٹنی ہونے پر نئے دانے کا جو تیوہار منایا جاتا ہے۔ ایسے کئی نئے دانے کے تیوہار کے پکوان سے متمتع ہوچکا۔ اب ذرا سا نہیں تھا۔ اچھا اونچا پورا جوان ہوچکا تھا۔ کھیتی کے کاروبار میں اپنے بڑے دادا اور بھائیوں کا ہاتھ بٹانے کے قابل تھا۔ اور بٹاتا تھا۔ کیونکہ صرف وہی پورن کو مکھر چلانے کے لئے کھیت جانے کا حکم دیتی تھی۔ بھینس کا دودھ دوہنے کے واسطے اور رگائے بیل اور بھینس کو لیجاکر چرواہے کے سپرد کرنے کے لئے پوپھٹنے ہی اٹھا دیتی تھی۔ جب فصلیں کھڑی ہوتیں تو سرد راتوں میں کھیت کی نگرانی کے لئے شام کی روٹی اپنی پھٹی ساری کے ایک ٹکڑے میں باندھ کر اسے کھیت روانہ کیا کرتی تھی۔ لیکن ہرلال اس کے برخلاف کارروائی عمل میں لاتا تھا وہ جب کبھی کوئی کام کہتا تو صرف بیاکھو اور منگل ہی کو کہتا تھا۔ پورن سے شاید اس لئے نہیں کہتا تھا کہ آخر اسے کام کہنے والی اس کی غمگسار بڑی ماں تو تھی۔ یا شاید اس لئے نہ کہتا ہو کہ پورن سیانا ہوگیا تھا۔ تاہم بیاکھو اور منگل سے چھوٹا ہی تو تھا۔ بہرکیف تقسیم احکام کی یہ خصوصیت برتی جاتی تھی۔

جس دن سرکاری جنگل میں بغیر لائسنس چرتے ہوئے ہرلال کے تمام مویشی پکڑے گئے تھے اور جنگلات کے محکمے سے چالیس روپے معاوضہ بندھا تھا۔ تمام گاؤں اس کے ہاں ایسا اکٹھا ہوگیا تھا۔ گویا آتشزدگی کا

ہولناک حادثہ رونما ہوا ہو۔ اور تمام گاؤں کے زن و مرد آگ بجھانیکے پانی لے کر آئے ہوں۔ مویشی چرانے گئے تھے۔ منگل اور پورن۔ آخر لڑکے ہی تھے۔ دونو کھیل میں لگ گئے۔ دوسرے چراہوں نے اس دن خصوصیت سے عدم تعاون پر اس واسطے عمل کیا کہ منگل کو گالیاں بکنے کے باعث پورن نے ان سب کی گوشمالی کی تھی۔ انہوں نے جنگل میں مویشی چلے جانے دیئے۔ چنانچہ جب ہرلال کا تمام صحن رات کو بھر گیا تھا اور باہر تک اہل موضع کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے تھے۔ تو میاں بیوی میں ایسی بات پر رسہ کشی ہو رہی تھی کہ مویشی سرکاری جنگل میں گھسنے دینے کا ذمہ دار کون تھا؟ ہرلال منگل کو مارنے کے واسطے۔ دانت پیس پیس کر لال پیلی آنکھیں نکال نکال کر اپنی ہیتل کی شام والی لاٹھی لے کر دوڑتا تھا۔ لیکن آگ بجھانے والے کمر پکڑ پکڑ لیتے تھے۔ اور ہرلال کی بیوی اسی انداز اور اسی تیور کے ساتھ چولھے کی سلگی ہوئی لکڑی لے کر پورن کی جانب لپکنا چاہتی تھی۔ اور تمام عورتیں اسے پکڑ لیتی تھیں۔ ہرلال کہتا تھا منگل کا قصور ہے۔ بہر حال اگر اس دن درمیان والے نہ ہوتے تو کورو اور پانڈو کی جنگِ عظیم ہو گئی ہوتی۔

لیکن ٹھیک اسی دن سے پورن کچھ پژمردہ سا رہنے لگا تھا۔ اس کا چلبلا پن کہیں چلا گیا تھا اور وہ فرصت کے اوقات میں خواہ وہ کھیت پر بسر ہوتے یا گھر کی انگنائی میں کچھ کھویا کھویا سا رہتا تھا۔ سردی کی راتوں میں وسط صحن کے الاؤ کے گرداگرد جب اور لوگ بیٹھتے تو وہ بھی بیٹھا کرتا تھا۔ لیکن اس کا دھیان کہیں اور رہتا۔ آگ کے سبز و سرخ شعلوں میں کونسا ایسا تماشا نظر آتا تھا کہ وہ دیر دیر تک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہتا حتیٰ کہ دھواں لگنے سے اس کی چمکدار بڑی آنکھیں پرنم ہو جاتی تھیں۔ کبھی کبھی تو وہ اپنے کان بھی بہرے کر لیتا تھا۔ وہ کیا بہرے کر لیتا تھا۔ خود بخود ہی بہرے ہو جاتے تھے۔ کوئی بات کہی جاتی وہ سنتا تو اور زیادہ بلند آواز سے کہی جاتی تو وہ ایں کیا؟ ایں کیا؟ کرتا رہتا تھا۔ شاید وہ زندگی کی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھاتا رہتا ہو۔ شاید فلسفۂ حیات کے اسرار و رموز حل کرتا رہتا ہو۔

ہندو دنیا میں دسہرہ ہی ایک ایسا تہوار ہے۔ جب بچھڑے ملتے ہیں اور جب اس فانی جگہ سے بچھڑ کر دوسری نامعلوم جگہ چلے جانیوالوں کے لئے بالضرور چند آنسو بہا کر ان کی یاد تازہ کی جاتی ہے۔ چنانچہ ہر دسہرے پر جب ہرلال نیا لباس پہنکر اور منگل و بیا کھو کو اور پورن کو بھی نئے کپڑے پہنا کر نیل کنٹھ کی زیارت کرنے جاتے اور وہاں سے کچنار کی پتی توڑ کر لاتے۔ پھر اسے "سونا" کہکر دستہ بستہ باہم گر تقسیم کرتے اور پھر چوکے میں کھانا کھانے بیٹھتے تھے تو ہرلال کو اپنے متوفی بھائی کی ضرور یاد آجاتی تھی۔ یک بیک سسکیاں بھرنے لگتا تھا۔ پھر پورن کے سر پر ہاتھ پھیرتے کہتا تھا — آج کو کبھی تیرا باپ ہوتا تو تجھے اتنا بڑا۔ اتنا ہوشیار۔ اتنا محنتی دیکھ کر پھولے نہ سماتا بیٹا!" اس وقت پورن کی آنکھیں بھی چھل چھل کرنے لگتی تھیں۔ اور ان میں جو آنسو امنڈ آتے تھے وہ کون دیکھ سکتا تھا۔ ایسی حالت میں شاید کوئی کھانا نہ کھانے پاتا۔ اگر بیا کھو کی ماں چولھے پاس بیٹھے بیٹھے جوش و اضطراب کے ساتھ نہ کہا کرتی ——

"اونہہ! بس چلو کھانا ٹھنڈا ہوجاتا ہے۔ کھاؤ بھی" اور آہستہ سے چولھے سے نکلنے والی آنچ کو سنا کرتی —— سب کو مرنا ہے۔ کون رہے گا؟ یہ ہمیشہ اسی طرح ہر تہوار بار کو رنگ میں بھنگ ڈالا کرتے ہیں۔ نہیں سمجھتے کہ منگل بیا کھو کا جی تھوڑا تھوڑا ہوتا ہوگا۔ مرنا! مرنا! جب دیکھو تب مرنا! ان کا ایک بھائی کیا مر گیا بڑا غضب ہو گیا۔ ارے اسے مرنا ہی تھا تو مر گیا اولاد تو در در کی نہیں ہوئی۔ پال پوس کر جوان کر دیا اب اور کیا۔ جس کی موت آئے گی وہ مریگا کہ نہیں۔ —— !" چولھے کی آنچ کے اگر زبان ہوتی تو ان باتوں کا جواب نفی میں کبھی نہ دیتی:

(۳)

تمام علاقے میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ مینہ ایسا غائب ہوا تھا گویا اب کبھی نہ برسے گا۔ بیساکھ جوں توں ختم ہوا تھا کہ جیٹھ ہی کے ماہ سے ڈونگرے گرنے لگے تھے۔ پورا جیٹھ برسا اور آدھا اساڑھ برسا۔ پھر جو برسنا موقوف ہوا تو بالکل ہی چلا گیا۔ جن لوگوں نے تھوڑی بہت دھان۔ کودوں۔ مکی اور جوار بوئی بھی تھی۔ وہ آگی۔ لیکن سخت تمازت اور بارش نہ ہونیکے باعث گھاس کی طرح سوکھ کر رہ گئی۔ بڑا کال پڑا۔ دھن جی بھائی غلے کے آڑھتیہ لوگوں پر فصل کے اقرار سے روپیہ پھیلا دیتے تھے۔ ابکی جو

روپیہ پھیلا چکے تھے اس کی وصولی کی ناکام کوشش کرنے آئے ہوئے تھے۔ کیونکہ بقول ان کے ان کی بمبئی والی دکان کو اچانک روپے کی بڑی ضرورت آپڑی ہے اور وہ صرف پندرہ ہی دن بعد پھر اتنا ہی اتنا روپیہ واپس پھیلا جائیں گے۔ ان سے جب لوگ پانی نہ برسنے کی فریاد کرتے تو وہ منہ بنا بنا کر کہتے تھے" اور چلاؤ اور چلاؤ! جب جیٹھ ہی میں پانی کے زور کے جھلے آیا کرتے تھے۔ اس وقت تم لوگ چلا چلا کر کہتے تھے ——

برسو مہاراج! برسو مہاراج! —— اب تمہارے کہنے کے مطابق مہاراج آگے ہی برس چکے تو اب کیوں چلانے روتے ہو؟"

جب اساڑھ۔ ساون اور بھادوں سوکھے گئے تو مخلوق تلملا اٹھی براہمن کی پوتھی خوب دیکھی گئی۔ اس کے بعد جادو ٹونے کی باری آئی۔ دن کو صحن جھاڑو سے جھاڑنے کی عام ممانعت ہوگئی۔ ماہی گیر اپنے جال لے لیکر گھر گھر گئے اور زن بچے کو جال اڑھا کر شگون اتار آئے۔ پھر گاؤں بھر کے لڑکے ننگے ہوکر مینڈکیاں پکڑ کر موسل۔ ٹوکری۔ چھاج پہ لٹکا کر تمام گاؤں میں "مینڈکی رانی پانی دے! دھان کودوں پکنے دے!" چلاتے پھرے مگر کوئی اثر نہیں ہوا۔ ملنھو چمار کی عورت پر مائی بھی آئیں اور ان سے بھی عرضداشت کا جواب "ہوں برسیگا" کی صورت میں ملا۔ لیکن مینہ نہیں برسا۔ تمام گاؤں میں چندہ ہوا۔ بھگوان کے نام پرا ور میگھ دوت کے منانے کے لئے "ہون یگیہ" بھی کیا گیا۔ چنانچہ سفید بادلوں کے ٹکڑے نمودار ہوئے تو کسان بڑے خوش تھے لیکن جب ہوا انہیں بہالے گئی اور نیلا آسمان جوں کا توں صاف اور نیلا ہی رہ گیا تو آہ وزاری مچ گئی۔ کوئی ایسا نہیں تھا جس کا خون نہ خشک ہوگیا ہو۔ حکام ضلع کو عرضیاں دیتے دیتے پٹواری جی کی روشنائی خشک ہوگئی اور لوگوں کی جیبیں رہی سہی درخواستوں کی لکھائی دیتے دیتے بالکل خالی ہو گئیں۔

ہرلال کی حالت سب سے ابتر اس لئے تھی کہ اس نے جو کچھ پس انداز کیا تھا وہ سب اور تمام غلہ بیا کھو۔ منگل اور پورن کی شادی میں لگا دیا تھا۔ بیاکھ کے پندرہ دن ختم ہوئے تھے کہ کلو پنڈت کے حساب کے بموجب شادی ہوئی تھی۔ ورنہ تمام برس میں شادی اٹھائی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ مہورت کا اہم معاملہ ہوتا ہے۔ اب ہرلال پچھتاتا تھا کہ میں نے ناحق شادی کردی۔ اگر اس سال نہ ہوسکتی تھی تو اگلے سال دیکھ لیتے۔ "بیاکھو کی ماں! میں نے بیشک برا کیا۔ پھر اپنی چھاتی پر دوسرا بوجھ یہ لے لیا کہ ضد کرکے تینوں لڑکوں کے گونے کرا لایا۔ چنانچہ تینوں بہوئیں بھی دوسروں کی "بلا اپنے سر" کے مصداق اپنے ہی گھر آگئیں۔ ہائے! اب کیا کیا جائے؟ ہائے اب کیسے دن کٹیں گے؟"

بیاکھو کی ماں منہ بنا کر کہتی —— "جیسا کیا ہے بھگتو۔ پورن تھا ہی اس کی وداع ہی رہنے دیتے پھر نہ ملنے اور ایک سانس لا کر چھاتی پر رکھ لی۔ ہائے بھگوان! کیا ہوگا؟"

چند روز تک غلہ خرچ ہوتا رہا اور جب اناج گھر میں نہیں رہا تو وہ روپے جو بڈھے ہرلال نے وقت بے وقت کام میں لانے کی غرض سے گھر کے پچھواڑے مہندی کے درخت کے نیچے ایک مٹی کی کلھیا میں رکھ کر دفن کرایا تھا۔ اکھاڑے گئے۔ ان پر سبزی مائل زنگار کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اور سیاہی اور راکھ کی سی سفیدی جم گئی تھی۔ تیس روپوں کی بساط کتنی۔ مکی اور جوار خریدی گئی اور اس کا دلیہ وہ بھی بالکل پتلا بنا بنا کر گھر بھر کھانے لگا جب شام کو کھانا کھانے کے بعد کبھی ہرلال ان کے ہاں آگ تاپنے اور چلم پینے جاتا۔ کبھی گاؤں والے اس کے ہاں آجاتے تو بجز گرانی کے اور کوئی موضوع بحث نہیں ہوتا تھا۔ کوئی کہتا۔ ابھی کیا ہوا ہے۔ ایسی گرانی پڑتا ہے کہ لوگ باگ اپنے بچوں کو آگ میں بھون کر کھا جائیں گے۔ کسی کی رائے ہوتی تھی کہ اب ڈاکے ضرور پڑیں گے۔ کوئی پیشین گوئی کرتا تھا کہ سرکار کی طرف سے اور نہیں تو سوراج والوں کی جانب سے عنقریب غلہ تقسیم ہوگا۔

پورن مالگذار کے ہاں محنت مزدوری کرنے جاتا تھا۔ لیکن جس دن سے گورنمنٹ کے سرمایہ امداد قحط زدگان کی سکیم کے مطابق ہردیال پور والی سڑک بننے کا آغاز ہوا وہ اور گاؤں والوں کے ہمراہ گٹی پھوڑنے جایا کرتا تھا اس کی دیکھا دیکھی بیاکھو اور منگل بھی جانے لگے تھے۔ مگر آٹھ ہی روز میں انہیں معلوم ہوگیا کہ گٹی توڑنا بہت مشکل ہے۔ ان کی ماں نے ان کے ہاتھوں کی ہتھیلی دیکھ دیکھ کر کہا تھا —— "اے ہے! کتنے بڑے بڑے چھالے پھوٹے ہیں۔ آگ لگ جائے ایسی کمائی کو خبردار اب کل سے

نہ جانا۔" اسی دن سے بنسیا گھوا اور منگل نے جانا چھوڑ دیا اور ساس کی ماں نے
تمام گاؤں میں یہ اطلاع گھر گھر پہنچا دی کہ گٹی پھوڑنے سے جو چھالے
پڑجاتے ہیں ان کو دیکھ کر اسے کتنی تکلیف ہوئی اور اسی لئے اس کے
بیٹے اب نہ جا سکیں گے۔

لیکن پورن کو کسی نے نہ روکا وہ جاتا ہی رہا۔ ہفتے کے دن
چھ پیسے یومیہ کے حساب سے جو بٹوارہ ہوتا وہ لاکر ہیرالال کے ہاتھ میں
رکھ دیا کرتا تھا۔

ایک رات جب وہ سونے کے لئے اپنی کوٹھری میں گیا تو اسے
بڑی حیرت ہوئی اس کی بیوی روپا چارپائی کے نیچے بیٹھی رو رہی تھی
اور بمشکل معلوم کرسکا کہ ساس نے آج اسے بہت سخت و سست کہا
ہے اور پورن کو ٹکڑ خور کہکر اس کی بے عزتی کی ہے۔ پورن ٹھنڈا سانس
لے کر چپ ہوگیا اور چارپائی پر لیٹ گیا۔

روپا بہت دیر تک انتظار کرتی رہی کہ پورن کچھ کہے گا لیکن
پورن کچھ نہ بولا۔

وہ قریب آکر بولی —— سوامی! آپ کیوں یہاں بےعزتی کی
زندگی بسر کررہے ہیں۔ وہ دیکھئے امرتی اور بلکو دو نو میاں بیوی شہر کی
طرف چلے گئے۔ چھدامی اکیلا گیا تھا پھر آکر سب بال بچوں کو لے گیا ہمیں
بھی اب اس جگہ سے نکل چلنا چاہئے تمہاری بڑی اماں سب عورتوں سے
کہتی ہیں کہ ان لوگوں نے ہمیں راکھ لگا دی۔ اب بھی نہیں ٹلتے جب
بچے تھے ہم نے پالا۔ بڑا کردیا۔ اب تو ہمارا اینڈ چھوڑیں!

پورن نے کہا —— میں اس حالت میں انہیں چھوڑ کر جاؤں گا تو
دنیا کیا کہے گی۔

روپا نے کہا —— یہ کب کہتی ہوں کہ بالکل چھوڑ دو۔ پر ابھی چند
روز کے لئے کہیں باہر چلو۔ جب ہاتھ میں روپیہ آجائے تو آجانے میں ہرج
نہیں ہے۔ آپ کہتے ہیں کہاں جاؤں؟ آج تک باہر نہیں نکلا۔ مگر پرماتما کی
دنیا بہت بڑی ہے۔ ہمت نہ ہارئیے۔

شاید تین بجے رات تک دو نو میاں بیوی مصروف تکلم رہے۔
تمام گاؤں میں گویا منادی ہوگئی ہو۔ پورن اور اس کی بیوی
فرار ہوگئے۔ وہ کب گئے کسی کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ کچھ لے کر
نہیں گئے۔ بلکہ اپنے چاندی کے گہنے کا لچھہ سائبان ہی میں بھول گئے۔

اس دن احوال پرسی کرنے والے عورت مردوں کا تانتا بندھا رہا۔ سب
سب کو ہیرالال اور اس کی بیوی یہی کہتے تھے۔ کہ آخر پرائی اولاد تھی۔
کب تک رکھتی۔ ایک نہ ایک دن دھوکہ دینے ہی والے تھے۔ چلو اچھا
ہوا۔ کبھی ہیرالال اپنی بیوی کو مخاطب کرکے کہتا تھا —— منگل کی ماں
تو سچ کہتی تھی۔ میں نے تیرا کہا نہ مانا ورنہ پچھتانا نہیں پڑتا۔ ہائے رام!
ہائے رام! سگے بھائی کی اولاد اور اتنا دھوکہ۔ اپنی اولاد کی برابر پوسا
بڑا کیا آس تھی کہ مصیبت کے وقت ہمیں کام دے گا"۔

منگل کی ماں دانت پیس کر کہتی —— ارے تم۔ تم ہی ہو
خراب یہ تمہارے کرتوت ہیں۔ ورنہ میں ماٹی ملے کو گھڑا نہ رہنے دیتی
اپنی اولاد اپنی ہی ہوتی ہے۔ پرائی اولاد کا کیا بھروسہ۔ تم نے رہی سہی
پونجی بھی شادی میں برباد کردی۔ آج کو وہی روپیہ بچتا تو اپنے کام آتا۔ تم نے
اس نمک حرام پرائے جائے کے لئے اپنی اولاد کو زہر دیا۔ پرائی
اولاد کا کیا بھروسہ؟ کوئی دوسرے کی اولاد کو لے کر نہ پالے پوسے۔

رفتہ رفتہ سب لوگ بھول گئے اور پورن کا ذکر اس طرح محو ہوگیا
گویا وہ گاؤں میں کبھی نہیں تھا۔ دن ہر صورت سے کٹ جاتے ہیں۔
گاؤں والوں کے بھی کٹنے لگے۔ اکثر لوگ گاؤں چھوڑ کر بھاگ بھی گئے۔
لیکن جو وضعدار تھے وہ اسی جگہ رہے۔ اور انہی وضعداروں کی
فہرست میں ہرلال کے خاندان کا نام سب سے اوپر تھا۔

ہر پندرھویں روز جو دیہاتی پوسٹمین کسی کے بیرنگ خط کسی کے
کارڈ لے کر آیا کرتا تھا۔ وہ ایکی مرتبہ ہیرالال کی بیوی کے نام کا پندرہ
روپے کا ایک منی آرڈر لے کر آیا۔ اکثر لوگ اکٹھے ہوگئے تھے ہیرالال کی
بیوی نے اپنی انگشت کا نشان لگا دیا اور دو آدمیوں کے شہادتی نشانہائے
انگشت بھی منی آرڈر کے فارم پر رقم ہوگئے۔ یہ منی آرڈر کس نے بھیجا ہے؟
سب کو یہی تشویش تھی۔ خود ہیرالال کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ چنانچہ ہیرالال کی
ماں نے بتایا کہ اس کے باپ کا بھانجا عرصہ دراز سے عدم پتہ ہے۔
اور سنتے ہیں کہ اس نے کہیں بہت بڑی دکان کھولی ہے۔ وہ بڑا

آدمی ہو گیا ہے۔ اس نے سنا ہو گا کہ ادھر کال پڑا ہے۔ طبیعت بےچین ہوئی ہو گی۔ امداد کا خیال آیا ہو گا۔ اس لئے منی آرڈر سے یہ روپے بھیجے ہوں گے۔ جب ہی تو میرے نام منی آرڈر بھیجا۔ کیونکہ میرا رشتے دار پھر جب اس نے مسکرا کر سب لوگوں کے روبرو ہیرالال کو مخاطب کر کے یہ بھی کہا ——— "دیکھو انہیں کہتے ہیں رشتے دار! ایک تمہارا بھتیجا (رشتے دار) تھا جو عین مصیبت کے زمانے میں دغا دے کر فرار ہو گیا!"

سب لوگ ہنس پڑے اور ہیرالال کھسیانا ہو کر چپ رہ گیا۔ البتہ منگل اور بیسا کھو چپ نہ رہ سکے۔ وہ بہت بری بری گالیاں بکتے رہے اور پورن اور اس کی بیوی کو کتے اور سور سے تشبیہ دیتے رہے ہیرالال نے پوسٹمین کو "بخشش" دیتے ہوئے اتنا البتہ پوچھا ——— یہ تو پڑھ کر بتا جاؤ بھیجنے والے کا کیا نام ہے اور کہاں سے بھیجا ہے؟

پوسٹمین نے جواب دیا ——— "سکھ چین بھیجنے والا ہے۔۔ دیولالی میں رہتا ہے"

ہیرالال کی بیوی جھٹ بول اٹھی ——— ہاں ہاں اسی قسم کا میرے باپ کے بھانجے کا نام ہے!

کوپن میں بس اتنا لکھا تھا "آپ لوگ تکلیف نہ اٹھایئے گا۔ اور یہ روپیہ خرچ کر لیجئے گا"۔

اس کے بعد ماہ بماہ ہیرالال کی بیوی کے نام منی آرڈر آنے لگے۔ کبھی چھ روپے۔ کبھی دس روپے۔ کبھی بارہ۔ کبھی پندرہ۔ ہر کوپن میں تکلیف نہ اٹھانے اور روپیہ اپنے خرچ میں لانے کی تاکید لکھی رہتی تھی۔

ان منی آرڈروں کا تذکرہ۔ کون ایسا گھر تھا جہاں نہ ہوا کرتا ہو؟ ندی کے گھاٹ پر تو بکثرت استفسار ہوا کرتے تھے۔ خود منگل اور بیسا کھو اپنے ہمجولیوں میں اپنے نانا کے بھانجے کی دریا دلی اور فیاضی کے فخریہ اظہار کرتے رہتے تھے۔ بھگوت دھوبی۔ تہابیر کیوٹ۔ یا تمرن اہیر بھی جب کبھی آ بیٹھتے تو ہیرالال سے پہلی خبر یہی پوچھتے تھے کہ کھو یا ڈاب بھی منی آرڈر آ رہے ہیں یا بند ہو گئے؟ پھر قبل اس کے کہ ہیرالال کچھ جواب دیتا اس کی عورت شاندار لہجے میں کہتی ——— "نہیں رہے ہیں تو کیا ہے ہمارے رشتے دار کچھ ایسے بے مروت اور بے وفا تھوڑا ہی ہیں۔ انہیں

کہتے ہیں سچا رشتے دار!"

تمام گاؤں کا یہ متفقہ فیصلہ تھا کہ اس وقت اگر خوشحال کوئی ہے تو ہیرالال کا خاندان ہے۔ بےفکری سے گزر رہی ہوتا ہے۔ ہر مہینے منی آرڈر چلے آ رہے ہیں۔ سکھ چین بہت مدد کر رہا ہے۔ رشتے دار ہو تو ایسا ہی ہو جو مصیبت کے وقت کام آئے۔ تین برس کے بعد۔

کڑی دھوپ دھیمی ہو گئی تھی۔ سایہ بڑھتا جا رہا تھا منگل کھیت میں بکھر چلا رہا تھا۔ اس کی نگاہ کام نہ کرتی تھی کہ جو دو شخص گاؤں کی پگڈنڈی پر چلے آ رہے ہیں وہ کون ہیں۔ ان کا لباس ان کے شہری ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ جب منگل کے اور آنے والوں کے درمیان صرف چند فرلانگ کا فاصلہ رہ گیا تو اس نے پہچانا کہ آگے آگے پورن بھیا ہے۔ اور اس کے پیچھے اس کی بیوی۔ چنانچہ منگل بیل بکھری بیا جوتے چھوڑ کر گھر کی جانب بھاگا۔ ہیرالال بیٹھا ہوا چلم پی رہا تھا۔ ماں گیہوں چن رہی تھی۔ بہوئیں پانی بھرنے گئی تھیں اور بیسا کھو سن کی ڈوری بٹ رہا تھا۔ آتے ہی پورن کی آمد کی اطلاع کی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ بہو کی گود میں چھ ماہ کا بچہ بھی ہے اور وہ شہری عورتوں کی طرح سفید ساری باندھے ہے اور جوتے بھی پہنے ہوئے ہے۔

ہیرالال نے آخری فقرہ سنکر کہا ——— "ہوں"

منگل کی ماں نے اپنے شوہر کی جانب گھور کر دیکھا اور کہنے لگی ——— دیکھو جی! اب میں کہے دیتی ہوں۔ انہیں بالکل منہ نہ لگانا۔ ورنہ مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔ میں بھگوان کی قسم کھائے لیتی ہوں کہ تم سے الگ ہو جاؤنگی اور اپنے دونوں بیٹوں کو لے کر الگ ہی رہا کرونگی۔ پھر تم اپنے بھتیجے اور بھتیجا بہو کے ہمراہ رہا کرنا!"

بیسا کھو بول اٹھا ——— ہاں بتائی! ہم سب تمہیں چھوڑ دینگے ہمارا سکھ چین ماما جو کچھ بھیجا کرتا ہے وہ ہمارے لئے بہت ہے"۔

ہیرالال نے ترشرو ہو کر کہا ——— تو کون منہ لگا رہا ہے جو زبردستی پیچھا پکڑ رہے ہو۔ تم سب نے گویا مجھے دبا لیا ہے۔ وہ روپے کیا آ رہے ہیں کہ زمین پر قدم نہیں رکھتے۔ ماں بیٹے پھولے نہیں سماتے ہیں۔ اور اس نے بھی دو مہینے سے روپے بھیجنا بند کر دیا ہے"۔

بیساکھو نے زور دے کر کہا — "اجی اکٹھے بھیجے گا اکٹھے۔ تم ہو کس خیال میں پتاجی!"

ہرلال کی بیوی نے کہا — "اب کاتک آئے گا تو پورے تین برس ہو جائیں گے۔ ماں کے ہاں جانے تک کو نہیں ملا۔ تڑپ رہی ہوں۔ بہوئیں آئیں گی چھٹی مل جائے گی۔ یہی سوچتی تھی۔ مگر بہوئیں آئیں تو کام اور بڑھ گیا۔ چاہے کچھ ہو اگلے مہینے ضرور جاؤں گی۔ ذرا جاؤں تو پوچھوں کہ مان سکھ چین بھیا کب بھاگے تھے۔ اور ماں کے ہاں بھی روپے اور چٹھی ضرور آتی ہو گی"۔

بیساکھو نے کہا — "ماں تو بالکل پاگل ہے۔ جب تجھے سکھ چین ماما اتنے روپے بھیجے جانتے ہیں تو نانی گھر دُنے نہ بھیجتے ہونگے؟ لو اب پتاجی کا پیارا بھتیجا پورن کمائی کرکے آ رہا ہے۔ ایک تھیلی بھر روپے ضرور لاکر دے گا! وہ دیکھو وہ آگیا"

سب دیکھنے لگے۔ پورن معمولی چپل پہنے تھا۔ کھدر کا سفید کرتہ کھدر کی گاندھی ٹوپی اور کھدر کی دھوتی پر اس کا لباس مشتمل تھا — بغل میں ایک چھوٹا ٹرنک اور بستر تھا۔ عقب میں سفید ساری میں ملبس اس کی بیوی تھی جس کی گود میں ایک سالہ بچی تھی:

پورن نے دور ہی سے دونو ہاتھ جوڑ کر "بندے ماترم" کہا۔ وہ جواب کا متوقع ہی رہا لیکن کسی نے اس کو لمبا چوڑا "بندے ماترم" نہیں کیا! اسی لئے پاس آکر اسنے کہا — "رام رام"۔ سب نے اسکی رام رام کے جواب میں خود بھی "رام رام" کہکر خاموشی اختیار کرلی۔ البتہ جب ہرلال نے آنکھوں کا پانی پونچھتے ہوئے کہا۔ "آو!" تو اس کی بیوی نے گیہوں کی ٹوکری زور سے اٹھا کر زور ہی سے دوسری جگہ رکھدی۔

پورن نے صحن کی مینڈ پر اپنا بستر اور صندوق رکھدیا اور ہرلال کے قریب آکر ڈٹ بیٹھ گیا۔ اسکی عورت گھونگھٹ ڈالے ہوئے سر راہ کھڑی تھی۔ پورن نے اس کی طرف دیکھ کر کہا — "کھڑی کیوں ہو۔ اندر چلی جاؤ"۔

بیساکھو اور منگل اور خود ہرلال کا بڑا تعجب ہو رہا تھا کہ پورن نے آکر کسی کے چرن نہیں چھوئے اور اکیلے رام رام پر اکتفا کی۔ اور وہ اپنی عورت کو یوں کھڑی ہے رہی!"

"اندر چلی جا" نہیں کہہ رہا بلکہ بہت مؤدبانہ گفتگو کر رہا ہے گویا وہ کسی تحصیلدار کسی چھوٹے صاحب۔ کسی بڑے صاحب کی میم ہو!

اسی اثنا میں بیساکھو کی ماں اندر سے نکلی۔ سلام و دعا سنے بغیر کہنے لگی — "دیکھو پورن! تم آئے ہو اچھے آئے۔ مگر بھیا اب اس گھر میں تمہارا گزر نہ ہو گا۔ اتنی بڑی بستی پڑی ہے۔ تم اور کوئی گھر دیکھ لو اور اپنا سامان رکھو اور الگ رہو۔ ہم نے تمہارے ساتھ نیکی یا بدی جو کرنا تھا بہت کیا۔"

سب دم بخود تھے۔ پورن کی بیوی اپنی بڑی ساس کے چرن چھو رہی تھی۔ اور بڑی ساس فرما رہی تھیں — تم سے زیادہ اس سنسار میں کوئی بے ایمان نہیں۔ کال کے زمانے میں تم ہمیں چھوڑ کر بھاگے۔ اور ہم تو کہتے ہیں کہ اگر تمہارے بڑے ماں باپ تمہیں رکھنا چاہیں تو وہ بھی نکل جائیں!"

پورن کا چہرہ تمتما اٹھا۔ تھوڑی دیر تک وہ اپنے ہونٹ چباتا رہا پھر یک بیک اٹھ کھڑا ہوا۔ صندوق اور بستر بغل میں دبایا۔ اپنی بیوی کو حکم دیا — "اچھا اسی وقت چلو!"

اور باہر ہو گیا۔ جب وہ بستی میں سے نکلا تو لوگ باگ پوچھنے لگے — "ارے کیا بات ہے پورن۔ ابھی آئے اور ابھی چلے؟" وہ ہر ایک پرسان حال کو مختصر طور پر "ادنہ۔ یونہی!" جواب دیتا گیا۔

بیساکھو اور منگل دور سے تاک رہے تھے کہ پورن کدھر جاتا ہے انہوں نے دیکھا کہ وہ بستی میں کسی سے بولنے چالنے کے لئے نہیں تھما اور جدھر سے آیا تھا اُدھر چلا گیا۔

شام کو دیوی نے دنیا کو اپنی تاریک قبا میں چھپا لیا تھا۔ ہرلال سے کسی نے نہیں پوچھا کہ تو کیوں سر کو ہاتھ لگائے ابتک بیٹھا ہے؟ تو کیا سوچ رہا ہے؟ تیری بوڑھی آنکھوں میں کیوں آنسو چھلک رہے ہیں؟

(۶)

"دھن جی بھائی اندر آجاؤ"

"نہیں ہرلال ہم نہیں آتے تو بہت بے ایمان ہے۔ تیرا سب خاندان بے ایمان ہے!"

ہیرالال نے ہنسکر کہا ——— "لا بیسا کھو کچھ میٹھے کے واسطے لا۔ دھن جی بھائی پانچ چھ برس کے بعد آئے ہیں۔ جب سے کال پڑا اور روپے وصول کرنے آئے تھے۔ پھر دھن جی بھائی کہاں آئے۔"

بیسا کھو نے مچائی لاکر رکھدی۔ دھن جی بھائی سے نہ محض یہ گاؤں بلکہ قرب وجوار کے چالیس پچاس گاؤں کے آدمی واقف تھے۔ ہر ایک سے بے تکلفی تھی۔

ہیرالال نے باہر جاکر انکا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور زبردستی لاکر مچائی پر بٹھادیا۔ پھر بیسا کھو سے کہا۔

"بیٹا سروتہ سپاری لا۔ انہیں سپاری کھلا۔"

"دھن جی بھائی تم بے ایمان ہو کر ہم ؟" کہتی ہوئی بیسا کھو کی ماں گھر میں سے صحن میں آئی۔ دھن جی بھائی نے کہا ——— "ہم کیسے بے ایمان ہیں بتاؤ ؟"

وہ بولی ——— کال پڑنے پر سب روپیہ وصول کرلے گئے۔ ذرا صبر نہیں ہوا اب کیوں اچھی فصلیں دیکھ کر آئے۔ ایسے بے ایمان ہو۔ اور ہم کیسے بے ایمان ہیں ؟

دھن جی بھائی نے کہا ——— تم سب ایسے بے ایمان کہ بچارے پورن نے تین برس تک اپنا پیٹ کاٹ کر اپنی تنخواہ کے روپے ہر مہینے تم لوگوں کو بھیجے۔ تمہارا کال کا مصیبت کا آفت کا وقت کاٹا تمہیں اپنا ماں باپ بھائی سمجھا۔ اور جب وہ یہاں آیا تو تم نے اسے ٹھہرنے بھی نہ دیا اور اسی وقت نکالدیا۔ واہ واہ! شاباش! تم بڑے بھلے آدمی ہو۔ تم نے اسے اچھا بدلہ دیا۔ کیوں نہ بھلے آدمیوں کی باتیں ہوتی ہیں تم سب چلّو بھر پانی میں ڈوب مرو!"

بہت سے آدمی جمع ہوگئے تھے۔ سناٹا طاری تھا۔

آخرکار بیسا کھو نے سکوت توڑا ——— "دھن جی بھائی آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" پورن اپنا پیٹ تو پال لیتا دوسروں کو کیا بھیجے گا وہ روپے تو میرے سکھ چین ماما بھیجتے رہے ہیں!"

دھن جی بھائی نے تیزی سے کہا ——— ہیرالال! تیرے بیٹے بھی کاٹھ کے اُلو ہیں۔ ارے کہاں کے سکھ چین ماما۔ سکھ چین تو پورن ہی کا فرضی نام تھا۔

بیسا کھو بولا ——— میری ماں کے باپ کے بھانجے جو گھر سے بچپن میں نکل گئے تھے!"

دھن جی بھائی کو اور بھی طیش آگیا۔ وہ غصے کے لہجے میں بولے ——— اور میں جھوٹا ہوں جو اپنے ہاتھ سے منی آرڈر لکھ لکھ کر بھیجتا رہا ہوں بیٹا! نہ تیرے سکھ چین ماما روپے بھیجا کرتے تھے۔ نہ دکھ چین ماما بلکہ روپے آتے تھے پورن کے پاس سے۔ اس کی زندگی بھی عجیب و غریب ہے۔ یہاں سے ریل میں سوار ہو کر دیولالی پہنچا۔ لوہے کے کارخانے میں نوکر ہوا۔ اول بارہ روپے تنخواہ ملتی رہی۔ بہت محنتی اور جفاکش ہونے کے باعث مستری کا کام بہت جلدی سیکھ گیا۔ کارخانے کے مزدوروں نے ہڑتال کیا پورن کو اور بھی موقع مل گیا۔ اب آج وہ پچاس روپے ماہوار کا مستری ہے۔ لوہے کے پمپ ڈھالنا اس کا کام ہے۔ اس نے تمہارے لئے بڑی قربانی کی تھی۔ وہ پانچسو روپے اپنے ساتھ لے کر آیا تھا کہ تمہارے کھیت پر ہوائی پنکھا لگادے کہ جو خود بخود پانی کھینچکر تمہارے کھیتوں کو سیراب کرے گا۔ اور آبپاشی کے ذرائع ہونے کے باعث تم باغبانی کر سکو گے۔ اور آئندہ خشک سالی سے دوچار نہ ہوا کرو گے۔ یہاں سے اسی دن واپس ہونے کے بعد جب مجھ سے ملاقات ہوئی تو میں نے پوچھا ——— "ارے پورن! دو چار دن بھی نہ رہ سکے۔ کیا ہوائی پنکھا لگا آئے ؟

کنواں کھدوا دیا ؟" اس کے جواب میں پورن نے پژمردگی کے ساتھ کہا ——— جی نہیں دھن جی بھائی"۔

جب میں نے پوچھا ——— "کیوں ؟"

تو اس نے زہرخند کے ساتھ کہا ——— "اونہہ!"

"کل شام کو ہرچھیٹ کورمی نے پوری کیفیت بیان کی۔ مجھے بڑا غصہ آیا اور تمہاری بدبختی پر افسوس بھی ہوا"

بڈھا ہیرالال گردن جھکائے سنتا رہا۔ پھر آنکھیں صاف کیں جن میں کچھ آنسو کچھ آگئے تھے۔ پھر زور سے زمین پر ہاتھ مار کر کہنے لگا ——— اس مردار چڑیل نے پورن کو بھگایا۔ ہمیشہ اس کے پیچھے پڑی رہتی تھی بھاگ گیا

دلچسپ کہانی

تو اسے بدنام کرتی رہی۔ میرا بھی دل اسی نے بگاڑا تھا۔ دوبارہ آیا تو دم نہ لینے دیا اور سامنے کہیں الگ اترنے کے لئے کہنے لگی۔ یہ ہمیشہ اسے پرائی اولاد پرائی اولاد کہا کرتی تھی۔ جورو کے آتے اسے اپنے باپ دادا کے بے نام و نشان سکھ چین بھیا۔ اور سکھ چین ماما کے فرستادہ بیان کرتی رہی۔ یہ چڑیل میرے بھتیجے کا دل بگاڑنے کا باعث ہوئی ہے۔ جی میں آتا ہے کہ اسے کاٹ کر بوٹی بوٹی کر ڈالوں!"

بیسا کھو کی ماں جھلا کر بولی —— "بس! بک بک مت کرو۔"

ہرلال نے کہا —— "یاد رکھنا مار ڈالوں گا۔" پھر وہ دانت پیسنے لگا۔

دھن جی بھائی نے ہنس کر کہا —— "ارے کالی مائی! تمہارا قصور اور تم زبان درازی کرتی ہو۔ ٹھیک ہے۔ آ لٹا چور کو توال کو ڈانٹے اپنے دل میں نادم ہو"

ہرلال کی یہ حالت تھی گویا اس نے بڑی بازی جیت لی ہو۔ بڑا میدان مار لیا ہو۔ وہ جوش کے ساتھ بولا —— دھن جی بھائی! تم جب جانے لگو تو مجھے بھی پورن کے پاس لے چلنا۔ پورن میرا بھتیجا۔ میرے بھائی کی اولاد۔ میں اسے نہیں چھوڑ سکتا۔"

سب لوگ پورن کی ترقی کا ماجرا سنکر انگشت بدنداں تھے۔ اور بیسا کھو کی ماں کو نفریں کر رہے تھے کہ جب وہ دوبارہ ملنے اور ترقی کے ذرائع عمل میں لانے آیا تھا تو صبر سے کام لینا تھا۔ کیا دو دن کھلانا بھی مشکل تھا

جس وقت دھن جی بھائی بیٹھے ہوئے باتیں کر رہے تھے۔ کلو نائی اپنی چمڑے کی پیٹی لٹکائے ہوئے آیا اور بولا —— "مالک چلئے۔ میں کب سے بیٹھا ہوا ہوں۔" دھن جی بھائی نے اپنے بڑے سائز کے چشمے میں نے ترچھی نگاہ سے اسے دیکھ کر کہا —— "ٹھہر بے! چلتے ہیں"

دھن جی بھائی کا یہ معمول تھا کہ روز صبح سویرے بالوں کے الٹے رخ سے اپنا سر منڈایا کرتے تھے۔ جب سر منڈ جاتا تو آم کی خشک گٹھلی کے کھردرے سے اتنے عرصہ تک اس کی تواضع ہوتی کہ میل کے بھورے بھورے ذرات نکلنے بند ہو جائیں۔ اور جلد کی رنگت سرخ ہو جاتے پھر اس پر اصلی آملہ بہیرا آئل کی مالش ہوتی تھی۔ کلو نائی ان کی یاد ہمیشہ کیوں کرتا تھا اور سدا آرزو مند کیوں رہتا تھا کہ دھن جی بھائی بکثرت تشریف لائیں اور مدت مدید تک گاؤں میں قیام فرما رہیں۔ اس کی وجہ محض یہ تھی کہ وہ دیا کرتے تھے۔ دو آنے حجامت۔ جبکہ کلو نائی ایک پیسہ فی سر حجامت لینے کا عادی تھا۔ بلکہ ہرلال کے گھر میں تو ایک پیسے میں دو سر مونڈنے پڑتے تھے۔

(۷)

دھن جی بھائی جب جانے لگے تو ہرلال بھی ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گیا لیکن وہ تنہا نہیں جانا چاہتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ بیسا کھو کی ماں بھی ہمراہ ہو۔ چنانچہ اس نے رات کو بہت دیر تک بحث کی۔ اس نے کہا —— سب تجھے تھوک رہے ہیں۔ اپنے سر سے کلنک مٹا۔ میرا کہا مان اور پورن کے گھر چل۔ وہ کوئی غیر نہیں ہے —— بیسا کھو اور منگل نے بھی اپنی ماں کو سمجھایا۔ جس روز روانگی تھی گاؤں کی تمام عورتیں جو سفر سے واقف ہو چکی تھیں ملنے آئی تھیں۔

بیسا کھو کی ماں اس کے پہلے صرف دو مرتبہ ریل میں بیٹھی تھی جب وہ پورن کے ہاں پہنچے تو اس نے بڑی خوشی کا اظہار کیا اور اس کے ساتھ ہی اپنی بیوی کو تاکید کر دی۔ کہ خبردار! "کوئی ایسی بات نہ کرنا کہ دل شکنی کا باعث ہو"۔

یہ دونو پورن کے ہاں تین مہینے مہمان رہے۔ چلتے وقت پورن نے ایک جوڑ سونے کے کڑے اپنی بڑی اماں کے ہاتھوں میں پہناتے ہوئے کہا —— بڑی اماں! یہ حقیر نشانی اس غریب پورن کی طرف سے قبول کیجئے۔ میں کسی لائق نہیں ہوں۔ بڑی اماں! تمہارا مجھ پر بہت حق ہے۔ میری پرورش تمہارے علاوہ کسی اور نے نہیں کی تھی۔ میری ماں کی صورت کیسی تھی۔ مجھے نہیں معلوم۔ میرے باپ کی شکل کیسی تھی یہ بھی نہیں جانتا۔ میں تو تم کو اپنی ماں اور چاچا جی کو اپنا باپ سمجھتا ہوں۔ بڑی اماں! میرا جی چاہتا ہے کہ میں ہمیشہ تمہارے چرنوں میں پڑا رہوں مگر کیا کروں نوکری کا واسطہ ہے۔ کیوں بڑی اماں! تمہاری اتنی ممتا اور اتنے ہی پریم کا میں بھی مستحق نہیں ہوں جتنا تم میرے دونو بھائیوں۔

بہا کھو اور شکل سے کرتی ہو۔ بڑی اماں! مجھے کچھ نہیں چاہئے

تمہاری، بی دی کی ضرورت ہے۔ اور تم اپنی محنت کا دان دو"؛

"یا کھو کی ماں ایسی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی گویا اس کے

دل کو بڑی چوٹ لگی ہو۔ ہر آں کے بھی آنسو نہیں تھمتے تھے۔ پورن کی

بیوی رو رہا بھی اشکبار تھی اور کہہ رہی تھی کہ آپ لوگوں کے چھوڑنے کو

جی نہیں ہوتا؛

بھولی شانا اپنی دادی کے گلے میں باہیں ڈال کر التجا سے دریافت

کر رہی تھی ــــ دادی اماں! تم لوگ کیوں رو رہے ہو؟"

بڑی اماں نے اشک صاف کر کے۔ شانا کو گود میں لے کر اس کے

بکھرے ہوئے بال سنوار کر بس اتنا کہا "کچھ نہیں بیٹا۔ یونہی جی بھر آیا تھا"؛

کولرج کی مشہور نظم "کبلا خاں" کا ترجمہ

(از جناب محمد فاتح خاں۔ فرخ سیوہاروی)

کولرج اٹھارھویں صدی کا مشہور شاعر ایک کتاب میں چند سطور کبلا خاں کی بابت پڑھ رہا تھا کتاب کا نام (پرچس پلگرمیج) تھا۔ یہ

شاعر بیشتر حصہ رات کا مطالعہ میں گذارتا تھا۔ اور جب نیند آنے لگتی تھی تو افیون کھا کر سو جاتا تھا۔ اس رات کو بھی حسب معمول اس شاعر نے یہی کیا

اور سو گیا۔ رات کو خواب میں اس نے چنگیز خاں کا محل دیکھا اور خواب میں اس نے جو کچھ دیکھا تھا۔ صبح کو بیدار ہو کر اس نظم کو کبلا خاں کے نام سے موسوم کیا۔

مگر اس نظم میں ایک خامی رہ گئی وہ یہ کہ یہ نظم نامکمل رہ گئی۔ مگر پھر بھی یہ نظم بہترین نظموں میں سے شمار کی جاتی ہے؛

کبلا خاں کا قصر شہر زناڈو میں تھا اور اس کے قریب میں متبرک الیف

دریا بے شمار عمیق غاروں میں سے بہتا ہوا چلا جاتا تھا۔ غار قدآدم گہرے

تھے اور سورج کی شعاعوں کے نہ پہونچنے کی وجہ سے تاریک تھے؛

محل دس میل میں واقع تھا۔ بلند دیوار اور برجوں نے شاہی قصر کو

چاروں اطراف سے محصور کر دیا تھا۔ نہریں کثرت سے تھیں اور

باغات کی سرسبزی کا دارومدار ان پر ہی تھا۔ ہر جگہ غنچے مسکراتے ہوئے

نظر آتے تھے۔ اور جا بجا سبزہ سورج کی کرنوں کی وجہ سے منور

معلوم ہوتا تھا۔ لیکن ان باغات میں ایک خیالی سرسبز دنیا

آباد تھی۔ جہاں کہ صنوبر کی فراوانی تھی۔ اس جگہ کی خاموشی نے

اس کے دلکشی اور دلفریب ہونے میں اضافہ کر دیا تھا۔ اس سے

تھوڑی دور آگے چل کر ایک صنف نازک اپنے بے وفا اور دغا

باز عاشق کے واسطے بے چین تھی اور یہاں بالکل جدا ہی عالم تھا۔

فضا میں شور و جوش برپا ہے۔ اور یہ اس چاند کا مسکن ہے جو کہ ایام زوال

میں ہو۔

اس کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کسی کی یاد میں آخری حسرت

بھری سانس لے رہی ہے۔

اس کے قریب ایک اور مقام ہے جہاں یکا یک ایک چشمہ بہتا ہوا

دکھائی دیتا ہے۔ جس میں کہ برف کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے مثل اولے کے

بہتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ اور تنکے بہت تیزی کے ساتھ بہتے ہوئے

چلے جاتے ہیں۔ اور یہ ابدی چٹانیں جو رقص کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ ان سے

مقدس دریا کا پانی ٹکراتا ہوا نظر آتا تھا۔ اور ان پانی کی لہروں میں کبلا خاں کے

باپ دادا کی آوازیں آتی ہیں جو اس کو جدال و قتال کا سبق سکھاتی ہیں

اور اس قسم کی زندگی بسر کرنے کو منع کرتے ہیں؛

اس شاہی محل کا عکس نہروں اور دریا میں جو پڑتا ہے اس کی وجہ سے

ایک نیا سنسار علیحدہ آباد معلوم ہوتا ہے۔

اس کے بعد ایک حبشن نا کتخدا لڑکی خواب میں دکھائی دیتی ہے۔ جو بربط بجا رہی ہے

جب وہ گانا بجانا ختم کر دیتی ہے تو (کولرج) اسکا خواہشمند ہے کہ کاش ایک

مرتبہ میں اس بربط کی آواز سن لوں تو میں اس کی سرورکی امداد سے ایک محل ہوائی فضا میں

تعمیر کروں جو کہ کبلا خاں کے محل کا جواب ہوگا اور تمام لوگ اسکو دیکھ کر انگشت بدنداں ہو جائینگے

مگر کبلا خاں کی خوفزدہ صورت اور پریشان حال دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ آنکھیں بند کر کے۔۔۔ جی چاہتا ہے۔ کیونکہ اس کی پرورش مثل وشمنوں کے ہوئی ہے۔ جنہوں نے تسنیم اور شہد کی نہروں کے ذائقوں سے لطف اٹھایا ہے؛

غزل

از جناب حاجی محمد اصطفا خاں صاحب مالک کارخانہ اصغر علی محمد علی تاجر عطر لکھنؤ

ایک لامحدود دل کی داستاں لکھتا ہوں میں
عشق میں ہر موئے تن گویا زباں رکھتا ہوں میں

آتشِ فرقت سے یہ سوزِ نہاں رکھتا ہوں میں
دل کے خاکستر میں کچھ چنگاریاں رکھتا ہوں میں

سوزِ غم سے دل جگر آتش بجاں رکھتا ہوں میں
اپنے دونوں پہلوؤں میں بجلیاں رکھتا ہوں میں

دونوں عالم پھونک سکتا ہوں اک آہِ گرم سے
سوزِ الفت اپنے سینے میں نہاں رکھتا ہوں میں

رات دن کی سرد آہیں کر نہ دیں ٹھنڈا اسے
اپنے دل کو اس لئے آتش بجاں رکھتا ہوں میں

خوف سے بادِ خزاں کے دل رہا کب مطمئن؟
شاخِ گل پر گرچہ اپنا آشیاں رکھتا ہوں میں

عشق میں حاجت بھلا کیا جامِ جم کی ہو مجھے
دل کے آئینے میں عکسِ دو جہاں رکھتا ہوں میں

کیوں نہ حاصل ہو مجھے سرمایہ صبر و سکوں
نام اس آرامِ جاں کا حرزِ جاں رکھتا ہوں میں

اپنے سر پر اپنی آہوں سے اٹھا لیتا زمیں
کیا کروں فطرت ہی میں خاموشیاں رکھتا ہوں میں

سیج پر پھولوں کی سونے والے کیا جانیں اسے
اپنی ہر کروٹ میں جو بیچینیاں رکھتا ہوں میں

غیر ممکن ہے کہ حاصل ہو مجھے اوجِ خیال،
ہر تخیل میں ہزاروں پستیاں رکھتا ہوں میں

آ ہی جاتا ہے زباں پر نالۂ بے اختیار
منہ میں اپنے اصطفا آخر زباں رکھتا ہوں میں

انسانی پرواز کی تاریخ!

ایک بہترین علمی مقالہ

از:-

ازجناب مولانا محمد اسمٰعیل صاحب ناصح عظیم آبادی

جب عالم انسانیت نے طفولیت کی منزل سے گزرنے کے بعد ہوش سنبھالا اور تمدنی ضروریات نے قطع مسافت کے لئے بحروبر سے کام لینے پر مجبور کیا تو انسان نے اس احتیاج کو رفع کرنے کی طرف توجہ مبذول کرنے کی ضرورت محسوس کی۔ اس نے دیکھا کہ کتنے خشکی کے جانور ہیں جو سرعت رفتار میں ہوا کو بھی مات کرتے ہیں تو اس نے بھی ان کی تقلید میں دوڑنے کی مشق بہم پہونچائی اور کتنے آبی جانور ہیں جو سمندروں میں تیر کر کہیں سے کہیں نکل جاتے ہیں۔ اس نے بھی ان کے اتباع میں شناوری کی مہارت پیدا کرنے کی سعی کی اور بعد میں جوں جوں تہذیب وتمدن میں ترقی ہوتی گئی زمین کی مسافت بسرعت تمام طے کرنے کے لئے طرح طرح کی گاڑیاں ایجاد کیں اور سمندروں کو عبور کرنے کے لئے کشتیاں اور جہاز بنائے۔ پھر جب مدارج تمدن میں ارتقائے مزید عمل میں آیا اور انسان کی نظر فضا میں اڑنے والے طائران صبارفتار پر پڑی تو اس کے دل میں بھی پرواز کے ذریعہ زود تر قطع منازل کرنے کی امنگ پیدا ہوئی۔ اس نے ابتداءً اس مقصد کے حصول کے لئے اپنی پوری عقل اور ساری کوشش صرف کر ڈالی اور جب کسی طرح یہ بیل منڈھے چڑھتے نظر نہ آئی تو اس نے انتہائی مایوسی میں اس چیز کو انسانی دسترس سے باہر اور صرف روحانی طاقت یا جادو وسحر کا کرشمہ قرار دیا اور چند خیالی مخلوقات دیو وپری اور جن وملک کی پرواز کا افسانہ گڑھا۔ ع

چوں نہ دیدند حقیقت رہِ افسانہ زدند

کتب مقدسہ میں ہوائی جہاز کا ذکر

ایک عرصہ دراز کے بعد جب انسانی عقول واذہان میں کافی ترقی ہوئی طرح طرح کی ایجادات واختراعات معرض وجود میں آئے۔ علوم وفنون مدون ہوئے اور تہذیب وشائستگی پھیلی تو بنی نوع انسان کے اندر کچھ ایسے غیر معمولی قابلیت ودماغ کے لوگ بھی پیدا ہوئے جو اپنی عقل رسا اور حکمت بالغہ کے ذریعہ ہوا پر قابو پالینے اور حسب منشاء پرواز کر کے کہیں سے کہیں پہونچ جانے پر قادر تھے عوام جو اباً عن جدٍ انسانی پرواز کے امکان پر یقین نہیں رکھتے تھے اور اس بناء پر اس قسم کے مظاہرے کو خرق عادت اور مافوق الفطرت قوت سے تعبیر کرنے کے عادی تھے۔ اسے ہمیشہ جادو وسحر کا اعجاز یا جن وپری کا کرشمہ قرار دیتے رہے چنانچہ مذہبی کتابوں میں جہاں کسی انسانی پرواز کا ذکر آیا ہے تو بمفولائے ارشاد نبوی نحن معشر الانبیاء نتکلم الناس علیٰ قدر عقولہم (ہم گروہ انبیا لوگوں سے ان کی عقلوں کے مطابق گفتگو کرتے ہیں) کسی ٹھیٹ علمی اصطلاح کے ذریعہ نہیں بلکہ انھیں عامیانہ اعتقادات کی وساطت سے اس موضوع کو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثلاً کتاب المکاشفہ کے باب نہم میں حضرت یوحنا کا ایک مکاشفہ حسب ذیل الفاظ میں درج ہے۔

"اور پانچویں فرشتے نے آواز دی اور میں نے دیکھا کہ ایک ستارہ آسمان سے زمین پر گرا اور اسے بے پایاں غار کی کلید حوالے کی گئی اور اس نے اس بے پایاں غار کو کھولا اور اس غار سے کسی بڑے چولھے میں سے نکلنے والے دھوئیں کی طرح دھواں نکلا اور اس غار والے دھوئیں سے آفتاب اور ہوا دھندھ ہو گئی اور اس دھواں کے اندر سے زمین پر ٹڈیاں نکل پڑیں اور ان کو بل عطا کیا گیا جس طرح زمین پر بچھوؤں

کو بل حاصل ہے اور ان کو یہ فرمان دیا گیا کہ وہ کسی گھانس کو نقصان نہ کریں۔ نہ کسی سبز چیز کو اور نہ کسی درخت کو صرف ان آدمیوں کو جن کی پیشانیوں میں خدا کی مہر نہ لگی ہوئی ہو اور ان کو یہ بتادیا گیا کہ وہ ان لوگوں کو مارے نہیں بلکہ پانچ ماہ تک اذیت دیتے رہیں اور ان کی اذیت ایسی تھی جیسی بچھو کی اذیت ہوتی ہے۔ جب وہ کسی آدمی کو کاٹتا ہے۔ اور ان دنوں لوگ اپنی موت کو ڈھونڈتے پھرینگے اور اس کو نہ پائیں گے اور مرنا چاہیں گے اور موت ان سے بھاگتی پھرے گی۔ اور ٹڈیوں کی شکل ان گھوڑوں جیسی ہوگی جو لڑائی میں تیار کئے جاتے ہیں اور ان کے سروں پر تاج زریں کی طرح کوئی چیز ہوگی اور ان کے بال عورتوں کے بال جیسے ہونگے اور ان کے دانت شیروں کے دانت جیسے ہونگے اور ان کی پٹیاں (سینہ بند) آہنی پٹیوں جیسی ہونگی اور ان کے پروں کی آواز ایسی ہوگی جیسی میدان جنگ کی طرف بھاگنے والے بہت سے گھوڑوں والی گاڑیوں کی آواز ہوتی ہے۔"

آیات مذکورہ بالا کی تفسیر میں ایک ممتاز فرانسیسی علامہ دیہر ایم لوئس براڈو ملران کو ہوائی جہاز کی پیشینگوئی پر محمول کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہوائی جہاز کے متعلق حضرت یوحنا کا یہ بیان جو اٹھارہ سو سال پیشتر عمل میں آیا ہے اگر مبہم، خیالی اور دور از کار معلوم ہو تو اس کا بہت معقول سبب ہے۔ غرض کیجئے کہ عہد وسطی کے کسی آدمی کو ریل گاڑی کے متعلق اپنا مکاشفہ بیان کرنا ہوتا تو وہ اس طرح کرتا کہ وہ ایک عظیم الجثہ کیڑا ہے جو نہایت سرعت سے چلتا ہے اس کا سر سینگ نما ہے اس کی آنکھیں بڑی بڑی اور شعلہ انگیز ہیں جیسے برابر شعلے۔ بخار اور دھواں نکلتے رہتے ہیں۔ اور اس کی دم پر بھی ایک سرخ آنکھ ہوتی ہے۔ وہ کڑک کی طرح شور مچاتا اور مہیب چیخیں مارتا جاتا ہے جیسے کوئی بڑا شکاری پرندہ اپنے شکار پر جھپٹتا ہو۔ مسٹر براڈو ملر کی رائے میں "ستارہ" سے انسان کی ذہنی و عقلی ترقی "بے پایاں غار" سے کوئلہ اور "کلید" سے دخانی انجن مراد ہے۔ غرض اس طرح کلوں کے زمانہ کا افتتاح ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ "ٹڈیوں" کی تاویل ہوائی جہاز اور بچھو کے ڈنک والے بل کی گاس سے کرتا ہے "ٹڈیوں" کو کھاس درخت اور دوسری سبزیوں سے تعرض نہ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ٹڈیاں کوئی معمولی قسم کی ٹڈیاں نہیں جن کی خوراک ہی سبزی ہے۔ زہریلے گاس کا مریض شدت تکلیف سے موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے اور موت کا متمنی ہوتا ہے۔ لیکن عرصہ تک مصیبت جھیلنے کے بعد بھی اس کی جان نہیں نکلتی اور یہی معنی ہیں آیت نمبر ۶ کے۔ ساتویں آیت میں ٹڈی کی شکل کو گھوڑے سے جو مشابہ بتایا گیا ہے وہ بھی ہوائی جہاز ہی کی تائید کرتا ہے کیونکہ گھوڑا سواری کا خاص اور صبا رفتار جانور ہے۔ لڑائی میں چلنے کے معنی ان کے جنگی اسلحے ہیں۔ تاج زریں سے مراد مڑنیوالے پراپلر پر تابش آفتاب ہے۔ اور آٹھویں اور نویں آیتوں کا مطلب تو اس قدر واضح ہے کہ تشریح کی ضرورت ہی نہیں ہے۔

قرآن شریف میں بھی حضرت سلیمانؑ کی پرواز کا ذکر آیا ہے۔ سورہ انبیاء میں ہے۔ ولسلیمٰن الریح عاصفۃ تجری بامرہٖ الی الارض التی بارکنا فیھا وکنا بکل شیٔ علمین۔ (ترجمہ اور سلیمٰن کے تابع ہوا کی جو اس کے حکم سے جھونکے سے چلتی اور اس سرزمین کی طرف بہتی جسے ہم نے برکت دے رکھی ہے اور ہم کو ساری باتوں کی خبر تھی۔)

اسی طرح سورہ صٓ میں مذکور ہے۔

فسخرنا له الریح تجری بامرہٖ رخاءً حیث اصاب — "پس ہم نے ہوا کو اس کے تابع کر دیا جو اس کے حکم پر آہستہ آہستہ چلتی جدھر وہ جانا چاہتا تھا۔"

ان آیات بینات سے صریحاً مستفاد ہوتا ہے کہ حضرت سلیمان کو ہوا پر اسی قدر اقتدار حاصل تھا جس طرح آج سائنس کے دور میں ہوا بازوں کو حاصل ہے جس طرح آج کل ہوائی جہاز اور غبارے دھواں۔ گاس سٹیم وغیرہ کی طاقت سے چلتے ہیں۔ اسی طرح ان کا آلہ پرواز صرف ہوا کی طاقت سے چلتا تھا۔ بعینہ اسی طرح جیسے کشتیاں سمندر میں بادبانوں کی مدد سے ہوا کے زور سے تیرتی ہیں چنانچہ جناب شاہ عبدالقادرؒ ان آیتوں کی تفسیر میں موضح القرآن میں فرماتے ہیں۔

"ایک تخت بنایا تھا بہت بڑا اپنے سارے کارخانوں سے اور
لوگوں کے ساتھ اس پر بیٹھتے پھر ہوا آتی زور سے اس کو
زمین سے اٹھاتی۔ اوپر نرم ہوا چلتی۔ یمن سے شام کو اور
شام سے یمن کو مہینہ کی راہ دوپہر میں پہونچاتی۔"

مشہور مفسر مقاتل بن سلیمان کی تحقیق یہ ہے کہ یہ جہاز ریشمی کپڑے کا تھا

گویا غبارہ کی قسم کا تھا جو موجودہ ہوائی جہازوں کی ایجاد سے پیشتر ریشمی کپڑوں ہی سے بنایا جاتا تھا جس کا ذکر آگے آئے گا۔ چونکہ اس پر بادشاہ سلامت خود رونق افروز ہوتے تھے اس لئے وہ نہایت مکلف اور زرنگار تھا۔ پرواز کے وقت اس کے اندر تیز ہوا پہنچائی جاتی اور جب وہ کافی بلندی پر اٹھ چکتا تو پھر ہوا کی رفتار ہلکی کر دی جاتی اور اس طرح تیزی و عمدگی کے ساتھ منزل مقصود کی جانب روانہ ہو جاتا۔

ہند قدیم میں ہوائی جہاز کا وجود

قدیم ہندوستان کو سیاسی و تمدنی حیثیت سے تمام روئے زمین پر خاص تفوق و برتری حاصل رہی ہے، ایک زمانہ وہ بھی تھا جب ایشیا و یورپ کے اکثر ممالک اس کے تابع فرمان تھے۔ چین، ایران، عرب، فلسطین، شام، مصر، حبشہ وغیرہ اس کے ممالک محروسہ میں داخل تھے۔ اس وقت اس کے علمی کمالات اور دماغی صلاحیت کی دھاک بندھی ہوئی تھی اور وہ تہذیب و شائستگی کا گہوارہ اور مرکز بنا ہوا تھا۔ ان دنوں اس کے پاس اپنے کارخانہ اور اپنے صناعوں کی بنائی ہوئی نوع بنوع کی گاڑیاں، طرح طرح کی کشتیاں اور گوناگوں جہازات کے بیڑے موجود تھے نیز اس کے پاس سامان جنگ اور آلات حرب ایک سے ایک اور ہلاکت آفرین تھے۔ بعض ان میں سے وہ تھے جو آج کل مستعمل ہیں مثلاً گولے، گیس، سرچ لائٹ وغیرہ وغیرہ۔ لہذا کوئی تعجب نہیں اگر ان کے پاس کسی نہ کسی نوع کے آلات پرواز بھی موجود ہوں جن کے ذریعہ ایام جنگ میں دشمنوں پر فضائی حملے کرتے ہوں اور امن کے زمانے میں سیر و سیاحت کا لطف اٹھاتے ہوں ہمارے اس خیال کی تائید مسٹر وی۔ آر۔ رامچندر دکھشیتار آف بنارس یونیورسٹی کے اس بیان سے ہوتی ہے جو موصوف نے یکم دسمبر ۱۹۳۷ء کو اناملیا یونیورسٹی میں ایک لکچر میں قدیم ہندوستان کی "ہوائی و بحری طریق جنگ" پر دیا تھا۔ ذیل میں ان کی تقریر کا ملخص پیش کیا جاتا ہے۔

"زمانہ قدیم میں ہندوستان کے اندر طریق ہوائی جنگ کے موجود ہونے کی شہادت موجود پائی جاتی ہے۔ ہوائی جہاز مختلف جانوروں کی شکل کے بنائے جاتے تھے۔ کوئی اونٹ، کوئی ہاتھی اور کوئی گھوڑے کی شکل کا ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ پرندوں اور رتھوں کی مانند بھی ہوائی جہاز بنتے تھے تمام ہوائی جہاز ہلکی سی لکڑی سے بنتے تھے۔ لفٹنٹ کرنل جیمز وج وڈ آف ماؤنٹ ورٹن نے کچھ عرصہ ہوا اعلان کیا تھا کہ ہندوستان میں ۱۲۵ نقشے ایسے ملے ہیں جن سے یہ جان کر حیرت ہوتی ہے کہ ۵۰۰۰ ق م میں ہندوستان کے اندر ہوائی جہاز پائے جاتے تھے۔ یہ ہوائی جہاز بہت سادہ قسم کے ہوتے تھے اور ہر ایک میں بیس بیس آدمی سوار ہو سکتے تھے۔ اسی طرح قدیم ہندوستان میں بحری طریق جنگ بھی رائج تھا۔ اس بات کی کافی شہادت موجود ہے کہ زمانہ قدیم میں ہندوستان کے اندر اور یوگ دھر کے زمانے میں بھی ایک اعلیٰ بحری بیڑہ موجود تھا۔ سہدیو نے سمندر پار کے کئی جزیرے فتح کر کے اپنی سلطنت میں شامل کر لئے تھے۔ سہدیو نے جاوا کے بیڑے اور بحیرۂ قلزم کا بھی ذکر کیا ہے۔ شاہان اندھرا کے پاس بھی ایک اچھا بحری بیڑہ تھا کا لنگا اور منگا میں پرانے وقتوں سے تعلق رہا ہے۔ خاندان چیرا، چورا، پالوا کے بھی اپنے بحری بیڑے تھے صیغہ بحر کا انچارج ایک ناظر (سپرنٹنڈنٹ) ہوتا تھا۔ اسی کے حیطۂ اختیارات میں تجارتی جہازات بھی ہوا کرتے تھے۔"

اس سلسلے میں راقم الحروف کی اپنی تحقیق یہ ہے کہ اس قسم کے ہوائی جہاز زیادہ تر مکانوں اور محلوں کی شکل و شباہت کے ہوا کرتے تھے اور اسی مناسبت سے انہیں "ویمان" کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ یہی لفظ ویمان کتب سنسکرت میں قصر شاہی کے معنی میں بھی مستعمل ہوا ہے۔ کبیر دیوتا کا ویمان ٹور سکان کے وضع کا تھا اور اس میں کئی منزلیں اور کمرے تھے۔ دھنشور دیوتا کے پاس جو ویمان تھا وہ رتھ کی شکل کا تھا۔ چھٹی صدی عیسوی کا مشہور سنسکرت شاعر "بھاروی" نے اپنی مثنوی "کراتا رجونیا" میں شیوا اور ارجن کے تذکرے کے ضمن میں ایک اڑنے والے رتھ کا ذکر کیا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں ہوائی جہاز کی کثرت تھی البتہ قیمت کی گرانی کے سبب سے وہ خاص خاص لوگوں ہی کے پاس پایا جاتا تھا۔ تاہم ہوا بازی اور طیارہ رانی کو ایک باقاعدہ فن کی حیثیت حاصل تھی۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ہم قدیم سنسکرت تصانیف میں اس کے متعلق مختلف اصطلاحات مندرج پاتے ہیں مثلاً طیارہ رانی کے لئے "ویمان یاتو" ہانکنے

دالے کو ڈیان ارنخ۔ ہوائی گاڑی میں پرواز کرنے کے لئے "وماں چریا" اور ہوائی بیڑے کیلئے "ڈیان پربھوت" کے اصطلاحات گوناگوں موجود ہیں۔

ان ہوائی جہازوں کو جب جنگ کے موقعے پر کام میں لایا جاتا تھا تو کم و بیش اسی طرح جس طریقے سے آج کل استعمال کیا جاتا ہے۔ اس سے فوجوں کو میدان جنگ میں لیجاتے تھے۔ دشمنوں کی سپاہ کی نقل و حرکت کی جاسوسی کیجاتی تھی اور ہوائی حملے کے ضمن میں بم اور گیس پھینکے جاتے تھے چنانچہ ایک جرمن اہل علم ڈاکٹر ڈور ہنرگ نے ایک ایسے ہی فضائی حملے کے حالات سپرد قلم کئے ہیں۔ جنھیں میں نہ صرف اپنے مذکورہ دعویٰ کی تصدیق میں بلکہ ناظرین کی دلچسپی کے خیال سے بھی قلمبند کرتا ہوں۔

"سری کرشن جی "یگیہ" کی تقریب میں شرکت کرنے کیلئے دہلی گئے ہوئے تھے۔ یہ تقریب دہلی کے راجہ یدھشٹر نے منعقد کی تھی۔ اور اس کیلئے انھیں دعوت نامہ بھیجا تھا۔ جب وہ لوٹے تو اپنی راجدھانی کو ویران پایا۔ مکانات جلے ہوئے تھے آدمیوں اور جانوروں کی لاشیں اور عورتوں اور بچوں کے جھلسے ہوئے اعضا ہر طرف بکھرے پڑے تھے۔ شہر بجنسہٖ وہ منظر پیش کر رہا تھا جو آج کل ہوائی حملہ کے بعد دیکھنے میں آتا ہے۔ سڑکوں اور گلیوں میں دست بدست لڑائی کے ہیبتناک آثار بھی ظاہر تھے۔

دریافت کرنے سے پتہ چلا کہ شیشوپال جو سری کرشن کے ہاتھوں قتل ہوا تھا اس کے حلیف شالو نے اپنے دوست کے خون کا انتقام لینے کی خاطر شہر پر چڑھائی کی تھی۔ اس نے ہوائی جہاز سے شہر پر آگ اور پتھر برسائے تھے اور جب شہر نیم برباد سا ہو گیا تو اس کے سپاہی اس میں گھس پڑے ایک دست بدست لڑائی ہوئی جس میں شالو کی فوج کو ہزیمت ہوئی اور وہ پسپا ہو گیا۔

سری کرشن جی نے لوگوں کو تسلی و تشفی دی اور شالو پر جس نے اُن کی راجدھانی میں اتنی ہلاکت و تباہی کی تھی دھاوا کرنے کی ٹھانی۔ شالو کرشن جی کی آمد آمد کی خبر پاکر خوف زدہ ہو گیا اور اپنی راجدھانی سے نکل کر ساحل بحر کے قریب ایک قلعہ میں جا چھپا۔ سری کرشن جی تعاقب کرتے ہوئے وہاں تک پہونچے اور قلعہ کا محاصرہ کر لیا۔ شالو کھلے میدان میں نکل کر نبرد آزما ہوا۔ اس نے سری کرشن کی فوج پر آگ، پتھر اور کھولتے ہوئے تیل برسانے کے لئے پھر ہوائی جہاز سے کام لیا اس نے ایک ایسا گولہ چھوڑا جس سے سری کرشن جی کی فوج دھوئیں سے چھپ گئی۔ یہ وہی چیز تھی جو عصر حاضرہ میں اسموک اسکرین کہلاتا ہے۔ اس پر کرشن جی نے نورانی تیر (موجودہ سرچ لائٹ) پھینکی جس سے روشنی پھیل گئی اس سے فوج کو شالو کے طیارے پر تیر کا نشانہ لگانے کا موقع ملا اور اس نے اس کے پرخچے اڑا دیئے۔ بعدہٗ جہاز میں آگ لگ گئی اور وہ نیچے آرہا جس پر سری کرشن جی نے سدرشن چکر چلا دیا۔ شالو کی فوج کو شکست ہوئی اور سری کرشن جی فتح و ظفر کا جھنڈا لہراتے ہوئے اپنی راجدھانی کو واپس آئے۔

یہ واقعات دوارکا میں اب تک زبان زد خلائق ہیں اور بعض قدیم خاندانوں میں رزمیہ مثنوی کی صورت میں اب تک سینہ بسینہ محفوظ چلے آتے ہیں اور آلھا کھنڈ وغیرہ کی طرح گائے جاتے ہیں اور انھیں وحی آسمانی کی طرح صحیح تصور کیا جاتا ہے۔

بالمیک کی رامائن اور کالیداس کی رگھونبس میں بھی ہم کو ایک ہوائی جہاز یا طیارہ کے مفصل حالات ملتے ہیں۔ اس کا نام پشپک دیمان تھا۔ اس کی شکل سورج جیسی گول تھی، وہ پربت کے مانند بہت بڑا اور پھول کی طرح نفاست سبک تھا یہ دیمان بہت آراستہ و پیراستہ تھا۔ اس پر سنہری نقش و نگار بنے ہوئے تھے اور جا بجا قیمتی جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ یہ کئی منزلہ تھا۔ بالائی منزل پر جو کمرے تھے وہ غیر معمولی طور پر سجے ہوئے تھے۔ ان پر تمام و کمال چاندی کے پتر منڈھے ہوئے تھے۔ جا بجا جھنڈیاں لگی ہوئی تھیں۔ ملمع کئے ہوئے کنول کے پھول بھی خوشنمائی میں اضافہ کر رہے تھے۔ موتیوں اور جواہرات کی مالائیں ادھر اُدھر لٹکی ہوئی اپنی بہار دکھا رہی تھیں۔ چاروں طرف گھنٹیاں لگی ہوئی تھیں جن میں سے نہایت سُریلی آوازیں نکلتی تھیں۔ یہ اتنا مضبوط تھا کہ اس کے ٹوٹنے کا مطلق خدشہ نہ تھا اور حسب مرضی چلایا جا سکتا تھا۔ اڑتے وقت زمین سے اٹھتے ہوئے اس سے زور و شور کی آواز نکلتی تھی۔ یہ ہوائی رتھ ابتداءً کبیر دیوتا کی ملک تھا جسے لنکا کے جابر فرمانروا راون نے اس کے مالک سے بزور چھین لیا تھا۔ راون اسی پر سوار ہو کر سیتا جی کا اغوا کرنے آیا تھا۔ پھر جب رامچندر جی نے راون کو قتل اور لنکا کو فتح کر چکنے کے بعد وہاں سے رخصت ہونے کی ٹھانی تو اسی "پشپک دیمان" پر معہ اپنے رفقائے سفر کے واپس لوٹے تھے۔

چین میں ہوائی جہاز

چین کا تہذیب و تمدن بھی بہت پرانا ہے۔ قدیم الایام میں اہل چین بہت سی چیزوں کے موجد ہوئے ہیں۔ یہ اپنے زمانہ عروج میں علم و فن میں

اپنا مثل نہیں رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے حکمت چین ضرب المثل ہے۔ ایسی صورت میں اگر انھوں نے کوئی آلۂ پرواز غبارہ وغیرہ کی قسم کا ایجاد کر رکھا ہو تو کیا عجب ہے چنانچہ ایک فرانسیسی مبلغ باسن نے چین کی سیاحت سے واپس آنے کے بعد ایک کتاب ۱۶۹۴ء میں لکھی ہے جس میں اس نے شاہ فوکین کے ۱۶۰۶ء کے جشن تاجپوشی کا حال درج کیا ہے۔ اس سلسلے میں پادری موصوف نے ایک بیلون یعنی غبارہ کے پکین سے پرواز کرنے کا تذکرہ بھی کیا ہے۔

ایک عربی مسلمان کا آلۂ پرواز

ممکن ہے اوپر کے بیانات کو اس بنا پر صحیح تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے کہ وہ کسی مستند تاریخی کتاب سے مستنبط نہیں بلکہ محض ظن و تخمین پر مبنی ہیں ان کے ماخذ یا تو خود افسانے ہیں یا افسانہ نما کتابیں لیکن یہ بھی تو حقیقت ہے کہ

ع چوں نہ باشد چیزکے مردم نگویند چیزہا

امر واقعہ یہ ہے کہ جب کسی چیز پر قدامت کا سیاہ پردہ پڑ جاتا ہے تو اس کا وجود بھی سائے کی طرح مبہم ہو جاتا ہے اور لوگوں کو اس کے حالات افسانہ نما معلوم ہونے لگتے ہیں۔ آپ تاریخ کی کتابوں کی ورق گردانی کیجئے آپ دیکھیں گے کہ جس قدر زمانہ بعید ہوتا جائیگا اتنا ہی اس کے واقعات دلچسپ اور رومانی ہوتے جائینگے۔ اگر موجودہ تمدن و تہذیب کسی وجہ سے مٹ جائے تو عرصہ دراز کے بعد ان کی آنے والی نسل اس عہد کے واقعات کا صفحات تاریخ میں حیرت و تعجب سے مطالعہ کریگی اور اسے بالکل افسانہ و داستان ہی کا لطف آنے لگے گا۔

بایں ہمہ یہ حقیقت ہے اور ایک ٹھوس تاریخی واقعہ کہ ایک دفعہ آلۂ طیران یعنی ہوائی جہاز کی ایجاد مسلمانوں کے دور عروج و عہد ترقی میں ہو چکی ہے چنانچہ مشہور مورخ علامہ مقریزی التلمسانی المتوفی سنہ ۱۰۴۱ ہجری (سترہویں صدی عیسوی) کے بیان سے مستفاد ہوتا ہے کہ آلہ پرواز یعنی ہوائی جہاز کا اولین موجد ابوالقاسم عباس بن فرناس نامی ایک عرب ہے یہ شخص اندلس کے بادشاہ عبدالرحمٰن ثانی کا سنہ ۸۲۱ء میں درباری طبیب تھا۔ مورخ موصوف نے اپنی تصنیف "نفح الطیب من غصن الاندلس الرطیب" میں اندلسیوں کے علوم و فنون کی ایجاد میں سبقت کرنے اور ان کی ذہانت کے فائق ہونے کا تذکرہ ایک خاص باب میں بالتفصیل کیا ہے۔ وہ حکیم ابن فرناس اور اس کی اس نادر روزگار ایجاد کا بیان ان الفاظ میں کرتا ہے۔

ان ابا القاسم بن فرناس حکیم الاندلس اول من استنبط بالاندلس من صناعة الزجاج من الحجارة واول من فك بها كتاب العروض للخليل واول من فك موسيقا ووضع الآلة المعروفه بالمنقال ليعرف الاوقات على غير رسم ومثال واحتال في تطيير جثمانه وكسا نفسه الريش ومد له جناحين وطار في الجو مسافة بعيدة ولكنه لم يحسن الاحتيال في وقوعه فتاذى مؤخره ولم يدر ان الطائر انما يقع على زمكه ولم يعمل له ذنبا وقيل ان ابن فرناس لما اراد ان يعرض اختراعه على اهالى قرطبة اجتمع خلق كثير لمشاهدته وكان نجاحه قليلا لانه لم يتمكن من الانتقال بطيارته في الجو بل كل ما امكن انه بقي مرتفعا في مكان واحد وسقط بعد ذالك على الارض بين اصوات التصاف والاستهزاء والضحك،

اندلس کا حکیم ابوالقاسم بن فرناس پہلا شخص ہے جس نے اندلس میں پتھر سے کانچ بنانے کا رواج نکالا۔ وہ پہلا شخص ہے جس نے موسیقی کے مسائل حل کئے اور منقال نامی آلہ بلا نشان کے وقت معلوم کرنے کیلئے ایجاد کیا۔ اس نے پرواز کرنے کی بھی ایک ترکیب نکالی اور پر لگا کر دور تک فضا میں پرواز کرتا رہا۔ لیکن چونکہ اترنے کے متعلق وہ کوئی عمدہ قاعدہ اختراع نہ کر سکا تھا اس لئے بعد میں صدمہ اٹھایا حالانکہ اس نے یہ سمجھا کہ اگر اڑنے والے کے دم نہ ہو تو وہ دھڑام سے گر پڑتا ہے کہتے ہیں کہ جب ابن فرناس نے اپنی اس ایجاد کو قرطبہ والوں کے سامنے پیش کرنے کا ارادہ کیا تو تماشہ دیکھنے کے لئے ایک خلقت ٹوٹ پڑی مگر اس میں اس کو کامیابی تھوڑی ہوئی اس لئے کہ وہ طیارہ سے کسی طرف منتقل نہ ہو سکا بلکہ سیدھا اوپر ہی کو اٹھتا چلا گیا اور پھر ہنسی اور طنزیہ آوازوں کے شور و غل میں زمین پر آ رہا۔

غبارہ کی ایجاد اور ترقیاں

چین و ہسپانیہ کی ایجاد کے بعد ممالک متمدنہ یورپ و امریکہ میں انسانی پرواز کے مسئلہ پر سنجیدگی کے ساتھ غور و خوض ہونے لگا اور اکثر صناع و اہل علم نے اپنی عنان توجہ کو کسی آلۂ پرواز کی ایجاد کی طرف مبذول کیا بالآخر اٹھارہویں صدی کے اخیر میں اس طویل خواب کی تعبیر عمل میں آگئی۔ مولوی سید عزیز الدین احمد بلخی عظیم آبادی مرحوم نے اپنی تالیف "انسان کی پرواز" میں جو اس موضوع پر اردو زبان میں غالباً پہلی اور واحد کتاب ہے اس ایجاد کی تاریخ ۱۷۸۳ء قرار دی ہے اور اس کا سہرا مانگولفر برادران کے سر باندھا ہے حالانکہ اس کی ایجاد

اس عہد سے بہت قبل ۱۷۰۹ء میں پادری گزمان کے ذریعہ شہر لزبن میں عمل میں آچکی تھی۔ اس نے باد سموم سے کام لیا تھا اس کے بعد کیونڈش نے ۱۷۶۶ء میں ہائیڈروجن گاس کے ذریعہ جو ان دنوں باد شعلہ گیر کے غیر علمی نام سے موسوم تھا غبارہ اڑانے کا خیال ظاہر کیا کہ یہ چیز ہوا سے بہت ہلکی ہے اور یہ اسی سائنسدان کی کتاب "مختلف الاقسام ہوائیں" کے مطالعہ کا نتیجہ تھا کہ انھیں غبارہ بازی کا شوق پیدا ہوا۔ اس کتاب میں مذکور تھا کہ اگر کسی وزنی تھیلے میں ہلکا گاس بھر دیا جائے تو ہوا میں طیارہ رانی کرنا ممکن ہے اسی سلسلے میں "انسان کی پرواز" کے مؤلف نے لکھا ہے کہ پروفیسر بلیک نے جانور کے مثانے پر اس کا تجربہ کیا اور کیو لیو نے مثانے کے بھاری ہونے کی وجہ سے اس پر تجربہ کرنے کا خیال ترک کر دیا لیکن صحیح یہ ہے کہ اڈنبرا کے پروفیسر بلیک کے دل میں یہ خیال آیا کہ اگر ہلکے تھیلے میں گاس بھر دیا جائے تو وہ خود بخود اوپر کو پرواز کرنے لگے گا۔ اور اس نے ۱۷۶۷ء میں اس کا تجربہ بھی کیا تھا۔ اس کے کئی سال بعد ۱۷۸۲ء میں خود کیولیو نے سور کے مثانوں اور کاغذی تھیلوں میں گاس بھر کر اس کی آزمائش کی جس میں اسے ناکامی ہوئی۔ مثانے والی آزمائش کی ناکامی کا سبب تو اس کا ہوا سے زیادہ وزنی ہونا تھا اور کاغذی تھیلے میں ناکامی اس لئے ہوئی کہ کاغذ کے پتلے ہونے کے سبب سے گاس فوراً خارج ہو جاتا تھا تاہم صابون کے بلبلوں کو گاس آگیں کرکے اڑانے میں اس نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کی۔ (دیکھئے السٹریٹڈ چیمبرس انسائیکلوپیڈیا میں بیلوں کا بیان۔)

ان گوناگوں آزمائشوں اور تجربوں کے بعد بالآخر وہ وقت آگیا جب حقیقی معنوں میں کسی کام کے غبارہ کی ایجاد عمل میں آئے اور اس کام کے لئے صناع نظرت نے فرانس کے دو بھائیوں اسٹیفن اور جازف مانٹگولفر کو منتخب کیا جنہوں نے مختلف خانگی تجربات کے بعد جون ۱۷۸۳ء میں ایک غبارہ تیار کیا، جس کا قطر ۳۵ فٹ تھا۔ یہ ٹاٹ کا بنا ہوا تھا اور اس پر کاغذ منڈھ دیا گیا تھا نیچے دھواں اور گرمی پہونچانے کے لئے ایک انگیٹھی یا نسیر گیلے کھڑ اور اون سے بھر کر اور سلگا کر رکھدی گئی تھی۔ یہ غبارہ یا بیلوں پندرہ سو فٹ کی بلندی تک اڑا۔ جب اس کی خبر پایہ تخت پیرس میں پہنچی تو لوگوں نے اینونائے کی طرح وہاں بھی غبارہ کی پرواز کے مشاہدہ کرنے کا اشتیاق ظاہر کیا اور ایک کثیر رقم چندہ سے فراہم کرکے دونوں بھائیوں، اس عہد کے ایک فلسفیانہ آلہ ساز رابرٹ اور ایک نوجوان تجربہ کار ماہر طبیعات پروفیسر چارلس کے حوالہ کی گئی اور ایک غبارہ ریشمی کپڑے کا تیار کیا گیا جس کا قطر ۱۲۔ فیٹ تھا۔ لیکن اس دفعہ بجائے دھواں کے اس میں گاس بھرا گیا اور ۲۷ر اگست ۱۷۸۳ء کو پیرس کے وسیع میدان سے تین لاکھ تماشائیوں کے مجمع میں جو شہر کی قریب قریب نصف آبادی پر مشتمل تھا اڑایا گیا ایک اور غبارہ اسی سال ۱۲ر ستمبر کو اڑایا گیا۔

غبارہ بازی کے معاملہ میں اتنی کامیابی مزید تجربات کی حوصلہ افزائی کے لئے کافی تھی چنانچہ اب یہ تجربہ کئے جانے کی تجویز ہوئی کہ آیا جانداروں کا غبارہ میں اڑنا ممکن ہے یا نہیں اس مقصد کے لئے چوپاؤں کو منتخب کیا گیا اور جازف مانٹگولفر نے ۱۹ر ستمبر کو ایک بجے دن کے وقت مقام وارسلے میں ایک ایسا غبارہ اڑایا جس میں ایک پنجرہ لگا ہوا تھا اس کے اندر ایک بھیڑ ایک مرغ اور ایک بطخ تین جانور بند تھے اس طرح ہوا پر سفر کرنے والوں میں انہیں تینوں ذی روح ہستیوں کو اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اس تماشہ کو دیکھنے کیلئے تماشائیوں کے زمرہ میں خود فرمانروائے فرانس معہ ملکہ و اراکین سلطنت کے موجود تھا۔ یہ بیلون آٹھ منٹ کے بعد دو میل کے فصل پر ایک جنگل میں گرا۔ تینوں مسافر صحیح وسلامت پائے گئے اس تجربہ نے انسانی سیاحت کے لئے راستہ صاف کر دیا سب سے پہلے ایم پلیٹر ڈی روزیر مقید غبارہ پر اڑنے کی آزمائش کرنے کے بعد ۲۱ر نومبر ۱۷۸۳ء کو مارکوئیس آرلینڈ کی معیت میں دو بجے دن کے وقت پیرس سے اڑا اور ۲۵ منٹ تک ۵۰۰ فٹ کی بلندی پر پرواز کرتے رہنے کے بعد تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر اترا۔ بعدہ یکم دسمبر کو دو اور آدمی یعنی پروفیسر چارلس اور رابرٹ ایک ۲۷ فیٹ کے قطر کے غبارہ پر اڑے۔ یہ بیلون پلیٹر ڈی والے غبارہ سے اس اعتبار سے ترقی یافتہ تھا کہ گاس کا اخراج کرکے حسب خواہش اتار لیا جا سکتا تھا۔ چنانچہ دو ہزار فیٹ کی بلندی پر دو گھنٹہ تک پرواز کرنے کے بعد پیرس سے ۲۷ میل کے فاصلہ پر قصبہ نسل میں اتار لیا گیا لیکن چارلس رابرٹ کو اتار کر بقیہ ماندہ گاس کے ساتھ رابرٹ دوبارہ اڑا اور غبارہ کے ہلکے ہو جانے کی وجہ سے آدھ گھنٹے میں دو میل کی بلندی سے تین میل پر اترا دوسرے سال یعنی ۱۷۸۴ء میں عظیم پیمانے پر پرواز کی تیاری کی گئی۔ اس دفعہ جو بیلون کام میں لایا وہ قطر میں ایک سو فٹ سے زیادہ اور بلندی میں ۱۳۰ فیٹ تھا فلیسلیز تھا اس پر شہر لائنز سے ۱۹ر جنوری کو سات آدمیوں نے پرواز کی۔ اس کشتی کی سرعت پرواز

کا یہ عالم تھا کہ پندرہ منٹ کے وقفہ میں تین ہزار فیٹ اونچا ہوگیا لیکن بدقسمتی
سے بالائی حصے میں خود بخود شگاف ہو جانے کے سبب سے زمین پر اترنے کے
لئے مجبور ہو گیا۔ الحاصل ایک سال کے اندر ہی غبارہ بازی نے رواج عام حاصل
کر لیا۔ اور کافی ترقی کر لی اور اب فرانس سے نکل کر اٹلی، امریکہ، انگلستان
وغیرہ ہر جگہ اس کا چرچا ہونے لگا۔

انگلستان میں پہلے پہل کونٹ زمبیکاری نامی ایک اطالوی نے غبارہ
بازی کو رواج دیا اس نے ریشمی کپڑے کا ایک مختصر سا ایر بیلون بنایا تھا جس کا
قطر دس فیٹ اور وزن ۴ ۱/۲ سیر تھا۔ وہ ۲۵ نومبر ۱۷۸۳ء کو مجمع کثیر کے سامنے
اڑا اور ڈھائی گھنٹے پرواز کرتے رہنے کے بعد لندن سے ۴۸ میل کے فاصلہ پر ضلع
سسکس میں اترا۔ بعدہ مسٹر جے جے ٹلر نے ۲۷ اگست ۱۷۸۴ء کو ایڈنبرا سے
خود پرواز کیا اور نصف میل آگے تک اڑا۔ بایں ہمہ انگلستان میں غبارہ بازی
کا اصل چرچا لونارڈی کی کوشش سے شروع ہوا۔ یہ شخص بھی اطالوی نژاد اور
سفیر نیپلز کا سکریٹری تھا اس نے ایک متوسط درجے کا ایر بیلون تیار کیا تھا جس
کا قطر ۳۳ فٹ تھا۔ وہ ۱۵ ستمبر ۱۷۸۴ء کو توپ خانہ والے میدان سے جہاں
تماشائیوں کا اژدہام کثیر تھا اور خود پرنس آف ویلز بھی رونق افروز تھے اڑا
اور ڈیڑھ گھنٹے کی پرواز کے بعد جنوبی ممفس میں اترا۔ وہ دوبارہ وہاں سے
اڑا اور پھر ۱۵ منٹ کے بعد ایک دیہات میں ایک عورت کی مدد سے بیلون سے
اترا لونارڈی کے بعد ایک اور قابل ذکر غبارہ بازی بلینکرڈ اور ڈاکٹر جفرے کی
تھی جو ۷ جنوری ۱۷۸۵ء کو ایک ساتھ بیلون پر آبنائے ڈوور کو انگلستان سے
عبور کر کے فرانس کیلے کے ساحل پر پہونچے۔ اس سلسلہ میں میری نظر جریدۂ "انیس"
کابل کے سال ہفتم شمارہ ۲۰ میں ایک خبر پر پڑی جس کا مفاد یہ ہے کہ کنگسٹن
واقع انگلستان کے میوزیم میں دو نہایت پرانے طیارے موجود ہیں جنھیں مسٹر
اسپرنگفیلو نے ۱۷۹۹ء اور ۱۸۴۷ء میں پرواز کرنے کی غرض سے بنایا تھا۔
اور اس پر ۴۰ میٹر اڑا بھی تھا۔ اس کے اپنے الفاظ یہ ہیں۔

"در موزہ خانہ کنگسٹن (انگلستان) دو طیارہ بسیار قدیم موجود
است کہ از قرار معلوم ہر دو سے آں را عالم متبحر انگلیسی موسوم بہ
اسپرنگفیلو بمقصد طیران در ہوا در اوقات متناوب حیات
خود ساختہ است۔ طیارہ اولیٰ را کہ عالم مذکور در سال
۱۷۹۹ء ساختہ ۳ بال دارد و بجز چند قدم مختصر کامیابی
حاصل نتوانستہ است۔ دومی در سال ۱۸۴۷ء تیار شدہ
و در سیستم یک بالہ میباشد و بواسطہ خود مخترع ۴۰ متر بلند
شدہ است۔ انگلیس اسپرنگفیلو را بسیار تقدیر میکنند
زیرا کہ تمام عمر خود را صرف فکر ہوا بازی نمودہ و در ظرف
۴۸ سال ۱۷۹۹ء تا ۱۸۴۷ء قطعاً ایں فکر را از سر
نکشیدہ است، طیارہ ہائے مذکور (از جملہ اصل ہائے اختراعات
قدیمہ) قیمت زیاد دارند۔"

اس بیان میں بظاہر کئی غلطیاں ہیں اولاً یہ کہ موجد کا نام سپرنگ فیلو
نہیں، اسٹرنگ فیلو تھا۔ پھر نہ تو یہ صحیح ہے کہ ایک غبارہ ۱۷۹۹ء میں تیار ہوا
تھا اور نہ وہ دوسرے طیارہ کے ذریعہ ۴۰ میٹر بھی پرواز کر سکا تھا۔ مجھے اس شخص
کے متعلق کتب تواریخ میں جو کچھ حالات معلوم ہو سکے ہیں وہ صرف اتنے ہیں
کہ اس نے "ہنس" نامی ایک شخص کی اسکیم کی بنیاد پر ۱۸۴۵ء میں ایک طیارہ
۷۰ فیٹ رقبہ اور ۳۰ پونڈ کے وزن کا بنایا تھا لیکن آزمائش کرنے پر اس میں
شدید نقص پایا گیا اور معلوم ہوا کہ وہ فضا میں پرواز کی صلاحیت سے معرا ہے
اس کے کچھ سال بعد اس نے ایک اور طیارہ بنایا لیکن وہ بھی کسی کھلی فضا
میں پرواز کرنے کی قابلیت نہیں رکھتا تھا۔ البتہ بند کمرے میں کام دے سکتا
تھا۔ تاہم اگر خود طیارہ مذکور پر سنہ ایجاد منقوش ہے تو وہ ایک نیا انکشاف ہے

مولوی سید عزیز الدین احمد بلخی مرحوم نے اپنی تاریخ زین ترکی میں
ایک غبارہ کے پرواز کرنے کی کیفیت درج کی ہے لکھتے ہیں کہ ۱۷۸۶ء کے
آغاز میں سلطان روم کے حکم سے ایک ایرانی طبیب دو ترکوں کے ہمراہ
ایک بیلون پر اڑا اور سمندر کی اس شاخ کو عبور کر کے جو یورپ اور ایشیا کے
درمیان حائل ہے۔ ایشیائے کوچک میں سمندر کے کنارے نوے میل
کے فاصلہ پر اترا۔

غبارہ بازی کی ابتدائی تاریخ میں ایک خاص قابل ذکر واقعہ عورتوں
کی پرواز ہے۔ سب سے پہلی عورت میڈم تھیل ہے جو ۴ جون ۱۷۸۴ء کو ایم فلیورنٹ
کی رفاقت میں شہر لائنز واقع فرانس سے ایک فائر بیلون پر اڑی انگلستان
میں بھی ۲۹ جون ۱۷۸۵ء کو مسز سیج نام کی ایک عورت نے ایک شخص مسٹر
بگن کے ہمراہ لندن میں پرواز کی۔ انیسویں صدی کی اڑنے والیوں میں
میڈم پوٹون سب سے زیادہ قابل ذکر ہے۔ اس نے بارہا پیرس میں بیلون پر

پرواز کی۔ اس نے ایک دفعہ یہ جدت کی کہ وہ ۱۸۵۲ء میں کریمورن گارڈنز لندن سے ایک گھوڑے پر سوار ہوکر اڑی۔ اسی طرح ۴ر اکتوبر ۱۸۶۳ء کو پیرس سے جو عظیم ترین بیلون ۱۳ آدمیوں کو لے کر اڑا تھا اس میں بھی ایک عورت پرنسس ڈیلا نور سوار تھی۔

ایک صدی کے اندر اندر غبارہ بازی میں کیا بلحاظ ساخت و جسامت اور کیا باعتبار رفتار و پرواز بہت ترقی ہوئی۔ ۱۸۶۲ء میں علمی تحقیقات کی غرض سے جو خاص بیلون بنایا گیا تھا۔ اور جسپر ۱۷ر جولائی کو ولور ہمپٹن واقع انگلستان مسٹر جیمز گلیشیر نے پرواز کی تھی۔ وہ نوے ہزار مکعب فٹ کے پیمانہ کا تھا۔ پیرس کے ایک فوٹوگرافر نادار نامی نے جو ایر بیلون ۱۸۶۳ء میں تیار کیا تھا وہ تقریباً ۲ لاکھ مکعب فیٹ گاس بھرے جانے کی وسعت رکھتا تھا۔ اس وقت تک اتنا عظیم الشان بیلون کہیں نہ بنا تھا۔ اس کا نام "لی جائنٹ" رکھا گیا تھا۔ اس کے نیچے ایک اور "معاون بیلون" لگا یا گیا تھا۔ پھر اس کے نیچے ایک کشتی ۳۰ فٹ طویل اور ۸ فیٹ بلند لٹکائی گئی تھی۔ سب سے بڑا ایر بیلون وہ تھا جو امریکہ میں ۱۸۷۳ء میں بحر اوقیانوس کو عبور کر کے یورپ پہونچنے کے خیال سے اخبار ڈیلی گرافک نیویارک کی طرف سے تیار کرایا گیا تھا۔ اس میں ۴ لاکھ مکعب فٹ کے بھرے جانے کی گنجائش رکھی گئی تھی۔ نیز وہ پونے دو سو من کا بوجھ اٹھانے کی استطاعت رکھتا تھا۔ مگر کمزور کپڑا لگائے جانے کی وجہ سے گاس بھرتے وقت وہ پھٹ گیا اور اس طرح بیکار محض ہو کر رہ گیا۔ ماسوا اس کے اس چیز میں رفتہ رفتہ اصلاحیں اور اضافے بھی خوب ہوئے جہاں بیلوں کی ابتداء دھوئیں سے ہوئی تھی۔ اور پھر بعد میں ہائیڈروجن گاس اور کوئلہ کا گاس استعمال ہونے لگا تھا وہاں اب بجلی کی مدد سے پرواز کرنے لگا۔ اور اس میں انجن اور موٹریں جوڑی جانے اور پراپلر لگائے جانے لگے جس سے اس کی رفتار کو قابو میں رکھا جاتا ہے۔

پرواز و رفتار میں بھی حیرت انگیز ترقی عمل میں آئی۔ ایم میلٹ اور کپتان جو دیس کے بیلون نے ۱۳ر اگست ۱۸۸۷ء میں ۴ ¼ میل کی بلندی تک پرواز کی۔ اس سے پہلے گاسٹن ٹسانڈیر۔ سیول اور کروس سپنلی کا غبارہ ۱۵ر اپریل ۱۸۷۵ء کو پرواز کرتا ہوا ۵ ½ میل کی اونچائی تک پہونچ چکا تھا۔ ان سبھوں سے بھی زیادہ ڈاکٹر اسے برسن کا غبارہ اونچا اڑا تھا جس پر ۵ر ستمبر ۱۸۶۲ء کو مسٹر گلیشیر اور مسٹر کاکسول ولور ہمپٹن سے اڑا تھا۔ یعنی دو گھنٹے کے عرصہ میں ۳۷ ہزار فٹ (۷ میل)۔ رفتار کے لحاظ سے سب سے زیادہ مسافت "لی جائنٹ" نے ۱۸۶۳ء کی پرواز کے سلسلہ میں طے کی تھی اس نے اس سفر میں ۱۷ گھنٹے کے عرصے میں ۲۳ ½ میل فی گھنٹہ کی اوسط رفتار سے پرواز کرتے ہوئے ۴۰۰ میل کا فاصلہ طے کیا تھا اس کے بعد نمبر ڈاکٹر برسن کے غبارہ کا ہے اس نے ۱۸۶ میل کی مسافت قطع کی تھی۔

ہوائی جہاز یا ایروپلین کی ابتداء

فن ہوابازی جس سرعت کے ساتھ ترقی کے منازل طے کر رہا تھا اس کا اقتضا یہ تھا کہ وہ جلد سے جلد معراج ترقی پر پہنچ جائے جسے فی الحقیقت دو امریکی بھائیوں ولبر اور آرول رائٹس نے ۱۹۰۳ء میں ایک خاص وضع کی مشین کی ایجاد سے پایۂ تکمیل کو پہونچا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ غبارہ کے ساتھ انجن کا استعمال نصف صدی پیشتر ہی سے رائج ہو چکا تھا اور گلفرڈ پہلا شخص تھا جس نے اپنے بیلون میں ایک سٹیم انجن لگایا تھا۔ اس کا کل وزن ۴۶۲ پونڈ یعنی پونے چھ من اور تین گھوڑے کی طاقت کا تھا۔ اس کے بعد ۱۸۸۳ء میں ٹسانڈیر نے الیکٹرک انجن سے کام لیا۔ اس کی رفتار پونے آٹھ میل فی گھنٹہ سے کچھ زائد تھی۔ اسی طرح جرمنی کے کاونٹ زپلن نے بھی ۱۸۹۷ء میں ایلومینیم کی ایک مشین تیار کی جو بالکل ہوائی جہاز کے مشابہ تھی۔ اس کی شکل مچھلی سے ملتی جلتی ہوئی تھی۔ اس کا طول ۴۴۶ اور قطر ۳۸ فیٹ تھا اندر سے ریشمی کپڑا منڈھا ہوا تھا۔ اوپر سے بھی جھلی منڈھ دی گئی تھی جس سے اندر کی طرف پانی کا گذر دشوار ہوگیا تھا۔ اس کے اندر ۱۶ گھوڑے کی طاقت کا انجن لگا ہوا تھا اس میں ۵ آدمی سوار ہو سکتے تھے لیکن بایں ہمہ جسامت و وضع وہ دراصل ایک انتہائی ترقی یافتہ بیلوں سے زیادہ نہ تھا۔ اس لئے کہ اس کی پرواز میں گاس سے اسی طرح مدد لی جاتی تھی جس طرح عام بیلونوں کے لئے لی جاتی ہے اور اس کے لئے ۱۷ الگ الگ خلئے بنے ہوئے تھے مگر رائٹ برادران کا طیارہ ان سبھوں سے جداگانہ قسم کا تھا اور جداگانہ اصول پر مبنی تھا۔ یہ اولیں مشین تھا جو ہوا سے نسبتاً بھاری تھا اور ساتھ ہی ہوا پر پورا قابو رکھتا تھا۔ اس نے ہوابازی کی تاریخ میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر دیا۔ جس سے پرواز کا صحیح مفہوم حاصل ہو گیا۔ ان کا اہم اصول "قیام توازن" تھا یعنی موٹر چلتے ہوئے طیارے کو چلاتے وقت اپنے کو ہوا میں سنبھالے رکھنا اور اس کے لئے بہت زیادہ مہارت پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔

اگرچہ یہ تخیل اور یہ اصول جدید نہ تھا۔ ان سے پیشتر اور لوگ بھی اس قسم کی رائے قائم کر چکے تھے مثلاً گیونارڈو ڈاونسی المتوفی ۱۵۱۹ء، سر جارج کیلے، مسٹر ہنسن، مسٹر وینہم، مسٹر بلٹن، مسٹر لارنس، ہارگریو، مسٹر فلپس، سر ہیرم میکسیم، لانگلے، ایڈر وغیرہ مگر عملاً اس فن میں کوئی قابل قدر اضافہ نہ کر سکے ان کے تجربات ہوابازی میں یا تو قطعاً ناکام رہے یا بہت کم کامیابی ہوئی۔ البتہ اٹو للی انتھل نامی جرمن کو اوروں سے زیادہ کامیابی حاصل ہوئی۔ اس کے نزدیک بھی مشق اور توازن پرواز کے لئے لازمی چیزیں ہیں۔ اس نے اپنی مشق کی ابتدا سبو سے شک کر کی اور اس طرح ۳۰ فٹ تک پرواز کرنے کی مہارت پیدا کر لی وہ ۱۸۹۶ء میں ۵۰ فیٹ تک مشق پرواز بہم پہنچا لینے کے بعد زمین پر گر کر جان بحق تسلیم ہو گیا۔

اس کے بعد پلچر جانوٹ اور کپتان فربر نے للی انتھل کے نقش قدم پر چلنے کی کوشش کی۔ ان میں سے اول الذکر کا تو وہی حشر ہوا جو خود للی انتھل کا ہو چکا تھا یعنی ہنگام پرواز مشین کے ایک بازو کے شکستہ ہو جانے کے سبب سے وہ ۳۰ فٹ کی بلندی سے گر کر فوت ہو گیا۔ البتہ فربر کو خاصی کامیابی حاصل ہوئی مگر اس کی مشین ولبر کی مشین کے نمونہ پر تیار ہوئی تھی اور اس پر وہ ۱۹۰۲ء میں بہ مشکل سے اڑا تھا۔

بہرحال قیام توازن کے لئے مشق بہم پہنچانے کی غرض سے رائٹ برادران ایک مدت تک پہاڑیوں کے نیچے ڈھلوانوں سے ہوا میں جست لگاتے رہے لیکن زمین سے نزدیک ہی رہا کئے تاکہ اگر مشین قابو سے باہر بھی ہو جائے تو گرنے پر مہلک ضرب نہ آئے۔ یہ مشین (طیارہ) ساؤتھ کنسنگٹن میوزیم میں ہنوز محفوظ ہے۔ ان کی مہارت پرواز کے جوہر فرانس میں نمایاں ہوئے۔ وہاں کی ایک سنڈیکیٹ نے ولبر رائٹ کو ۳۱ میل تک ایک ایسے طیارہ پر اڑنے کے لئے ۵۰ ہزار فرانک کے وعدے کے ساتھ دعوت دی تھی جس میں ایک اور آدمی ان کا شریک پرواز ہو اور انجن میں پٹرولیم بھی اتنا سما سکے کہ ۲۵۰ میل کی مسافت کے لئے کافی ہو چنانچہ فرانس میں اس کی اولیں پرواز ۸ اگست ۱۹۰۸ء کو لی مانس میں کل پونے دو منٹ ہوئی اور پہلی بار ۲۶ فیٹ کی بلندی سے لگاتار ... چکر لگائے کہ یورپ والے تو چکر میں آ گئے۔ اس کی دوسری شاندار پرواز ۲۱ ستمبر کو عمل میں آئی جس کی مدت ڈیڑھ گھنٹے سے کچھ زائد تھی اور ۵۵ میل کی مسافت طے ہوئی۔ اس کے علاوہ بھی فرانس میں اس نے متعدد قابل ذکر پروازیں کیں اور بارہا کسی شریک سفر کے ساتھ بھی طیارہ رانی کی۔ یہاں اس نے میکلن کپ، اور کمیشن ملا ایوی ایشن کے انعامات حاصل کئے

انسانی پرواز کی موجودہ کیفیت

ایروپلین یعنی طیارہ کی ایجاد کے بعد اس میں آہستہ آہستہ ترقی ہونے لگی۔ تاہم جنگ عظیم سے پیشتر ۸۵۰ فیٹ یا ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار کو معراج کمال تصور کیا جاتا تھا۔ ان دنوں ۳۰ فیٹ کی بلندی ہی غنیمت سمجھی جاتی تھی ۱۹۱۴ء میں جو طیارہ برطانوی مہم کو لے کر فرانس گیا تھا۔ وہ بالکل حقیر کمزور اور کم طاقت کا تھا۔ اس میں جو انجن جوتا گیا تھا وہ صرف پچاس گھوڑے کی طاقت رکھتا تھا۔ ابتداءً زیادہ سے زیادہ تین آدمی ایک طیارہ پر سوار ہو سکتے تھے لیکن دوران جنگ میں غیر معمولی سرعت کے ساتھ ترقی عمل میں آئی چنانچہ جنگ کے اختتام پر پانچ سال کے بعد اس میں پندرہ سو گھوڑے کی مجموعی طاقت کے ۵ موٹریں لگائی جانے لگیں اور چند ہی منٹ میں ایک میل اونچا پرواز کرنے لگا۔ باربرداری کے معاملہ میں بھی رفتہ رفتہ حیرت انگیز ترقی ہوئی ۱۹۱۹ء میں ۳۶۰ گھوڑے کی طاقت کے انجن سے کھینچے جانے والے طیارے میں دو ہی مسافر سوار ہو سکتے تھے دوسرے سال اتنی ہی طاقت والے انجن کے طیارے پر چار مسافر کسی قدر اسباب کے ساتھ چلنے لگے پھر ۱۹۲۶ء میں ۴۵۰ گھوڑے کی طاقت والے انجن سے دو نے آدمی معہ کثیر المقدار اسباب کے منتقل ہونے لگے۔ ۱۹۲۹ء کی مئی میں جب امپیریل ایرویز نے ہندوستان و انگلستان کے مابین باقاعدہ ہوائی ڈاک قائم کی اور پہلا طیارہ "سٹی آف جیروشلم" انگلستان سے کراچی کی ہوائی بندرگاہ میں وارد ہوا تھا تو اس پر ۴۱۸ پونڈ وزن کی ڈاک لدی ہوئی تھی۔ اور دو ہی سال کے عرصے میں یہ مقدار بڑھ کر چار چند ہو گئی، چنانچہ ۳۰ مئی ۱۹۳۰ء کو سائمن کمیشن کی رپورٹ کے جو نسخے ہوائی ڈاک سے آئے تھے ان کا وزن ۱۶۵۷ پونڈ تھا۔ ان طیاروں میں تین موٹریں جوتی جاتی تھیں۔

جسامت میں بھی تعجب خیز حد تک افزائش ہو رہی ہے ۱۹۲۷ء میں جو آر ۱۰۰ نامی طیارہ ہاوڈن واقع یارک شائر میں تیار ہوا ہے وہ ۵۰ لاکھ مکعب فیٹ کی وسعت رکھتا ہے۔ یہ چار منزلہ ہے اور اس میں ۵۰ ملاح اور ۱۰۰ مسافر سوار ہو سکتے ہیں۔ اس کے کھانے کے کمرے میں ۵۰ آدمی

بیک وقت خورد و نوش کر سکتے ہیں اور اس لحاظ سے یہ ایک اچھا خاصہ ہوائی ہوٹل ہے - پھر کمال یہ ہے کہ سبک بھی بیحد ہے یعنی وزن میں کل ۱۵۶، ٹن ہے - یہ شین ۸۲ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہے - گراف زپلن آر ۱۰۱ اور ہنڈنبرگ بھی اسی قبیل کے طیاروں میں سے ہیں مگر آخر الذکر دونوں جہاز اب برباد ہو چکے ہیں اول الذکر سنہ ۱۹۳۰ء میں اور موخر الذکر اسی سال ماہ مئی میں - ہنڈنبرگ پر اس آخری سفر میں ایک سو اشخاص سوار تھے اس سلسلے میں یہ خبر بھی دلچسپی سے سُنی جائے گی کہ امپیریل ایرویز کے لئے اُنسائن کی وضع کے" ۱۲ بڑے بڑے سریع السیر طیارے - سر ڈبلیو، جی ارم - اسٹرانگ لمیٹڈ مقام ہیبل واقع سودیٹن میں تیار کرا رہی ہے - یہ طیارے دنیا بھر کے باقاعدہ چلنے والے کرایہ کے ہوائی جہازوں میں سب سے بڑے ہونگے - کام کے لحاظ سے وہ دو قسم کے ہونگے - ایک یورپین یعنی صرف یورپ تک پرواز کرنے والے اور دوسرے مملکتی یعنی ممالک محروسہ میں جانے والے - اول الذکر میں ۲۴ اور موخر الذکر میں ۲۰ سے ۲۷ مسافر تک سوار ہو سکیں گے - آدمیوں کی کمی اس لئے ہوگی کہ ان میں مال نسبتہً زیادہ لادے جائینگے ان میں چار چار موٹرین ۸۰۰ گھوڑے کی طاقت والی لگائی جائینگی اور زیادہ سے زیادہ دو سو میل اور کم سے کم ۱۶۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے مسلسل ۱۰۰۰ میل تک چلتے رہیں گے -

سرعت رفتار میں بھی خاصی افزائش عمل میں آ رہی ہے ۲۰۰ میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنا اب معمولی بات سمجھی جاتی ہے کیونکہ ۴۰۰ میل تک کی دوڑ کا مظاہرہ وقوع پذیر ہو چکا ہے - اطالوی میجر برن ہارڈی اور فلائٹ لفٹنٹ - ڈی - آر - سی گریک شنیڈر ٹرافی ریس میں ۴۰۰ میل کی رفتار حاصل کر چکے ہیں بلند پروازی کے متعلق اگرچہ ہنوز کوئی قابل ذکر مظاہرہ عمل میں نہیں آیا تاہم موجودہ ترقیوں کے پیش نظر کون کہہ سکتا ہے کہ ۲۵۰۰۰ میل تک پرواز کرنے کا جو خواب اکثر ماہرین فن دیکھ رہے ہیں وہ ایک نہ ایک دن شرمندہ تعبیر نہ ہوگا -

جذبات

از جناب شیدا گورکھپوری

جذبات جو ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں اثر میں
چبھتے ہیں وہی تیر کے مانند جگر میں

اک حسنِ مجسّم کا ہے جلوہ جو نظر میں
معراج کی شب آج ہی شیدا مرے گھر میں

کیوں آپ کے جلوے ہیں ہر سمت پریشاں
کہئے تو چھپا لوں انھیں دامانِ نظر میں

شاید ہے محبت کی یہی منزل آخر
ہم ننگ ہیں اب نازِ نیا زاپنی نظر میں

ہو جائیں نہ کیوں خلق کی مسحور نگاہیں
کچھ رنگ تبسم ہے ترا نورِ سحر میں

آنکھوں سے ٹپکتے نہیں یہ اشک کے قطرے
ہیں پھول محبت کے مرے دامنِ تر میں

صدقے ترے سو جان سے اے جذب تمنا
ہر پھر کے وہ رہنے لگے گردابِ نظر میں

کیا جانئے کیا روگ مرے دل کو ہے شیدا
راحت ہے مجھے گھر میں نہ آرام سفر میں

میرے لئے

از:-
جنابہ محترمہ - آر - کے - بانو صاحبہ مضمر رضویہ

یاد ہے اُف عشق کی وہ ابتدا میرے لئے
وہ کسی کی اک نگاہِ دلربا میرے لئے

وہ اُٹھی کعبہ کی جانب سے گھٹا میرے لئے
میکدہ ہونے لگا آراستہ میرے لئے

یاد ہیں وہ سوئے در اُٹھتی ہوئی نظریں تری
ہر نگاہِ منتظر اک التجا میرے لئے

کوئی سرکاتا ہے اپنے روئے گلگوں سے نقاب
اُف! وہ اک نازک مہکتی سی ضیا میرے لئے

پھر نگاہِ ناز کو ہے میرے دل سے التفات
عام ہے گویا محبت کی صلا میرے لئے

فرش سے تا عرش اک موسیقیت برپا ہوئی
ہے تصور میں کوئی نغمہ سرا میرے لئے

کوئی میخانے میں کبتک منتظر بیٹھا رہے
لے بھی آ مے ساقیٔ رنگیں ادا میرے لئے

ایک میں ہوں وجہِ رسوائی تمہارے واسطے
ایک تم ہو زندگی کا آسرا میرے لئے

زانوے ساقی پہ سر ہے ہاتھ میں جام و سبو
صرف میں ہے میکدہ کا میکدا میرے لئے

اِن کے ہونٹوں پر تبسم مست آنکھوں میں شراب
کیف میں ہے وسعتِ ارض و سما میرے لئے

ٹھوکروں سے وہ کسی کی پے بہ پے توہینِ عشق
ناصیہ فرسائی کی وہ انتہا میرے لئے

یاد ہیں ابتک وہ اقبالِ محبت کے مزے
نرگسی آنکھوں میں اندازِ حیا میرے لئے

دو جہاں سے کھو دیا کمبخت نے مضمرؔ اُسے مجھے
ایک آفت ہے دلِ درد آشنا میرے لئے

نگوڑے مردوے

ایک ایکٹ کا نہایت دلچسپ ڈراما

(از جناب صاحبزادہ محمد عمر صاحب)

سین اول

ایلو ابھی تک گاڑی کی سواری نہیں پہنچی پھر کہتی ہیں کہ

تو ہوا کیا آ رہیں گی۔ یہاں کون لڈو بٹ رہے ہیں جو انہیں نہ ملیں گے

ابھی تو دیر کا کچھ کارن بھی تو ہو۔ نہ بال نہ بچہ نہ گھر نہ گھاٹ

کس نے دامن تھام لیا تھا انکا۔

تو انہیں جی بھر کر جلی کٹی سناؤ تمہیں کون ٹوکتا ہے۔ میں ذرا

اس صوفہ پر آرام ندرا لاپتی ہوں۔

تم صدا کی ناکاری ہو۔ حرام ہے جو ذرا سکت ہو تن بدن میں

یاد رکھنا جوانی چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ ورزش کیا کرو۔ ورزش

نہیں تو دیکھ لینا یہ جوبن۔ یہ انوٹ یہ چھب تختی ہوا ہو جائے گی۔

کیا کہنے ہیں جیسے میں ورزش ہی نہیں کرتی۔ دو گھنٹے صبح

دو گھنٹے شام ہارمونیم نہ بجالوں تو یہاں چین نہیں آتا۔ تمہارے

میں ورزش ہی نہیں کرتی۔

تو سچ یہ بھی ورزش ہے۔

تو اور کیا کروں۔ اکھاڑے میں جا کر ڈنڈ پیلنے سے تو رہی

راحت کی موٹر تھی تو گھنٹوں اسے لئے پھرتی تھی اس کی شادی ہو گئی

تو اس کے دل کے ساتھ اس کی موٹر پر بھی غیر کا قبضہ ہو گیا۔

بھول رہی ہو باجی! یہ باتیں تمہیں سجتی نہیں۔ انجمن حافظ

حقوق نسواں کی ممبرہ کا مردوں سے ملنا بھول ہے۔ آگے تم جانو۔

پر یہ بھی جانتی ہو کہ آخر دل ہی تو ہے۔

بھاڑ میں جائے ایسا دل جس سے آن کو بٹہ لگے۔ جانتی ہوں

اس انجمن کا اصول ہے کہ جہانتک بس چلے ہم شادی کا خواب تک نہ

دیکھیں۔ سب سے مزدری پہلو یہ ہے کہ جہانتک بس چلے اور جہاں

ہم بے بس ہو جائیں تو ذمہ داری گئی چولھے میں۔

دماغ ہوا نا کیا بات پیدا کی ہے۔

نہیں تو میرا ایمان ہے کہ کسی مردوے کو خاطر تلے نہ لاؤں۔

ہر طرح اسے جتادوں کہ میری نظر میں وہ ایک حقیر حیوان

ہے اور اس کا مرتبہ عورت کے مرتبہ سے لگا نہیں کھا سکتا۔

اوہو تم تو ایک پاک دامن ہو۔

نہیں تو کیا تمہاری طرح کھوٹ کپٹ سے بھرا دل ہے ہمارا

اچھا تو تمہیں نے مریم کے مصلے پر نماز پڑھ کر جنم لیا ہے۔ تم

ان اٹھان گھاٹیوں کو تو رکھو الگ اور ہمیں ذرا اپنے دل کی سیر

کراؤ۔

میں تو نہ اپنی بات چھپاؤں نہ کسی کی کہی یاد رکھوں۔ بس

سیدھی سادھی بات آتی ہے یہیں۔ تو سہرے لیکھے۔ اس انجمن کی بیل

منڈھے چڑھتی نظر نہیں آتی۔ یہ گھما گھمی اسی وقت تک ہے جب تک

خاوند نہیں ملتا۔ اور جسے گر پڑا کوئی مل گیا تو بوا میری کہی پلو میں باندھ لو

اسی گھڑی استیعفٰے اور خاوند کی تصویر صدر کی میز پر ہو گی۔

کچھ ان ہونی سی بات ہے یہ انجمن مجھے تو سارا کھیل ڈانواں

ڈول نظر آتا ہے۔ آگے اللہ جانے۔ پر باجی یہ بھی تو سچ ہے کہ مرد عورت کو

بیل بکری سے زیادہ نہیں سمجھتے اور اگر ان کے نکٹھوں پر آنسو بھی نہ بہائے جائیں تو کون کہہ سکتا ہے کہ اور کیا کچھ نہ کر گذریں۔

یہ تو پکی بات ہے اس سے کون انکار کر سکتا ہے۔ بیچاری نربل بے زبان عورت کی کوئی داد ہے نہ فریاد۔ مجھ سے پوچھو تو مرض ہم نے ضرور پا لیا مگر یہ علاج درست نہیں۔

تو پھر تمہیں بتاؤ۔

باہر رہ کر گیدڑ بھبکیاں دکھانے سے کچھ نہ بنے گا۔ مرد کے قلعہ کے اندر گھس جاؤ اور رہتے ہوئے قلعہ کے ساتھ مرد پر بھی قبضہ کر لو یہ عدم تعاون کی پالیسی نہ کہیں اور کامیاب رہی ہے نہ یہاں رہ سکتی ہے

اللہ تم نے تو میرے دل کی کہی۔ ہمارے پاس لاکھوں ہتھیار ہیں جن کا مرد مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور ہمیں انہیں استعمال کرنے سے روکا جاتا ہے۔

ہاں اسی بات کا تو رونا ہے۔

پھر اس سن میں۔

یاد ہے وہ دن جب سکول میں تم نے اور میں نے راغب سے شادی کے متعلق بات چیت شروع کی تھی۔

یہ بھی بھلا کوئی بھولنے کی بات ہے مگر اس کے بعد کسی نے جھوٹوں بھی تو نہیں پوچھا۔ بھول جاؤ باجی بیتے کی باتیں بھول جاؤ۔ جاگتے تو خاوند کی پرچھائیں تک نظر نہیں آتی۔

ہے ہے کیا کفر بک رہی ہو۔ نہ نظر آئے دشمنوں کو آج ہی کی بات ہے کہ ایک ہونہار خاوند ملا بہت باتیں ہوئیں بے حد باتیں۔ جب اس کی ٹوپی میرے پاؤں پر آ رہی تو میں مسکرائی۔ عورت کا رتبہ اس طرح بلند ہوتا ہے"۔ تم اپنا منہ ادھر کر لو ہم اپنا منہ ادھر کر لیں"۔ سے کچھ نہیں بنتا۔ اور اس نے زبردستی تصویر میری جیب میں ڈال دی کہو کیسی رہی۔

اوہوں۔ بڑی دون کی نہ لو۔ اپنے گوں بڑا تیر مار کر آئی ہو اتنا تو میں بھی کر کے آ رہی ہوں۔ تصویر میرے پاس بھی آ گئی۔ اور استعفےٰ بھی لکھ رکھا ہے اجلاس شروع ہونے کی دیر ہے۔ اور تمہارے ساتھ میں بھی داخل کر دونگی۔ لو سنبل بھی آ گئیں۔

آپا سنبل تسلیم۔

تسلیم۔ آج اجلاس ہے نا نرگس۔

جی ہاں۔ اور سنا ہے کہ بڑی دھوم کا اجلاس ہے۔ کسی استعفےٰ کا تو خطرہ نہیں۔

اللہ ہی جانے میں نہ ہاں کہہ سکتی نہ نہیں۔ مگر میں اپنا استعفےٰ نہ دوں تو لوگو بتاؤ کیا کروں۔

خیر تو ہے اب سے دور کیا بھیڑ پڑی۔ ویسے تو اللہ رکھے سب خیر صلا ہے بات یہ ہوئی مجھے ایک مردوے سے شادی کا وعدہ کرنا ہی پڑا۔ بہت ٹالا۔ پر اس نے اس طرح باتیں کیں کہ میرا دل پسیج ہی گیا۔ اب تصویر تو لے کر آئی ہوں مگر استعفےٰ پیش کرتے ہول آتا ہے۔ بوا اس جگ میں پرائی پیر کو کوئی نہیں سمجھتا۔

شرع میں کیا شرم۔ جب دین دھرم شادی کی اجازت دے تو ہمارا ہاتھ پکڑنے والا کون یہ کہے اب رتجگا کب ہوگا۔

اری دوانی نہ سوت نہ کپاس کولھو سے لٹھم لٹھا۔ ذرا بری ڈولی سسرال تو پہونچنے دے پھر رتجگا بھی لے لینا۔

مزا تو جب ہے جو ساری انجمن کو بلوا جائے۔

(ہنستی ہیں)

ایلو صدر صاحبہ اور باقی ممبرہ بھی آ گئیں۔ اب اجلاس شروع ہوتا ہے۔ صدر تقریر کرنے لگیں۔

صدر۔ بہنو! انہیں چاہتی کہ اس وقت اس سانپ کے کرتوت دہراؤں جس نے عورت کی جنت کو دوزخ بنا رکھا ہے اسے مرد کہتے ہیں یہ مرد انسان نہیں بلکہ ایک بچھو ہے جو خواہ مخواہ ڈنک مارتا ہے اور عورت کی زندگی کو پامال کئے جاتا ہے۔ دغا۔ فریب۔ عیاری مکاری کسی سے نہیں چوکتا اور شادی کے پھیر میں غلامی کی زنجیر میں جکڑ لیتا ہے اس کے سبز باغ میری توبہ کوئی کاٹیاں سے کاٹے عورت بھی اس کے پھندے سے نہیں بچ سکتی۔ اللہ ہی بچائے بچائے۔ جب سے دنیا پیدا ہوئی یہ عورت کی آزادی۔ عزت

اور چین کا لاگو ہو رہا ہے۔ اب قیامت قریب ہے پھر بھی یہ ایک منٹ کیلئے چین کی سانس نہیں لینے دیتا۔ اس جنم کے بیری سے جان بچانے کیلئے یہ انجمن قائم کی گئی ہے اور ہم ہر اس طریقے سے کام لے رہی ہیں جس سے ہم مرد کی پہونچ سے دور رہیں۔ آپ یہ سنکر خوش ہوں گی کہ ہمارے ایکے نے مردوں کی محفل میں ہلچل ڈال دی ہے اور سہمے ہوئے دماغ جھکنے کی راہ ڈھونڈھ رہے ہیں۔ فتح ہمارے سامنے ہے اور مرد کی پگڑی ہماری اوڑھنی کے سامنے پانی بھرنے کے لئے بے قرار ہو رہی ہے۔

آوازیں خوب۔ خوب۔

صدر۔ بہنو! نگوڑے مردوے کو معلوم ہو گیا ہے کہ ہم اسے برساتی کیڑے سے زیادہ نہیں سمجھتیں اور اس کا یہ سمجھنا ہماری کامیابی کا نشان ہے۔

آوازیں۔ خوب۔ خوب۔

صدر۔ دنیا کی کوئی طاقت۔ مردوں کی کوئی شرارت اور حکومت کی کوئی حمایت ہمارے ارادوں میں خلل نہیں ڈال سکتی۔ میں ہانکے پکارے کہے دیتی ہوں کہ ہم اس سانپ کی پھنکار سے نہیں نہیں ڈرتیں۔ ہم اسے کچلنا چاہتی ہیں۔ حیلے حوالے سے نہیں بلکہ کھلے میدان میں ہم برقعہ کے قیدخانہ سے نکل آتی ہیں اور انہیں کی زمین پر ان سے دوچار ہونے کا دم بھرتی ہیں۔ ہم جانتی ہیں کہ مرد کی آنکھوں میں جادو ہوتا ہے اور وہ ایک نظر میں عورت کا دل موہ لیتا ہے۔ مرد لاکھ جادو جگائے مگر مجھے یقین ہے کہ اس انجمن کی کسی ممبر پر اس کا اثر نہ ہوگا۔

آوازیں۔ ضرور۔ ضرور۔

صدر۔ بہنو! ہمارا سفر ابھی ختم نہیں ہوا ابھی مرد کو یہ بتانا ہے کہ دنیا کو مرد کے وجود کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ ایک عضو بیکار۔ ایک کھلونا ہے ٹوٹا ہوا۔ ایک چیز ہے فالتو دنیا کو اس کی ضرورت نہیں اور ہم اس سے شادی کرنے کے خیال تک کو اپنی خودداری کا ننگ خیال کرتی ہیں۔ بہنو! مجھے امید ہے کہ میں نے جو کچھ کہا وہی آپ کا خیال ہے۔

آوازیں۔ بیشک۔ بیشک۔

صدر۔ میں آپ کو ایک خطرہ سے آگاہ کرنا چاہتی ہوں اور وہ غداری ہے اللہ نہ کرے ہم سے کوئی غداری کرے اور مرد کے سامنے جھکے مگر پھر بھی وقت پر سپاہیوں کو ہوشیار کر دینا سپہ سالار کا فرض ہے غداری مرد کیا کرتے ہیں۔ مذہب۔ حکومت وطن سب کو مرد کی غداری کا شکوہ ہے۔ عورت کی وفاداری تو ستی کی چتا سے مرد سے ان کی وفاداری کا ثبوت مانگتی رہی مگر آج تک کسی مرد نے اس میدان میں اترنے کا دم نہ بھرا۔ ہمارے ارادوں میں دن رات نئی طاقت پیدا ہو رہی ہے اور ہمارا ہر قدم ترقی کے راستے پر پڑ رہا ہے۔ مرد کہتا ہے کہ عورت کے ارادے کو قرار نہیں ہوتا گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ۔ مگر ہم نے کرکے دکھا دیا کہ جو ہم کہتی ہیں کرکے دکھاتی ہیں دیکھ لیجئے آج تک ہمارے ممبروں سے کوئی بھی شادی پر آمادہ نہیں ہوئی۔ آج مجھے یہ کہنے کا فخر ہے کہ ہم یہ جنگ رہتی دنیا تک لڑے جائنگی اور اس وقت تک دم نہ لیں گی جب تک مرد اپنی آل [illegible] ہمارے حوالے نہ کر دے گا۔

آوازیں۔ ضرور۔ ضرور۔

صدر۔ شکریہ۔ اگر ہم کمزور ہوتیں تو ہماری بھی وہی گت بنتی جو باقی بہنوں کی گھروں کی ڈھابلی میں بن رہی ہے۔ ان چند الفاظ کے ساتھ میں اجلاس کی کارروائی شروع کرتی ہوں اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ اس ایک مہینے میں انجمن نے کتنی عورتوں کو شادی کے پھندے سے بچایا۔ ابھی ہمیں کس اصلاح کی ضرورت ہے اور اس جنگ میں فتح حاصل کرنے کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ اگر کسی بہن پر کمزوری غالب آئی ہو اور وہ مرد کے ساتھ میل ملاپ کرنا چاہے تو بڑی خوشی سے انجمن کے جھنڈے تلے سے نکل جائے۔ (وقفہ) اس خاموشی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہماری بہنیں بالکل محفوظ ہیں۔

آپ کی انجمن جم جم ترقی کرے مگر۔

صدر۔ ہاں ہاں مگر ہچکچانے کی کوئی بات نہیں۔ میں شوق سے سننا
چاہتی ہوں کہ اس جانے جہاں میں ہم نے مرد کو کس طرح
ذلیل کیا۔ کوئی مرد ملا اور ہم نے کس طرح اسے دھتکارا
وغیرہ وغیرہ

—— میری طرف تو کسی نے دیکھا تک نہیں۔

صدر۔ اچھا یہ بتاؤ کسی نیک مرد کی کیا علامت ہے۔

—— مرد اور نیک ان ہونی بات ہے۔

صدر۔ میرا مطلب ہے کہ ایسا وجود دوسروں سے کم موذی ہو۔
میرے نزدیک تو ایسا وہ مرد ہوتا ہے۔ جسکی چندیا پر بال نہ
ہوں۔

صدر۔ تو غور کے قابل یہ بات ہے کہ آپ اس رائے کو درست خیال
کرتی ہیں یا نہیں۔

آوازیں۔ اتفاق ہے اتفاق۔

—— میرا یہ مطلب نہیں کہ ایک بال نہ ہو۔ بال ضرور ہوں مگر
ماتھا کھلا کھلا ہو۔

صدر۔ اب یہ کہئے کیا کسی ایسی روشن پیشانی نے آپ کے دل میں
کوئی روشنی پیدا کی۔

—— ہاں۔

صدر۔ کیا کیا۔

—— یہ کہ جو بات ہو صاف کہہ دو۔

صدر۔ یہ تو اچھا اثر ہے۔

—— شکر ہے کہ آپ کو میرا کیا پسند آیا۔

صدر۔ اس کا نتیجہ۔

—— نتیجہ یہ کہ یہ رہا میرا استعفےٰ۔

صدر۔ باپ رے باپ ایکدم استعفےٰ۔ اندھیر ظلم۔ قہر سنبل خانم
آپ نے میری تمام امیدوں پر پانی پھیر دیا مجھے رنج ہے کہ آپ
جیسی کارکن الگ ہو رہی ہے۔ میرا کیا کرایا اکارت جائیگا
اب بدلنے کی تو نہیں۔

—— بالکل نہیں۔

صدر۔ تو اس کی تصویر بھی دیدو تاکہ سے قصر پریشان میں رکھا جائے

—— حاضر ہے۔

صدر۔ کوئی اور استعفےٰ اور تصویر داخل کرنا چاہیں۔

—— حاضر۔

صدر۔ یہ ہوئے دو۔

—— حاضر۔

صدر۔ تین۔

—— حاضر۔

صدر۔ چار۔

—— حاضر۔

صدر۔ پانچ۔

—— حاضر۔

صدر۔ چھ۔ جملہ چھ استعفے اور تصویریں داخل ہوئیں۔

آوازیں۔ ہم جائیں۔

صدر۔ ذرا ٹھیریئے آج کا دن اس انجمن کی تاریخ میں یادگار رہیگا
آج اس انجمن کو فتح بھی ہوئی اور شکست بھی۔ مجھے افسوس ہے
کہ ہماری چھ بہنیں نگوڑے مردوے کے جال میں پھنس گئیں۔ مگر
بہنو! مجھے یقین ہے کہ ابھی ابھی آپ کی رائے بدلجائے گی نہ صرف
آپ استعفے واپس لے لیں گی بلکہ اس انجمن کے ساتھ آپ کی عقیدت
پہلے سے بھی بڑھ جائے گی۔ آپ ایک حیرت۔ ایک اچنبے اور ایک
تعجب کے لئے تیار ہو جائیں۔

بہنو! مجھے افسوس ہے کہ آپ کے بہت سے خیالی قلعے
گھروندے کی طرح ڈھے جائیں گے۔ مگر کوئی ڈاکٹر اس لئے اپریشن سے
گریز نہیں کر سکتا کہ مریض کو نشتر لگانے سے درد ہوگا۔

بہنو! یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اب سے دور آپ ایک
مکروہ سازش کا شکار ہوتی ہیں۔ نگوڑا مرد میری نظروں میں پہلے سے
بھی زیادہ ذلیل ہو گیا۔

بہنو! میں آپ کو زیادہ انتظار میں رکھنا نہیں چاہتی۔

سنئے آپ پر کیا بیتی آج استعیفوں کے ساتھ چھ تصویریں پیش ہوئیں اور آپ یہ سنکر سراپا حیرت بن جائیں گی کہ یہ چھ کی چھ تصویریں ایک ہی شخص کی ہیں۔

آوازیں - ہرگز نہیں ہوسکتیں۔ غلطی ہو رہی ہے۔ سراسر دھوکا ہے۔ فریب ہے۔

صدر - بہنو! اس میں کسی سہو یا خطا کی کوئی گنجائش نہیں یہ رہیں تصویریں دیکھ لو اپنی تسلی کر لو۔

تو میری جوتی سے مجھے اس کی کون پروا ہے۔

چھی چھی مجھے تو اس کی شکل سے نفرت تھی۔

قربان جاؤں اپنے اللہ کے ہاتھ دے کر بچا لیا۔

میرا تو اسی وقت ماتھا ٹھنکا تھا۔

میں اس مونڈی کاٹے کو پہلی ہی نظر میں بھانپ گئی تھی۔

صدر - بہنو! اور سنو مجھے اس شخص کی طرف سے ایک چٹھی ملی ہے سنئے آپ کیا سمجھتے ہیں:-

"محترمہ - میں ایک پیشہ ور ظریف ہوں میری زندگی کا مقصد صرف مذاق کرنا ہے میں نے آپ کی انجمن کا ذکر سنا کہ آپ اس بات کے درپے ہیں کہ مردوں کو ملیامیٹ کر دیا جائے۔ میں نے کہا ذرا آپ لوگوں سے بھی دل لگی ہو جائے اور آپ کو محسوس ہو کہ مرد عورت کیلئے سرمایۂ برکت ہے۔ میں نے یہ کام پورا کر دیا۔ اُمید ہے کہ آپ اس جدت کی داد دیں گی۔ الراقم جگنو میاں"

میرا بس چلے تو کچا چبا جاؤں نگوڑے کو۔ موئے کی تکے بوٹیاں کر کے چیل کوؤں کو ڈال دوں۔

علمبردار کا علم ٹوٹے ... میرا سہیر۔

جیسا ہم سے سلوک کیا اپنی ماں بہن سے پائے۔

اے شاہ مدار زندگی اجیرن کر دے اس فریبی کی۔

اے لال پری ایسا سانپ ڈسے پانی بھی نہ مانگنے پائے۔

....

صدر - بہنو! ذرا خاموش اس چٹھی کے سلسلہ میں ابھی مجھے ایک تار ملا ہے وہ بھی سن لیجئے اس میں جگنو میاں ایک تجویز پیش کرتے ہیں اور مجھے امید ہے کہ آپ کسی حالت میں بھی منظور نہ کرینگی۔

فرماتے ہیں:-

"مجھے افسوس ہے کہ مذاق حد سے بڑھ گیا میں ان چھ عورتوں میں سے ایک کو شرف نکاح عطا کرنے کو تیار ہوں۔ بیشک دو کو سرفراز کرتا مگر آجکل اسے اچھا خیال نہیں کیا جاتا۔ جگنو میاں"۔

میں تو پہلے ہی جانتی تھی کہ وہ مجھے ہی چاہتے ہیں۔

حیران تھی کہ ہو کیا رہا ہے آخر۔ اب معلوم ہوا کہ ان عورتوں کو بنا رہے تھے۔ بڑے شریر واقع ہوئے ہیں۔

میں مزے سے بیٹھی تماشا دیکھ رہی تھی۔ ان کا دل تو میری مٹھی میں بند تھا۔ آخر جاتے تو جاتے کہاں۔

آوازیں - میں تیار ہوں۔ میں حاضر ہوں۔

صدر - مجھے یہ دیکھ کر صدمہ ہوا کہ تم نے اس تجویز کو پسند کیا۔

آوازیں - آنکھوں سے دل سے سوق سے۔

صدر - میری بدبخت بہنو! یہ تو ظاہر ہے کہ آپ سب کی شادی جگنو میاں سے نہیں ہو سکتی

آوازیں - بیشک بیشک۔

صدر - اور آپ یہ فیصلہ نہیں کر سکتیں کہ کس کے دامن میں یہ سعادت ڈالی جائے۔

آوازیں - درست۔ درست۔

صدر - اور باوجود میرے منع کرنے کے آپ اسے قبول کرنے پر تُلی ہیں۔

آوازیں - ضرور۔ ضرور۔

صدر - اب آپس میں اس بات کا بنٹ جانا تو ہو گیا ناممکن۔ اس پر پھوٹ پڑ جانیکا دھڑکا لگا ہے اس لئے یہ فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے کہ اس انتخاب کا بار میں اپنے سر پر لوں اور کسی ایک کو اس مہم کیلئے نامزد کر دوں فرمائیے آپ کو منظور ہے۔

آوازیں - ضرور ضرور۔

صدر - تو بہنو! یہ بھر نا صرف اسطرح بھر سکتا ہے کہ اس قربانی کیلئے میں تیار ہوں اور اس نگوڑے مردوے سے آپ شادی کر کے آپ کو۔

جوزیفائن کی طلاق

تاریخ نپولین کا ایک المناک ورق

از پروفیسر عشرت رحمانی صاحب

جوزیفائن کی طلاق کا مسئلہ حیات نپولین میں کچھ کم انقلاب انگیز حادثہ نہیں ہے۔ نپولین جیسے مستقل مزاج اور مطمئن انسان نے اس موقعہ پر صبر و ضبط کھو دیا۔ وہ جس نے اسیری کے المناک ایام اطمینان و صبر سے بسر کئے جو مرتے دم تک پریشان و سراسیمہ نہ ہوا۔ وہی نپولین اس دوران میں اکثر مرتبہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ بچوں کی طرح بیتاب و مضطر رہا کیونکہ اس کو جوزیفائن سے سچی محبت تھی اور جوزیفائن بھی اس پر دم دیتی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس محبت و شیفتگی کے باوجود طلاق کا مسئلہ کیوں درپیش ہوا؟۔

خاص سبب یہ تھا کہ وہ صرف اپنی عزیز رعایا اور وطن کے حقوق کی حمایت میں اس سے زیادہ تکلیف دہ حادثات اپنی ذات کے لئے برداشت کر سکتا تھا اور کسی خوف دہر اس کو سامنے نہ آنے دیتا۔

جوزیفائن کے پہلے شوہر سے صرف ایک لڑکا یوجین اور ایک لڑکی ہورٹنس تھے۔ لیکن جب سے نپولین کے ساتھ اس کی شادی ہوئی تھی اس کے بطن سے بقول شخصے ایک چوہے کا بچہ بھی پیدا نہ ہوا۔

جوزیفائن کی اولاد نپولین کی جانشین قرار نہیں پا سکتی تھی اس لئے مدت مدید تک انتظار کرنے کے بعد رعایا نے فیصلہ کر لیا کہ شہنشاہ نپولین اعظم لاولدی کا داغ مٹانے کے لئے دوسری شادی کرے تاکہ تخت کا جائز وارث پیدا ہو سکے۔ ورنہ موجودہ حالت میں تخت و ملک خطرہ میں ہے جب تک شہنشاہ کا جانشین موجود نہیں اور یہ اسی وقت ممکن تھا جبکہ نپولین جوزیفائن سے قطع تعلق کر لے۔

نپولین کے لئے یہ مطالبہ بہت ہی سخت تھا۔ لیکن حب الوطنی کا جذبہ اس کے دل میں کارفرما تھا اور اپنے عزیز ملک و رعایا کے مطالبات سے بھی اس کو اس قدر عشق تھا کہ ایک عورت کی محبت اس کے مقابلے کے لئے کوئی حقیقت نہیں رکھتی تھی۔

چنانچہ رعایا کے اصرار سے مجبور ہو کر ہر ممکن کوشش بچاؤ کی رائگاں جانے کے بعد نپولین نے فیصلہ کر لیا کہ جو کچھ بھی ہو جوزیفائن کو طلاق دی جائیگی اور دوسری شادی کرے گا۔

ایک روز اُس نے دل پر جبر کر کے بڑی مشکل سے ماہ نومبر ۱۸۰۹ء کی شب میں کھانے کے دوران میں جوزیفائن کو اپنے اس قاتلانہ ارادے سے مطلع کر دیا۔ اور اپنی بریت کے تمام پہلو اس کے سامنے ظاہر کر دیئے کہ وہ ہر طرح معذور ہے ورنہ اس مصیبت سے دوچار ہونے کے لئے آمادہ نہیں۔ اس نے کہا کہ میں جانتا ہوں کہ جوزیفائن کی جدائی کے بعد میری زندگی عذاب ہو جائے گی لیکن سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہیں۔ رعایا و ملک و وطن کے مفاد کے لئے ہر قربانی جائز تصور کر لینا چاہئے اور یہی باعث ہے کہ میں اس رنجدہ ارادہ کی تکمیل کے لئے تیار ہوا ہوں"

جوزیفائن اگرچہ پیشتر سے رعایا اور نپولین کی گفتگو سے وقتاً فوقتاً واقف ہوتی رہتی تھی لیکن اس طرح نپولین کی زبان سے صاف صاف الفاظ میں طلاق کی اطلاع پانے کی متوقع نہ تھی۔

نپولین کی یہ دلخراش تقریر وہ ہرگز برداشت نہ کر سکتی تھی۔ خاموشی سے اس نے سب کچھ سنا لیکن یارائے ضبط کھو دیا۔ بے اختیار غش طاری ہو گیا اور زمین پر آ رہی۔ نپولین یہ حالت دیکھ کر گھبرایا۔ اس نے فوراً آواز

دی کوئی حاضر ہے ؟" تاکہ کسی کی مدد سے جوزیفائن کو سنبھال کر دوسرے کمرے میں پہونچائے۔ نپولین کی آواز کے ساتھ "کونٹ دی مانٹ" حاضر ہوا۔ اور اس کے ساتھ نپولین نے اپنی محبوب بیوی کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا۔ اور معتبر ملازم اس کی بیٹی ہورٹنس کے ساتھ اس کی خدمت پر مقرر کئے۔ خود باہر چلا گیا کیونکہ وہ زیادہ عرصہ تک اس حالت کو نہیں برداشت کر سکتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد نپولین اپنی محبوبہ کی مزاج پرسی کے لئے آیا۔ ہورٹنس سے بہت کچھ تسلی آمیز گفتگو کرتا رہا لیکن اس نے جو اپنی ماں کی اس مصیبت اور بےعزتی پر دیوانی ہو رہی تھی نہایت رکھائی سے ہر بات کا جواب دیا۔ اور آخر میں صاف طور پر کہدیا۔ کہ "حضور عالی! میں اور میری غریب ماں ہر حکم کی تعمیل بخوشی کریں گے اور اس بےعزتی کو برداشت کر کے یہاں سے نکل جائیں گے"۔ نپولین کا دل اس تقریر سے پاش پاش ہو گیا۔ وہ اپنی مجبوری اور محبوب جوزیفائن کی جدائی کے خیال پر دیر تک روتا رہا اور چلا گیا۔

چند روز میں جوزیفائن کا بیٹا یوجین (جو نپولین کے حکم سے اٹلی میں تعینات تھا اس دہشتناک خبر کو پا کر آ گیا اور اپنی ماں اور بہن کی دلجوئی کرتا رہا کہ وہ اس مصیبت میں زیادہ رنج و غم نہ کریں۔ اس کو خود بھی اس غیر متوقع آفت کے نازل ہو جانے پر اور خصوصاً اپنی ماں کے غم پر بہت زیادہ رنج تھا۔ نپولین نے اس سے اپنی مجبوری کا اظہار کر کے ظاہر کیا کہ وہ جس طرح اب تک اس کے پاس رہتا تھا رہے گا۔ اور ہمیشہ امور سلطنت میں شریک رہے گا کیونکہ یہ جدائی ظاہری اور معمولی ہے۔ ہورٹنس اپنی ماں کی دلجوئی کے لئے جوزیفائن کے ہمراہ رہے گی۔ اور وہ حسب معمول اپنے کام میں مشغول رہے۔ مگر یوجین نے اس سے بیزاری ظاہر کی اور کہا کہ "وہ اپنی ماں کی اس بےعزتی کے بعد اس طرح ہرگز یہاں نہیں رہ سکتا۔ یہ تذلیل کسی کو گوارہ نہیں وہ اور ہورٹنس دونوں اپنی غریب ماں کے ساتھ رہینگے"۔

نپولین نے بار بار اپنی مجبوری کا اظہار کیا اور کہا کہ "آئندہ ہونے والے ولیعہد سلطنت کی پرورش و نگہداشت تم ہی کر سکوگے۔ تمہاری نگرانی میں وہ امور سلطنت سے بخوبی واقف ہو جائے گا۔ بادشاہ ہونے تک تمہاری ہدایات کی اس کو ضرورت ہوگی۔ تم ہی میرے قوت بازو ہو۔ میرے بعد بعد بھی تم اس کی نگرانی کروگے"۔

جوزیفائن کی اولوالعزمی کی مثال جو اس نے اس موقع پر قائم کی ملنا مشکل ہے۔ اس مصیبت کے دوران میں بھی اس نے نپولین کے خلاف ایک لفظ زبان سے نہ نکالا اور یوجین کو ہدایت کی کہ "وہ نپولین کی خواہش کے مطابق بدستور یہیں رہے اس کے ہر حکم کی تعمیل کرے کیونکہ وہ ہم سب کا محسن ہے"۔

نپولین نے جوزیفائن کی محبت کا ثبوت اس طرح دیا کہ طلاق کے اعلان کے ساتھ فیصلہ کر لیا کہ جوزیفائن کی طلاق کے بعد بھی وہ اسی عزت و احترام کے ساتھ رہے۔ اس کی تضحیک کا معمولی شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے وہ ایک عالیشان محل میں علیحدہ رہے گی جہاں تمام سامان شاہانہ ہونگے، اور تیس لاکھ فرانک سالانہ اس کے مصارف کے لئے پیش کئے جاتے ہیں"۔ لیکن جوزیفائن نہ اس تزک شاہانہ کی طالب تھی اور نہ جائداد و املاک کی وہ صرف نپولین کو چاہتی تھی جس کی جدائی کے بعد دنیا اس کی نگاہ میں ہیچ تھی اور طلاق کے بعد بھی عمر بھر وہ اسی کا دم بھرتی رہی۔ اسی کی تھی اور اسی کی ہو کر رہی مرتے دم تک نپولین کے فراق میں مضطر و بیقرار رہی اور آخر اسی صدمہ میں گھل گھل کر جان دی۔

۱۵ دسمبر ۱۸۰۹ء کو اس جانکاہ واقعہ کی تکمیل کا دن تھا یعنی طلاق نامہ پر دستخط ہونے والے تھے۔ ٹوئی لیر کے وسیع کمرے میں سلطنت کے اکابرین جمع ہوئے جو سب کے سب مغموم و رنجیدہ تھے۔ نپولین اور جوزیفائن کی حالت ناگفتہ بہ تھی جوزیفائن پیہم گریہ و زاری سے بحد نحیف و نزار ہو رہی تھی۔ یہی حال نپولین کا تھا روتے روتے اس کی آنکھیں سرخ ہو گئی تھیں لیکن اس وقت دونوں صبر و ضبط سے کام لے کر حالت کو سنبھالے ہوئے تھے تاکہ حاضرین پر کسی قسم کی بیقراری کا اظہار نہ ہونے پائے۔

نپولین نے کمال جرأت سے اپنی اور جوزیفائن کی جبریہ جدائی پر ایک دردناک تقریر کی۔ اس کے بعد مصیبت زدہ جوزیفائن نے طلاقنامہ ہاتھ میں اٹھایا کہ دستخط کرے لیکن فرط الم سے بیتاب تھی۔ کاغذ ہاتھ سے گر گیا اور ہچکی بندھ گئی۔ آخر رومال سے منہ چھپا کر روتی ہوئی نیم جان ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ اور "مانشلوا رے نادے" نے اس کی جانب سے اعلان پڑھا جس میں طلاق کے متعلق لکھا تھا کہ "میرے محبوب شوہر شہنشاہ نپولین اعظم نے ملک فرانس کی بہبودی پر نظر رکھ کر جو جدائی کا حکم دیا ہے مجھے بدل و جان منظور ہے اور ملک و رعایا کی آئندہ سود و بہبود کے لئے دست بدعا ہوں۔ میں ہمیشہ

فرانس اور نپولین اعظم اور اس کی عزیز رعایا کی خیر طلب وبہی خواہ رہونگی"۔

اس کے بعد وہ بیہوشی کے عالم میں ہورٹنس اور یوجین کے سہارے ایک کمرے میں پہونچا دی گئی۔ نپولین پریشان وبیتاب اپنے کمرے میں چلا گیا تمام حاضرین اظہار افسوس کرتے ہوئے اٹھ گئے۔ فرانس کی رعایا گو طلاق کے لئے مصر تھی لیکن جوزیفائن کی محبت اور وقعت ان کے دلوں میں بدستور تھی اور آخر دم تک کم نہ ہوئی۔

دوسرے روز سینیٹ کا بڑا جلسہ منعقد ہوا جو طلاقنامہ کے تکملہ کیلئے تھا اس میں یوجین صدر تھا تمام اراکین سلطنت حاضر تھے۔ مجمع کثیر پر خاموشی کا تسلط تھا۔ جوزیفائن سفید لباس میں ملبوس ہورٹنس کا سہارا لئے ہال میں داخل ہوئی اور ایک مخصوص کرسی پر بٹھا دی گئی وہ غم اور بیکسی کا مجسمہ بنی ہوئی تھی لیکن نہایت صبر وضبط سے کام لے کر خاموش تھی۔

نپولین بھی مایوس ومغموم ساکت بیٹھا تھا یوجین نے کھڑے ہو کر بحیثیت صدر تقریر کی کہ "شہنشاہ نپولین اعظم اور میرے ماں کے تعلقات کی علیحدگی کا سبب فرانس کی بہبودی کا خیال ہے۔ رعایا کی خواہش کے مطابق یہ کارروائی عمل میں آئی ہے جس کے لئے ہم نہایت خوشی سے دعا کرتے ہیں کہ یہ آرزو پوری ہو اور ملک وطن کی بہبودی کے سامان حسب خواہش جلد پیدا ہوں۔ میری ماں کی عزت جو شہنشاہ نے فرمائی ہے اس کے شکریہ کیلئے الفاظ نہیں مل سکتے ہم اپنے محسن شہنشاہ کی بخشش وعنایات کو ہمیشہ یاد رکھیں گے مجھے اس امر کے اظہار میں اطمینان ومسرت ہے کہ یہ کارروائی نہایت احترام کے ساتھ عمل میں آئی ہے۔ اس سے زیادہ عزت کیا ہو سکتی ہے کہ خود شہنشاہ نپولین رو رہا ہے اور ہر رکن سلطنت مغموم ہے"۔

اس وقت تمام حاضرین اور نپولین اعظم کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے آخرکار سونے کا قلمدان رکھا گیا۔ اور بمشکل غم ویاس کی کشمکش کے بعد جوزیفائن نے طلاقنامہ پر دستخط کر دیئے حلف کا اعلان کیا گیا اور وہ بیہوش ہو کر گر پڑی۔ یوجین اور ہورٹنس بھی دونوں روتے روتے بیہوش ہو گئے۔ نپولین بدحواس واشکبار تھا اس محشرستان غم میں سانحہ ہوشربا کی تکمیل ہو گئی۔

اس حسرتناک سین کا ڈراپ ہو چکا تھا لیکن نپولین اور جوزیفائن کے دلوں سے اس کے نقش ان کی زندگی کی آخری ساعتوں میں بھی محو نہ ہوئے۔

مری ہستی

از نثار الملک میر آحدی اجمیری

مری ہستی کا جلوہ بزم عالم میں نمایاں ہے
مری قربانیوں پر ہر ہلال عید قرباں ہے

جو اپنی زندگی کو موت سے تعبیر کرتے ہیں
انھیں مرنے کی خواہش ہے مجھے جینے کا ارماں ہے

بشر کے واسطے یاس و توہم موت ہیں دونوں
نہ اس کا کچھ مداوا ہے نہ اس کا کوئی درماں ہے

ارادے جن کے پختہ ہیں انھیں کس بات کی مشکل
جنھیں محنت کا چسکا ہے انھیں ہر بات آساں ہے

مجھے اے سیر کیوں ہو مال اور اسباب کی خواہش
مری قسمت میں بے برگ وسامانی ہی ساماں ہے

چار غزلیں

از:-

(حضرت سائل دہلوی۔ حضرت ریاض خیرآبادی۔ حضرت اعجاز لکھنوی۔ حضرت ولایت گورکھپوری)

حضرت سائل دہلوی

نہ کیوں ہو دید کے قابل بھلا تعمیر میخانہ ۔۔۔ کہ اک اک خشت میخانے پہ ہے تصویر میخانہ
زباں سے میری گر سن لے کوئی تفسیر میخانہ ۔۔۔ تو پھر جائے نظر کے سامنے تصویر میخانہ
ہوئی ہے شیخ سے کتنی بڑی تقصیر میخانہ ۔۔۔ کہ مے خانے میں آکر اس نے کی تحقیر میخانہ
ہوائے خانۂ خمار گر اسکو نہیں لگتی ۔۔۔ یہ نقص قسمت زاہد ہے یا تقصیر میخانہ
نہیں معلوم کن کن مسئلوں پر بحث ہونی ہو ۔۔۔ ملے گا آج پیر خانقاہ سے پیر میخانہ
تہجد کو وضو کے واسطے کیا شیخ آتا ہے ۔۔۔ ہلا کرتی ہے کیوں پچھلے پہر زنجیر میخانہ

عجب کیا ہے اگر سائل بھی دونوں وقت پیتا ہے
اسے کیوں چھوڑ دیتی خیر عالمگیر میخانہ

حضرت ریاض خیرآبادی

سلامت میکدہ یارب سلامت پیر میخانہ ۔۔۔ حرم میں بھی مری آنکھوں میں ہے تصویر میخانہ
تجھے جانا بھی جنت میں ہے او واعظ جواں ہوکر ۔۔۔ جو آیا ہی تو دیکھے جا ذرا تاثیر میخانہ
رہ دیر و حرم بھولا جو کوئی وہ یہاں پہنچا ۔۔۔ نہ بھولا راستے میں کوئی بھی رہ گیر میخانہ
فرشتے اسکی چشم فیض سے انسان بنتے ہیں ۔۔۔ بلاتا ہے کچھ ایسی دور ہی سے پیر میخانہ
کہیں ہم کیا ہمارا میکدہ وابستہ ہے کس سے ۔۔۔ ملی ہے عرش کی زنجیر سے زنجیر میخانہ
لگاتے اپنی پیشانی میں سجدے کے بہانے سے ۔۔۔ یہی خاک در میخانہ ہے اکسیر میخانہ

ریاض اس میکدے میں بھی شرف ہے کچھ سیادت کو
نہیں ہم پیر میخانہ مگر ہیں میر میخانہ

حضرت اعجاز لکھنوی

اٹھیں گے حشر کے دن یوں مرید پیر میخانہ ۔۔۔ بغل میں شیشۂ مے ہاتھ میں تصویر میخانہ
مصور یا کوئی معجز نما ہے پیر میخانہ ۔۔۔ گری جو بوند ساغر سے بنی تصویر میخانہ
اشارہ پاکے اس کا رند مے سے کھنچتے جاتے ہیں ۔۔۔ پلٹ دیگی وہ چشم مست کیا تقدیر میخانہ
چلوائے میکشو تھوڑی سی پی لگنے کو ہی آئیں ۔۔۔ کریگا ختم کیا واعظ ابھی تحقیر میخانہ
وہ میکش ہیں سحر ساقی جو آنے سے ہمیں روکے ۔۔۔ نسیم صبح اٹھ کر کھول دے زنجیر میخانہ
طلوع مہر کا شک ہو رہا ہے ساغر مے پر ۔۔۔ بہت چمکی ہوئی ہے آجکل تقدیر میخانہ

پڑا جب عکس زلف ساقی مخمور ساغر میں
مسلسل موج بادہ بن گئی زنجیر میخانہ

حضرت ولایت گورکھپوری

ہمیشہ ناصح ناداں نے کی تحقیر میخانہ ۔۔۔ مگر عالم میں بڑھتی ہی گئی توقیر میخانہ
ہیں ان بادہ کشوں میں ہوں ترے اے پیر میخانہ ۔۔۔ جو رکھکر پوجتے ہیں سامنے تصویر میخانہ
بھرا کیا ہے تری آنکھوں میں آخر پیر میخانہ ۔۔۔ کوئی کہتا ہے جادو ہے کوئی تاثیر میخانہ
وہ میکش ہوں کہ میں اپنے لئے اکسیر سمجھونگا ۔۔۔ اٹھا کر خاک میخانہ جو دیدے پیر میخانہ
کبھی شیخ حرم سے اسکی میں تعبیر پوچھونگا ۔۔۔ کہ آتی ہے نظر کیوں خواب میں تصویر میخانہ
تب قدر آج ہے آتے رہیں گے صبح تک میکش ۔۔۔ کھلی رہنے دے ساقی رات بھر زنجیر میخانہ

یہ میخانے میں جانے کی ولایت شرط اول ہے
قدم رکھنا تو پہلے چوم کر زنجیر میخانہ

سنسکرت شاعری میں محبت کا عنصر

از:-
(جناب علی احمد صاحب علیؔ - فرزند حضرت جلیلؔ مدظلہ)

جب ہم سنسکرت کے دور میں قدم رکھتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اس کی بنیاد ہی "محبت" پر قائم ہے اور بالخصوص نظموں میں "محبت کا عنصر" اپنے انتہائی کمال کو پہونچ چکا ہے۔ پتنجلی کی مہابھاشا جو کہ دوسری صدی عیسوی کے دور کی بتائی جاتی ہے۔ اس میں بہت سے قصوں کا حوالہ دیا گیا ہے۔ مثلاً یاوکریت۔ پری یانگو۔ بیاتی۔ وسودت بیمنتار اور بھیمردہ وغیرہ۔ ہم کو ان قصوں کے مفصل حالات سے کوئی سروکار نہیں۔ البتہ وسودت کا پورا قصہ عشق و محبت کی چاشنی لئے ہوئے ہے۔ اس میں اکثر جگہ پتنجلی نے بہترین ترنم آمیز اشعار بھی درج کئے ہیں۔ ایک موقع پر صبح کا سماں یوں کھینچا ہے۔

"اے صبح کی خوبصورت دیوی۔ تاریکی سے نکل۔
اپنے محبوب کی گردن سے باہیں ڈھیلی کر دیکھ مرغ
بانگ دینے لگے اور چراغ یعنی اختران سحری ٹمٹمانے
لگے"۔

اکثر سنسکرت مصنفوں سے یہ روایت ہے کہ دور قدیم میں پنی نی نامی ایک شاعر گذرا ہے جس کی دو نظمیں پٹال وجے اور جامبووتی شہرت دوام حاصل رکھتی ہیں۔ ایک نظم میں اس نے شام کو ان لفظوں میں بیان کیا ہے۔

"ملکہ شب ضیا باری کرتی ہوئی شام کی سرحد میں داخل
ہو چکی ہے اور نیلگوں آسمان پر اپنی حسین ہمجولیوں
(ستارے) کی منتظر ہے جو اپنے رُخ سے صبح کی نقاب
اُلٹ کر آنے ہی کو ہیں اس کو محویت انتظار میں اس کی
بھی خبر نہیں کہ اس کے ساتھ جو شمع تاریک افروز تھیں
اس نے سمت مشرق کو بالکل تاریک کر دیا ہے اور اس
(ملکہ) کی اس بیباکانہ حرکت سے شبہ شرق کا چہرہ
مارے غصہ کے لال ہو گیا ہے"۔

اسوگھوسا جو سنسکرت کے دور اولیں سے تعلق رکھتا ہے اس کی دو مشہور تصانیف سنٹرل ایشیا میں پائی گئیں۔ ایک تو ڈراما ہے اور دوسری ایک نظم ہے جس میں محبت کے فلسفہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نند اور سندری کی حسن و عشق سے بھری ہوئی مثنویاں بھی خاص اہمیت رکھتی ہیں لیکن اسوگھوسا کی نظم مسلسل کا پیرایۂ بیان حد درجہ دلچسپ ہے۔ یہ سنسکرت کا مشہور مصنف بھی وہی پرانی داستان دُہراتا ہے اور عورت کو دنیا کی تمام برائیوں کا مرکز بناتا ہے۔

"تند مزاج اور پُر جوش عورت خطرہ کا سبب بنتی ہے
اور ایسی عورت جسمیں جذبہ ہی نہ ہو وہ بھی بالعموم
خطرناک ثابت ہوتی ہے۔ پس جبکہ ہر دو صورتوں میں
"عورت" موجب اضطرار و پریشانی ہے لوگ کیوں
اس سے گریز نہیں کرتے"۔

"عورت کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ نہایت شیریں
معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن اس کے دل میں زہر بھرا
ہوا ہوتا ہے"۔

اوائل سنہ عیسوی کے اکثر سنسکرت کے منظوم کتبے جو ہمیں ملے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سنسکرت کے شعراء شاہی درباروں میں باریاب تھے۔ اس سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ سنسکرت کی پرورش شرفا اور عالی طبقہ کے لوگوں میں ہوئی ہے اور سنسکرت کی

ابتدائی نظموں" کو ہم دیکھتے ہیں کہ شروع ہی سے ان میں دلفریبی و دلکشی پیدا ہو گئی تھی جو پڑھنے والے کو اپنا گرویدہ کر لیتی تھیں۔

اس سے پہلے جو بیان کیا گیا اس سے یہ مراد نہ لینا چاہئے کہ چونکہ سنسکرت کے شعراء دربار شاہی میں باریاب تھے۔ اس لئے اس کو بہت جلد ترقی ہوئی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ابتدائی تصنیفات جن میں محبت کی کافی چاشنی تھی۔ مقبول عام ہوئیں اور بہت جلد لوگوں کے دلوں پر اپنا قبضہ جما لیا۔ عام طور پر سوائے "میگھ ورت" "گیتا گووند" چند تصنیفات سنسکرت کی تمام عشقیہ نظموں میں کسی قسم کا تسلسل نہیں پایا جاتا اور نہ ان میں ردیف و قافیہ کی کہیں پابندی نظر آتی ہے۔ بلکہ ہر جملہ اپنے مطلب کا آپ حامل ہوتا ہے۔ ہم کو سنسکرت کے ابتدائی دور کا بہا دلچسپ ذخیرہ جو حاصل ہوتا ہے وہ سات سو شعروں پر مشتمل ہے اور ان کو مشہور شاعر ہالا ستا معوان سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ تو ممکن نہیں کہ ان تمام اشعار کا مفصل تذکرہ کیا جا سکے البتہ ہم بعض دلچسپ اشعار کا اقتباس درج کرتے ہیں۔ جدائی کی تکالیف کو کن پر درد الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"وہ غریب لڑکی اس قدر روئی جتنا کہ وہ رو سکتی تھی اس نے اپنے جسم کو اس قدر نحیف و زار کر لیا جتنا کہ وہ کر سکتی تھی اور اس وقت تک سرد آہیں بھرتی رہی جبتک کہ اس کی سانس چلتی رہی"

"اس دنیائے فانی میں "محبت" دھوکے اور مکاری کا نام ہے اس لئے کہ جس نے محبت کی وہ ہمیشہ مصائب آلام میں مبتلا رہا اور جب تک زندہ رہا انتظار کی کٹھن گھڑیاں کاٹتا رہا"

"آج صرف ایک دن کے لئے میرے محبوب! مجھ کو روتا چھوڑ کر نہ جا اور کل جب تو جائے گا تو میں تجھ سے وعدہ کرتی ہوں کہ ایک آنسو بھی نہ بہاؤں گی اگر میں زندہ رہی"

"یہ عورتوں کی خطا ہے کہ جب ان کے شوہر پردیس میں ہوتے ہیں تو وہ بہت کمزور دل ہو جاتی ہیں اور انکی جدائی کا اس قدر اثر لیتی ہیں کہ بعض اوقات جان پر بن آتی ہے"

"وہ عورتیں کس قدر خوش نصیب ہیں جنکو خواب میں دیدار محبوب نصیب ہوتا ہے اس لئے کہ جدائی کے بے پایاں صدموں سے جب نیند ہی نہیں آتی تو خواب کا کیا ذکر۔"

فرقت کے دشوار لمحوں میں ایک خیالی عاشق اپنے دل کو یوں تسکین دیتا ہے ——

"اس کا خوبصورت جاذب نظر چہرہ ابتک میری آنکھوں میں پھر رہا ہے اور میرا جسم اس کو محسوس کرتا ہے۔ اس کی شیریں آواز ابتک میرے کانوں میں گونج رہی ہے۔ اور ابتک میرا دل اس کے دل سے وابستہ ہے۔ پھر میں یہ کیونکر کہہ سکتا ہوں کہ وہ مجھ سے جدا ہو گئی —"

جب محبوب اپنی محبوبہ سے جدا ہوتے وقت اس بات کی التجا کرتا ہے کہ وہ اسے فراموش نہ کرے تو وہ یوں جواب دیتی ہے —

"یاد تو اس شخص کو کیا جاتا ہے جو بھلا دیا گیا ہو۔ محبت حقیقی معنوں میں محبت نہیں ہے۔ اگر وہ اس بات کی محتاج ہو کہ اسے یاد کیا جائے۔ -"

محبت میں عہد کے پورے ہونے پر جو مسرت حقیقی حاصل ہوتی ہے اس کو کس نزاکت سے بیان کیا گیا ہے۔

"ہر آئندہ آنی گھڑی اسے خوش آئند معلوم ہوتی ہے۔ جب وہ دیکھتا ہے تو اس کی آنکھیں بادۂ عشرت سے چھلکتی نظر آتی ہیں۔ جب وہ بات کرتا ہے تو اس کی گفتگو سے گلہائے مسرت کی بو آتی ہے اور جب وہ سوچتا ہے تو اسے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آج اس نے دنیا کو فتح کر لیا ہے۔"

برخلاف اس کے وعدہ کے ایفا نہ ہونے پر محبوب یوں اپنے دل کو تسکین دیتا ہے۔

"اس کے حسین دلکش حسن کو تنہا ہی رہنے دو۔ مجھ کو اس کی ضرورت نہیں صرف اس جگہ کو جہاں وہ رہتی ہے دیکھ لینے سے مجھے لطف دیدار حاصل ہوتا ہے۔"

امارو نے اس خیال کو یوں ادا کیا ہے۔

"میں نہیں چاہتا کہ اس سے لطف ملاقات حاصل کروں بلکہ جب میں اس کے کوچے میں پھر پھر کر کھڑکیوں سے اسے دیکھنے کی لاحاصل کوشش کرتا ہوں تو میں بے حد محظوظ ہوتا ہوں۔"

یہاں یہ خیال اس دلچسپ واقعہ کی یاد دلاتا ہے جب مادھو اپنی محبوبہ مالتی کے کوچے میں گشت لگایا کرتا تھا۔ عورت کے انتہائے حسن کو کس قدر بہتر الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"اس کے حسین جسم کے جس حصہ پر نظر پڑی وہیں جم کر رہ گئی آج تک کسی نے اس سراپا حسن کو مکمل طور پر نہیں دیکھا۔"

ایک دوشیزہ جو اپنے رازِ محبت کو کسی پر ظاہر کرنا نہیں چاہتی۔ اس سے اس کی سہیلی یوں ہمکلام ہوتی ہے۔

"اگر تم اس سے محبت نہیں کرتیں تو پھر اس کا نام لینے سے تمہارا چہرہ کیوں شگفتہ ہو جاتا ہے مانند اس کنول کے جو سورج کی شعاعوں کے پڑتے ہی کھل جاتا ہے۔"

ایک دوسری نوگرفتارِ محبت اپنی سہیلی پر اعتماد کرتی ہے۔

"جب میرا محبوب آتا ہے تو میں دونوں آنکھوں سے اپنی آنکھیں بند کر لیتی ہوں گویا کہ میں اسے دیکھنا نہیں چاہتی لیکن پیاری سہیلی میرے جسم میں انتہائے مسرت سے ارتعاش کی سی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جسکو میں چھپا نہیں سکتی۔"

محبوبہ اپنے محبوب سے بدگمان ہو کر اس کو اس طرح جھڑکتی ہے

"وہ الفاظ اور ہوتے ہیں جو دل کی گہرائیوں سے نکلتے ہیں اور اثر رکھتے ہیں جاؤ۔ چلے جاؤ۔ ان جھوٹے پیمانوں سے کیا فائدہ جو صرف لبوں تک ہی محدود رہتے ہیں۔"

"ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ اس عورت کے پاس حسن بھی ہے روپیہ بھی ہے۔ اور میں بدصورت ہوں اور غریب بھی ہوں لیکن کہو کیا محبت کا یہی شیوہ ہے کہ ایک سے محبت کر کے اسے برباد کر دیا جائے۔ صرف اس لئے کہ خدا نے اسے حسین نہیں بنایا اور نہ اس کو دولت دی۔"

کس قدر نازک اور لطیف خیالات ہیں۔

"جب وہ نہا کر کھڑی ہوتی ہے اور اپنے دراز سیاہ بالوں کو شانوں پر منتشر کر دیتی ہے۔ تو ان بالوں کے آنسو جاری ہو جاتے ہیں اس خوف سے کہ اب انہیں کس کر باندھ دیا جائیگا۔"

"صحرا کی حسین دوشیزہ جب کسی پیاسے تھکے ماندہ مسافر کے پیالے چلو میں اپنے گاگر سے پانی ڈالتی ہے تو مسافر اس کے حسن سے مسحور ہو کر اس کے حسین چہرہ پر اپنی نظریں جما دیتا ہے اور اسے اس کی خبر بھی نہیں ہوتی کہ پانی اس کی انگلیوں میں سے ہوتا ہوا زمین پر گر رہا ہے"

"پھول بیچنے والی حسینہ کے حسن کو دیکھ کر منچلی طبیعت کا نوجوان آہستہ آہستہ اس کے قریب پہونچتا ہے اور اس سے پھولوں کی قیمت پوچھتا ہے۔ اگرچہ کہ وہ ان کو خریدنا نہیں چاہتا"

"کھیت کی رکھوالی کرنیوالی کسان کی خوبصورت لڑکی دم بھر کے لئے بھی اطمینان سے نہیں لیٹنے پاتی اس لئے کہ ہر راہ گیر اس سے راستہ پوچھنے کے لئے کچھ دیر ٹھہر جاتا ہے حالانکہ ہر ایک راستہ سے واقف رہتا ہے۔"

"عورت محبت کے دیوتا کے سامنے قسم کھاتی ہے کہ وہ اپنے محبوب سے نہ صرف اس دنیا میں بلکہ دوسری دنیا میں بھی محبت کرے گی۔ صرف اس شرط پر کہ جس تیر سے اس کے محبوب نے اس کے دل کو زخمی کر دیا ہے اسی تیر سے وہ بھی اس کے دل کو گھائل کر دے۔"

محبوب اپنی روٹھی ہوئی محبوبہ کے گھر جاتا ہے تو دیکھتا ہے کہ وہ چولھے کے پاس بیٹھی ہے اور اپنے غصہ کو چھپانے کی خاطر وہ چولھے کی بجھی ہوئی آگ کو پھونکنے لگی ہے۔ تو محبوب اس کو پشیمان کرنے کے لئے اس سے یہ کہتا ہے:-

"آگ کہیں تمہارے پھونکنے سے روشن نہ ہوگی بلکہ دھواں ہی رہے گا۔ اس لئے کہ آگ تمہارے منہ کی روح پرور ہوا سے اپنے دماغ کو تازہ کرتی ہوگی اور یہ سوچتی ہوگی کہ اگر میں روشن ہوگئی تو یہ عطر بیز ہوا کے جھونکے بند ہو جائیں گے۔"

"مسافر جو ہمیشہ دورانِ سفر میں کسی مکان یا آرام کا متلاشی رہتا ہے اکثر دیہات کی کنواریاں اسے اپنا مخاطب بناتی ہیں۔"

"دوپہر کے وقت جبکہ آفتاب سر پر ہوتا ہے اور سایہ تک گرمی کے خوف سے جسم کو چھوڑ کر کہیں جانا پسند نہیں کرتا۔ اس وقت اے مسافر تو میرے مکان میں کیوں پناہ نہیں لیتا۔"

"رات تاریک ہے۔ گھر خالی ہے۔ مجھے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ اے مسافر کاش اس وقت تو آجاتا اور آج کی رات میرا مہمان ہوتا۔"

امارو نے بھی عشقیہ نظموں میں شہرت دوام حاصل کی ہے انند وردھن نے اس کے خیالات کی بہت تعریف کی ہے سنسکرت کی خیالی شاعری کا بانی اسی کو خیال کیا جاتا ہے جس نے سنسکرت کی شاعری میں ایک انقلاب پیدا کر دیا اپنی ایک نظم میں وہ محبت کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ محبت میں تمام غذاؤں سے زیادہ طاقت ہے۔ خوبصورت مگدہ کی داستان کی تصویر بہتر سنسکرت کے شعراء نے کھینچی ہے لیکن امارو نے جس حسن و خوبی سے واقعات قلمبند کئے ہیں وہ کسی دوسرے شاعر کو نصیب نہیں۔

"جب اس کی سہیلیوں نے مگدھ کو یہ سکھانا چاہا کہ وہ ابھی بہت بھول ہے اور اس کو اپنے محبوب پر کافی اثر رکھنا چاہئے اور ہمیشہ اس سے ایسا سلوک کرنا چاہئے کہ وہ خوشامد کرنے پر مجبور ہو جائے۔ یہ سن کر اس مجسم ناز نے معصومانہ انداز سے یہ جواب دیا۔ پیاری سہیلیو ذرا آہستہ گفتگو کرو۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ میرے دل کا مالک جو ہمیشہ دل ہی میں رہتا ہے ان باتوں کو سن لے۔"

عروس نو کی کیا خوب تصویر کھینچی ہے۔

"جب اس کا شوہر اس کے لباس کو ہاتھ لگاتا ہے تو وہ شرم سے گردن جھکا لیتی ہے اور جب وہ آغوش میں لینے کے لئے اپنے ہاتھ دراز کرتا ہے تو وہ نہایت سنجیدگی سے اس کے ہاتھوں کو اپنے لرزتے ہوئے ہاتھوں سے ہٹا دیتی ہے۔"

"صبح جب اس کی آنکھ کھلتی ہے تو وہ دیکھتی ہے کہ اسکی تمام سہیلیاں اس کو دیکھ دیکھ کر ہنس رہی ہیں۔ تب وہ بات کرنا چاہتی ہے لیکن اس کی زبان ہی نہیں کھلتی۔"

اسی قسم کے ہزاروں لطیف اور دلچسپ اشعار امارو نے تصنیف کئے ہیں۔ جن میں سے چند اور مثالیں درج ذیل کی جاتی ہیں۔

"نوجوان میاں اور بیوی کے راز و نیاز کی باتیں جو روزانہ رات کے وقت ہوتی تھیں گھر کے پالتو طوطے نے سیکھ لیں اور صبح کو وہ انہیں الفاظ کو تمام گھر والوں کے سامنے دہرانے لگا۔ نوجوان بیوی شرم سے گھبرا جاتی ہے اور طوطے کی چونچ میں اپنا کان کا خوشنما ہیروں کا بندہ دیدیتی ہے تاکہ طوطا اس سے کھیلنے لگے۔"

محبوب کی موجودگی میں عورت کے غصہ کا اظہار کس خوبی سے کیا گیا ہے۔

"میں یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ میں اس سے برہم ہوں اپنی جبین پر مصنوعی بل ڈال لیتی ہوں لیکن میری آنکھیں یہی کہتی ہیں کہ میں اس کو گھورتی رہوں میں

قصداً کوئی بات نہیں کرتی لیکن میرے لبوں پر تبسم کی ہلکی
لہر دوڑ جاتی ہے۔ میں اپنے دل کو سخت اور سرد بنالیتی
ہوں لیکن میرے جسم میں رعشہ سا پڑ جاتا ہے۔ میں نہیں
جانتی کہ اس کی موجودگی میں میں کب تک اپنے غصہ کو
برقرار رکھ سکتی ہوں"۔

"میں اپنی صورت اس کی آنکھوں کے سامنے سے پھیر
لیتی ہوں جو میرے چہرے کے اُتار چڑھاؤ کا بغور معائنہ
کرتی رہتی ہے۔ میں کوشش کرتی ہوں کہ اُس کے الفاظ کو
نہ سنوں۔ لیکن میں محسوس کرتی ہوں کہ میری پیشانی اور
گال پسینہ سے تر ہو گئے ہیں"۔

ایک دوشیزہ اور اس کے محبوب کے درمیان ایک
دلچسپ مکالمہ یوں قلمبند ہوتا ہے۔

"اپنے مغرور غصہ کو کم کردے" "لیکن میرے غصہ نے آپ کو
کیا تکلیف پہنچائی ہے"؟

"کیا تم اب مجھ سے بیزار ہو گئی ہو" "آپ کی کوئی غلطی
نہیں۔ صرف میرا ہی قصور ہے"۔

"پھر تم یوں بھرائی ہوئی آواز میں روتی کیوں ہو"
"پھر کس کے سامنے روؤں" "میرے سامنے کس لئے"
"تو میں تمہاری کوئی نہیں"
"نہیں تم تو میرے دل کی ملکہ ہو" "میں نہیں ہوں۔
اس لئے رو رہی ہوں"۔

میاں اور بیوی کے آئے دن کی رنجشوں کو کس پر لطف
پیرایہ میں ڈھالا ہے۔

ایک ہی بستر پر لیٹی ہوئی عروس نو جب اپنے شوہر کے
منہ سے کسی دوسری عورت کے حسن کی تعریف سنتی ہے
تو آتشِ رشک و حسد سے جل جاتی ہے اور انتہائی نفرت کے
ساتھ اپنا رخ اُس کی طرف سے پھیر لیتی ہے اور اس کی
خوشامد والے [illegible] الفاظ [illegible] نہیں کرتی۔ اور جب شوہر مایوس
ہو کر خاموش ہو جاتا ہے تو عروس نو چپکے چپکے اپنا اپنا رخ
اس کی طرف کرتی ہے۔ اس خوف سے کہیں وہ سو نہ
گیا ہو۔"

"محبوب سے جب کوئی گستاخی ہو گئی تو محبوبہ کی جبین پر
بل آ گئے۔ پھر جب اُس نے بات کرنا چاہی تو اس نے اپنے
کانوں پر ہاتھ دھر لیا۔ اور جب اُس نے اپنی مشتاق باہیں
اس کے سامنے پھیلا دیں تو وہ دُور ہٹ گئی۔ پھر جب اس کے
کپڑوں کو چھو لیا تو غصہ سے اس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور جب
مایوس محبت نے خود کو اپنی مغرور محبوبہ کے قدموں پر گرا دیا
تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ رونے لگی"۔

ضبطِ غم سے میرے دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور
اس کی محبت مجھ کو گھلا گھلا کر لاغر کر دے لیکن اب میں اس
بے وفا محبوب سے کبھی نہ ملونگی۔ اپنے محبوب کی ٹھکرائی ہوئی
ناکام محبت دوشیزہ کے منہ سے یہ الفاظ انتہائی غصہ کی حالت
میں نکلتے ہیں۔ لیکن پھر اُس کی مشتاق نظریں اس راہ پر
جم جاتی ہیں جس طرف سے اس کی محبوب آنیوالا ہوتا ہے"۔

اپنے محبوب سے روٹھی ہوئی مغرور عورت کو اس کی ہمجولیاں
کس طرح نصیحت کرتی ہیں اور آئندہ آنے والی مصیبت کا نقشہ اسکی
آنکھوں کے سامنے کھینچتی ہیں۔

"اپنے محبوب سے روٹھنے والی خاموش بیٹھی ہوئی اشک
فشانی کیوں کر رہی ہے۔ سن غور سے سن ابھی تو تیرے رونے کا
وقت ہی نہیں آیا۔ کچھ دیر اور ٹھہر جا۔ جب تیرا محبوب
تیری اس بے رُخی اور تیرے غرور سے تنگ آکر تجھ کو ہمیشہ
کے لئے چھوڑ دے گا۔ تب تیرے رونے کا وقت آئے گا
اور اس وقت خود بخود تیری آنکھیں خون کے آنسو بہائینگی"۔

تب مغرور عورت اپنے کئے پر پشیمان ہوتی ہے اور اپنے
محبوب کے پاس حسب ذیل پیام روانہ کرتی ہے۔

"میرے پیارے میں نے غصہ میں تم سے کہدیا چلے جاؤ اور

تم حقیقت میں چلے گئے اور پھر نہ آئے۔ مجھ سے قصور ہوا اور بڑی بھول ہوئی۔ شرمندہ ہوں۔ خدا کے لئے اب میرے قصور کو معاف فرما دو"

طویل سفر سے شوہر کی واپسی پر بیوی کی حالت۔

"بیچاری بیوی جو کہ ہجر کے پیہم صدموں سے زرد پڑ گئی ہے۔ سارا دن بڑی بیقراری سے کاٹتی ہے لیکن رات میں اس کے شوہر کے دوست اسکو دیر تک باتوں میں لگا لیتے ہیں اور کمرے میں شوہر کی منتظر بیوی یہ کہتے ہوئے کہ آج باتیں ختم نہ ہونگی اپنی ریشمی ساری کا آنچل سنبھالتے ہوئے اٹھتی ہے اور روشنی کو مدھم کر دیتی ہے۔ پھر بستر پر دراز ہو کر متوحش خیالات میں گم ہو جاتی ہے"

اسی قسم کے بیشمار محبت سے بھرے ہوئے اشعار آمارو کے تصانیف میں ملیں گے۔

"تیرے اعضا اس قدر کمزور کیوں ہیں۔ اور تیرے بدن میں یہ کپکپی کس لئے ہے۔ اور اے پیاری تیرے گال اس قدر زرد کیوں پڑ گئے ہیں"۔ جب اس کے محبوب نے اس سے یہ سوال کیا تو اس نے کہا "میری زندگی کے مالک یہ میری فطرت ہے"۔

"یہ کہا اور وہاں سے ہٹ گئی اس خیال سے کہ آنسو جو اسکی آنکھ میں بھر آئے تھے کہیں جاری نہ ہو جائیں۔"

اس عورت کی خوشی کا کیا پوچھنا جسنے طویل سفر کے بعد اپنے شوہر کے آنیکی خبر سنی ہو۔

"ہجراں نصیب بیوی اپنے شوہر کے انتظار میں اس راستہ کو بیٹھی ہوئی تاک رہی ہے۔ جس طرف سے وہ آنیوالا ہے۔ آفتاب غروب ہو جاتا ہے اور اندھیرا چھا جاتا ہے۔ لیکن وہ غمزدہ اسی طرح بیٹھی ہوئی محو انتظار رہتی ہے۔ آخر کار مایوس ہو کر گھر کی طرف قدم اٹھاتی ہے لیکن مڑ مڑ کے دیکھتی بھی جاتی کہ کہیں اس کا شوہر نہ آ گیا ہو۔"

اب مشہور شاعر سری نگار کی سحر نگاری دیکھئے۔

سہیلی عورت کے محبوب سے اس کی جدائی کا حال یوں بیان کرتی ہے۔

"جب سے وہ تم سے جدا ہوتی ہے وہ کبھی چاند کو نہیں دیکھتی اس لئے کہ اس سے اس کو تکلیف ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی صورت کو کبھی آئینہ میں دیکھنا پسند نہیں کرتی۔ جب کوئل کی کوک وہ سنتی ہے تو وہ بیچین ہو جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ وہ خود اپنی آواز سننا پسند نہیں کرتی وہ محبت کے دیوتا کے بنائے ہوئے حسین پھولوں سے بھی نفرت کرتی ہے لیکن یہ بات تعجب خیز ہے کہ وہ تم سے بے حد محبت کرتی ہے جو اس کی نظروں میں محبت کے دیوتا سے کم نہیں"۔

کچھ اور نازک خیالیاں ملاحظہ ہوں۔

"میری ساس میری طرف دیکھتی ہی نہیں اور جب کبھی دیکھتی بھی ہے تو اس کے چہرے سے غصہ کے آثار نمایاں رہتے ہیں۔ میری نند مجھ کو ہمیشہ بُرا بھلا کہتی رہتی ہے۔ اے پیاری سہیلی تو نے جانا میری خطا کیا ہے۔ میرا یہی قصور ہے کہ "وہ" مجھ سے بے حد محبت کرتے ہیں۔"

حُسنِ سادہ کی تصویر کس قدر حسین کھینچی ہے۔

تیرے سینے کا بوجھ خود تیرے لئے ناقابل برداشت ہے پھر تو یہ مالا پہنکر اپنے بوجھ میں اضافہ کیوں کر لیتی ہے۔ تیرے پاؤں خود ہی کمزور ہیں اور ان کے لئے تیرا جسم ہی بہت بار ہے۔ پھر تو اس میں پازیب پہنکر بوجھ کو ناقابلِ برداشت کیوں بنا لیتی ہے۔ جب خدا نے تجھ کو خود مجسمہ حسن بنایا ہے تو اس حسن سادہ کو زیورات اور جواہرات پہن کر غیر فطرتی کیوں بنا لیتی ہے"۔

"کلائی میں چوڑیاں نہیں۔ پاؤں میں پازیب نہیں۔ گلے میں مالا نہیں۔ باوجود اس کے جب اس کی چوڑی پیشانی پر بکھرے ہوئے بال آ کر گستاخی کرنے لگتے ہیں تو دیکھنے والوں پر

ایک عجب کیف طاری ہوجاتا ہے۔ اُف رے حسن کی سادگی"

عورت غصہ کا اظہار کرنا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔

"نہ تو تم میرے پاس آتی ہو۔ نہ مجھ سے آنکھیں ملاتی ہو اور نہ مجھ سے بات ہی کرتی ہو۔ گویا کہ تم مجھ سے ناراض ہو لیکن میں اسے کیسے یقین کروں۔ جب تمہارے گلابی ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تمہارے دل کا راز عیاں کئے دیتا ہے"۔

عروس نو کی حیا اور شوخی میں کشمکش۔

"اگر وہ سو جاتی ہے تو اپنے شوہر کے حسین چہرہ کو دیکھ نہیں سکتی، اور اگر وہ نہیں سوتی تو اس کا شوہر آ سے چھیڑتا ہے ان خیالات کی کشمکش میں نہ تو عروس نو سونے ہی پاتی ہے اور نہ جاگتے"۔

سنسکرت کے تمام شعرا میں بھاؤ بھوتی ہی صرف ایک ایسا شاعر ہے۔ جو عورت کے ظاہری حسن سے متاثر نہیں ہوتا اور گہرائی میں چلا جاتا ہے یعنی روح کی خوبصورتی سے بحث کرتا ہے لیکن ابھی ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے۔ "مروالا اور راندولیکھا کے ناموں کو بھی ہم اپنے مضمون سے حذف نہیں کرسکتے۔ یہ دونوں اپنے دور کی نامور شاعرہ تھیں جنہوں نے اپنی بیش بہا اور نادر تصانیف سے یہ ثابت کر دکھایا کہ صرف مرد ہی نہیں بلکہ صنفِ نازک بھی نازک اور لطیف خیالات پیدا کرسکتی ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہمیں انکا نمونہ کلام دستیاب نہ ہوسکا۔

اب ہم کالی داس کی تصنیفات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ سنسکرت کے مشہور شاعر کالیداس کی شہرت صرف ہندوستان ہی تک محدود نہیں بلکہ تمام مہذب دنیا میں اس کی قابلیت پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے۔ اور سب سے زیادہ تعجب انگیز بات تو یہ ہے کہ اس مشہور شاعر کی بے نظیر تصنیفات نے بہ نسبت اہل ہند کے اہل یورپ سے زیادہ خراج تحسین حاصل کیا ہے۔ چنانچہ الگزینڈر ہمبوٹ کہتا ہے۔" اپنی تصانیف میں کالیداس نے نہایت ہی اعلیٰ خوبی سے اس تاثیر کو بیان کیا ہے جو کہ فطرت عاشقوں کے دلوں میں پیدا کرتی ہے"

رومیش چندردت مصنف ایسٹ انڈیا کہتا ہے" جس کسی نے کو لیداس کے ڈرامے شکنتلا کو پڑھا وہ یہ ضرور محسوس کرے گا کہ ابتک کسی انسان کے دل میں اتنی خوبصورت اور نازک مخلوق کا خیال نہیں آیا جتنی کہ شکنتلا میں بیان کی گئی ہے"۔

یونتو کالیداس کی ہر تصنیف عشق و محبت کی شراب میں ڈوبی ہوئی ہے لیکن" سری نگرتک" اپنی مشہور تصنیف میں اس نے عشق کی ابتدأ اور اس کا انجام نہایت ہی دلکشا الفاظ میں بیان کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ کالیداس کو تمام شعرائے سنسکرت پر اس لئے ترجیح ہے کہ جہاں کہیں اس کو موقع ملا ہے اس نے حسن وجمال کی بہترین تصویر کھینچی ہے مشہور عام تصانیف "میگھ ودت" وکرم اروسی۔ شکنتلا اور سکار سنبھو کے چند دلچسپ نمونے درج کئے جاتے ہیں۔ "میگھ ودت" میں یکش (جسکو اس کے مالک کبیر نے جلاوطن کر دیا تھا) ابر کو اپنا قاصد بناتا ہے اور اپنی بیوی کے گھر کا پتہ اسکو بتاتا ہے اور راستہ کی دلفریب تصویریں کھینچتا ہے۔

"اے ابر جب تو ہوا کے دوش پر سوار ہو کر اُس طرف سے گزرے گا تو وہاں کے پردیسیوں کی خوبصورت عورتیں اپنے کھلے بال منہ سے ہٹا ہٹا کر تجھے الفت بھری نگاہوں سے دیکھیں گی۔ اور رات میں جب چاروں طرف تیری سیاہی چھاجائے گی تو وہاں کی رہنے والی جوانی میں مست اور محبت اور میں اندھی عورتیں یہ دعائیں مانگیں گی کہ اپنے محبوب کے گھر پہونچنے تک یہ ابر نہ برسے اور نازک صاف دل کی عورتیں اپنے دل میں خوف کھائے گی کہ تیرے برسنے کی وجہ سے وہ اپنے شوہروں کے پاس نہ جاسکیں گی۔ اس لئے ابر میں تجھے سمجھائے دیتا ہوں کہ تو کم سے کم دو گھڑی رات گئے تک نہ برسنا ورنہ وہ تجھے پانی پی پی کر کوسیں گے"۔

"جب کچھ رات گئے تک تو نہ برسے گا تو جوانی میں چور اور محبت میں مخمور عورتیں ڈرتے ڈرتے اپنے محبوب کے پاس جائیں گی اور تیرے سر پر چھائے رہنے کی وجہ سے

تاریکی اس قدر رہے گی کہ ایک ہاتھ کو دوسرا ہاتھ سوجھائی نہ دے گا۔ اس اندھیرے میں انکو راستہ تلاش کرنے میں بڑی دقت ہوگی اس لئے تو اپنی بجلی کو چمکا چمکا کر راہ دکھا دینا۔ مگر خیال رہے۔ پانی نہ برسانے لگنا۔ ورنہ وہ بیچاری گھبرا جائیں گی۔ تجھ کو دیکھ کر عیش کی بھوکی اور جوانی میں چور نازک بدن عورتیں کیتکی اور کنول کے پھولوں کے خوبصورت ہار گوندھ کر اپنے بالوں اور کانوں کو سجائیں گی۔ اور جب تیری خوفناک گرج ان کے کانوں میں پہنچیگی تو وہ الزام ہٹنے سے بالوں کو سمیٹ کر جوڑے باندھ لیں گی اور سب کو چھوڑ کر اپنے شوہروں کی خوابگاہ کو سدھاریں گی اور جب پانی سے تر ہوا کے ٹھنڈے جھونکوں سے دل میں سرایت کرنے والی خوشگوار سردی پیدا ہوگی تو وہ اپنے ابھرے ہوئے سینوں کو سنگین کپڑوں سے چھپا لینگی اور ہوا بار بار انہیں چھیڑنے کے لیئے انکا آنچل دوش سے گرا دے گی جسکی وجہ سے ان کے گلے کی سنہری اور روپہلی زنجیریں چمک چمک کر عجب بہار دیں گی اور ایسا معلوم ہوگا کہ چاند اور سورج کے درمیان بجلی کوند رہی ہے"

"وکرم اروسی" میں پروراوس اروسی کی (جو آسمانی پری ہے) یوں تعریف کرتا ہے۔

"اس کا جسم زیوروں کا زیور اور سنگھاروں کا سنگھار ہے بادی النظر میں جو چیزیں حسن کا معیار سمجھی جاتی ہیں اگر اسکی رعنائی سے اُلٹا انکی زیبائی کا اندازہ کیا جائے تو بجا ہے"

اروس اپنے دل کے جذبات کو پروراوس کے خط میں کس عمدہ پیرایہ میں بیان کرتی ہے۔"

"میرے محبوب اگر میں جس کے دل کا حال آپ سے پوشیدہ ہے حقیقت میں آپ کے تعلق خاطر کی کیفیت معلوم ہونے کے بعد میں آپ کی طرف سے ویسی ہی سرد مہر ہوں جیسا کہ آپ کا خیال ہے تو پھر کیا بات ہے کہ جب میں

نندن بن میں پارسنگھار کے پھولوں کی سیج پر لیٹتی ہوں تو نسیم بہار سے بھی میرے دل کو آرام نہیں ملتا اور جو پھول میرے جسم سے چھو جاتا ہے مرجھا کر فنا ہو جاتا ہے"

پروراوس جب اپنی محبوبہ اروسی سے ملتا ہے تو اپنی حالت دل کا اظہار یوں کرتا ہے۔

"حسرت سی حیرت ہے کہ مراد کے حاصل ہو جانے سے حالت ہی بالکل بدل جاتی ہے چاند کی وہی کرنیں اب میرے جسم کو تازگی بخش معلوم ہوتی ہیں اور عشق کے وہی شرار روح پرور ہیں"

پروراوس اروسی کی تلاش میں جنگل میں نکل آتا ہے اور وہاں کسی کو اپنا رہبر نہ پاکر راج ہنس ہی سے اپنی محبوبہ کا پتہ دریافت کرتا ہے۔

"او سیاہی مائل نیلی گردن اور سفید کودن کی آنکھوں والے پرند تو نے اس جنگل میں کہیں میری دلربا صراحی دار گردن اور غزالی آنکھوں والی نازنین کو دیکھا ہے۔ [illegible] حقیقت میں دیکھنے کے قابل ہے۔ اچھا او راج ہنس یہ بتا اگر تو نے میری کمان ابرو سندری کو تالاب کے کنارے ٹہلتے نہیں دیکھا تو پھر اوڑا کو تو نے اس کی مستانہ چال کیسے اڑائی۔ پس جب تو نے میرے دلنواز کی چال اڑائی ہے تو اسے بھی پیدا کر۔ کیونکہ تیرے پاس سے جب مال مسروقہ کا ایک حصہ برآمد ہوا ہے تو تو ہی باقی کا ذمہ دار ہے"۔

شکنتلا کالیداس کی بہترین تصنیفوں میں شمار کی جاتی ہے۔ دشینت اپنی محبوبہ شکنتلا کے حسن کی تعریف یوں کرتا ہے۔

"اس کے لب رنگین گل نو دمیدہ کی سرخی لئے ہوئے ہیں اس کے شفاف و بلوریں بازو نرم لچکدار ڈالیوں کے مانند ہیں اور اس کے عضو عضو سے جوش شباب گل نو شگفتہ کی لطافت کے ساتھ نمایاں ہے"۔

دشینت سے یہ دیکھا نہیں جاتا کہ شکنتلا جیسی نازک اور حسین عورت اپنے ہاتھوں سے گھڑوں میں پانی بھر کر لائے اور درختوں کو

سینچے۔ چنانچہ وہ شکنتلا کے پاس پہونچتا ہے اور یوں کہتا ہے۔

"تم اس قدر اپنی نزاکت پر ظلم کیوں کرتی ہو۔ دیکھو درختوں کو پانی دیتے دیتے تم تھک سی گئی ہو۔ اور گھڑوں کو اٹھاتے اٹھاتے تمہاری ہتھیلیاں لال ہوگئی ہیں۔ سینے کا جو ابھار عیاں ہے اس سے بھی اس کے آثار نمایاں ہیں۔ سانس اوپر کو چڑھ رہی ہے۔ کرن پھول کا سہارا ہے کہ پسینہ سے تر عارض پر چمٹ گئے ہیں جیسے پتے گلوں سے لپٹے ہوئے رہتے ہیں۔ جوڑے کی گرہ ڈھیلی ہوگئی ہے اور بال بکھر کر گالوں پر آگئے ہیں۔"

"کیا اچھا ہو مشہور رزمیہ نظم ... اکا آیدا ... سے دیوی پاربتی کے حسن کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

"اٹھتی ہوئی جوانی اس کے اعضاء کی تناسب بالیدگی کا سبب بنی جسکی وجہ سے وہ مجسمۂ حسن بن گئی اس طرح جس طرح کہ کسی تصویر کو رنگ اور روغن چڑھا کر جلا دی گئی ہو"

"دمِ خرام پاؤں کے اٹھے ہوئے انگوٹھے اور ناخونوں سے سُرخی ٹپکنے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا گلِ لالہ چن رہی ہیں۔"

"حسن کی دیوی جب چاند کی طرف دیکھتی ہے تو کنول کے دلفریب نظارہ سے محروم ہو جاتی ہے اور جب وہ کنول پہ توجہ کرتی ہے تو چاند کے نور سے لطف اندوز نہیں ہوسکتی لیکن جب وہ پاربتی کے حسین چہرہ پر نظر کرتی ہے تو اس کو کنول اور چاند دونوں کا نظارہ نصیب ہوتا ہے"

"اس کا بے عیب حسن ایک غنچۂ ناشگفتہ ہے یا ایک نرم شاخ ہے جو ابھی خراش ناخن سے نا آشنا ہے یا ایک دُرِ ناسفتہ ہے۔"

کس قدر لطیف تشبیہات ہیں۔

"موتی کسی شفاف مونگے میں جاگزیں ہو یا کوئی نو دمیدہ پھول کونپل میں چھپا رہے تو اس کے دلربا تبسم سے جس کا حسن لبِ شیریں کی سرخی نے اور بھی دوبالا کر دیا تھا۔ تعبیر دی جا سکتی۔"

"تلون آمیز نظر کو اس نیلے کنول کے پھول سے تشبیہہ دی جاسکتی ہے جو تند ہواؤں سے تھپیڑے کھا رہا ہو"

ان چند مثالوں سے جو درج کی گئی ہیں کہیں یہ خیال نہ کیا جائے کہ سنسکرت زبان میں اشعار کا بے بہا ذخیرہ ختم ہوگیا ہے بلکہ اس صنف کی ہر نظم اپنے اندر ایک نیا لطف رکھتی ہے۔ تمام نظموں میں "محبت" کا عنصر بدرجہ اتم موجود ہے۔ نظریۂ محبت۔ اس کے احساسات تاثرات بیقراری۔ امید۔ رشک۔ غصہ۔ ناامیدی۔ یاس۔ تمنائے ملاقات۔ حقیقی جذبات بہر حال ہر پہلو پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور اس کا حقیقی لطف تو اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے۔ جب ان تصنیفات کا بذاتِ خود مطالعہ کیا جائے۔

....

شعلۂ طور

(از جناب رئیس احمد صاحب طورؔ)

آشنا نا آشنا کیوں ہو گئے؟
بندہ پرور یوں خفا کیوں ہو گئے؟

کشتیٔ دل غرق کرنا ان کا کام
پھر وہ میرے ناخدا کیوں ہو گئے

اب انہیں نیند آنی ہے محال
نالہائے شب رسا کیوں ہو گئے

ہم بھی دیدیتے جفاؤں کا جواب
آگ پابندِ وفا کیوں ہو گئے

خلوتوں میں تم نے برسائی شراب
میکدے میں پارسا کیوں ہو گئے

یہ قبائے گل کو کر دیتی ہے چاک
پھول ممنونِ صبا کیوں ہو گئے

آنکھ میں آنسو ہیں لب خاموش ہیں
ہم سراپا مدعا کیوں ہو گئے

وہ پشیماں ہیں فقیرِ بے نوا
چند جملے تھے ادا کیوں ہو گئے

رات بھر بے مدعا پڑھ کر نماز
صبح کو محوِ دعا کیوں ہو گئے

ہے جنوں میں بھی محبت کا خیال
نالے مٹ مٹ کر دعا کیوں ہو گئے

او تغافل کیش جو چاہے سمجھ!
طورؔ نا حق بے وفا کیوں ہو گئے

راز

(ازجناب ابو محمد امام الدین صاحب رام نگری)

شیام پور کی عالیشان اور خوش منظر عمارت راہگیروں کو بے ساختہ اپنی جانب متوجہ کرلیتی تھی۔ وہ باہر سے جتنی قابل دید تھی اندر سے اس سے زیادہ حسین تھی۔ اس عمارت کی مالک ادھیڑ عمر کی ایک عورت تھی۔ اس کا باغ حسن پژمردہ ہوچکا تھا۔ آفتاب شباب کی درخشانی ماند پڑچکی تھی۔ اس کی زیب و زینت۔ بے کنارے کی ریشمی سفید ساری تک محدود تھی۔ اس کا نام رانی تھا۔ رانی ہمیشہ خوش اور بشاش رہتی تھی جیسے اس کا قلب مسرت و شادمانی کا سرچشمہ ہو۔ اس کے سوا اس کے گھر میں نہ کوئی مرد تھا۔ نہ کوئی عورت تھی۔ صرف دو بچے تھے۔ لیکن وہ رانی کے لئے سب کچھ تھے۔ ایک لڑکا تھا لال اور دوسری لڑکی تھی منی لال اور منی کے ہوتے ہوئے رانی کو دنیا کی کوئی کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ رانی کا تمام وقت انہیں دونوں کی درشت و پرداخت اور لاڈ پیار میں گذرتا۔ وہ انہیں کھلاتی پلاتی۔ ان کے کپڑے بدلتی۔ انہیں کھلاتی۔ ان کے ساتھ خود کھیلتی۔ وہ آپس میں لڑتے جھگڑتے تو انہیں سمجھاتی بجھاتی۔ نہ مانتے تو ڈانٹ ڈپٹ کرتی۔ روٹھ جاتے تو مناتی۔ نازبرداری کرتی۔ انہیں سلیقہ اور شعور سکھاتی۔ یہی اس کا مشغلہ تھا۔ یہی اس کی تفریح و دلبستگی تھی۔

ساڑھے دس بجتے ہی شوفر آتا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتا۔ اور رانی کی آنکھوں کے دونوں تارے کو لے کر سکول چلا جاتا۔ ہنستی ہوئی کوٹھی کواداس دیکھ کر رانی بھی افسردہ ہوجاتی اور اسی حالت میں بیٹھی دیر تک چھت کی کڑیاں گنتی رہتی۔ ساڑھے تین بجتے ہی از خود رانی کے دل کی کھوئی ہوئی مسرت واپس آجاتی۔ دل و دماغ میں خوشی کی بجلیاں کوندنے لگتیں۔ وہ اٹھتی۔ پھلوں اور مٹھائیوں سے دو طشتریاں سجا کر رکھتی۔ پھر پھاٹک پر جاتی اور بیقرار نظروں سے اسکول کا راستہ دیکھنے لگتی۔ چار سوا چار بجے شوفر بچوں کو لے کر واپس آتا۔ بچے پھوپھو پھوپھو چلاتے ہوئے رانی ان کے سر پر ہاتھ پھیرتی۔ پیار کرتی۔ ہاتھ منہ دھلاتی اور مٹھائی اور پھل کی طشتریاں لاکر ان کے سامنے دھر دیتی۔ بچے کھائے جاتے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے جاتے رانی ان کی بھولی بھولی باتوں پر مسکراتی اور ٹکٹکی باندھے ان کی صورتیں دیکھا کرتی۔ جیسے اس کی آنکھیں سیر ہی نہ ہوتیں۔

کبھی رانی کا دل زیادہ خوش رہتا تو وہ ایسی تدبیر کرتی کہ بچے آپس میں جھگڑ پڑیں۔ منی۔ لال کی گیند اٹھا کر آنگن میں پھینکدیتی۔ لال جھنجلا کر منی کی گڑیا چھین لیتا۔

منی کہتی۔ دیکھو پھوپھو! لال نے میری گڑیا چھین لی۔
لال کہتا۔ تو پھوپھو! منی نے میری گیند کیوں آنگن میں پھینکدی؟
رانی دونوں کو جھڑکتی۔ تم لوگ کیسے لڑتے ہو؟ کہیں آپس میں بھی اس طرح جھگڑا کیا جاتا ہے؟
منی! تم لال کی گیند اٹھا لادو۔ اور تم لال منی کی گڑیا دیدو۔
کبھی رانی قصداً لال کو مٹھائی زیادہ دیدیتی۔ لال کھاتا جاتا اور منی کو چڑاتا جاتا۔
منی کو تو کم ہی مٹھائی ملی۔ مجھے تو زیادہ ملی۔
منی کہتی۔ پھوپھو! مجھے بھی اور مٹھائی دو۔ میری تو کم ہے۔
رانی کہتی۔ بیٹا اب کہاں ہے؟
منی لال کی طشتری پر جھپٹتی۔ لال منی کی طشتری کی مٹھائی بھی اٹھا لیتا۔ منی طشتری اٹھا کر پھینکدیتی اور روتی ہوئی کہتی۔ اب میں لال کے سے کبھی نہ بولوں گی۔ یہ بڑے خراب ہیں۔
رانی یہ سب دیکھ دیکھ کر خوش ہوتی۔ منی کو گود میں اٹھالیتی

اسے بہلا پھسلا کر رضامند کرتی۔ رانی کا یہی مشغلہ تھا۔ اس کی بے کیف و بے نشاط زندگی کو اس مشغلے نے ایک عجیب کیف و سرور سے معمور کر دیا تھا۔

کوٹھی کے احاطے میں ایک چھوٹا سا باغ تھا۔ جو ہری بھری بیلوں اور تر و تازہ پودوں سے ہمیشہ شاداب و شگفتہ رہتا تھا۔ رانی شام سے کچھ پہلے دونوں بچوں کو لے کر اسی باغ میں چلی جاتی خود بنچ پر بیٹھ جاتی اور بچے باغ بھر میں دوڑ لگاتے اور تیتریاں پکڑتے پھرتے۔ ان کے شیریں اور مترنم فردوسی قہقہوں سے باغ موسیقی زار بن جاتا۔

لال کہتا۔ منی! دیکھو۔ کیسا اچھا پھول کھلا ہوا ہے۔

منی کہتی اور اس پر کتنی خوبصورت تیتری بیٹھی ہوئی ہے۔

لال کچھ سوچ کر کہتا۔ کہیں میں پھول ہوتا.... ....

منی فوراً جواب دیتی۔ اور کہیں میں تیتری ہوتی.... ..

لال ہنس پڑتا کہتا۔ تب تو بڑا مزہ آتا۔

منی بھی ہنستی ہوئی کہتی۔ اور کیا۔ دونوں ساتھ ہی رہتے تم مجھے دیکھا کرتے۔ میں تمہیں۔

رانی خاموش بنچ پر بیٹھی رہتی۔ اس کے لئے نہ لہلہاتے ہوئے پودوں میں کوئی جاذبیت تھی اور نہ کھلے ہوئے پھولوں میں۔ اسے نہ چڑیوں کی موسیقی اپنی جانب متوجہ کر سکتی تھی اور نہ گھونسلوں کی طرف بھاگے جاتے ہوئے پرندوں کی پرواز۔ اس کی زندگی اور اس کی دنیا کی تمام تر دلچسپیاں انہیں دونوں بچوں کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ وہ دل ہی دل میں کہتی۔ کتنے حسین اور پیارے بچے ہیں۔ جیسے ایک سبز و شاداب ٹہنی میں کھلے ہوئے دو تر و تازہ پھول۔ ان کو دیکھتے ہوئے دل سیر ہی نہیں ہوتا۔ جس قدر زیادہ دیکھتی ہوں۔ دیکھنے کا شوق زیادہ ہوتا جاتا ہے میری اجڑی ہوئی دنیا کو ان بچوں نے کس طرح آباد کر رکھا ہے ان کی بدولت میری بے نشاط زندگی کس قدر کیف اور طرب افزا ہو رہی ہے۔

رانی کو اسی طرح سوچتے سوچتے شام ہو جاتی۔ دونوں بچے ایک دوسرے کے گلے میں بانہیں ڈالے رانی کے سامنے آ کر کھڑے ہو جاتے اور اس طرح رانی کا سلسلۂ خیال شکست ہو جاتا۔ رانی دونوں کے سروں پر اپنا ایک ایک ہاتھ رکھ دیتی۔ دونوں اس کے ہاتھوں سے لپٹے۔ جھومتے کودتے گھر میں چلے جاتے۔

لال اور منی کی عمر جیسے جیسے زیادہ ہوتی جاتی تھی دونوں کی سادگی۔ بے تکلفی۔ ہنسی۔ کھیل اور چھیڑ چھاڑ میں کمی ہوتی جاتی تھی اس تغیر کو دیکھ کر رانی کبھی کبھی بے چین ہو جاتی اور دل ہی دل میں کہتی۔ قدرت بھی کتنی بے رحم ہے۔ کاش وہ میرے بچوں کو بچے ہی رہنے دیتی۔ کاش وہ کبھی بڑے نہ ہوتے وہ اسی طرح دنیا سے ناواقف اور بے خبر رہتے۔ قدرت نے میرا کیا کیا نہیں چھین لیا؟ میرے پاس باقی ہی کیا ہے؟ یہی دو بچے کائنات زندگی ہیں۔ کاش ان کا بچپن ہمیشہ باقی رہتا۔

لیکن قدرت کسی کی تمنا اور آرزو کی پابند نہیں۔ وہ کسی کی خاطر داری کے لئے اپنے آئین میں رد و بدل نہیں کیا کرتی۔ وہ آزاد اور مختار مطلق ہے۔ لال پندرہ برس کا ہو گیا اور منی بارہ سال کی۔ رانی نے دیکھا اب منی سکول جانے کے قابل نہیں رہی۔ اسے خود اپنے سے ڈر معلوم ہونے لگا کہیں منی کو اس کی نظر نہ لگ جائے اسے اب دوسروں کی نظروں سے چھپا کر رکھنا چاہئے۔ رانی نے منی کا سکول جانا بند کر دیا۔ لیکن لڑکے میں تو لڑکی کی طرح جاذبیت و دلفریبی نہیں ہوتی۔ اس لئے اسے نظر لگنے کا اندیشہ نہیں۔ لہذا لال کا سکول جانا جاری رہا۔

منی گھر رہ کر رانی کی مسرتوں میں حصہ گیر ہونے لگی۔ لال کے سکول سے گھر آنے کے وقت رانی اس کے ناشتے کی طشتری سجانے چلتی تو منی لپک کر اس کے ہاتھ سے طشتری چھین لیتی۔ رانی کہتی پگلی کہیں کی۔ تجھے ان کاموں کی کیا فکر؟ تو چل کنارے بیٹھ میں لال کو کھلا پلا لونگی۔

منی کہتی۔ اب تمہیں کو کنارے بیٹھنا چاہئے۔ پھر کچھ۔ اب

یہ میرا کام ہے۔ البتہ تم دیکھتی رہو اور جہاں مجھے غلطی کرتے دیکھو مجھے بتادو۔

رانی ہنس پڑتی۔ کہتی اچھا بیٹی! یہی سہی۔ جس میں تم خوش رہو۔

خوشی سے رانی کا دل لبریز ہوجاتا۔ اس کی رگوں میں مسرت کی ایک نئی لہر دوڑ جاتی۔ اس کا چہرہ کھِل اٹھتا۔ منی اپنے نازک گلابی ہاتھوں سے طشتری مانجھتی۔ اسے انواع واقسام کے میوے پھل اور مٹھائی سے سجاتی۔ پھر بڑی لگن اور بے چینی کے ساتھ لال کے آنے کا انتظار کرتی۔ ذرا سا کھٹکا ہونے پر چونک کر دروازے کی طرف دیکھنے لگتی جیسے لال آرہا ہو۔ یہ دیکھ کر رانی بے ساختہ مسکرا پڑتی کہتی۔ پگلی کہیں کی۔ کوئی اس طرح بھی بے چین ہوتا ہے۔ وقت سے وہ خود ہی آجائے گا۔

منی کی بڑی بڑی نرگسی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ کہتی پھوپھو! لال بڑے بے مروت ہیں۔ وہ قصداً دیر کرتے ہیں۔ میں ان کے لئے بے چین رہتی ہوں۔ اس لئے وہ اور بھی جلدی نہیں آتے۔ آج انہیں آنے دو۔ میں ان سے بولوں گی بھی نہیں۔

لیکن جیسے ہی لال گھر میں قدم رکھتا منی کی طبیعت بدل جاتی وہ خوشی سے بے قابو ہوجاتی۔ اس کی رسیلی آنکھوں میں اور بھی رس اُمنڈ آتا۔ جادو بھری آنکھیں اور بھی سحر آگیں ہوجاتیں۔ اس کا چہرہ تازہ کھلے ہوئے گلاب کی طرح شگفتہ ہوجاتا۔ گلے میں آواز مترنم ہوجاتی۔ پاؤں میں خود بخود حرکت رقص پیدا ہوجاتی۔

لال ہاتھ منہ دھوکر ناشتے پر [illegible] منی بھی پنکھا لے کر اس کے سامنے بیٹھ جاتی۔ لال کھاتا جاتا اور کبھی ادھر ادھر کی کبھی اپنے پڑھنے لکھنے کی باتیں کرتا جاتا۔ منی گوش شوق بنی ہوئی اسی کی باتیں سنتی رہتی اور اس کی نگاہیں اس کے چہرے پر گڑی ہوتیں۔ بوڑھی رانی دور بیٹھی اس روح افزا منظر سے مسرت اندوز ہوتی اور اپنی خوش بختی پر ناز کرتی۔

منی نے سکول میں [illegible] اور سینے پرونے کا کام اچھی طرح سیکھ لیا تھا لال سکول جاتا تو وہ سوئی تاگا لے کر بیٹھ جاتی۔ کبھی رومال کاڑھتی رہتی۔ کبھی مفلر اور گلوبند اور کبھی پنکھا بناتی اور جب کوئی چیز تیار ہوجاتی۔ تو لال کو دکھا کر کہتی۔ دیکھو تو یہ تمہیں پسند ہے؟

لال۔ پسند کو پوچھتی ہو۔ جی چاہتا ہے تمہارے ہاتھ چوم لوں۔

منی۔ تو لوگے اس کو؟

لال۔ بھلا ایسی اچھی چیز کسی کو ملے اور وہ نہ لے؟

منی۔ اچھی چیز مفت نہیں ملا کرتی۔

لال۔ پھر؟

منی۔ دام دینے پڑیں گے۔

لال۔ کتنے؟

منی۔ بہت زیادہ۔

لال۔ کچھ بتاؤ گی بھی۔

منی۔ نہ دے سکو گے۔

لال۔ تو یہ کہو تمہیں دینا ہی نہیں ہے۔

منی۔ اچھا لو۔ تم یوں ہی لے لو۔ لیکن دیکھو سکول سے آنے میں اتنی دیر نہ کیا کرو۔ تم نہیں رہتے تو مجھے گھر بالکل اُداس اُداس معلوم ہوتا ہے۔

یہ کہتے کہتے منی کی آواز گلوسی ہوجاتی۔

لال منی کے تحفے کو لے کر اپنی نگاہیں اس کے چہرے پر جما دیتا اور ایک لمحے کے بعد کہتا۔ منی! تم میرے لئے اپنے خوبصورت اور نازک ہاتھوں کو اسقدر تکلیف کیوں دیتی ہو؟

منی اپنی پتلی پتلی گلابی انگلیوں کو لال کے منہ پر رکھ دیتی۔ کہتی لال! تم یہ کیا کہتے ہو؟ میں تمہارے لئے کچھ تھوڑے ہی کرتی ہوں۔ میں تو اپنے دل کو خوش کرنے کے لئے کرتی ہوں۔ کہتے کہتے جیسے منی کی آواز میں لرزش پیدا ہوجاتی۔ اور لال کسی خاص خیال میں ڈوب جاتا

اسی طرح صبح کے بعد شام اور شام کے بعد صبح مہینے کے بعد سال اور سال کے بعد مہینے ہوتے لال کی عمر اٹھارہ برس کی اور منی کی پندرہ سال کی ہوگئی۔ اب ان کے نام ہی بچپن کے تھے۔ دوسری تمام چیزیں

بدل گئی تھیں۔ جسم بھی بدل گیا تھا۔ دل بھی بدل گئے تھے۔ بچپن کے بھولے بھالے دل جوانی کے سوچنے سمجھنے والے دل بن گئے۔ ان میں جذبات کی موجیں اٹھنے لگی تھیں۔ میٹھا میٹھا سا درد محسوس ہونے لگا تھا۔ جسم میں بھی زبردست تغیر و انقلاب ہو گیا تھا۔ گلاب اور کنول سے چہرے آفتاب و ماہتاب سے چشمک کرنے لگے تھے۔ شباب کے ہنگامے میں طفلی کا نام و نشان بھی باقی نہ تھا۔ لال اور رانی اب بھی اپنے جھوٹے سے باغ میں جاتے۔ لیکن اب پہلے کی طرح باغ میں ہنگامہ برپا نہ ہوتا۔ چہل نہ مچتی۔ دونوں بتوں کی طرح جا کر بنچ پر بیٹھ جاتے۔ لال دیر تک نہ جانے کیا سوچا کرتا اور منی رہ رہ کر کن انکھیوں سے اس کی صورت دیکھ لیا کرتی اور کسی خیال میں غرق ہو جاتی۔ کبھی کبھی لال کا استغراق اضطراب میں بدل جاتا۔ وہ اپنی بیقرار آنکھیں منی کے گلگوں چہرے پر جما دیتا۔ اور اس کے منہ سے بے اختیار نکل جاتا۔ منی؟

منی کے سرخ سرخ گال اور شہابی ہو جاتے۔ اس کا سر خود بخود جھک جاتا۔ اس کی آبدار رسیلی آنکھیں نیچی ہو جاتیں۔ صرف گلا سترنم ہو جاتا۔ لال!

لال کچھ کہہ نہ سکتا۔ دل میں ایک طوفان برپا ہو جاتا جو اسے بولنے سے

ظاہر کر دیتا۔

منی کہتی۔ چپ کیوں ہو گئے۔ کیا کہتے ہو کہو۔

وہ ہمت کر کے اپنا سر اوپر اٹھاتی اور لال کی طرف دیکھتی

لال بڑی مشکلوں سے کہتا۔ کیا کہوں منی۔

اور پھر کسی ادھیڑ بن میں پڑ جاتا۔ منی بھی خاموش ہو جاتی اور کسی خاص فکر و کاوش کے گرداب میں غوطے کھانے لگتی۔

ایک روز رانی نے لال سے کہا۔ تمہیں کچھ منی کی بھی فکر ہے؟

لال کھانا کھا رہا تھا۔ رانی کے سوال نے اسے پریشان کر دیا گر ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں لئے ہوئے اس نے رانی سے پوچھا کیسی فکر پھوپھو! رانی کو کیا ہوا ہے؟

رانی نے کہا۔ اسے ہوا کیا ہے۔ لیکن تم یہ نہیں دیکھتے کہ وہ بالکل سیانی ہو گئی ہے۔ کوئی لڑکی ہمیشہ اسی طرح تو رکھی نہیں [illegible]کتی۔ اس کی شادی تو کرنی ہی پڑے گی اس سلئے پوچھتی ہوں۔ اس بارے میں تم کیا کر رہے ہو؟

رانی مسکرانے لگی۔

لال کا چہرہ اتر گیا۔ کانپتی ہوئی آواز میں اس نے کہا۔ پھوپھو! میں نے تو اس کے متعلق کچھ بھی نہیں کیا۔ میرے تو خیال میں بھی کبھی یہ بات نہیں آئی کہ مجھے منی کی شادی کرنی پڑے گی۔ تمہارے کہنے سے خیال

شاد مرحوم کی ایک غزل
(غیر مطبوعہ)

سوا اس نازنیں کے کب کوئی دل میں سماتا ہے
پلٹ جاتا ہوا لٹے پاؤں جو آنکھوں تک آتا ہے

اٹھا لو جام کو رندو وبالِ جاں ہے مے پینا
مجھے ہنستا ہوا ساقی کا چہرہ یاد آتا ہے

وہ اور قاصد سے میری حال پرسی؟ میں نہ مانوں گا
میں سمجھا اے خیالِ یار تو باتیں بناتا ہے

محبت کر کے میں حسرت زدہ کس گو مگو میں ہوں
نہ تجھ کو صبر اے دل اور نہ رونا مجھکو آتا ہے

مری دیوانگی ناصح کا عاقل بن کے سمجھانا
اس افسانے کو جو سنتا ہے گھڑیوں مسکراتا ہے

یہ کیا کہتا ہے اے ناصح کہ اب کے یوں نہیں یوں کر
ہزاروں کو پڑھا چھوڑا ہمیں کو تو پڑھاتا ہے

ہو رہا ہے۔ اب فکر کروں گا۔

اس روز لال سے پیٹ بھر کھانا نہیں کھایا گیا۔ رانی کے کہنے پر بھی کہ اب منی کی شادی کی تم نہ فکر کیا۔ بہت بھر کھانا تو کھائے لال یہ کہہ کر کہ "آج اچھی طرح بھوک نہیں تھی" اٹھ گیا اور جلدی سے کپڑے پہن کر کالج چلا گیا۔

آج شام کو لال کالج سے لوٹا تو اس کا چہرہ اُداس تھا منی نے بھی دوڑ کر اس کا خیر مقدم نہیں کیا۔ اس سے لال کی افسردگی اور بھی بڑھ گئی۔ وہ ہاتھ منہ دھو چکا تو رانی جلدی سے ناشتے کی طشتری اٹھا لائی لیکن لال نے طشتری کی طرف دیکھا بھی نہیں۔ کہا۔ پھوپھو طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ تھوڑی دیر باغ میں تفریح کرنے جا رہا ہوں۔ ابھی نہ کھاؤں گا۔

لال باغ چلا تو منی بھی ... ن کر ساتھ ہو لی۔

دونوں خاموش بنچ پر بیٹھ گئے۔ دونوں کسی خیال میں ڈوبے ہوئے تھے۔ تھوڑی دیر بعد لال کو قدرے سکون ہوا تو اس نے منی کی طرف دیکھا۔ منی کے چاند سے چہرے کو فکر و تشویش کے بادل نے دھندلا کر رکھا تھا وہ پھر ایک ٹھنڈی سانس لے کر سوچ میں پڑ گیا کچھ دیر کے بعد اس نے پھر منی کی طرف نگاہ کی۔ منی کی کالی کالی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں جن کے ساتھ ہلکی سی سوجن بھی پائی جا رہی تھی لال کا دل بھر آیا۔ اس نے گلوگیر آواز میں کہا۔ منی!

"لال" منی کی آواز بھی گلوگیر تھی اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

لال کی آنکھیں بھی اشک آلود ہو گئیں۔ اس نے ایک ریشمی رومال سے منی کے آنسو پونچھے اور کہا۔

پگلی کہیں کی۔ روتی کیوں ہے۔

منی۔ پھوپھو مجھے گھر سے نکالنا چاہتی ہیں۔

لال۔ نوجوان لڑکی کہاں کب تک گلے باندھا جا سکتا ہے۔

منی۔ تم کیوں ان کا ساتھ دے رہے ہو؟

لال۔ میں بھی تو اپنا فرض ادا کرنے پر مجبور ہوں۔

منی۔ ہائے تم بڑے بے مروت ہو لال۔

منی سسکیاں بھرنے لگی اور چلنے کے لئے اٹھی۔ لال نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کے جسم کانپ اٹھے۔ منی کے پاؤں آگے بڑھنے سے رک گئے۔

لال بھی اشکبار ہو گیا۔ اس نے منی کو سمجھاتے ہوئے کہا تمہیں شادی کی گفتگو سے اتنا صدمہ کیوں ہے منی؟

منی نے جواب دیا۔ میں اس گھر سے کہیں جانا نہیں چاہتی۔

لال۔ کیوں؟

منی۔ مجھے نہیں معلوم۔

لال بے چین ہو کر کھڑا ہو گیا۔ اس کے پاؤں خود بخود ادھر اُدھر حرکت کرنے لگے۔ اس کا دماغ کسی گہرے خیال میں غرق ہو گیا۔ اسے یہ بھی خبر نہ ہوئی کہ منی وہاں سے کب چلی گئی۔ لیکن اس کے باوجود وہ کسی نتیجے پر نہ پہونچ سکا۔ اور انتشار خیال میں آپ ہی آپ بڑبڑانے لگا میں بھائی ہوں اور منی بہن۔ محبت کے دو چشمے کسی نامعلوم جگہ سے چل کر اتنے دنوں تک ایک دھارا میں بہتے رہے۔ اور اب ان میں جبریہ جدائی ہو رہی۔ آہ! منی کو کیا معلوم کہ اس کے چلے جانے سے اس کے لال کی زندگی کتنی بے کیف و بے روح ہو جائے گی۔ کچھ بھی ہو۔ اس تلخی کو تو بخوشی یا بجبر حلق سے اتارنا ہی پڑے گا۔ مسرت و شادمانی کا یہ پیالہ تو ایک روز شکست ہو کر رہے گا پھر کیوں نہ اسے رفتہ رفتہ خالی کرنے کی کوشش کی جائے۔

اس روز سے لال اور منی کی زندگی میں ایک نیا انقلاب پیدا ہو گیا۔ دونوں افسردہ اور ملول رہنے لگے۔ دونوں اپنے اپنے کام کرتے تھے۔ لیکن کٹھ پتلی کی طرح۔ منی کی طرف دیکھ کر لال کی نگاہیں خود بخود جھک جاتیں اور جیسے کوئی بڑی فکر اس کا گلا گھونٹنے لگتی۔ یہی حالت منی کی تھی۔ لال کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آتے۔ وہ آہستہ آہستہ لال کے سامنے سے چلی جاتی منی کی افسردگی ضعف و نقاہت کی صورت اختیار کرتی گئی۔ چنانچہ ایک ہی ہفتہ میں ایسا معلوم ہونے لگا۔ مہینوں کی بیماری سے

اٹھی ہو۔ نہ چہرے پر وہ سرخی و شادابی رہی نہ آنکھوں میں وہ کشمکش و جاذبیت۔ موسیقی طراز گلے میں شکستہ تاروں کی سی جھنجھناہٹ پیدا ہوگئی۔ وہ گھنٹوں پلنگ پر پڑی اداس آنکھوں سے چھت کی طرف دیکھتی رہتی۔ لال آتا اور منی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر پوچھتا منی! کیسی طبیعت ہے؟

"اچھی ہے مجھے تنگ نہ کرو" منی ہاتھ چھڑا کر منہ دوسری طرف پھیر لیتی۔

لال گھنٹوں منی کے پاس بیٹھا رہتا۔ اسے طرح طرح سے سمجھاتا۔ ادھر ادھر کی باتیں سناتا لیکن منی ایک لفظ نہ بولتی۔ صرف کبھی کبھی لال کی طرف دیکھ لیتی۔ ایک روز منی کو حرارت ہوگئی۔ لال ڈاکٹر کو بلا لایا۔ ڈاکٹر نے دیکھ کر کہا۔ مرض تو کوئی نہیں ہے صرف دل کمزور معلوم ہوتا ہے۔

لال نے پڑھا تھا کہ دماغی صدمے سے دل کمزور ہو جاتا ہے اور بعض اوقات اس کا انجام بہت خراب ہوتا ہے۔ ڈاکٹر کی تجویز نے لال کو پریشان کر دیا۔ اس روز اس نے کچھ کھایا پیا نہیں۔ سونے کا وقت ہوگیا لیکن وہ منی ہی کے پاس بیٹھا رہا۔ رانی نے کہا۔ اس قدر متفکر ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ حرارت ہوگئی ہے نکل جائے گی۔ اب جا کر سو رہو۔ کیا اپنی طبیعت بھی خراب کرو گے۔

منی نے بھی کہا۔ تم ناحق میرے لئے اس قدر پریشان ہوتے ہو۔ جا کر سو کیوں نہیں رہتے۔

لال نے جواب دیا۔ سو رہوں گا۔

منی کی آنکھوں میں بھی نیند نہ تھی۔ رنج و فکر نے اس کی نیند اڑا دی تھی۔ منی کروٹ بدلتی تو لال پوچھتا کیسی طبیعت ہے؟

منی جواب دیتی۔ اچھی ہے۔ تم ابھی تک نہیں سوئے؟

لال کچھ نہ بولتا۔ منی بھی چپ ہو جاتی۔

کسی طرح صبح ہوئی۔ منی کی طبیعت کچھ اچھی تھی۔ لال کو بھی قدرے اطمینان ہوا۔ منی نے یکایک پوچھا۔ تم میرے لئے اس قدر فکرمند کیوں ہو؟ میں تمہاری کون ہوں؟

لال۔ مجھ سے پوچھتی ہو۔ اپنے دل سے کیوں دریافت نہیں کرتیں؟

منی۔ اس سے کیا پوچھوں؟ وہ تو غم سے پاش پاش ہو رہا ہے۔ تڑپ رہا ہے۔ اس سے کیسے پوچھوں؟

لال چپ ہوگیا۔ اس کی آنکھیں نمناک ہوگئیں۔

منی نے پوچھا۔ آخر تم اس قدر پریشان کیوں ہو رہے ہو؟

لال۔ تمہاری پریشانی دیکھ کر۔

منی۔ اگر میں خوش رہوں۔

لال۔ تو میں بھی خوش رہوں گا۔

منی۔ اچھا اب میں خوش رہنے کی کوشش کروں گی۔ بشرطیکہ تم پھوپھی کے ساتھ مل کر مجھے گھر سے نکالنے کی تجویزیں سوچنا چھوڑ دو۔

پاگل کہیں کی۔ خود بھی پریشان رہتی ہے اور لال کو بھی پریشان کرتی ہے۔ اچھا اب میں تیری شادی کی بات نہ کروں گی۔" یہ کہتی ہوئی رانی وہاں آ پہنچی۔

منی نے بے اعتمادی کی نظروں سے رانی کی طرف دیکھا۔ اس نے منی کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

بیٹی! اطمینان رکھ۔ میں تجھے اس گھر سے کہیں نہ جانے دوں گی تو ہمیشہ اسی گھر میں رہے گی۔

رانی کے ان مختصر الفاظ میں مسرت و شادمانی کی نہ جانے کون سی بجلی تھی جو ایک ساتھ منی اور لال کے قلب و دماغ میں دوڑ گئی اور دونوں کے دھندلائے ہوئے چہرے گلاب کے تازہ پھول کی طرح شگفتہ ہوگئے۔ منی اور لال کے وہم و گمان میں بھی یہ بات نہ آئی تھی کہ ان کے کان کبھی یہ خوشخبری سن سکیں گے۔ وہ دونوں مسرت آمیز حیرت سے رانی کی طرف دیکھنے لگے۔

رانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اگر تم دونوں کو آپس میں بیاہ دیا جائے تو کیسا ہو۔

منی اٹھ بیٹھی اور ہنستے ہوئے بولی۔ بھائی بہن میں بھی کہیں شادی ہوتی ہے؟ تم کیسی گندی بات کرتی ہو پھوپھو۔

نہ تو ہی باہر جانے پر راضی ہے اور نہ لال ہی تیرا باہر جانا پسند

کرتا ہے تو پھر اس کے سوا اور چارہ ہی کیا ہے کہ تم دونوں کی شادی کر دی جائے؟ رانی نے مسکرا کر کہا۔

"میں تمہارے پاؤں پڑتا ہوں پھوپھو۔ ایسا نہ کرنا۔ ہمیں اسی طرح رہنے دو۔ ہم بہن بھائی اسی طرح اپنی زندگی خوش خوش گذارنے کو تیار ہیں"۔ لالؔ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔

"تم دونوں بھائی بہن تھوڑے ہی ہو لالؔ"۔ رانی متانت سے بولی۔

تو اور کون ہیں پھوپھو۔ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ لالؔ نے حیرانی سے پوچھا۔

"ویسے تو میں نہ جانتی ہوں بیٹا! تم کیا جانو گے؟"

رانی نے اسی طرح متانت سے جواب دیا۔

لال۔ جو کچھ بھی ہو لیکن لوگ تو ہم دونوں کو بھائی بہن سمجھتے ہیں۔

رانی۔ مجھے دنیا کے سمجھنے سے کیا واسطہ۔ اصلیت سے تو میں واقف ہوں۔ دنیا کیا جانے؟

تم دونوں کو بھائی بہن کی شکل میں دیکھنے میں بھی نسوانی زندگی کی ایک آرزو تھی وہ پوری ہو گئی۔ میری تمنا تم دونوں کو شوہر بیوی کی صورت میں دیکھنے کی باقی ہے۔ اب اسے بھی پورا کرنا چاہتی ہوں۔ اس کے بعد مجھے سکون و اطمینان کے ساتھ مرجانے کے سوا کوئی حسرت باقی نہ رہے گی۔

منیؔ اور لالؔ نے رانی کی زبان سے کبھی ایسی بات نہیں سنی تھی۔ وہ دونوں بت بنے تعجب اور حیرت سے اس کی بات سن رہے تھے۔ ان کی حیرانی سے پھٹی ہوئی آنکھیں رانی کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔

رانی پھر کہنے لگی۔ بیٹا! تم دونوں میری بات پر تعجب نہ کرو۔ میں کچھ دیوانی نہیں ہوگئی ہوں جو اول فول بک رہی ہوں۔ میں جو کچھ کہہ رہی ہوں ٹھیک کہہ رہی ہوں۔ تم واقعی بھائی بہن نہیں شوہر بیوی ہو۔ تم دونوں کی آپس میں شادی بھی ہو چکی ہے۔

منی کے افسردہ چہرے پر سرخی سی دوڑ گئی۔ لالؔ اور بھی حیرت زدہ ہو کر بولا۔

پھوپھو! تم یہ سب کیا کہہ رہی ہو۔ مجھے بہت تعجب ہو رہا ہے تم کہتی ہو میں دیوانی نہیں ہوگئی ہوں پھر تم کیسی بات کر رہی ہو؟

رانی نے کہا۔ بیٹا! تمہاری شادی کی کہانی جتنی دلچسپ ہے اتنی ہی دردناک بھی ہے۔ یہ جس زمانے کی بات ہے۔ منی کے باپ علیگڑھ میں ڈپٹی کلکٹر تھے۔ ان کے ہاں کئی بچے پیدا ہوئے لیکن سب کے سب مرتے گئے۔ یہاں تک کہ ان کا بڑھاپا آگیا۔ وہ اپنی کبرسنی اور خالی گھر کو دیکھ کر بہت مغموم رہتے تھے۔ یکایک تم انہیں مل گئے تم ان کے ایک خاص دوست کے بیٹے ہو۔ تم دو برس کے تھے کہ تمہاری ماں کا انتقال ہو گیا۔ تمہارے باپ نے تمہیں منی کے باپ کی گود میں ڈال دیا کہا۔ بھائی میں بوڑھا آدمی ٹھہرا۔ نہ جانے کب میرے کوچ کا وقت آجائے تو اس بچے کو کون دیکھے گا؟ تمہارے ہاں اس کی پرورش ہو جائے گی۔ اسے لاوارثی کی مصیبت سے دوچار نہ ہونا پڑے گا۔ اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد تمہارے والد بھی چل بسے۔ منی کے باپ نے ان کی کل جائداد فروخت کر کے روپے تمہارے نام بینک میں جمع کر دیئے۔

تمہیں پاکر منی کے باپ ماں بیٹے کا غم بھول گئے۔ تم ان کے لئے حقیقی بیٹے کی طرح عزیز ہو گئے۔ تمہیں ان کے ہاں آئے ایک سال بھی پورا نہیں ہوا تھا کہ تمہاری شریک زندگی منی پیدا ہوئی۔ اس سے ان کا گھر ایک نئی خوشی کا گہوارہ بن گیا۔ وہ تمہیں مبارک سمجھ کر اور محبت کرنے لگے۔

ابھی منی ایک برس کی بھی نہیں ہوئی تھی کہ اس کی ماں دنیا سے چل بسی۔ بے چاری تمہاری کوئی خوشی دیکھ نہ سکی۔ منی کی ماں کے مرنے سے اس کے باپ بڑی مصیبت میں پڑ گئے۔ مرد دو دو بچوں کو کیا سنبھال سکتا ہے؟ وہ سسرال سے مجھے اپنے ہاں لوا لائے۔ وہ میرے رشتے کے بھائی ہوتے تھے۔ میں بچپن کی بیوہ تھی اور سسرال میں جانور سے بدتر زندگی گذار رہی تھی۔ تم دونوں کی بدولت میں نرک سے سورگ میں آئی۔ بھیا نے تم دونوں کو میرے سپرد کر کے کہا۔

بہن! بچے تمہارے حوالے ہیں۔ اب تمہیں ان کی ماں ہو جس طرح چاہو انہیں رکھو۔

میں تم دونوں کو پاکر اپنی نامراد زندگی کی ساری مرادیں پاگئی۔ میرا سویا ہوا نصیب جاگ گیا۔ میری مرجھائی دل کی کلی کھل گئی۔ میرے غم زدہ دل کو دنیا کی ساری مسرتیں حاصل ہوگئیں۔

ایک روز بھیا نے نہ جانے کیا سمجھ کر کہا۔ بہن! اگر لال اور منی کی شادی کر دی جائے تو کیسا ہو؟ اس وقت تم کوئی پانچ برس کے تھے۔ اور منی تو دو ہی سال کے قریب کی تھی۔ میں نے کہا۔ ایسے بچوں کی بھی کہیں شادی ہوتی ہے بھیا! کیا لڑکوں کا کھیل کھیلو گے؟

بھیا بولے۔ اسے تو میں بھی سمجھتا ہوں بہن۔ لیکن کیا کروں جتنے بچے ہوئے ایشور سب کو چھینتے گئے۔ زندگی کی کوئی آرزو پوری نہ ہوئی۔ بیوی تو دل کی ساری حسرتیں دل ہی میں لئے ہوئے دنیا سے چلی گئی۔ میری زندگی کا بھی کیا اعتبار ہے۔ یہ دونوں بچے ہیں۔ شادی نہیں تو شادی کے کھیل ہی کھیل کر دل کی آرزو پوری کر لوں۔ مر گیا تو کھیل کی آرزو بھی رہ جائے گی۔

یہ کہتے کہتے ان کی آنکھیں اشک آلود ہو گئیں۔ میرا دل بھی بھر آیا۔ میں نے کہا:۔

"ہاں بھیا ہوگا تو بہت اچھا۔ میرا کلیجہ بھی ٹھنڈا ہوگا۔ میرے گھر میں یہ کمسن جوڑا بھائی بہن کی طرح کھیلے گا۔ ان کی محبت کتنی پاکیزہ ہوگی۔ ان کو دیکھ کر ہمیں کیسی خوشی ہوگی۔ ضرور ان کی شادی رچانی چاہئے۔ ایسا کھیل کسی نے نہ کھیلا ہوگا۔

بھیا ہنسنے لگے۔ بولے۔ سچ کہتی ہو۔ یہی کھیل دیکھنے کے لئے تو میرا دل بے اختیار ہو رہا ہے۔ ہم بہت دنوں تک یہ کھیل دیکھتے رہیں گے اور اپنے تپیدہ دلوں کو ٹھنڈک پہونچاتے رہیں گے۔ وقت آنے پر جب اس راز کا انکشاف ہوگا تو بچوں کو کتنا تعجب ہوگا۔ کتنی خوشی ہوگی۔ وہ وقت بھی دیکھنے کے قابل ہوگا۔

اسی سال علیگڈھ ہی میں بڑی دھوم سے تم دونوں کی شادی ہوئی۔ اس کے بعد بھیا پنشن لے کر یہاں چلے آئے اور بڑے شوق و حوصلے سے تم دونوں کے لئے یہ کوٹھی بنوائی لیکن افسوس کہ وہ زیادہ دنوں تک تم دونوں کے کھیل دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے۔ ہیضے کی ہوا کے ایک ہی جھونکے نے ان کی زندگی کا چراغ بجھا دیا۔

یہ کہکر رانی رونے لگی۔ لال اور منی کی آنکھوں سے بھی آنسو جاری ہوگئے۔

(ترجمہ)

رنگِ تغزل

از:—

(حضرت سید شاہ شاہد علی صاحب فانی سبز پوش رئیس اعظم سجادہ نشین خانقاہ رشیدیہ)

تھے رات کہاں خیر سے دیکھو تو اِدھر کو
یہ دل نہیں میرا جو چرا تے ہو نظر کو

اس وقت بھی اب جائیے دشمن ہی کے گھر کو
شب بھر تھے کہاں آپ جو آئے ہیں سحر کو

جلتا ہے جگر آگ لگی اپنے ہی گھر کو
اے آہِ شرر بار سلام ایسے اثر کو

دامن کو بچائے ہوئے جاتے ہیں وہ گھر کو
اے آہ! پکڑ دوڑ کے دامانِ اثر کو

بن ٹھن کے اُٹھے تھے کہ چلیں غیر کے گھر کو
اللہ کی قدرت کہ نکل آئے اِدھر کو

رستے میں ملا تھا کوئی؟ دیکھو تو اِدھر کو!
تم اور بھلا جانے لگے غیر کے گھر کو؟

تم اپنے تغافل کا گلہ کیوں نہیں کرتے؟
کیوں دیتے ہو الزام مرے دیدۂ تر کو؟

دم بھر میں کٹے چار پہر وصل کی شب کے
اب آٹھ پہر روتے ہیں اُس چار پہر کو

اس طرح نکل جائے غبار آپ کے دل کا
مٹی میں ملا دیجئے مجھ خاک بسر کو

اک عمر ہوئی پھر کے نہ کچھ میری خبر لی
اب میری خبر جائے گی قاصد کی خبر کو

بل کثرتِ نظارہ سے کھاتی ہے کمر بھی
اللہ اٹھا سکتے نہیں بارِ نظر کو

کب ہوگی سحر شام جدائی کی الٰہی!
اک عمر ہوئی دیکھتے اس شام و سحر کو

ملتے نہیں کامل نظرِ یار کی صورت
کیا جانے ہوئی کس کی نظر اہل نظر کو

ملنا نہیں منظور تو کہہ دیجئے کھل کر
وعدے میں نہ ہو دخل اگر اور مگر کو

فانی کی خبر آگئی فرقت میں تمہاری
جھوٹوں بھی کبھی تم نہ گئے اُس کی خبر کو

افضل خاں علامی

(از جناب کوثر چاندپوری)

نام و نسب اور ابتدائی حالات اصل نام مرزا شکر اللہ تھا۔ عبدالحق کے بیٹے تھے۔ علامی تخلص تھا اور شیراز وطن۔

عبدالحق شیراز کے اکابر میں شمار ہوتے تھے۔ اور شاہانِ عراق کے لشکر میں ہمیشہ ممتاز عہدوں پر مامور رہے۔ افضل خاں نے ابتداءً علم سیاق اور خط نستعلیق میں مہارت پیدا کی چونکہ طبیعت اُلوالعزم اور ترقی پسند پائی تھی۔ خیالات میں بلندی اور ارادوں میں جوش تھا۔ اسی لئے باپ کے مناصب کو آئندہ ترقیوں کے لئے کافی نہ سمجھ کر ترک کردیا اور اہلِ علم کی صحبت اختیار کی۔ ان دنوں شیراز میں علامہ شاہ تقی الدین محمد نسابہ شیرازی علم و فضل۔ اور زہد و اتقا کے لحاظ سے شہرت و ناموری کے مالک تھے۔ یہ بھی ان کے حلقہ درس میں شامل ہوگئے اکثر متداول کتابیں نہایت محنت اور شوق سے پڑھیں عربی میں کمال حاصل کیا۔ حتیٰ کہ شاہ صاحب کے ارشد تلامذہ میں شمار ہونے لگے۔ علامہ کے شاگردوں میں ان کا خاص درجہ تھا۔ اور فرہت و دانشمندی کے اعتبار سے بھی امتیاز رکھتے تھے۔ پھر شیراز سے دار السلطنت قزوین میں آئے اور فرمانروائے وقت کے لشکر میں ملازم ہوگئے۔ جلد ہی ان کی قابلیت اور استعداد سب پر ظاہر ہوگئی۔ اور فرہاد خاں قرامانلو کی ملازمت میں داخل ہوگئے جو شاہ عباس صفوی کا رکن السلطنت اور عمدۃ الدولہ تھا۔ عرصہ تک فرہاد خاں کے قتل ہو جانے پر افضل خاں نے وہاں رہنا مناسب خیال نہ کیا اور ہمدان پہونچ گئے۔ وہاں کے زمانہ قیام میں کچھ دنوں تک مرزا ابراہیم حسین ہمدانی سے استفادہ کیا۔ پھر عتباتِ عالیہ کی زیارت اور عراق کی سیاحت فرمائی۔

قابلیت علمی افضل خاں نہایت فصیح و بلیغ تھے۔ ہیئت ہندسہ اور حساب میں مہارت رکھتے تھے لیکن مزاج میں بے پروائی زیادہ تھی اسی لئے کاغذات پر غور نہ کرتے تھے۔ چنانچہ اس بنا پر بعض لوگوں نے یہ رائے قائم کرلی تھی کہ افضل خاں حساب داں نہیں ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ نہ تھا بلکہ علامی سیاق و سباق میں کافی مہارت رکھتے تھے۔ چنانچہ ماثر رحیمی میں ہے کہ

> امامرزا ے الیہ چوں یک چندے دراوائل سن
> خط نستعلیق و علم سیاق را درزیاد و باقصی الغایت
> رسانید[۱]

صاحب ماثرالامراء نے بھی ماثر رحیمی کے اس بیان کی تائید کی ہے۔ اور اس الزام کو ان کی بے پروائی پر محمول کیا ہے مصنف مذکور لکھتا ہے۔

> انچہ گو یند باایں ہمہ علم و دانش اصلا بکاغذمی رسید
> و سیاق داں نہ بود کہ بنا بر عالی جاہی و بے پروائی
> باشد[۲]

خط نسخ اور نستعلیق نہایت اچھا لکھتے تھے۔ کلام مختصر مگر پر معنی ہوتا تھا۔ زبان کے محاورات پر پورا عبور تھا اور محاورات کو وسعت اور قدرت کے ساتھ استعمال کرتے تھے۔ مختلف عنوانات پر نہایت جامع اور مفید تحریریں لکھ سکتے تھے۔ شعر بھی کہتے تھے۔ مگر افسوس ہے

---

[۱] ماثر رحیمی جلد سوم صفحہ ۲۷

[۲] ماثر الامراء جلد اول صفحہ ۱۵۰۔

کسی کتاب میں انکا کلام دستیاب نہ ہوا۔ عجیب یہ تھا کہ اپنا کام خود نہ کرتے تھے۔ زمانۂ وزارت میں دیانت رائے ناگر گجراتی پر جو انکا پیشکار تھا سارا کام چھوڑ رکھا تھا۔ ہر قسم کے سوال اور جواب کا وہی ذمہ دار تھا۔ چنانچہ ایک ظریف شاعر نے ان کے مرنے پر مرثیہ لکھا تھا جس میں کہتا ہے کہ قبر میں افضل خاں سے سوال کیا گیا تو اس نے کہا۔ دیانت رائے سے پوچھو وہی تمہیں جواب دے گا۔ حقیقت میں یہ افضل خاں کی ایک انتظامی کمزوری تھی۔ جس سے ان کی قابلیت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ ضرور ہے کہ حکام جب اپنے اہل کاروں پر ضرورت سے زیادہ اعتماد کرنے لگتے ہیں اور اپنی ذمہ داریوں کو محسوس نہیں کرتے تو یقیناً انتظامات میں خرابی واقع ہوتی ہے اور غریبوں پر مظالم ہونے لگتے ہیں۔

ہندوستان میں آمد افضل خاں نے خوش قسمتی سے وہ زمانہ پایا تھا جب عبد الرحیم خاں خاناں اپنی شوکت و حشمت اور اقبال و سخاوت کے لحاظ سے جوان تھا اور دنیا بھر میں اس کی قدر دانی و علم نوازی کا شہرہ تھا۔ اگرچہ اکبر کا عہد حکومت ختم ہوچکا تھا۔ مگر اس کے برکاتِ سلطنت کا سایہ ہندوستان پر ہنوز موجود تھا اور شہنشاہِ جہانگیر جو اپنی عیش پرستی اور بادہ نوشی کے باوجود نہایت عادل اور ہوشمند حکمراں تھا۔ دادِ حکومت دے رہا تھا۔

خان خاناں کا نام اہلِ علم کے دلوں پر مقناطیس کا اثر کرتا تھا افضل خاں نے بھی خان خاناں کی علم نوازیوں کی شہرت سنی اور بے اختیار ہندوستان کا رخ کیا۔ خان خاناں برہانپور میں قیام پذیر تھا یہ بھی دریا کی راہ سے بندرِ سورت پر پہونچے وہاں سے برہانپور آئے۔

خان خاناں کے دربار میں بڑی عزت ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لئے گئے۔ خان خاناں حسب عادت نہایت اعزاز و اکرام سے پیش آیا اور انعامات سے سرفراز کیا۔ عرصہ تک اس کی خدمت میں رہے۔ خان خاناں ان کے حال پر خاص توجہ کرتا تھا اور انکی صحبت سے بہت مسرور ہوتا تھا[1]۔

[1] ماثر رحیمی جلد سوم صفحہ ۲۷-۲۸-۲۹-

دربار شاہی میں رسائی اگرچہ خان خاناں کو افضل خاں سے بہت محبت تھی اور وہ ان کو جدا کرنا پسند نہ کرتا تھا مگر جوہر شناس تھا۔ جانتا تھا کہ یہ جوہر قابل شاہی دربار میں پہونچکر ہی اپنے علم و فضل کے شایانِ شان ترقی کرسکتا ہے۔ چنانچہ اس نے جہانگیر سے انکی سفارش کرکے برہانپور میں ایک عمدہ عہدے پر مامور کرادیا۔ اب افضل خاں ملازمین شاہی کے زمرے میں داخل ہوگئے۔ بہت ممکن ہے کہ خان خاناں کو اپنے زوال و ادبار کا یقین ہوگیا ہو اور اس طرح اس نے اپنے وابستگانِ دولت کی آئندہ زندگی سے اطمینان کرنا چاہا ہو۔ بہرحال تین سال تک یہ برہانپور ہی میں رہکر اس عہدے پر فائز رہے، اس کے بعد خان خاناں نے سفارشی عرلضیہ کے ساتھ دربار میں بھیجدیا وہاں پہونچکر شاہزادۂ خرم کے لشکر میں میر عدل مقرر ہوئے۔

خطاب اور اضافہ مناصب رانا کی مہم میں افضل خاں جو اس وقت تک صرف مرزا شکر اللہ تھے۔ شاہجہاں کے ہمدم و ہمراز تھے۔ انہی کے مشورے سے رانا کے ساتھ صلح ہوئی اور مرزا کی اصابت رائے۔ کاردانی اور فراست کا سب کو یقین ہوگیا۔ چنانچہ انہیں سرکار شاہجہاں کی دیوانی پر سرفراز کیا گیا۔ مرزا نے یہاں بھی اپنے فرائض کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ رانا کی مہم طے ہوجانے پر شاہجہاں کی سفارش سے ان کو افضل خاں کا خطاب عطا ہوا[1]۔

بیجاپور کی سفارت مہم دکن کے سلسلہ میں افضل خاں راجہ بکرماجیت کے ہمراہ شاہزادے کی طرف سے بیجاپور بھیجے گئے یہ سفارت مقاصد کے لحاظ سے بہت کامیاب رہی۔ عادل شاہ نے اطاعت کی اور افضل خاں پچاس ہاتھی بہت سا نقد روپیہ اور مرصع آلات بطور پیشکش لے کر آئے۔

دربار شاہی سے انعام سنہ ۱۰۳۰ھ میں افضل خاں شاہزادہ خرم کی طرف سے فتح کی عرضداشت لے کر دربار شاہی میں آئے

[1] ماثر الامراء جلد اول صفحہ ۳۵ و ماثر رحیمی جلد سوم صفحہ ۳۱ -

رخصت کے وقت بادشاہ نے خلعت۔ ہاتھی اور دوات قلم مرصع مرحمت کیا۔ جہانگیر خود اپنی توزک میں لکھتا ہے۔

افضل خاں را رخصت نمودہ کلگی کہ دارائے
ایران فرستادہ بود۔ تعریف آں در جائے خود
نوشتہ شدہ بجہت خرم عنایت نمودہ فرستادم۔
بمشار الیہ خلعت و فیل و دوات قلم مرصع مرحمت
شد[1]

دوبارہ دربار میں

سترھویں سنہ جلوس میں شاہجہاں نے دھولپور کو اپنی جاگیر میں لینے کی درخواست دی اور دریا خاں کو اس کی حفاظت کے لئے بھیجدیا۔ لیکن اس سے پہلے یہی پرگنہ سلطان شہریار کی تنخواہ میں دیا جاچکا تھا۔ اور شریف الملک نے اس کی طرف سے قبضہ حاصل کر لیا تھا۔ دریا خاں پہونچا تو دونوں میں جھگڑا ہوا اور جنگ و جدل تک نوبت پہونچگئی۔ لڑائی کے وقت شریف الملک کی ایک آنکھ گولی کے صدمہ سے ضائع ہوگئی۔ اس واقعہ سے نورجہاں جس کے ہاتھ میں اسوقت حکومت کی باگ تھی اور شہریار کی طرف داری پر مائل تھی۔ نہایت برہم ہوئی۔ بادشاہ بھی ولیعہد سے ناراض ہوگیا۔ اس سے پہلے قندہار کی مہم کے لئے شاہجہاں کی طلبی کا فرمان جاری ہوچکا تھا مگر اب اس کی جگہ شہریار اس مہم پر نامزد ہوا اور شاہجہاں کو حکم دیا گیا کہ قدیم جاگیر کے بدلہ میں دکن۔ گجرات۔ مالوہ کو اپنے تصرف میں لائے اور ان میں سے کسی ملک کو پسند کرکے وہاں قیام کرے۔ اپنے کمکی امراء کو قندہار کی مہم کے لئے بھیجدے۔

شاہجہاں کے لئے یہ موقعہ بہت سخت تھا۔ وہ جاگیر کے تغیر اور اُمرا کی روانگی پر تیار ہوتا ہے تو فوج اور سامان میں کمی ہوتی ہے۔ نیز اثر و اقتدار میں فرق آتا ہے اگر بغاوت و سرکشی پر آمادہ ہوتا ہے تو جہانگیر کی قوت و سطوت سے ٹکرانے کا خوف دامنگیر ہے۔ دوسری صورت پر عمل کرنا جان کی بازی لگانے کا مرادف تھا مگر فوج اور سامان کی کمی بھی خودکشی سے کم نہ تھی۔ مجبوراً شاہزادہ نے افضل خاں کے دربار میں بھیجکر اپنی اطاعت کا یقین دلاتے ہوئے معذرت کی۔

افضل خاں نے نہایت موثر طریقہ پر بادشاہ وقت کے سامنے ثابت کر دیا کہ مہم قندہار کے متعلق جو فیصلہ کیا گیا ہے وہ دور اندیشی اور مصلحت کے بالکل خلاف ہے۔ اتنی زبردست مہم میں ایسی سہل انگاری کسی طرح مناسب نہیں۔ ایسے امور میں عورتوں کی رائے پر عمل کرنا قطعاً ضعف عقل کی دلیل ہے۔ بادشاہ کو خود بھی غور و فکر سے کام لینا چاہیئے۔ شاہزادے کے اعتقاد اور اطاعت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اگر بیگم کے کہنے سے اس کی جاگیر بدلی جاتی ہے تو وہ دشمنوں کے ہجوم میں کیونکر اپنے اثر و اقتدار کو قائم رکھ سکے گا۔ اگر جاگیر بدلی ہی جاتی ہے تو مالوہ اور گجرات کی جگہ بندر سورت عنایت فرمادیا جائے کہ شاہزادہ وہاں پہونچکر گوشہ نشین ہوجائے۔ حقیقت میں یہ خرم کی درخواست کا مضمون تھا۔ افضل خاں نے بہت اچھی طرح اسکو ظاہر کیا۔ شاہزادہ کا اس التجا سے یہ مقصد تھا کہ بادشاہ مہربان ہوجائے اور بغاوت کا الزام اس پر عائد نہ ہو۔ مگر بدقسمتی سے یہ مدعا حاصل نہ ہوسکا۔ مفسدوں نے معاملہ کو خراب کر دیا تھا۔ افضل خاں کی گفتگو اور اس کا زور بیان کوئی مفید نتیجہ پیدا نہ کرسکا۔ اگرچہ بادشاہ پر افضل خاں کی اصلاح کوشی کا اثر ہوا۔ اور اس نے بیگم کو سمجھانے کی کوشش کی مگر وہ پہلے سے زیادہ برہم ہوگئی اور افضل خاں کو بے نیل و مرام واپس آنا پڑا۔

یہ خیال کہ بادشاہ افضل خاں کی گفتگو سے متاثر ہوا ماثر الامراء کا ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جہانگیر بیگم کی رائے اور مرضی کے خلاف کوئی کام نہ کرسکتا تھا۔ اور بیگم شاہجہاں سے ناراض تھی۔ اسی لئے یہ کہنا صحیح نہیں۔ کہ جہانگیر افضل خاں کی طرف ملتفت ہوا اور اسنے بیگم سے سفارش کی۔ اس نے خود اسی واقعہ کو اپنی توزک میں لکھا ہے۔ جس سے ماثر الامراء کے اس خیال کی پوری تردید ہوتی ہے۔

ہم دریں تاریخ افضل خاں دیوان خرم عرضداشت

[1] توزک جہانگیری صفحہ ۳۳۳

اورا آوردہ ملازمت نمود۔ بے اعتدالیہائے خود
سا لباس معذرت پوشانیدہ اورا فرستادہ
کہ شاید بتیاں و چرب زبانیہا کارے از پیش تواند
برد و اصلاح ناہمواری او تواند نمود من خود اصلا
توجہ نہ فرمودم و رو نہ دادم [1]

لیکن بادشاہ کی نظر میں افضل خاں کی جو وقعت تھی اس میں فرق نہ آیا اور آسے خلعت دے کر رخصت کیا گیا۔ شاہ جہاں کی جاگیر کے متعلق پہلے جو فیصلہ ہو چکا تھا وہی بحال رہا۔

افضل خاں کے بیٹے کا قتل

جہانگیر اور شاہجہاں کے معاملات درست نہ ہوئے اور لشکرکشی تک نوبت پہنچی شاہ جہاں میں لشکر شاہی سے ٹکرانے کی قوت نہ تھی۔ وہ باپ کے مقابلہ سے پھر کر ماندہ ہوتا ہوا برہانپور پہونچکر مقیم ہوا یہاں بعض مہمات کے طے کرنے کو افضل خاں کو بیجاپور بھیجا گیا۔

سلطان پرویز۔ مہابت خاں کی اتالیقی میں شاہجہاں کے تعاقب پر مامور ہوا تھا اس نے برہانپور میں بھی شاہجہاں کو ٹھہرنے نہ دیا۔ اور وہ تلنگانہ کے راستہ سے بنگالہ کی طرف بڑھا۔ اکثر ملازموں نے بیوفائی کی اور اس سے جدا ہو گئے۔ مرزا محمد ولد افضل خاں بھی اپنی ماں اور بچوں کو لے کر بھاگ گیا۔ شاہزادہ نے سید جعفر بارہہ کو اس کا پیچھا کرنے کا حکم دے کر کہا کہ مرزا محمد کو واپس لے آئے اگر اطمینان اور تسلی دینے سے نہ لوٹے تو سر کاٹ کر لے آئے۔

سید جعفر نے مرزا محمد کو بہت سمجھایا مگر وہ لڑنے مرنے پر آمادہ ہو گیا اور سید جعفر کو زخمی کر دیا پھر خود بھی میدان میں کام آیا اس کا سر کٹ کر شاہجہاں کے پاس پہونچا۔ افضل خاں اس وقت بیجاپور میں تھا۔ اس نے بیٹے کی ہلاکت کا حال سنا تو بہت رنجیدہ ہوا۔ افضل خاں کے اس سفر کے متعلق توزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ شاہجہاں نے امداد طلب کرنے کی غرض سے اس کو عادل خاں کے پاس بیجاپور بھیجا تھا اور عادل خاں کے لئے بازوبند بھی بھیجے تھے۔ ملک عنبر کے لئے گھوڑا۔ ہاتھی اور شمشیر مرصع بھیجی گئی تھی۔ افضل خاں پہلے عنبر کے پاس گیا اور اپنا مقصد بیان کیا۔ عنبر نے جواب دیا کہ میں عادل خاں کے تابع ہوں۔ دکن میں اس وقت وہی سب سے قوی اور صاحب فوج ہے تمہیں پہلے اس کے پاس جانا چاہئے اگر وہ تیار ہو جائے گا تو میں بھی یقیناً تمہاری مدد کرونگا۔ افضل خاں وہاں سے عادل خاں کی خدمت میں گیا مگر وہ بہت بری طرح پیش آیا عرصہ تک شہر کے باہر ٹھہرائے رکھا۔ اور کوئی توجہ نہ کی بلکہ طرح طرح سے ذلیل کیا۔ شاہ جہاں نے عنبر کے لئے جو کچھ بھیجا تھا۔ عادل خاں نے وہ بھی افضل خاں سے لے لیا۔ افضل خاں یہیں تھا کہ بیٹے کے قتل کی اطلاع پہنچی [2]

میر سامانی کا عہدہ

بنگالہ سے لوٹ کر شاہ جہاں نے سنہ ۱۰۳۵ھ میں بہت سی پیشکش دے کر افضل خاں کو دربار جہانگیری میں بھیجا۔ جہانگیر نے افضل خاں کو واپس نہ جانے دیا اور اپنے پاس رکھ کر خان سامانی کے عہدے پر سرفراز کر دیا۔ سنہ ۲۲ جلوس جہانگیری میں جہانگیر کشمیر کی سیر کو گیا۔ افضل خاں راستہ کی صعوبت کے خیال سے زائد کارخانوں کے ساتھ لاہور میں رہ گیا۔

شہریار کی وکالت و مدار المہامی

کشمیر سے واپس آتے وقت جہانگیر کا انتقال ہو گیا۔ شہریار نے لاہور میں اپنی سلطنت کا اعلان کر دیا۔ افضل خاں خوش قسمتی سے وہیں تھا۔ شہریار نے اس کو اپنا وکیل اور مدار المہام بنا دیا۔

افضل خاں کی حکمت عملی

افضل خاں اگرچہ شہریار کا وزیر تھا مگر وہ اس کی حکومت کو پسند نہ کرتا تھا بلکہ باطن میں شاہ جہاں کا حامی تھا۔ ایک دن شہریار نے بایسنغر کی سرکردگی میں اپنا لشکر آصف خاں سے لڑنے کو بھیجا۔ بعد میں خود بھی سوار ہو کر جانا چاہا۔ افضل خاں اسے روک کر اصرار کے ساتھ کہا۔ کہ آپ کا لڑائی میں شریک ہونا مناسب نہیں۔ کم سے کم لشکر کی خبر

[1] توزک جہانگیری جلد ۲ صفحہ ۳۵۵

[2] توزک جہانگیری جلد ۲ صفحہ ۳۸۷۔

آنے تک ضرور توقف کرنا چاہئے۔ چونکہ یہ لشکر بالکل غیر تربیت یافتہ تھا اور زبردستی روپئے کے لالچ میں بیکار لوگ جمع ہو گئے تھے۔ شہر یار کی عدم موجودگی میں بغیر آئے ہی سب منتشر ہو گئے۔ شہر یار مجبوراً قلعہ میں آگیا۔

عہد شاہجہانی کے مناصب — ۱۰۳۷ھ میں شاہجہاں اپنے خسر آصف خاں کی امداد اور حسن تدبر سے ہندوستان کا بادشاہ ہوا۔ ۲۶ جمادی الآخر کو افضل خاں لاہور سے آکر قدمبوس ہوا اور چار ہزاری ہو کر بدستور میر سامانی پر مامور ہوا۔

وزارت — ۲ سنہ جلوس میں ارادت خاں ساوجی کی جگہ افضل خاں دیوانی کل کے مرتبہ پر فائز ہوا۔ منصب میں ایک ہزار کی ترقی ہوئی۔

" شد فلاطون وزیر اسکندر "

اس کی وزارت کی تاریخ ہے۔

۱۰ سنہ جلوس میں افضل خاں نے بادشاہ کو اپنے گھر مدعو کیا اور منزل افضل سے قصر خلافت تک جس کا فاصلہ پانچ جریب ہے۔ نہایت قیمتی کپڑوں کا فرش بچھایا۔ ۱۱ سنہ جلوس میں وہ ہفت ہزاری بنا دیا گیا۔

انتقال — ۱۰۴۸ھ میں افضل خاں بیمار رہا اور صحت کی امید منقطع ہو گئی۔ بادشاہ خود عیادت کو گیا اور افضل خاں کو تسلی دی۔ آخر ۱۷ رمضان ۱۰۴۸ھ کو ستر سال کی عمر میں بمقام لاہور اس کا انتقال ہو گیا۔

" زخوبی برد گوئے نیک نامی "

تاریخ وفات ہوئی[1]

" علامی از دہر رفت " سے بھی تاریخ نکلتی ہے اس کی قبر آگرے میں جمنا کے کنارے پر واقع ہے اور " چینی روضہ " کے نام سے مشہور ہے۔

افضل خاں نے آٹھ سال تک وزارت کی وہ بہت ہی مہذب اور رحم دل وزیر تھا۔ شاہجہاں اس کی نسبت کہا کرتا تھا کہ افضل خاں کی زبان سے اس کے اٹھائیس سالہ زمانہ ملازمت میں کبھی ہم نے کسی کی برائی نہیں سنی۔

اولاد — افضل خاں کا ایک بیٹا مرزا محمد تھا جو شاہجہاں کے حکم سے دوران جنگ میں قتل کر دیا گیا تھا۔ انتقال کے وقت کوئی اولاد نہ تھی۔ اپنے بھتیجے عنایت اللہ خاں المخاطب بہ " عاقل خاں " کو گود لے لیا تھا[2]

[1] مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۱۵۰۔

[2] مآثر الامرا جلد اول صفحہ ۱۵۱۔

" جب ہم اپنے دوستوں سے جدائی کا تحمل نہیں رکھتے۔ اگر وہ چلے جائیں تو ہم پریشان ہو جاتے ہیں اور یہ نہیں دیکھ سکتے کہ ان سے بھی بہتر دوست میسر آنے ممکن ہیں۔ ہم ماضی کے پرستار ہیں۔ ایک پرانے خیمے میں جہاں ہمیں ایک وقت کھانا اور پناہ ملتی تھی پڑے رہتے ہیں اور یہ نہیں سوچتے کہ اگر روح میں قوت ہے تو وہ پھر خوراک اور طاقت ہمارے لئے پیدا کر سکتی ہے۔ خدا کی آواز ہمیں کہہ رہی ہے کہ ——" ہاں بڑھے چلو " اور ہم ہیں کہ حال و استقبال دونوں کو چھوڑ کر صرف ماضی پر انحصار رکھتے ہیں۔ اور ان عجیب الخلقت مخلوقات کی طرح پیچھے کی طرف دیکھتے ہیں جن کی آنکھیں کہا جاتا ہے کہ پس پشت ہوتی ہیں۔"

ورڈز ورتھ

افسانۂ دل

از:—

(جناب عزیز احمد صاحب عزیز۔ گورکھپوری)

اک نظر دیکھ لے غارت گرِ کاشانۂ دل
پھر تمناؤں سے آباد ہے ویرانۂ دل

ہر سحر ہوتی ہے پیدا شفقِ خونیں سے
رنگ لایا ہے یہاں تک مرا افسانۂ دل

حُسن کی امن پسندی کو سنا دے اے شوق!
پھر باندازِ کہن نعرۂ مستانۂ دل

زحمتِ گوش بس اکبار گوارا کیجے!
ختم ہو جائیگا دو لفظوں میں افسانۂ دل

تم نے آنکھوں سے پلا دی ہی محبت کی شراب
کیف و مستی میں ہے ڈوبا ہوا میخانۂ دل

حُسن سمجھا ہے جسے ناز سے مستیٔ شباب
سینۂ عشق میں ہے لغزشِ مستانۂ دل

یاد آجاتی ہیں جب تیری عنایاتِ قدیم
دیدنی ہوتی ہے بیتابیٔ دیوانۂ دل

ان کے گیسوئے معنبر کو پریشاں کر دے
آج وہ جوش دکھا ہمتِ مردانۂ دل

حسن آغاز ہے جب خونِ تمنائے عزیز
لطف پر دیکھئے کیا ہوتا ہے افسانۂ دل
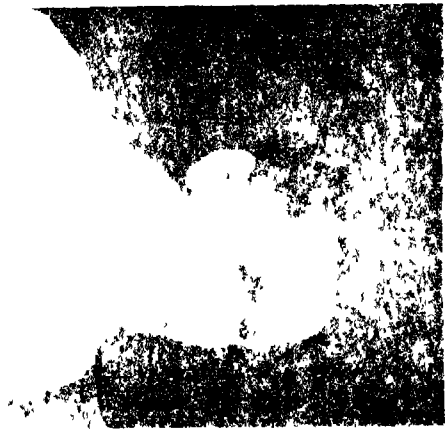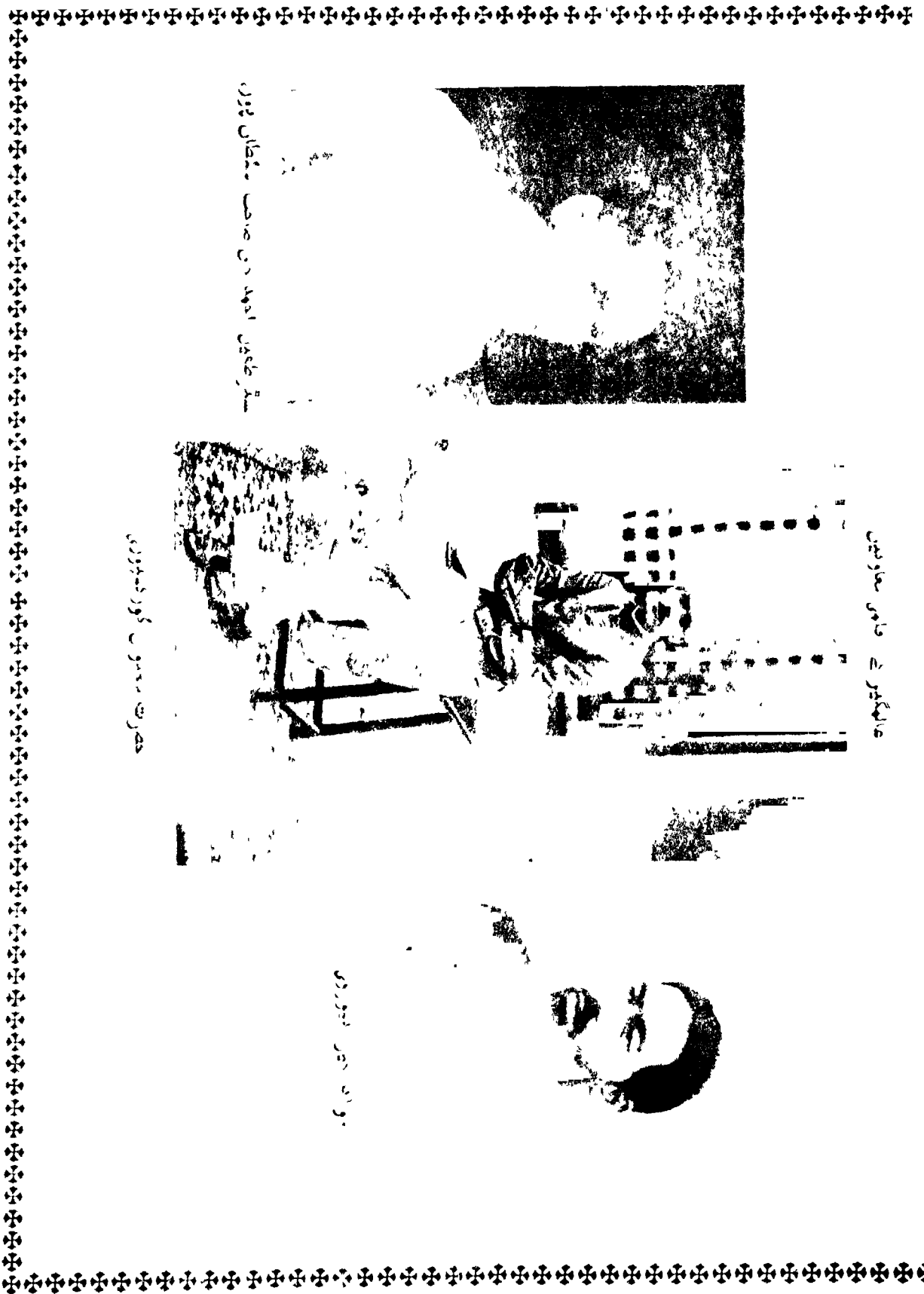
مٹی کا گھڑا

(ایک عبرت خیز افسانہ)

(از جناب طفیل احمد خانصاحب سلطانپوری پٹنہ کالج)

شام کی ہلکی تاریکی پھیلتی جا رہی تھی۔ گھاٹ پر سناٹے میں لہروں کے لڑنے کی مترنم آواز کے علاوہ کچھ اور سنائی نہیں دیتا تھا۔ رجنی اس دن اکیلی تھی۔ اس نے "مٹی کا گھڑا" کمر پر رکھ اور آہستہ آہستہ گھاٹ کی پختہ سیڑھیوں پر چڑھنے لگی۔ سیڑھیوں کے اوپر آسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی ٹہل رہا ہے۔ اوپر پہونچی تو دیکھا کہ "للو بابو" اسے دیکھ کر مسکرا رہے ہیں۔ وہ شرما گئی۔ اس کی پیشانی شرم کے پسینے سے بھیگ گئی۔ اور اس کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ عورت کا دل مرد کو تنہائی میں دیکھکر کانپنے لگتا ہے۔

کہاں جا رہی ہے رجنی گھر؟ کہتے ہوئے "للو بابو" اس کے آگے آکر کھڑے ہو گئے۔

رجنی رک گئی جیسے چلتے چلتے تھک گئی ہو یا کسی نے اس کے پاؤں میں بھاری بیڑیاں ڈالدی ہوں۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں وہ ڈھلکے ہوئے آنچل کو سنبھالنا چاہتی تھی کہ للو بابو بالکل اس کے قریب آگئے۔ وہ ان سے بچ کر نکل جانا چاہتی لیکن اس کا پاؤں پھٹی ہوئی ساری میں الجھ گیا۔ گھڑا زمین پر گر پڑا اور پانی گھاٹ کی سیڑھیوں سے کھیلتا ہوا ادھر ادھر بہنے لگا۔

رجنی سہمی ہوئی ہرنی کی طرح گھڑے کے ٹکڑوں پر نظریں جماکر سوچنے لگی دوسرا گھڑا کہاں سے آئیگا۔ وہ اپنی بوڑھی ماں کو کیا جواب دے گی۔ یہی ایک گھڑا بچ گیا تھا۔ گھر میں کل تین ہی گھڑے تھے۔ یہ آخری تھا ایک کو گائے کے چھوٹے بچھڑے نے توڑ دیا تھا اور ایک کو ننھے سوہن نے۔ اس کی ماں کو کتنا افسوس ہوا تھا اور وہ کتنی روئی تھی۔

"للو بابو" ابھی تک وہیں کھڑے ہوئے مسکرا رہے تھے۔ ادھر ادھر دیکھ کر بولے۔ ڈیوڑھی پر آؤ میں دوسرا گھڑا منگوا دوں گا۔ وہ گاؤں کے بڑے زمیندار کے اکلوتے بیٹے تھے۔ ان کو گھڑوں کی کیا کمی تھی۔

رجنی سہمی ہوئی بلی کی طرح ڈرتے ڈرتے دبے پاؤں گھر میں داخل ہوئی۔ اس کی ماں کہیں گئی ہوئی تھی۔ اس نے اطمینان کے سانس لئے اور چولھے کے پاس بیٹھ گئی۔

جی میں سوچنے لگی۔ "للو بابو" روز گھاٹ پر آتے ہیں۔ مجھے دیکھ دیکھ کر مسکراتے ہیں۔ اور آج تو ——— ؟

رجنی! اس کی ماں نے پکارا۔ اس کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ وہ ایکبار پھر سہم گئی۔ ماں کو کیا جواب دے گی۔

رجنی! اس کی ماں نے پکارا۔ رجنی ابھی تک چپ تھی لیکن کب تک چپ رہ سکتی تھی اس کی ماں چولھے کے پاس پھر آگئی۔ اور بولی۔

اتنی دیر تک کہاں تھی رجنی!

——— رجنی کچھ دیر کے بعد بولی۔ گھاٹ گئی تھی۔

گھڑا ——— رجنی نے ماں کے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔

کیا گھڑا ٹوٹ گیا؟

ہاں۔

بڑھیا۔ رجنی کا منہ دیکھ کر رہ گئی۔ اب بگڑ کر کیا کر سکتی تھی ——— کچھ دیر کے بعد بولی۔

دیکھ رجنی! تو گھڑے بہت پھوڑتی ہے۔ اتنے گھڑے کہاں سے آئیں گے۔ تیرے دادا کے مرنے کے بعد گھر کا جو حال ہے وہ تجھ سے کیا چھپا ہوا ہے۔ گھر کیسے چلے گا اگر تو اسی طرح کام کرے گی؟ اب گھڑا

کہاں سے آئے گا گھر میں پیسے بھی تو نہیں ہیں؟
میں گھڑا لے آؤں؟
کہاں سے لے آئے گی؟
"للو بھیا" کے وہاں سے (گاؤں میں للو بابو بھیا کے نام سے پکارے جاتے تھے) گھاٹ پر وہ بھی کھڑے تھے۔ گھڑا ٹوٹ گیا تو انہوں نے کہا کہ ڈیوڑھی پر آ کر نیا گھڑا لے جانا۔ کتنے غریب پرور ہیں للو بھیا ماں!

رتجنی کی مختصر دنیا ساری ہونے کے باوجود بھی ناکام تمناؤں کی بہت سے انسانوں سے معمور تھی۔

وہ گاؤں کی دلکش فضا اور اپنے دکھ بھرے رومان میں سورج مکھی کے پھول کی طرح زندگی کے لمحے گذار رہی تھی۔ برسات کی بھیگی ہوئی نشیلی رات اور جاڑوں کے چھوٹے چھوٹے دن خیالات سے باتیں کرتے کرتے ختم کر دیتی تھی۔ وہ جی رہی تھی لیکن جینے کے مقصد سے بے خبر تھی۔ بعض وقت وہ سوچنے لگتی کیا وہ اسی طرح پہاڑی پھول کی طرح کھل کر مرجھا جائے گی۔ کبھی کبھی وہ خیال سے گھبرا اٹھتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا کہ وہ ساون کی مست گھٹاؤں کے غول دیکھ کر سہم جاتی اور جب رم جھم رم جھم ہونے لگتی تو جھونپڑی کے ٹوٹے ہوئے دروازے کو بند کر کے سو جاتی۔ وہ گاؤں کی شوخ لڑکیوں کو آم کے باغ میں جھولوں پر پینگیں مارتی دیکھتی تو اس کا دل دھڑکنے لگتا۔ جب اسکی سہیلیاں اسے بلاتی تو وہ ہنسکر ٹال جاتی۔ اسے گویا دنیا کے کھیلوں سے دلچسپی ہی نہ تھی۔ اس کی عمر کا یہ قیامت خیز دور تھا لیکن باغ کی اس معصوم کلی کی طرح جو خزاں رسیدہ ہو کر بھی حسین ہوتی ہے۔

ٹھاکر ہری ہر دت کے مرنے کے بعد سے رتجنی کے گھر کو مصیبتوں نے گھیر لیا تھا۔ دروازے کے سامنے برگد کے پرانے درخت کے نیچے اس کی دو گائیں بندھی رہتی تھیں جنہیں وہ بہت چاہتی تھی۔ تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد وہ گھر میں سے نکلتی اور ناندوں میں ہری ہری گھاس کی مٹھیاں ڈال کر پھر گھر میں چلی جاتی۔ اس کام میں اس کا ہاتھ بٹانے والا کوئی اور نہ تھا اس کے علاوہ گھر کے تمام کام بھی اب اس کو کرنے پڑتے تھے۔ سوتہن ابھی چھوٹا تھا۔ آٹھ نو سال کے بچے کا بساط ہی کیا پھر بھی اس سے رتجنی کی تکلیف دیکھی نہ جاتی تھی۔ خاص کر اس وقت جب وہ بھوری گائے کا دودھ دوہنے جاتی اور اس کا بچھڑا اس کو دق کرنے لگتا۔ رتجنی شام کو گھاٹ سے واپس آ کر جب دوہنے بیٹھتی تو سوتہن بچھڑے کو جو بڑا شریر تھا دور لیجا کر بیٹھ جاتا۔ اور جونہی رتجنی دودھ دوہ کر رکھتی وہ بچھڑے کو چھوڑ دیتا اور خود تالیاں بجا بجا کر لڑکوں میں جو آنکھ مچولی کھیلنے کے لئے منتظر رہا کرتے تھے بھاگ جاتا۔

رتجنی کی بوڑھی ماں بہت کمزور ہو گئی تھی۔ اور اب تو اس کی کمزوری کے دن ہی تھے۔

رتجنی کے مستقبل کو سوچ سوچ کر وہ اور بھی کمزور ہوتی جا رہی تھی۔ سب سے دکھ کی بات رتجنی کا کنوارپن تھا۔ اس نے بس بھر کوئی بات اٹھا نہ رکھی مگر غریب آدمی کی لڑکی کو بڑے گھر والے پوچھتے ہی کب ہیں۔ کئی جگہ بات چل کر بھی رتجنی کی سوئی ہوئی قسمت نہ جاگی۔ ایک دفعہ تو گاؤں کے مہنت جی نے ایک جگہ شادی ٹھیک بھی کر دی تھی مگر تلک اور لین دین کا ایسا جھگڑا پڑا کہ بات نہ بن سکی۔ لڑکے والے دونوں گائیں مانگتے تھے جو اس غریب گھر کی روٹی دال کا سہارا تھیں۔

ایک مرتبہ ایسا ہوا کہ رتجنی کے ایک رشتہ دار نے اپنے لڑکے سے بغیر کچھ لئے دیئے شادی کی تاریخ طے کی مگر گاؤں والوں نے وہاں یہ خبر پہونچا دی کہ وہ بد چلن ہے۔

رتجنی کی ماں نے سنا تو سر پیٹ کر رہ گئی۔ کچھ دنوں کے بعد بات کھل گئی۔ معلوم ہوا کہ للو بابو نے اپنے آدمیوں سے یہ خبر وہاں پہنچوا دی تھی۔ غریبوں کی دنیا میں شک و بد گمانی کا گذر ہی کہاں۔ رتجنی کی ماں کو یقین نہ آیا۔ مگر بات تھی سچ۔

رتجنی کا کچا مکان للو بابو کے پکے مکان سے ملا ہوا تھا۔ برابر تو نہیں تاہم مہینے میں دو چار مرتبہ رتجنی کا للو بابو کے وہاں جانا

ضرور ہو جایا کرتا تھا۔ کبھی نمک کیلئے کبھی اُدھار آٹے دال کیلئے رجنی
رشتے میں للّو بابو کی بھتیجی ہوتی تھی مگر غریب بھائی بھتیجوں کو پوچھتا کون
ہے۔ بات یہ تھی کہ رجنی کے باپ بابو ہری ہردت کو للّو بابو کے باپ نے
جو دوسری ماں سے تھے جائداد سے محروم کر دیا تھا۔ راجپوتی آن
ٹھاکر صاحب جب تک جیتے رہے آنکھ اٹھا کر بھی اپنے مکان کی
طرف نہیں دیکھا۔

رجنی جب للّو بابو کے وہاں جاتی تو اس کا دل زور زور سے
دھڑکنے لگتا۔ کبھی ان کی ڈیوڑھی کا بڑا سا دروازہ دیکھ کر کبھی للّو بابو کا
"بیٹھکا" دیکھ کر وہ آگے پیچھے دیکھنے لگتی اور جلدی سے گھر کے اندر چلی
جاتی۔ للّو بابو جب وہ جاتی تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتے گھورتے
مسکراتے اور کبھی کبھی راستے ہی میں روک کر اس کے گالوں پر ہلکے
ٹھوکر لگا دیتے۔

رجنی کے جسم میں تیز آگ دوڑ جاتی اور گھر آکر وہ پہروں واقعات کے
پہلوؤں پر سوچا کرتی۔

گاؤں کے نوجوانوں میں جنکا کوئی کام نہ تھا۔ رجنی اور للّو
بابو کے سوا کوئی اور تذکرہ نہ تھا۔ وہ جب بھی اکٹھا ہوتے تھے اسی قسم کی
باتیں کیا کرتے تھے۔ رجنی کا اب گھر سے نکلنا بھی دوبھر ہو گیا تھا۔
شام کو گھاٹ پر بھی میلہ سا رہنے لگا تھا۔ لیکن للّو بابو کو اس کی خبر نہ تھی
گاؤں کے بڑے زمیندار کے خلاف کس کی مجال تھی کہ کوئی بات
کہتا۔ ذرا سی کان میں بھنک پڑ جاتی تو قیامت آجاتی۔

بڑے بھائی کے گھر میں رجنی کا للّو بابو کے وہاں آنا جانا اب
زیادہ ہو گیا تھا۔ بات یہ ہوئی تھی کہ للّو بابو کے لڑکے ہونیوالا تھا۔
بہو کے پاس رہنے کے لئے رجنی سے بہتر کوئی عورت گاؤں میں
نہ تھی۔

اپنے گھر سے رجنی کبھی کبھی جب رات میں دیر کو آتی تو للّو
بابو اُسے اپنے بیٹھکے میں روک لیتے اور ادھر اُدھر کی باتوں میں
لگا کر اتنی دیر کر دیتے کہ ڈیوڑھی کا صدر دروازہ بند ہو جاتا اور
وہ نوگرفتار پرندہ کی طرح للّو بابو کی گرفت میں پھڑپھڑا کر رہ جاتی

جھوٹی محبت ختم ہوتے کیا دیر لگتی ہے۔ للّو بابو کا نشہ اتر گیا
پھول کی خوشبو نکل جانے کے بعد کون مالے کو گلے میں ڈالے رہتا
ہے۔ رجنی کا ان کے گھر آنا جانا بالکل بند ہو گیا۔ خود غرضی کی محبت
ختم ہو جانے کے بعد خونی رنگ اختیار کر لیتی ہے ایک دفعہ للّو
بابو نے رجنی کو بلایا لیکن وہ نہ آئی۔ بیچ کے لوگوں نے کیا جانے
رجنی کے وہاں سے آکر للّو بابو سے کیا کہہ دیا کہ وہ اس کی جان کے
پیاسے ہو گئے۔

ساون کا مہینہ تھا۔ مکئی کے کھیت ہوا کے تیز جھونکوں کے
سہارے جھول رہے تھے۔ دیہات میں ساون کا مہینہ بہت
پرکیف ہوتا ہے۔ لیکن رجنی کے گھر میں تو چپت ہی کا موسم تھا۔ اسکے
وہاں بھوسہ ختم ہو گیا تھا۔ گاؤں کی اور لڑکیوں کے ساتھ وہ بھی
گھاس لانے جایا کرتی تھی۔

ایکدن شام کا وقت تھا۔ چراغ جل چکے تھے۔ وہ گاؤں کے
باہر گھاٹ سے کچھ دور گھاس لئے آرہی تھی۔ مہنت جی کے کھیت کے
پاس اسے ایسا معلوم ہوا جیسے کوئی اس کا پیچھا کر رہا ہے عورت کے
احساسات بہت تیز ہوتے ہیں وہ سہم گئی اتنے میں کسی نے اس کا
ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ ڈر کر چیخ اٹھی۔ گھاس زمین پر گر گئی۔ اور اس کی
سانس زور زور سے چلنے لگی۔ للّو بابو بھوکے شیر کی طرح اس کے
سامنے کھڑے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔ رجنی چپ چاپ
بت بنی ہوئی کھڑی تھی۔

شام کو دیہات میں عموماً لوگ سویرے سو جاتے ہیں اور
اکثر کھیتوں میں مچانوں پر بھی سوتے ہیں۔ مہنت جی کا ہلواہا اس
دن مچان ہی پر تھا۔ رجنی کی چیخ سن کر کھیت سے نکلا جب تک
سوندھو چمار بھی اپنے مچان پر سے آگیا۔

للّو بابو آگے بڑھ گئے اور رجنی اپنے گھر چلی گئی۔ اسے
رات بھر نیند نہیں آئی۔ وہ اب خودکشی کرے گی اس نے من
ہی من میں کہا۔

صبح کو للو بابو کے دروازہ پر پنچایت ہوئی اور سوندھو چمار پر یہ الزام لگایا گیا کہ وہ رات رجنی سے باتیں کر رہا تھا۔ دیہات میں یہ وبا بہت کم تھی مگر للو بابو جیسے شہری۔ دیہاتی اب اس کا پرچار کرنے لگے ہیں۔

للو بابو نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ جھوٹ کیسے ہوتا اور جھوٹ ہوتا بھی کیا للو بابو جو کہہ رہے تھے۔ بھلا زمیندار بھی جھوٹ بولتے ہیں۔ بیچارہ سوندھو مارا گیا۔ گالیاں کھائیں۔ پنچ سے باہر ہوا اور جرمانہ کی رقم بھی زمیندار کی جیب میں پڑی۔

سوہن [illegible] گاؤں کے بڑے بوڑھے بڑی حیرت سے اس واقعہ کو سن رہے تھے۔ نکو بابا نے تو یہانتک کہہ دیا کہ یہ ست جگ ہے اس میں یہی سب ہوگا بھیا یہ نہیں والنٹیروں کا قصور ہے جنھوں نے اونچ نیچ کا بھید مٹا دیا ہے ورنہ ایک چمار کی یہ مجال تھی کہ ــــ! ایشور کیا حال ہوگا سنسار کا۔

گاؤں کے بچہ بچہ کی زبان پر اسی کا چرچا تھا۔ کہ "سوندھو چمار "رجنی دیدی" کی عزت بگاڑ دیتا اگر للو بھیا نہ آجائے۔ لیکن یہ کوئی نہیں جانتا تھا کہ "قوت" کمزور کے مقابلہ میں ہمیشہ جھوٹ کو سچ کر دکھاتی ہے"

آس پاس کے گاؤں میں بھی یہ خبر پھیل گئی اور دیہات میں تو چھوٹی چھوٹی باتیں کہانیاں بن جایا کرتی ہیں یہ تو گویا ایک بہت بڑا واقعہ ہوگیا تھا۔

اب رجنی کو اپنے گھر میں کون مور کھ لیجا کر رکھتا۔ غریب اجنبی کی زندگی کی گاڑی اور بھی بوجھل ہوگئی۔

رجنی کی بوڑھی ماں پر اس واقعہ کا بہت اثر ہوا اس کی حالت دن بدن خراب ہونے لگی۔

ایک دن بارش کا سلسلہ شام تک نہ ٹوٹا۔ پہر رات گئے کچھ پانی تھما تو رجنی کی ماں نے کہا۔ بیٹی اب میں گھڑی دو گھڑی کی مہمان ہوں۔ للو بھیا کو بلا لا ان سے کچھ کہنا ہے۔ آہ! آہ! بڑھیا نے کراہتے ہوئے کروٹ بدلی۔

رجنی پر ماں کی محبت کا غلبہ ہوا وہ للو بابو کے پچھلے برتاوے بھول گئی اور اسی وقت ان کو جا کر بلا لائی۔

رجنی کی ماں ایک ٹوٹی ہوئی چارپائی پر پڑی کراہ رہی تھی للو بابو گھر میں داخل ہوئے تو انکی لالٹین کی روشنی کے سامنے کونے میں جلتا ہوا مٹی کا چراغ شرما گیا۔ غربت ہمیشہ امارت سے دبجاتی ہے ایک طرف زمین پر سوہن بچپن کی بے فکر نیند میں سو رہا تھا۔ رجنی نے ماں کو آواز دی ــــ مائی چاچا آئے ہیں۔

بڑھیا نے آہ! رام کہکر آنکھیں اوپر کیں اور بولی بھیا اب میں نہیں بچونگی۔ رجنی اور سوہن کا خیال رکھنا۔ رجنی کا بیاہ نہ دیکھ سکی آہ! ــــ آہ ــــ رام گھبراؤ نہ بھابی ایشور چاہیں گے تو سب ہو جائے گا۔ للو بابو نے کہا۔ رجنی رونے لگی۔ بارش پھر شروع ہوگئی تھی۔ سارا گھر چھلنی کی طرح ٹپک رہا تھا۔ للو بابو چلے گئے تو رجنی نے ماں کو ایک گھونٹ دودھ پلایا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ آہ ــــ آہ بڑے سکھ چین سے سو رہے تھے۔ غریب کی کون خبر لیتا ہے۔ آدھی رات کے بعد رجنی کی آنکھ لگ گئی۔ بڑھیا نے شاید پانی کے لئے کئی بار پکارا بھی مگر وہ نہ اٹھی۔ صبح کو جب سوہن نے ماں کو پکارا تو وہ خاموش تھی۔ پڑوسن نے آکر دیکھا تو بڑھیا سرد ہو چکی تھی۔ رجنی سرہانے بیٹھی رو رہی تھی مگر رونے سے تو مردہ نہیں جیتا۔

رجنی ماں کے مرنے کے بعد سے بہت پریشان تھی۔ جیسے جیسے دن گذرتے جا رہے تھے۔ اس کی پریشانیاں اور بھی بڑھتی جا رہی تھیں۔ گاؤں کی بڑی بوڑھیوں نے تو پہلے ہی سمجھ لیا تھا اور اب نا تجربکار لڑکیوں نے بھی سمجھ لیا۔ اس میں رجنی کا کیا قصور تھا اس نے تو اپنے آپ کو سامراج کی قربانگاہ پر بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ غریبوں کی عزت ہی کیا۔ عزت و آبرو تو ان لوگوں کی ہے جو امیر ہیں۔ اور اونچے اونچے مکانوں میں رہتے ہیں۔

آخرکار رجنی کا قصور چھپ نہ سکا۔ کسی بڑے گھر کی بات ہوتی تو ممکن بھی تھا مگر وہ تو غریب تھی۔ اس نے سوچا اب وہ کیا کرے گی

اس کی آنکھیں کھل گئیں جیسے سوتے سوتے چونک پڑی ہو۔ شرمیلی ہرنی بھوکی شیرنی بن گئی وہ للو بابو کے راز کو فاش کرنے کے لئے تل گئی۔

رات کے ۹ بج چکے تھے۔ کھانا کھا کر للو بابو سونے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ رجنی ان کے بیٹھکے پہونچی۔ وہ گھبرا گئے۔ غصہ سے انکی آنکھیں گویا نکلی پڑتی تھیں گرج دار آواز میں بولے نکل جا یہاں سے کیوں آئی ہے۔ نیچ کہیں کی۔

رجنی کے بال کھلے ہوئے تھے۔ اس کی میلی ساری سے بو آ رہی تھی۔ اس نے نومولود لڑکے کو زمین پر لٹا دیا۔ اور بولی۔ کیا کہا ——— میں کیوں آئی ہوں ——— تمہارے کرتوت کا پھل دینے آئی ہوں لو یہ اپنا بچہ ——— !

پاگل ہوگئی ہے کیا ——— !

ہاں میں پاگل ہوگئی ہوں ——— !

تو بہت بڑھی جا رہی ہے رجنی ——— للو بابو نے کہا اور ڈرے کہ اب تو سارا بھید کھل جائے گا۔

رجنی رونے لگی۔ کمزور دل انسان غصہ کی حالت میں رونے لگتا ہے۔ رجنی کی تو پرورش ہی کمزور فضا میں ہوئی تھی۔ اس نے سسکیاں لے کر کہا۔ للو بھیا آپ نے کہا نباہ کا وعدہ نہیں کیا تھا۔

للو بابو نے بگڑ کر کہا۔ خبردار جو ایسی باتیں تم نے کیں ——— عورت پھر بھی عورت ہے مرد کے مقابلہ میں کبھی فتح نہیں پا سکتی ——— رجنی بھی عورت ہی تھی۔ جس ہمت سے آئی تھی وہ ٹوٹ گئی۔ اور وہ روتی ہوئی اپنے گھر چلی آئی ——— ؟

زمانہ بڑے بڑے واقعات کو فراموش کر دیتا ہے۔

کچھ دنوں تک تو گھر گھر رجنی ہی کا چرچا تھا مگر پھر کسی نے یہ بھی نہ پوچھا کہ وہ کس حال میں ہے اور کیونکر جی رہی ہے۔

چیت کا مہینہ تھا۔ کھیت کچھ کٹ گئے تھے اور کچھ کٹ رہے تھے۔ للو بابو کا گھر دور سے چمک رہا تھا۔ اسپر سفیدی ہوئی تھی۔ گاؤں میں یہی ایک مکان تھا۔ جسپر کبھی کبھی سفیدی ہو جایا کرتی تھی۔

دروازے پر شہنائی بج رہی تھی۔ آج للو بابو کی برات جانے والی تھی۔ گاؤں کے چھوٹے چھوٹے بچے خوشی سے ادھر ادھر دوڑ رہے تھے۔ زمیندار کے گھر شادی جو تھی۔

نوجوان لڑکیاں ڈھولک بجا بجا کر گا رہی تھیں ——— !

رجنی گائے کی ناند میں گھاس ڈال رہی تھی۔

اور اس کا چھوٹا بچہ لڑکوں کے ساتھ برات جانے کی ضد کر رہا تھا۔

....

....

....

رباعیات

اس دہر میں جس رخ سے صاحب کو دیکھا
محروم حقائق سے ہے انساں دیکھا
جب سامنے آیا کوئی دولت کا غلام
ہم نے نگہ حقارت سے اس کی طرف دیکھا

ہمت ہوں قسمت کو جگا دیتا ہوں
ظلمت کو بھی پیغام ضیا دیتا ہوں
تو تیرہ نظر ڈالتا ہے پا بزیر خاک
میں ذرے کو خورشید بنا دیتا ہوں

حیدر دہلوی

رات

از:-

(جناب سید کاظم علی صاحب سبزپوش رئیس اعظم)

رات توکیوں اسقدر سنسان و وحشتناک ہے!
ذرہ ذرہ دہر کا خاموش ہے غمناک ہے

انجم کم ضو تری صورت سے گھبراتے ہیں کیوں؟
خوف کیوں کھاتے ہیں وہ اسدرجہ تھراتے ہیں کیوں؟

چاند جو وادی میں تیری اک چراغِ طور ہے!
بھاگتا کیوں تیری تاریکی سے اتنا دور ہے؟

یہ محیط نیلگوں یعنی فضائے آسماں
سیکڑوں تابندہ خو عالم کی بستی ہے جہاں

جس کی رفعت میں نظر آتا ہے بستی کا سماں
اہلِ عالم کو نہیں ہے جس پہ ہستی کا گماں

روشنی میں رات کا منظر دکھاتا ہے ہمیں
ابر چھا جائے تو پھر کیا کیا ڈراتا ہے ہمیں

ہاں مگر وحشت میں تیری شانِ یکسوئی بھی ہے
اہلِ دل کے واسطے سامانِ دلجوئی بھی ہے

تیری تاریکی سے لیکن دل مرا مانوس ہے
جانتا ہوں میں کہ تو اک پردۂ فانوس ہے

نور تیرا خندہ زن ہے مہرِ عالمتاب پر
کیا چمک تیری عیاں ہو چشمِ محوِ خواب پر

دیدۂ ظاہر سے افزوں ہے یہ نظارہ ترا
اس سے روشن ہے دلِ آئینہ صد پارہ مرا

خون میں مل مل کے جو دوڑے ہی پاریکی طرح
میری رگ رگ میں نہاں ہے تیرہ اریکی طرح

یہ تجلی وہ ہے جس سے طور بھی تابندہ ہے
ذرہ ذرہ وادیٔ فاراں کا "چشمِ زندہ" ہے

ایک دن پردہ اٹھا دے آزمانے کے لئے
"میں نے جو دیکھا ہے اوروں کو دکھانے کے لئے

تیمور کا عشق

شہنشاہ اعظم امیر تیمور صاحبقران ثانی کی حیات معاشقہ کا ایک ورق

تاریخ عالم میں ایک دلچسپ باب کا اضافہ

ادیب الملک شاہزادہ آیاز صاحب

عنوان بالا کے تحت میں شہنشاہ تیمور کی سوانح حیات کا ایک خاموش باب اقوام عالم کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ممکن ہے مورخین اس حقیقت سے اتفاق نہ کریں لیکن مجھے اس واقعہ کا علم فارسی کی ایک قلمی کتاب سے ہوا۔ اگرچہ آج تک میں نے کسی تاریخ میں ایسا کوئی تذکرہ نہیں دیکھا۔ لیکن اپنے بزرگ کے ارشادات کو غلط کہنے کی جرأت بھی نہیں رکھتا۔ جنھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں یہ کتاب میرے حوالے کی۔ اکثر انسان کے خانگی معاملات میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں ہزاروں کمزور پہلو مستقبل کے مفاد کے لئے دبا دیئے جاتے ہیں۔ لاکھوں عیوب پر اپنی عزت، جاہ و حشمت کی خاطر پردہ ڈالا جاتا ہے سیکڑوں گناہ کرکے اپنی زندگی کو بلند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ یہ بھی شہنشاہ اعظم امیر تیمور کے ایک کمزور پہلو کی نقاب کشائی ہے۔ ذیل کے واقعہ کے غلط یا درست ہونے کی میرے پاس کوئی دلیل نہیں۔ لیکن میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں۔ وہ صرف اس قلمی کتاب کا خلاصہ ہے جسے میں عرصہ چار پانچ سال ہوئے پڑھ چکا ہوں۔ بہرحال یہ واقعہ اپنی نوعیت کا ایک دلچسپ فسانہ ہے جس کے غلط یا صحیح ہونے کا میں ذمہ دار نہیں۔

شاہزادہ آیاز

دسمبر ۱۹۲۸ء کی ایک شدید ترین سرد رات کو لکھنؤ کے ایک مشہور ہوٹل کے مرصع کمرے کے اندر میں قبلہ صدیق مرزا کا سر دبا رہا تھا۔ بجلی کی ہلکی ہلکی سبز روشنی کمرے کے سامان پر تھرکتی پھرتی تھی۔ برآمدے سے ہوا کے کانپتے ہوئے جھونکے کمرے میں سمٹ کر داخل ہو رہے تھے۔ ہر شے پر جمود کا عالم طاری تھا صرف دو دان سے کسی کسی وقت کوئی ننھی سی چنگاری چمک کر فضا کے سکوت کو توڑ تی نظر آتی تھی۔ میرے محترم بزرگ نے ایک درد انگیز آہ کے ساتھ کروٹ لیکر فرمایا۔

"بیٹا! میرے کاغذات کا بکس لاؤ۔"

میں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور بکس لاکر پیش کر دیا۔ موصوف نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے چند کاغذات الٹنے کے بعد ایک ضخیم مجلّد کتاب نکالی اور مجھے دیتے ہوئے فرمایا۔

"اس کتاب کو تادم مرگ عزیز رکھنا۔ تاریخ عالم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہوگا۔"

میں نے کتاب لے کر اس کی ورق گردانی شروع کر دی۔ کتاب موٹے خاکی سومیائی کاغذ، چمڑے کی مضبوط جلد۔ کاغذ میں کافور کی سی خوشبو اور فارسی زبان میں مختلف نوشتوں میں لکھی ہوئی تھی۔ ہر نوشتے کے اختتام پر صاحب تحریر کے دستخط تھے۔ صدیق مرزا نے تھوڑی سی تاخیر کے بعد فرمایا۔

"اس میں میرے تمام اہل خاندان کے واقعات ان کے اپنے ہاتھوں سے لکھے ہوئے ہیں۔ میں نے بھی اپنی زندگی کے واقعات سے چند اوراق سیاہ کئے ہیں۔ کبھی موقع ملے تو میرے بعد اس کتاب کو ملک کے سامنے پیش کر دینا"۔

میں نے اس کتاب کا خوب مطالعہ کیا۔ ضروری اقتباسات لئے اور کتاب کو نہایت محفوظ رکھا۔ آخر دست اجل کی فیصلہ انگلیوں نے میرے محترم بزرگ کی کتاب زندگی کا ورق الٹ دیا۔ شمع حیات جھلملائی اور مارچ ۱۹۳۱ء میں خاموش ہوگئی۔ میری دنیا تاریک ہوگئی۔ میرے عہد مصائب کی وہی ابتدا تھی۔ اس کے بعد آج تک میرے آنسو خشک نہ ہوسکے۔ وہ ہستی جو میری ہلکی سی آواز پر دنیائے دل فدا کر دیتی تھی آج میرے حشر بدوش نالوں کو سن کر بھی خاموش ہے۔ یہ ایک مستقل سوز ہے جو میری زندگی سے وابستہ ہو کر رہ گیا ہے۔ وقت گذرتا گیا اور ۱۹۳۳ء میں میری معمولی سی غفلت سے وہ کتاب میری جملہ اسناد کثیر مجموعہ نظم و نثر مکان میں چوری ہو جانے سے تلف ہوگیا۔ میں زندگی میں سب کچھ حاصل کر سکتا ہوں لیکن آہ! وہ کتاب کہیں نہیں مل سکتی۔ آج اس کتاب کے چند اقتباسات مختصر افسانے کی صورت میں ارباب نظر کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ کتاب کے صفحۂ اول پر شجرۂ نسب تھا۔ جسے من وعن نقل کرتا ہوں اور صدیق مرزا مرحوم کے نام نامی سے شروع کرتا ہوں۔

"صدیق مرزا ابن ناصر میرزا ابن عثمان مرزا ابن فاروق میرزا ابن وزیر میرزا ابن ظہیر میرزا بن نصیر میرزا ابن بیدار میرزا ابن بختیار میرزا ابن دلاور میرزا بن عتیق میرزا ابن خلیق میرزا ابن شوکت میرزا کامران بن فریدوں میرزا بن جبار میرزا ابن علی احمد میرزا ابن عباس میرزا ابن حسین میرزا ابن حسن میرزا ابن احمد میرزا ابن محمد میرزا بن مظفر میرزا بن جعفر میرزا ابن غضنفر میرزا ابن سکندر میرزا بن جمشید میرزا ابن میرزا سہراب شاہ بن حضرت امیر تیمور صاحبقران ثانی"۔

کتاب کی ابتدا شوکت میرزا کامران نے کی اور اس سے قبل کے تمام واقعات ایک داستان صورت میں قریباً ۲۵۰ صفحات لکھے کہ یہ واقعات ہمارے خاندان میں سینہ بسینہ آرہے ہیں جنھیں اس کتاب میں اس لئے لکھتا ہوں کہ میرے بعد میری اولاد اس کے مطالعہ سے اپنا صحیح حسب و نسب معلوم کر سکے اور آئندہ اپنے ہاتھ سے اپنی سوانح حیات قلمبند کرے۔

داستان کی ابتدا یوں ہوتی ہے ——

امیر تیمور اپنے دور پریشانی و بے سروسامانی میں پھرتے پھراتے قریب شام ایک گاؤں میں پہونچے اور درخت کے ساتھ گھوڑا باندھ کر نماز مغرب ادا کی۔ اتفاق سے گاؤں کے سربرآوردہ رئیس اور محترم بزرگ حاجی میرزا قاسم علی اس طرف سے گذرے۔ امیر نے انھیں مخاطب فرما کر ایک شب بسر کرنے کی اجازت طلب کی۔ حاجی نہایت فراخدل اور بلند اخلاق انسان تھے خندہ پیشانی سے امیر کا خیر مقدم کیا اور مکان پر لے گئے۔ اور اپنی بیوی و لڑکی سے تعارف کرایا۔ رات کو سفر کی تکان اور پریشانیوں سے امیر کو بخار آگیا اور مجبوراً کچھ عرصہ ٹھیرنا پڑا۔ ایک شب امیر بستر بخار کی حالت میں آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹے ہوئے تھے کہ آپ نے پانی طلب کیا۔ فاطمہ حاجی کی لڑکی فوراً پانی لائی۔ لیکن امیر بخار کی غنودگی میں کافی عرصہ آنکھیں بند کئے ہوئے لیٹے رہے امیر نے پھر کچھ دیر کے بعد کروٹ بدل کر آنکھیں کھولیں۔ فاطمہ پانی لیکر کھڑی تھی امیر نے فاطمہ کی طرف دیکھا۔ دونوں کی اولیں نظریں یکبارگی ملیں اور دلوں کی گہرائیوں تک اتر گئیں۔ امیر نے پانی پیا اور فرمایا۔

"فاطمہ تم نے مجھے پانی نہیں پلایا شراب محبت پلائی ہے"۔

فاطمہ شرمائی، آنکھیں دوبارہ اٹھیں اور ملیں پھر جھک گئیں محبت کے حسین و لطیف جذبات و احساسات کی ابتدا ہوئی۔ عشق کی مترنم گھڑیاں نغمہ ریز لمحات اور خمار پرور دور شروع ہوا۔ امیر اپنا فرض بھول گئے۔ ملک گیری کا خیال دل سے بالکل محو ہوگیا۔ بیخودی عشق میں کھوئے ہوئے امیر کو ڈیڑھ ماہ کا طویل عرصہ گذر گیا۔ ایک روز فرض نے خواب شیریں سے بیدار کیا۔ امیر عازم سفر ہوئے۔ فاطمہ اس جدائی کی تاب نہ لاسکی اور بیمار رہنے لگی۔ امیر پھر چند ماہ کے بعد واپس آئے۔ اپنی پریشانیوں سے نجات حاصل کرنے کیلئے دوبارہ حاجی کے پاس پہونچے۔ شہنشاہ جو تلواروں کی جھنکاریں سننے اور خون کی ندیاں دیکھنے گیا تھا ایک بار پھر دربار حسن و ناز میں سراپا عشق و نیاز بن کر آیا۔ اس دفعہ امیر نے حاجی سے التجا کی۔ بھیک مانگی۔ دست طلب بڑھائے۔ فاطمہ کی حالت امیر کے آتے ہی بہتر ہونے لگی۔ دانا باپ نے معاملہ بھانپ لیا اور اپنے مقصد حیات قرۃ العین کو ایک "پردیسی" کے حوالے کر محب و محبوب ملے۔ لیکن ابھی ان فردوس آفریں گھڑیوں کی ابتدا بھی ہونے پائی تھی۔ ابھی محبت تشنۂ تکمیل ہی تھی کہ قسام ازل کو ناگوار گذرا کے سنگدل دیوتا نے کمان سنبھالی اور ایک زہر آلود تیر چلا یا۔ امیر کو فرض ہوشیار کیا اور چند روز کے وعدے پر عازم سفر ہوئے۔ فاطمہ نے نشانی

امیر نے اپنی زمردیں انگوٹھی فاطمہ کو دیکر کہا -

"لو یہ انگوٹھی تنہائی میں تمہاری دنیائے تصور کو آباد رکھیگی"۔

امیر کو ایک سال گزر گیا۔ انھیں نہ آنا تھا نہ آئے ادھر فاطمہ کے بطن سے لڑکا پیدا ہوا جس کا نام نانا نے سہراب شاہ رکھا۔ سال گزرتے گئے اور سہراب کی عمر چودہ سال کی ہوگئی۔ اس عرصہ میں امیر مسند شاہی پر جلوہ افروز ہوگئے - تمام ملک گیری میں مدہوش انھیں بھول کر بھی خیال نہ آیا کہ میں نے اپنی زندگی کے افسردہ و پریشان لمحات میں کسی معصوم لڑکی کے جذبات کے ساتھ کھیل کر اپنی دنیا رنگین بنائی تھی۔ فاطمہ اپنی بدنصیبی کا ماتم کیا کرتی تھی - تصویریں انگوٹھی سے اتیں ہوئیں —— موسم گرما کی ایک دوپہر کو گاؤں کے تالاب پر سہراب درختوں کی گھنیری چھاؤں میں بیٹھا تھا کہ اس کے پڑوس کی ایک بیرانہ سال عورت وہاں سے گزری اور باتوں باتوں میں سہراب کو اس کی ماں اور پردیسی کی محبت و شادی کا تمام افسانہ سنا دیا۔ سہراب کی رگ غیرت تڑپ اٹھی خون تیمور کو جوش آیا اور ماں سے آکر کہا۔ "مجھے اجازت دو کہ اپنے بیرحم باپ کو ڈھونڈھ کر تمھارے سامنے لاؤں تاکہ تم اس سے موجودہ کس مپرسی کا انتقام لے سکو۔ ماں نے ہرچند سمجھایا لیکن ایک شب سہراب گھر سے غایب ہوگیا اب فاطمہ خاوند اور فرزند دونوں کے غم میں رونے لگی۔ حاجی کو سہراب کے غایب ہوجانے سے سخت صدمہ ہوا۔ فرط غم سے اس پر فالج کا اثر ہوگیا۔ ایک صبح فاطمہ اپنی حالت پر اشک حسرت بہا رہی تھی کہ اس کی نظر انگوٹھی کے اندرونی حصے کے دھندلے نقوش پر پڑی - وہ حاجی کے پاس آئی اور ان نقوش کو بغور دیکھنے کے لئے کہا۔ حاجی نے غور سے دیکھنے کے بعد پڑھا۔

"تیمور صاحبقران ثانی"

حاجی بولا "تیمور —— شہنشاہ اعظم —— ہمارا والی ملک —— ضیغم اسلام —— پردیسی —— امیر تیمور —— صاحبقران ثانی"۔ اس کا چہرہ فرط مسرت سے جگمگا اٹھا۔ فاطمہ تیمور کا نام سن کر ششدر سی رہ گئی۔ ہنسی اور کہا۔ "فاطمہ شہنشاہ اعظم کی بیوی"۔

دن گزرتے گئے۔ حاجی کا انتقال ہوگیا۔ فاطمہ اس آخری صدمے کی تاب نہ لاسکی۔ اس کا دماغی توازن خراب ہوگیا۔ اسی حالت میں وہ امیر اور سہراب کی تلاش میں نکلی۔ سہراب اس عرصے میں پردیسی باپ کو تلاش کرتے کرتے امیر کے دربار میں پہونچا اور اپنی سرگذشت سنائی - امیر کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ لیکن ضبط کے بعد فرمایا۔

"بیٹا بہادر تلوار سے محبت کرتے ہیں عورت سے نہیں"۔

سہراب نے سنا غور کیا اور نہ جانے کیا سوچ کر امیر سے ملازمت کی درخواست کی۔ امیر نے فوراً اپنے ذاتی اسٹاف میں جگہ دیدی۔

ایک شب امیر کی بزم نشاط گرم تھی۔ محفل چنگ و رباب میں مست تھی جھوم رہی تھیں۔ امیر اپنے چند خاص مصاحبین کے ساتھ بیٹھے تھے کہ یکایک ایک دردبھری آواز نے امیر کو مخاطب کیا۔ امیر کی نظریں اٹھیں۔ سامنے فاطمہ ان کی محبت کا مرکز، پریشاں حال آداب شاہی کے ماتحت ہاتھ باندھے کھڑی تھی۔ امیر گھبرائے ہوئے مسند شاہی سے اٹھے۔ وہ چاہتے تھے کہ فاطمہ کو گلے سے لگالیں لیکن جاہ و جلال شاہی مانع ہوا اور کہا۔

"تو کون ہے؟ ——"

فاطمہ نے چیخ کر کہا۔ "میں کون ہوں؟ —— اپنے دل سے پوچھو —— شہنشاہ ہوکر اپنا وعدہ بھول گئے۔ کیا تیمور جیسا اولوالعزم انسان اور ظالم ——؟"

مصاحبین ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔ امیر سر جھکائے کھڑے رہے وہ کچھ کہنا چاہتے تھے مگر فرط غم سے بول نہ سکے۔ فاطمہ چند قدم آگے بڑھی، اور دیوانہ وار چلائی۔

"تیمور۔ سفاک، پردیسی۔ عورت کے جذبات سے کھیلنے والے خونخوار درندے۔ کشتی محبت کو غرق گرداب فراق کرنے والے بیرحم ناخدا، معصوم محبت کی روح کو مجروح کرنے والے جلاد۔ ایک شکستہ دل عورت کو تباہ کرنے والے سنگدل۔ ہوش میں آ —— سر اٹھا —— تیمور! میں فاطمہ بنت حاجی ہوں۔ بتا۔ بے رحم انسان بتا، میرا سہراب کہاں ہے؟ —— تیرے فریب محبت کا زندہ ثبوت ——"

تیمور نے سر اٹھایا اور نہایت تحکمانہ انداز سے [illegible] چھپاتے ہوئے حکم دیا "اسے باہر نکالدو۔ یہ دیوانی ہے۔ [illegible] اسے میری آنکھوں کے سامنے سے دور کردو"۔

اتفاق سے دروازے پر سہراب کا پہرہ تھا۔ سہراب فرمان شاہی کے مطابق حاضر ہوا اور اس دیوانی عورت کو باہر لے گیا۔ فاطمہ کے جانے کے بعد ایک مصاحب نے کہا۔ "جہاں پناہ! یہ دیوانی عورت کون تھی؟"

امیر نے جواب دیا۔ "شاید اس کا بچہ جنگ میں کام آیا ہے اسے مانگنے آئی ہے"۔

مصاحب یہ سن کر خاموش ہو گیا۔ ادھر سہراب اپنی ماں کو کشاں کشاں بہت دور تک لے گیا تاکہ واپس نہ آسکے۔ اس کے بعد کہنے لگا۔ دیوانی خبردار اگر دوبارہ ظل سبحانی کے دربار میں آئی تو سر اڑا دونگا۔

فاطمہ نے سہراب کی آواز پہچانی اور چلائی "کون۔ سہراب۔ بیٹے"۔ سہراب نے غور سے دیکھا اور بے اختیار ماں کہہ کر فاطمہ سے لپٹ گیا۔ ماںتا کی ماری سہراب کی بلائیں لینے لگی اور بولی "بیٹے تو اور تیمور کے دربار میں سپاہی۔ اس خونخوار بھیڑیئے کا غلام۔ اس ننگ انسانیت کے پاس ——" "آہ میری روح کبھی آرام کی نیند نہ سوتے تو ——"

"نہیں ماں ایسا نہ کہو۔ امیر بہت رحمدل ہیں۔ ان کے مجھ پر بہت احسان ہیں"۔

"سہراب! تم نہیں جانتے ہو بیٹا۔ مجھ سے پوچھو وہ کون ہے"۔ فاطمہ کانپتی ہوئی اٹھی اور خود بخود کہنے لگی۔ "تیمور عورت کا خوفناک انتقام جانتے ہو عورت کی محبت اور نفرت سے آشنا ہو۔ تمھاری شمشیر زنی کے تمام جوہر اس کے سامنے ہیچ ہیں۔ میری ایک آہ! میری ایک خفیف آواز تمھاری تمام مملکت کو تباہ کر سکتی ہے۔ میرا ایک آنسو تمھاری سلطنت ڈبو سکتا ہے۔ لیکن نہیں تمھیں عزت د سلطنت نے مجھ سے دور کر رکھا ہے۔ اچھا میں اس راز کو سہراب پر ظاہر کرنے کے بعد ہمیشہ کے لئے اپنے سینہ میں دفن کرتی ہوں۔ تیمور تیری فاطمہ بیوفا بننا نہیں چاہتی"۔ اس نے سہراب سے کہا۔ "سہراب یہ انگوٹھی لو تمھارے پردیسی باپ کا عطیہ ہے اس کے اندرونی نقوش پڑھنا۔ لیکن اپنے بیرحم باپ کو دیکھ کر انتقام نہ لینا بلکہ میری عزت کا پاس کرنا اور اس راز کو اپنی اولاد کے بغیر کسی پر ظاہر نہ کرنا —— اچھا جاؤ۔ میں تمھیں پھر ملونگی"۔

ادھر شہنشاہ کی محفل نشاط ختم ہو چکی تھی۔ ان کا دل نغموں سے نفرت کرنے لگا۔ سہراب واپس آیا اور روشنی میں ان نقوش کو بغور دیکھنے لگا۔ امیر کا نام پڑھ کر اس کا چہرہ غم و غصہ سے تمتما اٹھا اس نے اپنی تلوار پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"بیرحم انسان! ایک مظلوم عورت کی زندگی ختم کرنے کے بعد تو مسند شاہی پر جلوہ افروز ہے۔ میں اپنی ماں کی تباہی کے بعد تمھیں اور تمھاری حکومت کو بھی برباد کرنا چاہتا ہوں"۔ سہراب کمرے میں داخل ہوا۔ امیر تنہا سر جھکائے رو رہے تھے۔ سہراب بولا۔

"امیر سر اٹھاؤ —— میں تمھارا آئینہ ہوں —— پاکیزہ فریب، دیکھو اور انجام کے لئے تیار ہو جاؤ"۔ تیمور نے سر اٹھایا۔ سہراب شہنشاہ کی نگاہوں کی تاب نہ لا سکا۔ اور سر جھکا لیا۔ امیر کے لرزیدہ قدم سہراب کی جانب بڑھے شہنشاہ نے سہراب کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے فرمایا۔

"جان پدر! میں جانتا ہوں کہ تم میری لغزش سے آشنا ہو چکے ہو اگر تم اپنے مجرم باپ کو اسی جگہ جہاں وہ اپنے پورے اقتدار کے ساتھ حکمران ہے ذلیل دیکھنا چاہتے ہو تو اس کی یہ کمزوری ملک کے سامنے پیش کر دو۔ یا اس راز کو راز رہنے دو۔ جاؤ میں تمھیں بہت سا زر و جواہر اور یہ خنجر دے کر رخصت کرتا ہوں۔ گاؤں میں جا کر آرام کی زندگی بسر کرو۔ میں تمھیں ملتا رہونگا"۔ سہراب کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ اسے ماں کے آخری الفاظ کا خیال آیا اور سر جھکا لیا۔ امیر نے بڑھ کر پہلی اور آخری مرتبہ سہراب کی پیشانی کو بوسہ دیا اور صبح سے قبل ہی سہراب وہاں سے رخصت ہو گیا۔

امیر سے رخصت ہو کر سہراب نے اپنے نانا کے گاؤں میں آکر کچھ زمین وغیرہ خریدلی اور گزر اوقات کرنے لگا۔ باقی تمام عمر یاد الٰہی میں گذاری اور اپنے نانا حاجی میرزا قاسم علی کے نقش قدم پر چل کر بہت جلد مذہبی پیشوا کی حیثیت اختیار کر لی۔ سہراب شاہ جب کربلائے معلیٰ کی زیارت کو گئے تو وہیں ایک عرب آغا کربلائی کی دختر سے عقد کر لیا۔ ان کے اولاد تو بہت ہوئی۔ لیکن سب سے بڑے لڑکے جمشید میرزا ہی اس لڑی کے دوسرے موتی ہیں انھوں نے والد کی زندگی ہی میں پانچ سال کربلائے معلیٰ میں رہکر علم حاصل کیا اور مجتہد العصر عمامہ باندھ کر واپس آئے۔ وقت گزرتا گیا اور اس خاندان کے ایک فرد جعفر میرزا نے شہنشاہ بابر کی فوج میں سپاہیانہ زندگی شروع کر دی۔ اور ہندوستان کی لڑائی میں کام آگئے۔ ان کے ساتھ ان کی بیوی اور جوان سال لڑکا [illegible] تھا۔ بیوی کو سپاہیانہ زندگی سے نفرت تھی۔ وہ دہلی کے گرد و نواح میں پھرتی رہی۔ آخر تقدیر نے ایک سقے کے دروازے پر لا بٹھایا اور اس نے عقد ثانی کر لیا۔ اس جاہل قوم میں لڑکے کی تعلیم کا کوئی سلسلہ نہ ہو سکا۔ اور مجبوراً مظفر میرزا نے بھی سقے کا کام شروع کیا۔

گردش دوراں نے شہنشاہ ہمایوں کو پابند مصائب کیا اور جان بچانے کیلئے دریا میں کودنا پڑے۔ اس وقت ایک سقے نے مشکیزے پر بٹھا کر شہنشاہ کی جان بچائی اور معاوضہ میں ایک روز کی سلطنت طلب کی یہ کی تاریخ شاہد ہے۔ وہ سقہ احمد میرزا مظفر میرزا کا پوتا تھا۔ اس کی

رگوں میں بھی خون شاہی تھا۔ اگر وہ معمولی سقہ ہوتا تو بہت سا زر و جواہر مانگ کر خود کو مالا مال کر لیتا لیکن خون تیمور میں قدرت نے ملک گیری کی صلاحیت بخشی تھی اس لئے سقے نے بھی حکومت ہی مانگی۔ یہ خون کا اثر تھا۔ سقے کے دماغی ارتقا کا نتیجہ نہیں۔ اس کے بعد ان سقوں نے ترقی کر کے باغبانی اختیار کی۔ فریدون میرزا اپنے فن کا عروج دیکھ کر ایران چلے گئے اور محل شاہی میں رسائی حاصل کر کے باغبان اعلیٰ مقرر ہو گئے۔ ان کے لڑکے شوکت میرزا کامران (جنھوں نے اس کتاب کی ابتدا کی تھی) نہایت حسین اور ذہین تھے۔ دربار شاہی میں چوبدار اعلیٰ ہو گئے اور انھوں نے فریدوں میرزا کی وفات کے بعد اس کتاب کو لکھنا شروع کیا۔ یہ آوارہ نصیب خاندان تین پشتوں کے بعد ہندوستان میں آیا اور دلاور میرزا نے سپاہیانہ زندگی اختیار کر لی۔ قدرت نے آخر اس خاندان کو بھی موقع دیا اور بیدار میرزا کو محمد شاہ بادشاہ کی مصاحبت مل گئی۔ خوب دولت جمع کی۔ یہی اس خاندان کے دور امارت کی ابتدا تھی۔ آخر وزیر میرزا ہندوستان [illegible] ایران چلے گئے۔ وزیر میرزا کے انتقال کے بعد فوق میرزا [illegible] فارسی مکمل کی اور وہیں ایک متمول حنفی تاجر کی لڑکی ام کلثوم سے شادی کر لی۔ ام کلثوم نہایت پرہیزگار اور عالم عورت تھی۔ اس کا رنگ مذہبی غالب آیا اور فوق میرزا نے اپنا نام بدل کر فاروق میرزا کر دیا۔ وزیر میرزا تک اس خاندان کے تمام افراد شیعہ تھے لیکن فاروق میرزا بیوی کی صحبت میں رہکر سنت مسلم کے حنفی ہو گئے۔ فاروق میرزا آخری ایام میں ہندوستان آ گئے۔ وہ زمانہ ابوظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ آخری تاجدار خاندان مغلیہ کا تھا۔ فاروق میرزا کی وفات کے بعد عثمان میرزا شاہ کے پاس کتاب لے کر حاضر ہوئے۔ شاہ نہایت حلیم طبع، معاملہ فہم، سخی اور حکیم تھے۔ انھوں نے معمولی سے مطالعہ کے بعد اپنے جیب خاص سے کافی روپیہ دیا۔ غدر کے بعد عثمان میرزا لکھنؤ، عظیم آباد، بنارس وغیرہ ہوتے ہوئے کلکتہ پہونچے اور وہیں انتقال فرمایا۔ ناصر میرزا کافی عرصہ کلکتہ رہے، اور وہیں قبلہ صدیق میرزا تولد ہوئے۔ اس کے بعد ناصر میرزا تبدیلی آب و ہوا کے لئے کشمیر تشریف لے گئے۔ اور کشمیر سے ڈلہوزی، کوہ مری وغیرہ ہوتے ہوئے راولپنڈی آکر انتقال فرمایا۔ صدیق میرزا جوان تھے۔ تعلیم عربی فارسی بہت زیادہ تھی۔ انگریزی بھی خوب جانتے تھے روپیہ کافی ہونے کی وجہ سے ہمیشہ میرزا [illegible] رہتے۔ بڑے بڑے آدمیوں سے رسم و راہ تھی۔ شغل احباب گرم رہی۔ [illegible] مرتے دم تک سید نادر مرحوم کو اپنے ساتھ رکھا۔ انھیں کی صحبت نے شاعری کی ابتدا کی۔ صدیق میرزا کی زندگی نہایت خاموش زندگی تھی [illegible] زائد نہیں رہتے تھے اور آخر لاولد اختلاج قلب کے عارضہ میں مبتلا ہو کر مارچ ۱۹۲۱ء میں کلکتہ جا کر ہوڑہ قبرستان میں حضرت سلطان الفقرا، سراج الاولیا، قطب الاقطاب حکیم صاحب رح کے آغوش میں ابدی نیند سو گئے۔

اس خاندان کی مختصر سی داستان میں نے اہل نظر کے سامنے پیش کی ہے۔ جس کے جملہ حقوق کتابی صورت یا کسی اور شکل میں لانے کے لئے قطعاً محفوظ ہیں۔

شاہزادہ ایاز:-

ادب لطیف

تم پوچھتے ہو کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ میں نہیں بتا سکتا۔ مگر جا رہا ہوں، اگر راہ سیدھی ہو تو گمراہ نہوں گا، اتنا جانتا ہوں کہ صبح صادق اور روز روشن میرے آگے ہیں۔ اور شب تاریک پیچھے۔ یہ میرے لئے کافی ہے۔ نہ اس سے زیادہ کچھ مجھے نظر آتا ہے نہ اس سے کم۔ مگر میں عقیدہ رکھتا ہوں۔ مستقبل کے متعلق مجھے کچھ تردد نہیں۔

صبح کا سہانا وقت ہے ——— آفتاب اپنی سیمیں روپہلی کرنوں سے تاریک دنیا کو نورانی جامہ پہنا رہا ہے ——— سبزہ پر اوس کے قطرے گوہر آبدار کی طرح چمک رہے ہیں ——— دیکھو مرغ سحر بانگ دے رہا ہے۔ وہ کہہ رہا ہے۔

اٹھو ——— اٹھو [illegible] اٹھو ——— تمھاری زندگی کی ایک شب اور گذر گئی۔ (ریبہ نگمینہ)

کلامِ فراق

از:-

جناب پروفیسر رگھوپتی سہائے۔ فراقؔ ایم اے۔ گورکھپوری

(مرسلہ از حضرت مجنوں گورکھپوری)

صلائے عام عشق ہے فریبِ غلط میں نہ آ
عذاب سہ عذاب سنجات میں ہے کیا دھرا
تڑپنے دے کسی کو کیا کسی کو چین دے تو کیا
تری نظر کی پے بہ پے یہ جنبشِ سکوں نما
فراقؔ سا کوئی وہ نیری انجمن میں کون تھا
وہ درد کچھ اٹھا اٹھا وہ رنگ کچھ اڑا اڑا
جو اہلِ دل کی جان ہیں وہ اور ہیں کرم ستم
یہ کیا کہ باتوں باتوں میں ہنسا دیا رُلا دیا
یہ فرق و امتیاز یہ تعینات کس لئے
وفا جفا کو چھوڑ کے کر اہلِ دل کا فیصلا
ازل سے جو نہ مٹ سکی وہ بیکسی تھی عشق کی
تری نگاہ لطف نے ہزار آسرا دیا
میں پوچھتا تو ہوں مگر جواب کے لئے نہیں
یہ کیوں تری نظر پھری یہ کیوں بدل گئی ہوا
خبر نہ جن کی تو نے لی وہ لوگ اب فسانہ ہیں
پتہ نہ جس کا تھا تجھے وہ غم دلوں کو کھا گیا
فسردہ سی فضا بھی بجلیوں کی رو میں آ گئی
مجھے اداس دیکھ کے یہ کون مسکرا دیا
میں ہوش و مستی خمار و کیف و کم سے دور ہوں
ترے نثار ساقیا ترے نثار ساقیا
مٹا نہ دے یہ مٹا نہ دے یہ سوز و ساز زندگی
تلف نہ کر تلف نہ کر یہ نسخہ ہائے کیمیا
فراقؔ اور بھی تو اہلِ درد کی ہیں حالتیں
میں دورِ چرخ و دورِ مے سے بے خبر نہیں مگر
ازل سے ہے چھڑا ہوا اس آنکھ کا معاملا
ہے تمکنت بھی حسن کی اب ایک لرزشِ خفی
کچھ اضطرابِ عشق کو سنا ہے صبر آ گیا
بس ایک رہروانِ راہِ عشق کا پیام ہے
نہ ہوش ہی سے موڑ منہ نہ غفلتوں سے باز آ
کہاں تک اک جہاں کے وہم و بود کو روئیے
یہ سچ کہ عشق باوفا یہ سچ کہ حسن بے خطا
حیاتِ عشق ماورائے وصل و ہجر یار ہے
ہزاروں ایسی حسرتوں کو خاک میں ملا دیا
مجھے بھی یاد ہیں وہ شامِ ہجر کی حکایتیں
وہ درد سا رُکا رُکا وہ اشک سا تھما تھما
کہاں نگاہِ ناز اور کہاں یہ نقشِ آرزو
گھٹا دیا بڑھا دیا بنا دیا مٹا دیا
بس ایک عشق کے خراب ہونے ہی کی دیر تھی
شباب تھا زمانہ تھا گذر گیا گذر گیا
انہیں سے اٹھ رہے ہیں شعلۂ نوائے سرمدی
بس ایک سوزِ بے اثر بس ایک سازِ بے صدا
نہ پوچھ نشہ و خمارِ بادۂ جہاں فگن
وہ رفعتیں عدم بدوش پستیاں فلک نما
ہر انجمن سے وہ نگاہِ ناز لے اڑی مجھے
بصد جنون و ہوشِ عشق رہ گیا ہے دیکھتا
یہ بیقراریاں درست یہ سکونِ غم بجا

خودکشی

(بہترین طبعزاد افسانہ)

(از جناب چودھری عبدالرشید صاحب۔ تبسم۔ بی۔ اے)

مایا رام سیٹھی کی دوکان تو اتنی بڑی نہ تھی کہ صرف اس کی دوکان کی وجہ سے امرتسر کا بچہ بچہ اس کے نام سے واقف ہوتا مگر پھر بھی شہر کے بڑے بڑے تاجروں کو سیٹھی پر رشک آتا تھا کہ وہ ایک معمولی سی دوکان کا مالک ہوتے ہوئے بھی ہر جگہ مشہور تھا۔ دراصل بات یہ تھی کہ سیٹھی کے باپ دادا ساہوکارہ کیا کرتے تھے۔ وہ نہایت تنگی ترشی سے گزارہ کرتے مگر ضرورتمندوں کے لئے ان کا روپیہ ہر وقت موجود رہتا۔ یہ جدا بات ہے کہ وہ بعض دفعہ سو روپیہ قرض دے کر پانچسو لکھوا لیتے اور اس فرضی رقم پر سود بھی کچھ کم عائد نہ کرتے لیکن ان کے ہاں سے کوئی حاجت مند خالی نجاتا تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ کسی محتاج کی حاجت روائی کرنا خواہ وہ کسی شرط کے ماتحت ہو دان سے کم نہیں سیٹھی خاندان کا یہ کاروبار کئی پشتوں تک چلتا رہا۔ یہاں تک شہر میں کوئی محلہ ایسا نہ رہا جس میں دو ایک مکان انہوں نے قرق نہ کرا لئے ہوں۔ مایا رام بھی اپنے باپ دادا کے نقش قدم پر چلتا رہا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ مایا رام نے باپ دادا کی کمائی کو خوب سنبھالا۔ کیا مجال ہے جو اس نے گھر میں انتہائی ضرورت کے وقت بھی بغیر ماتھے پر شکن ڈالے کبھی دھیلہ پیسہ خرچ کیا ہو۔

حالات یکساں نہیں رہتے۔ ساہوکارا ایکٹ کے بن جانے سے اس کاروبار پر بعض پابندیاں عائد ہو گئیں اور سیٹھی کے ہاں روپیہ کی وہ پہلی سی ریل پیل نہ رہی۔ سیٹھی نے یہ دیکھ کر کہ لکشمی دلوی کچھ آنکھیں چرا رہی ہے یہ ترکیب سوچی کہ ساہوکارا کے ساتھ ساتھ کوئی اور کاروبار شروع کیا جائے۔ چنانچہ اس نے گھنٹہ گھر کے قریب پنساری کی دوکان کھول لی۔ اور ایک ملازم کی مدد سے سودا سلف فروخت کرنے لگا۔ سیٹھی خود ایک گدے پر پالتی مار کر بیٹھ جاتا۔ گاہکوں سے پیسے وصول کرتا اور اشیاء کی پڑیاں باندھ باندھ کر دیتے جاتا۔ رلدو کا یہ کام تھا کہ وہ نہایت ہوشیاری کے ساتھ مطلوبہ شے اندر سے لا کر سیٹھی کے سامنے رکھ دے اور دوسرے حکم کا منتظر رہے۔ صبح سے لے کر پہر رات گئے تک سیٹھی کی دوکان پر گاہکوں کی خوب ہماہمی رہتی اور آنے جانے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔ اس طرح سیٹھی اور رلدو کو سارا دن سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔ اس شبانہ روز محنت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ساہوکارا سے سیٹھی کی آمدنی میں جو کمی واقع ہونے لگی تھی وہ بھی پوری ہو جاتی اور اس کے علاوہ بھی ایک اچھی خاصی رقم بچ رہتی۔

رلدو کی اصل عمر تو کسی صورت تیس سال سے زیادہ نہ تھی مگر شکل سے وہ پینتیس بلکہ اس سے بھی دو ایک سال زیادہ کی عمر کا معلوم ہوتا تھا۔ اس کی صحت بہت اچھی تھی اور وہ تین چار من کی بوری خود ہی اٹھا کر لا سکتا تھا مگر اس کے چہرے کو ذرا غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا کہ اس کے رخساروں پر نہایت ہلکی ہلکی جھریاں لکیروں کی صورت میں موجود ہیں۔ جن سے ایک قسم کی خشونت سی ٹپکتی ہے۔ اور پتہ چلتا ہے کہ رلدو کی گذشتہ زندگی غیر معمولی طور پر مشقت میں گزری ہے وہ مزدور تھا اس لئے زیادہ صاف ستھرا رہنے اور اپنے جسم کا خاص خیال رکھنے کی نہ اس نے کبھی ضرورت ہی محسوس کی اور نہ اسے اتنی فرصت ہی ملی۔ تاہم اس کے خد و خال میں وہ تناسب بدرجہ اتم موجود تھا جو مردانہ حسن کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ رلدو بلا کا محنتی آدمی تھا۔ کام کرتے وہ کبھی نہ تھکتا تھا۔ سیٹھی کی دوکان سے چھوٹی دوکانوں پر بھی دو دو تین تین آدمی کام کرتے تھے مگر یہاں رلدو اکیلا ہی سارے گاہکوں کو بھگتا لیتا تھا۔ سیٹھی کو رلدو کا ایک اور فائدہ بھی تھا۔ وہ ریلوے سٹیشن سے بلٹیاں چھڑانے کے لئے بھی اسی کو بھیجتا۔ رلدو اشیاء سے بھری ہوئی پیٹیاں اپنی ہی پیٹھ پر اٹھا کر لے آتا اور اس طرح سیٹھی کے

بہت سے پیسے بچ جاتے۔ پھر رلدو ایماندار بھی تھا۔ اسے سیٹھی کی دوکان پر کام کرتے تقریباً پانچ سال ہو چکے تھے۔ وہ ہر وقت بھری دوکان میں رہتا مگر چوری کی نیت سے کبھی اس نے کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔ دوسرے دوکانداروں کے کارندے ریلوے سٹیشن سے بلٹیاں چھڑا کر لاتے تو دوکان تک پہنچتے پہنچتے ضرور تھوڑی بہت چیزیں خورد برد کر لیتے۔ اور نہیں تو گھی کے کنستر میں کوئی نوکدار چیز چبھو کر چھید لیتے۔ اس کے نیچے برتن رکھ کر تھوڑا سا گھی نکال لینے کے بعد پھر اس چھید کو موم سے بند کر دیتے۔ یا بوری میں سوراخ کر کے کھانڈ نکال لیتے اور کئی دفعہ ایسا بھی کرتے کہ گھی کا پورا کنستر ہی کسی کے ہاتھ اپنے گھر پہنچا دیتے اور مٹی کے تیل کا کنستر دو اڑھائی روپیہ میں خرید کر دیگر کنستروں میں شامل کر دیتے۔ جب دوکاندار کو اس نقصان کا علم ہوتا تو تمام قصور اشیاء بھیجنے والے تاجر کے سر تھوپ دیا جاتا۔ سیٹھی کی دوکان سے ملحقہ دوکان سے ہی کئی دفعہ یہ سننے میں آیا کہ کارندے بلٹی چھڑا کر لائے تو فلاں فلاں چیز کم نکلی۔ مگر سیٹھی کو اس پانچ سال کے عرصہ میں ایک دفعہ بھی ایسی شکایت کا موقع نہ ملا۔ یہ تو نہیں کہ رلدو اس قسم کے داؤ پیچ نہیں جانتا تھا۔ بلکہ ایمان کی بات تو یہ ہے کہ وہ دوسرے دوکانداروں کے کارندوں سے زیادہ ہوشیار تھا۔ رلدو دیانتدار تھا اور وہ اپنی دیانتداری کو کسی قیمت پر ہاتھ سے دینا نہ چاہتا تھا۔ اس کی محنت وفا اور دیانتداری نے سیٹھی پر بہت اثر کیا اور سیٹھی کو کئی دفعہ خیال بھی آیا کہ وہ اس کی روزانہ مزدوری میں دو ایک پیسوں کی زیادتی کر دے۔ مگر وہ اپنے اس خیال کو عملی جامہ نہ پہنا سکا۔ آج پانچ سال کے بعد بھی رلدو کو وہی چار آنے روزانہ مزدوری مل رہی تھی جو پہلے دن مقرر ہوئی تھی۔

اسے زمانہ کی ناقدر شناسی کہئے یا رلدو کی بدقسمتی کہ رلدو جتنا زیادہ محنت اور ایمانداری سے کام کرتا اتنے ہی اس کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے جاتے۔ سیٹھی یہ چاہتا تھا کہ رلدو اس کے گھر کا تھوڑا بہت کام کاج بھی کر دیا کرے اور بازار سے سودا سلف لانے کے لئے ان کے ہاں دو روپے ماہوار پر جو لڑکا ملازم تھا وہ اسے نکال کر دو روپے کی او بچت کر لے۔ رلدو کو دوکان کے کام سے بہت ہی کم فرصت ملتی تاہم وہ تھوڑا بہت وقت نکال کر سیٹھی کے گھر میں بھی کام کر ہی آتا۔ اس کی اس جانفشانی کا نتیجہ بھی توقع کے برعکس ہی نکلا۔ مزدوری میں اضافہ تو رہا ایک طرف غریب رلدو کو کئی کئی دن ایک پیسہ نہ ملتا۔ رات کو دوکان بند کرتے وقت جب وہ سیٹھی سے اپنی مزدوری طلب کرتا تو سیٹھی اسے ہنسی مذاق میں ٹالنے کی کوشش کرتا اور اگر رلدو اس پر مصر ہوتا تو سیٹھی نہایت متانت کے ساتھ جواب دیتا۔

"آخر تمہارے پیسے جمع ہی ہو رہے ہیں۔ مل جائیں گے کیوں گھبراتے ہو۔ نہ تو میں مرا جا رہا ہوں اور نہ دوکان ہمیشہ کے لئے بند ہو رہی ہے"۔

اس قسم کا جواب سن کر رلدو خاموشی کے ساتھ وہاں سے چل دیتا۔ رلدو نے شہر سے باہر ایک نہایت مختصر سا مکان تین روپے ماہوار کرایہ پر لے رکھا تھا۔ اس کی شادی ہوئے آٹھ سال ہو چکے تھے گھر میں وفادار بیوی لیلا کے علاوہ دو لڑکے اور ایک لڑکی بھی تھی۔

ظاہر ہے کہ اتنی قلیل آمدنی میں چار افراد کا پیٹ بیوی پڑوس کی عورتوں کے ہاں تھوڑا بہت کام کر آتی اور اس طرح مل ملا کر ان کا گزارہ ہو جاتا۔ لیکن جب سے سیٹھی نے رلدو کو روزانہ مزدوری ادا کرنے میں ناغہ کرنا شروع کر دیا۔ انہیں فاقے ہونے شروع ہو گئے تھے۔ لیلا نے رلدو کو کئی دفعہ مشورہ دیا کہ وہ اپنے لئے کسی اور جگہ ملازمت تلاش کر لے مگر اس کساد بازاری کے زمانہ میں جبکہ ایم۔ اے پاس لوگ پندرہ پندرہ روپیہ ماہوار کے کام پر پل پڑتے ہوں رلدو اسے بے علم اور بے یار و مددگار کے لئے نوکری کی سبیل بن جانا آسان نہ تھا۔ رلدو کے پاس اتنا وقت بھی نہ تھا کہ وہ تلاش ملازمت میں کہیں آ جا سکے۔ یہ تو جبھی ممکن تھا کہ یا تو وہ سیٹھی کی ملازمت چھوڑ دیتا اور یا رخصت لے لیتا۔ بغیر کسی اور جگہ بندوبست کئے ملازمت کو چھوڑ دینا رلدو کے لئے مہلک خطرات سے خالی نہ تھا اور چھٹی دینے کیلئے سیٹھی تیار نہ تھا۔ ان تمام حالات نے رلدو کو مجبور کر دیا کہ وہ اپنے

آپ کو قسمت کے حوالے کردے۔ رلدو اور اس کی بیوی کو اپنی چنداں پروا نہ تھی۔ مگر بچوں کو بھوک سے بلکتے دیکھنا اُن کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ خود کئی دفعہ متواتر دو دو تین تین دن فاقہ کرکے مگر بچوں کو کھلا پلا کر سلاتے۔ لیکن کب تک ؟ آخر رلدو اور لیلا کی صحت پر اثر ہونے لگا رلدو کے رنگ میں زردی آگئی اور اس زردی میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔ بیوی کو کوئی خاص مرض تو لاحق نہ ہوا مگر اُسے یوں محسوس ہونے لگا کہ اس کے اعضا ہر وقت تھکے رہتے ہیں۔ سر میں کچھ گرانی رہتی ہے اور وہ پہلی سی چستی باقی نہیں رہی۔ مزدور کا کل سرمایۂ حیات اُس کی صحت ہوتی ہے۔ یہی وہ چیز ہے جو عموماً اس سے وفا کرتی ہے۔ لیکن اگر کسی مزدور کی صحت بھی جواب دینے لگے تو سمجھ لینا چاہئے کہ فطرت اُسے دنیا کے تمام تفکرات سے آزاد کرکے ہمیشہ کی نیند سلا دینے کی فکر میں ہے۔ عام لوگ نامساعد حالات سے گھبرا کر موت کی خواہش کرتے ہیں۔ مگر مزدور کو موت کے تصور سے بھی سکون حاصل نہیں ہوتا۔ مزدور کی بہتری صرف اسی میں ہے۔ کہ وہ تندرست رہے۔ جب مزدور کی تندرستی کا سفینہ شکستہ ہوجائے تو اسے اور اس کے ذریعے روزی حاصل کرنے والوں کو تباہی اور بربادی گرداب میں ڈوب مرنے کے لئے کمربستہ ہوجانا چاہئے ؛

(۲)

رلدو کی بیوی میعادی بخار سے بیمار ہے۔ رلدو کے بچے بہت چھوٹے ہیں۔ بڑے لڑکے کی عمر سات سال ہے اور چھوٹے لڑکے نے ابھی دودھ چھوڑا ہے۔ لڑکی کی عمر چار سال ہے۔ جس دن سے رلدو کی بیوی بیمار ہوئی ہے یہ بچے ہر وقت سہمے سہمے رہتے ہیں۔ ان کے گلاب سے چہرے کملا کر رہ گئے ہیں۔ رلدو صبح کا گیا پہر رات گئے گھر واپس آتا ہے۔ جب کہیں رات کا کھانا تیار ہوتا ہے۔ رلدو کھانا پکانے کے بعد بیوی کی دیکھ بھال کرتا ہے اور اسے تسلی دیتا ہے کہ اس قسم کی تکلیفوں کے لئے تقدیر کی طرف سے ایک خاص وقت مقرر ہوتا ہے۔ جب وہ وقت گزر جائے انسان کے لئے چین ہی چین ہوتا ہے۔ ابھی صبح کے چار ہی بجتے ہیں کہ رلدو "ہے رام" کہکر اٹھ بیٹھتا ہے۔ ضروری حاجات سے فارغ ہوکر نہایت انہماک سے پوجا پاٹ کرتا ہے۔ پھر بچوں کے لئے کھانا تیار کرنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ اور سورج کے طلوع ہوتے ہی وہ اپنے روزانہ کام پر روانہ ہوجاتا ہے۔

دوکان پر کام کرتے کرتے جس وقت رلدو کو اپنی بیوی کی ناگفتہ بہ علالت کا خیال آجاتا تو اُس کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے اور اُس کا دل بیٹھ جاتا۔ وہ چاہتا تھا کہ سیٹھی سے چند دن کی رخصت لے کر بیوی کی تیمارداری کرے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو کم از کم وہ دل کھول کر اس کا علاج تو کرسکے۔ اسی خیال سے آخر اُس نے ایکدن سیٹھی سے اپنی تمام رام کہانی کہہ سنائی۔ اس کا خیال تھا کہ اُس کی اس پریشانی کو کم کرنے کیلئے سیٹھی ضرور اُس کی مدد کرے گا۔ مگر سیٹھی نے سب کچھ سنا اور خاموش ہورہا۔ رلدو کو چھٹی دے دینا سیٹھی کے لئے آسان نہ تھا۔ دوکان پر کام کرنے کے لئے کوئی دوسرا نوکر موجود نہ تھا۔ پھر اگر کوئی اور نوکر دو چار دن کے لئے رکھ بھی لیا جاتا تو وہ مفید ثابت نہ ہوتا کیونکہ اُسے تو جاننے کے لئے ہی کافی مدت کی ضرورت ہوتی کہ کونسی چیز کس ڈبے یا کس بوری میں ہے۔ باقی رہا رلدو کی بقایا مزدوری کا سوال۔ سو اس کے متعلق وہ ہمدردانہ طور پر غور کرنا چاہتا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ سیٹھی کو پندرہ دن کے اندر اندر انکم ٹیکس کی قسط ادا کرنا تھی ۔
اپنے جمع شدہ روپیہ میں سے سیٹھی ایک پائی تک کو چھیڑنا نہیں چاہتا تھا۔ یہ ایک اصول تھا جس پر اُس کے باپ دادا عمل کرتے چلے آئے تھے۔ سیٹھی کس طرح محض ایک مزدور کی خاطر اپنی ایک خاندانی روایت کو پس پشت ڈال دیتا ؟ چنانچہ بہت کچھ غور کے بعد سیٹھی نے رلدو سے کہا "چھٹی تو تمہیں مَیں دے نہیں سکتا۔ البتہ دس دن تک تمہارا بقایا صاف کردیا جائے گا۔ بس انکم ٹیکس کے ادا ہونے کی دیر ہے مجھے تم سے ہمدردی ہے اور مَیں تو دل سے چاہتا ہوں کہ پرمیشور تم پر کرپا کرے۔ کوئی بہت بڑی رقم تو مجھے تم کو ادا کرنی نہیں۔ پھر فکر کیوں کرتے ہو۔ آخر جمع ہی تو ہے۔ مل جائے گی"۔

رلدو نے نہایت دردناک الفاظ میں پہلے گھر کا نقشہ کھینچ کر سیٹھی کے دل میں رحم کے جذبات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر وہ

اس میں کامیاب نہ ہو سکا۔ کئی دفعہ رلدو کی آنکھوں میں آنسو بھی آئے مگر وہ ضبط کر گیا۔ اس کی بار بار التجا پر سیٹھی اپنا پہلا ہی جواب دوہراتا چلا گیا۔ یہ دیکھ کر رلدو نے ایک آہ کھینچی اور خاموشی سے پھر کام کرنے لگا

رلدو کی بیوی کو بخار چڑھے آج گیارھواں دن ہے۔ رلدو کا خیال ہے کہ آج اس کی بیوی کا میعادی بخار اتر جائے گا۔ غریب لوگ اپنے گھروں میں کسی بیماری کی میعاد کا اندازہ ڈاکٹروں کی رائے یا دوا کے بتدریج اثر سے نہیں کیا کرتے۔ وہ ہر بیماری کے متعلق ایک حد مقرر کر لیتے ہیں اور چونکہ یہ حد ان کے گذشتہ تجربات کی مدد سے قائم کی ہوتی ہے اس لئے عام طور پر درست ہی ثابت ہوتی ہے۔

رلدو کو بھی یقین ہے کہ آج اس کی بیوی کا بخار خود بخود اتر جائے گا اس خیال سے اسے کچھ تسلی بھی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا دل بیٹھا جا رہا ہے۔ کیونکہ کل سے سیٹھی نے اسے ایک کوڑی نہیں دی اور آج صبح وہ بچوں کے لئے کوئی کھانا تیار نہیں کر سکا انہیں سوتے چھوڑ کر وہ دل ہی دل میں کرتار کے آگے پرارتھنا کرتا آ گیا تھا یوں تو اب بچے بھی ایک آدھ فاقے کے عادی ہو چکے ہیں مگر رلدو کے دل میں رہ رہ کر یہ وسوسہ پیدا ہو رہا تھا کہ اگر آج شام کو بھی سیٹھی نے کچھ نہ دیا تو وہ کیا کرے گا؟ بیوی کو دودھ کی ضرورت ہوگی۔ بچے بھوک سے بلک رہے ہوں گے اور رلدو کے جاتے ہی وہ اس کی ٹانگوں سے چمٹ جائیں گے سیٹھی کے انکم ٹیکس ادا کرنے میں ابھی چار دن باقی ہیں۔ کچھ عجب نہیں کہ وہ آج بھی رلدو کو مزدوری ادا کرنے سے انکار کر دے۔ دوکان میں سیٹھی کا سیف سامنے کھلا پڑا تھا اگر رلدو اس میں سے دو ایک روپے کا کریانہ اڑا لیتا تو سیٹھی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ رلدو اس کی نظروں میں ویسے کا ویسا ایماندار بھی رہتا اور اسے لمبے تفکرات سے مخلصی بھی مل جاتی۔ آج رلدو نے جب اپنے موجودہ تمام حالات پر نظر دوڑائی تو ایک لمحہ کے لئے اس کے دل میں یہ خیال آیا بھی مگر اس خیال کے آتے ہی اس کا دل کانپ اٹھا۔ "بے ایمانی؟ یہ کبھی نہ ہوگا۔ آخر یہ چند روزہ زندگی ہے ہی کیا!" یہ کہہ کر وہ پھر کام میں مصروف ہو گیا۔ عام طور پر سیٹھی رات کے ساڑھے نو بجے دوکان بڑھا دیا کرتا تھا۔ مگر آج برابر گیارہ بجے تک اکا دکا گاہک آتا رہا۔ آخر جب سیٹھی کے اشارہ پر رلدو دوکان بڑھانے لگا تو رلدو نے کانپتے ہوئے دل اور ملتجیانہ نگاہ سے لکنت آمیز لہجہ میں آج اور صرف آج کی مزدوری کے لئے رحم کی درخواست کر ہی دی وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا اور سب کچھ یکدم کہہ دینا چاہتا تھا۔ ہر چند کہ سیٹھی کو اس کی خانگی پریشانیوں کا علم تھا وہ اپنی موجودہ صورت حالات ایک دفعہ پھر سیٹھی کے سامنے بیان کرنا چاہتا تھا۔ مگر تلاطم جذبات میں اس کی آواز گھٹ گئی وہ کچھ بھی نہ کہہ سکا۔ الفاظ گلے میں اٹک کر رہ گئے۔ سیٹھی سمجھنے کو تو سب کچھ سمجھ گیا لیکن ٹس سے مس نہ ہوا۔ بلکہ اس نے تیوری چڑھا کر کچھ اس انداز سے رلدو کی طرف دیکھا کہ خود رلدو نے محسوس کیا کہ وہ ایک ذلیل انسان ہے۔ انسان کی ذلت اسوقت انتہا کو پہنچ جاتی ہے جب وہ خود اپنی نظروں میں حقیر ہو جائے۔ یہی کیفیت اس وقت رلدو کی تھی۔ سیٹھی نے رلدو کی درخواست کا کچھ جواب نہ دیا اور تحکمانہ لہجہ میں اسے کہا۔ "دروازہ بند کرو" رلدو بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ وہ اپنے آقا کے حکم کی تعمیل کرنا چاہتا تھا مگر اس کے ہاتھ باغی ہو رہے تھے۔ اسے یوں معلوم ہونے لگا کہ اسے اپنے ہاتھوں پر کوئی دسترس نہیں رہی۔ رلدو کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ بت بنا کھڑا تھا۔ غالباً وہ یہ سوچ رہا تھا کہ چار آنے کوئی اتنی بڑی رقم نہیں کہ اس کے ادا ہو جانے سے انکم ٹیکس کی ادائیگی میں خلل آ جائے گا۔ وہ اس وقت اپنے پسینے کی کمائی کو سیٹھی کی خیرات سمجھ کر اس کے سامنے ہاتھ پھیلا رہا تھا۔ مگر سیٹھی کو اس صورت میں بھی مزدوری ادا کرنے میں تامل تھا۔ سیٹھی نے جب دیکھا کہ رلدو کیلئے اس کی تیوری کارگر ثابت نہیں ہوئی تو اس نے اندر کی طرف ہاتھ بڑھا کر ایک اکنی نکالی اور نہایت رعونت کے ساتھ رلدو کے ہاتھ پر رکھ دی۔ پہلے تو رلدو یہ سمجھا کہ شاید اسے چونی دی گئی ہے اور خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔ مگر جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ یہ چونی نہیں بلکہ اکنی ہے۔ رلدو نے اسے بھی غنیمت سمجھا اور دروازہ بڑھا دیا۔ سیٹھی زیر لب کچھ بڑبڑاتا ہوا حسابوں کا گچھا سنبھالے اپنے گھر کو چل دیا اور

رلدو نے اپنی راہ لی۔

رلدو کا مکان سیٹھی کی دوکان سے کوئی میل سوا میل کے فاصلہ پر ہے۔ رلدو نے اکنی کو جیب میں نہیں ڈالا اور نہ اسے دھوتی کے پلے ہی باندھا ہے۔ بلکہ وہ اسے مٹھی میں دبائے چلا جا رہا ہے۔ اُسے اس طرح معلوم ہو رہا ہے گویا کہ تمام کائنات اس وقت اس کی مٹھی میں بند ہے۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہا ہے اور تیز تیز قدم بڑھائے چلا جاتا ہے تاکہ جتنی جلدی ممکن ہو سکے گھر پہنچ جائے اور یہ اکنی اپنی بیوی کے سامنے رکھ کر اس کے نصف تفکرات کا خاتمہ کر دے وہ سوچ رہا تھا کہ دو پیسے کا دودھ آ جائے گا اور دو پیسے کا آٹا۔ نمک گھر میں موجود ہے۔ وہی نمک دودھ میں ڈال کر بیوی کو دودھ پلا دیا جائے گا اور روٹیاں بھی نمکین ہی پکائی جائیں گی۔ اس طرح اس کے بچے اور وہ ایک وقت خوب پیٹ بھر کر کھانا کھا سکیں گے پھر پرماتما جو دکھائے گا دیکھا جائے گا۔ غریب آدمی کی ضروریات زندگی کتنی مختصر ہوتی ہیں! ایک اکنی اسے کتنے تفکرات سے آزاد کر سکتی ہے! رلدو انہیں خیالات میں ڈوبا جلد جلد چلا جا رہا تھا۔

(۳)

"ہے کوئی اللہ کا پیارا جو بوڑھے محتاج کو ایک پیسہ دیدے؟
میرے داتا کسی سخی کو بھیج! اندھا محتاج دو دن سے یہاں بھوکا پڑا ہے
ہے کوئی اللہ کا پیارا ... ..."

رلدو لارنس روڈ پر چلا جا رہا تھا۔ گھر پہنچنے کے لئے ابھی اسے نصف فاصلہ طے کرنا باقی تھا کہ کسی کے یہ دلدوز الفاظ رلدو کے کان پڑے۔ آواز اُسی سمت سے آ رہی تھی۔ جدھر کو رلدو جا رہا تھا۔ جوں جوں وہ چلتا گیا یہ آواز زیادہ صاف طور پر سنائی دیتی گئی۔ حتیٰ کہ رلدو بالکل اس جگہ کے قریب پہنچ گیا جہاں سے آواز آ رہی تھی۔ رلدو نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے ایک بے حد ضعیف اور بوڑھا فقیر نہایت پھٹے پرانے کپڑے پہنے بیٹھا ہے۔ اس نے ہاتھ پھیلا رکھا ہے۔ جب کسی راہرو کے پاؤں کی آہٹ سنتا ہے بلند آواز سے "ہے کوئی اللہ کا پیارا ......" پکارنا شروع کر دیتا ہے۔ بوڑھے کے الفاظ میں اتنا سوز تھا کہ رلدو کا دل بے اختیار ہو گیا اور وہ خود بخود وہاں ٹھہر گیا۔ جب بوڑھا یہ کہتا "اندھا محتاج دو دن سے یہاں بھوکا پڑا ہے" تو رلدو کے دل پر ایک ٹھیس سی لگتی۔ اس بات کا رلدو ہی صحیح اندازہ لگا سکتا تھا کہ جس شخص کو دو دن کھانا نصیب نہ ہو اس کی کیا حالت ہوتی ہے رلدو نے خیال کیا کہ اب ساڑھے گیارہ کا عمل ہو رہا ہے۔ اگر یہ فقیر فی الواقعہ بھوک سے نڈھال نہ ہوتا تو اس پیرانہ سالی میں اتنی رات گئے تک سڑک پر نہ پڑا رہتا۔ پیشہ ور گداگر بیشک لالچی ہوتے ہیں مگر یہ بوڑھا جو کچھ کہہ رہا ہے وہ سب درست ہے۔ رلدو نے ایک دفعہ اور اپنی مٹھی کو کھولا اور اکنی کو دیکھا اور کچھ سوچنے لگا۔ وہ دل ہی دل میں کہنے لگا۔

"اگر میں اس اکنی میں سے ایک پیسہ اس محتاج کو دیدوں تو خواہ وہ پیٹ بھر کر کھانا نہ کھا سکے مگر اس سے وہ ایک روٹی تو خرید لے گا پھر صبح خدا اس کا کوئی اور بندوبست کر دے گا۔ گو رات زیادہ ہو رہی ہے مگر کہیں نہ کہیں سے میں یہ اکنی دے کر چار پیسے لے سکتا ہوں۔ اس بوڑھے کی مدد ضرور کرنا چاہئے۔"

پھر اُسے خیال آیا کہ گھر میں بیوی بیمار پڑی ہے۔ تین بچے صبح سے بھوکے ہیں۔ خود سارا دن خالی پیٹ کام کیا ہے۔ اگر اب بھی کچھ نہ کھایا تو کل کام کس طرح ہو سکے گا۔ اب رلدو نے حساب کرنا شروع کیا۔ بیوی کے لئے ایک پیسے کا دودھ آ جائے گا اور دو پیسے کا آٹا خرید لینگے۔ مگر ایک پیسے کا دودھ کیا آئے گا! اس سے تو کچھ بھی نہیں بنے گا۔ اچھا تو دودھ دو پیسے کا خرید لیا جائے اور آٹا ایک پیسے کا۔ اس طرح بچے بھوکے رہتے ہیں۔ اول خویش اور پھر درویش۔ بچوں کو تو پالنا میرا فرض ہے۔ خیرات مجھ پر فرض نہیں تو پھر کیا اس بوڑھے کو یوں ہی مرنے دیا جائے؟ نہیں یہ نہیں ہو گا۔ اچھا تو بچوں کو کھانا کھلا دیا جائے اور خود کل شام کو دیکھا جائے گا

رلدو کسی فیصلہ کن نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ وہ کسی گہرے سوچ میں پڑا تھا۔ ادھر فقیر نے یہ دیکھ کر کہ کسی کے پاؤں کی چاپ اس کے قریب آ کر ختم ہو گئی ہے۔ زیادہ دردناک اور بلند آواز سے "صرف

ایک پیسے کا سوال" پکارنا شروع کر دیا۔ رلدو کو یہ بھی تشویش تھی کہ اس کے گھر پہنچنے تک پرسو آنے کی دو کان بند نہ کر دے۔ ایک پیسہ کی خاطر وہ کب آدمی رات گئے دوبارہ دوکان کھولنے کی زحمت گوارا کریگا۔

رلدو انہیں خیالات میں غلطاں تھا کہ اسے دائیں طرف سے تیز روشنی دکھائی دی۔ کوئی لاری آرہی تھی۔ رلدو سوچتے سوچتے لاری کو قریب سے قریب تر آتے دیکھنے لگا۔ اسے ہارن کی آواز بھی سنائی دی مگر یہ ہارن اس کے لئے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ لاری سڑک کے دوسرے کنارے کے ساتھ ساتھ جا رہی تھی اور جوں جوں وہ لاری قریب آتی گئی خود بخود اور بھی دوسرے کنارے کے ساتھ لگتی گئی۔ مگر اس کا ڈرائیور ہارن برابر کئے جا رہا تھا۔

"گھرر..... گھرر..... گھٹ"۔ بائیں جانب سے ایک تیز رفتار موٹر کار آئی۔ اس کے ڈرائیور نے پہلے تو سامنے سے آنیوالی لاری کی طرف توجہ نہ کی۔ جب وہ موٹر اس لاری کے بالکل قریب آگئی تو موٹر کے ڈرائیور نے تصادم سے بچنے کے لئے یکدم موٹر کو ایک طرف کرنا چاہا۔ موٹر تصادم سے بچ گئی۔ لاری صاف نکل گئی اور فقیر بھی موٹر کی زد میں آتے آتے بچ گیا۔ لیکن رلدو اس کی پوری لپیٹ میں آگیا۔ رلدو کے منہ سے ایک چیخ بلند ہوئی مگر اس چیخ کو فوراً ہی فضا نے اپنے دامن میں لپیٹ لیا۔ فقیر اگرچہ اندھا تھا مگر اندھوں کی دوسری حس زیادہ تیز ہوتی ہیں وہ اصل معاملہ کو فوراً بھانپ گیا اور گرد و غبار کے اچھی طرح سے بیٹھنے سے قبل ہی ٹانک ٹوئے مارتا ہوا وہاں سے چلدیا۔

یہ رائے بہادر دولت رام کی موٹر کار تھی۔ اور ابھی کل ہی ساڑھے پانچ ہزار روپئے کو انہوں نے خریدی تھی۔ آج وہ اسے خود چلا رہے ہیں۔ رائے بہادر نے جب دیکھا کہ کوئی آدمی موٹر کی جھپٹ میں آگیا ہے تو اس نے موٹر کو ٹھیرا لیا اور خود نیچے اتر آیا۔ رلدو خون میں لت پت بیہوش زمین پر پڑا تھا۔ رائے بہادر نے اس پر ٹارچ کی روشنی پھینک کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ رلدو مرا نہیں۔ رائے بہادر نے نہایت حقارت سے اسے بوٹ کی ٹھوکر مارتے ہوئے گرج کر کہا۔

"یو بلڈی۔ خود کشی کرتا ہے"۔

پھر خدا جانے رائے بہادر کے دل میں کیا آئی کہ اس نے ایک اور راہگیر کی مدد سے رلدو کو اسی حالت میں اٹھا کر اپنی موٹر میں پھینکا اور ہسپتال لے گیا۔ رلدو کو ہسپتال میں چھوڑ کر رائے بہادر نے تھانے کا رخ کیا۔ وہاں رپٹ لکھا کر آرام سے اپنے بنگلے میں جا سویا۔ ڈاکٹر نے رلدو کے جسم کو دھو کر زخم سی دیئے اور ایک بازو کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اسے مضبوطی سے باندھ کر اوپر پلستر لیپ دیا۔

رلدو ساری رات بیہوش رہا۔ صبح کے وقت نرس نے رلدو کو آہستہ سے بڑبڑاتے ہوئے سنا۔

"میں بغیر کھانا کھائے بھی ایک دن اور زندہ رہ سکتا ہوں بیلے بوڑھے۔ یہ ایک پیسہ ہے"۔

جب رلدو اچھی طرح سے ہوش میں آیا تو اس نے اپنے آپ کو ہسپتال میں پایا۔ اس کا تمام جسم درد کر رہا تھا۔ ابھی وہ اپنے ماحول کو اچھی طرح سے سمجھ بھی نہیں سکا تھا کہ پولیس انسپکٹر اس کا بیان قلمبند کرنے کے لئے آموجود ہوا۔ اب تو رلدو کو یہ یقین ہو گیا کہ وہ یا تو خواب دیکھ رہا ہے یا مر چکا ہے۔ آخر اسے بتایا گیا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔ اور پولیس یہ معلوم کرنا چاہتی ہے کہ وہ کیوں رائے بہادر کی موٹر کے آگے لیٹ گیا تھا۔ اس قسم کے بےمعنی سوالات سے وہ اور بھی گھبرا گیا۔ اب وہ تمام ماجرا سمجھ چکا تھا۔ اس نے ٹھیک ٹھیک تمام واقعات کہہ دیئے۔ پولیس انسپکٹر نے بعض سوالات نہایت درشتی سے کئے مگر ڈاکٹر نے اسے ایسا کرنے سے روک دیا۔

ڈاکٹر کی رائے تھی کہ رلدو بیس پچیس دن تک تندرست ہو جائے گا۔ مگر رلدو کا دل کہیں اور ہی تھا۔ وہ ایک منٹ بھی یہاں ٹھیرنا نہ چاہتا تھا۔ مگر مجبور تھا۔

لیلا کا بخار ٹھیک گیارھویں دن اتر گیا۔ ایک تو اس دن گھر میں کھانے کو کچھ نہ تھا۔ دوسرے خلاف معمول رلدو گھر نہ آیا۔ بچے تو رو دھو کر سو رہے مگر بیوی کو تمام رات نیند نہ آئی۔ وہ چاہتی

تھی کہ صبح ہوتے ہی خود سیٹھی کی دوکان پر جا کر اپنے سوامی کے متعلق پتہ کرے مگر وہ بے حد کمزور تھی۔ اور بچے بہت چھوٹے تھے۔ اس لئے دوکان تک کوئی بھی نہ جا سکتا تھا۔ وہ اسی ادھیڑبن میں تھی کہ دوپہر کے وقت اسے اطلاع ملی کہ اس کا سوامی ہسپتال میں ہے۔ غریب کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ مشرقی عورت کی زندگی عزت آبرو غرضیکہ ہر چیز اس کے خاوند کی زندگی سے وابستہ ہوتی ہے۔ اپنے خاوند کی جان کو وہ خطرہ میں نہیں دیکھ سکتی۔ گھر میں ایک پھوٹی کوڑی تک نہ تھی لیلا نے اپنے بیاہ کی نشانی کے طور پر ایک آرسی سنبھال کر رکھی ہوئی تھی۔ اس نے وہ آرسی نکال کر اپنے بڑے لڑکے کو دی کہ وہ اسے مصری جی کے پاس لے جائے جو اسی محلے میں رہتے ہیں اور جو کچھ بھی اسکی قیمت دے۔ وہ لے آئے۔ تھوڑی دیر بعد مصری جی بچے کے ساتھ خود گھر آئے اور لیلا کے ہاتھ پر دس روپے رکھ دیئے۔ یہ آرسی شاید تیس بتیس روپے میں بنی تھی۔ مگر ضرورت کی قیمت ہی کیا ہے؟ لیلا نے شکریہ کے ساتھ وہ قبول کئے۔ بچوں کو بازار سے دودھ منگا کر پلایا اور انہیں گھر ہی میں چھوڑ کر اکیلی گرتی پڑتی ہسپتال پہنچی۔ اس کے میلے کچیلے کپڑے دیکھ کر ہسپتال کے چپڑاسیوں نے کئی دفعہ لیلا کو روکنے کی کوشش کی مگر وہ ادھر اُدھر سے پوچھتی ہوئی اپنے سوامی کے پاس جا ہی پہنچی۔ رلدو کو اس حالت میں دیکھ کر لیلا دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ جس سے تمام ہسپتال میں کہرام سا مچ گیا۔ نرسوں نے آکر بڑی درشتی سے لیلا کو چپ کرایا ادھر رلدو کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ آخر لیلا نے رلدو کو تسلی دی، اور رلدو نے لیلا کی ڈھارس بندھائی ؛

(۴)

ہسپتال میں رلدو کے زخم مندمل ہونے شروع ہوئے اور کوئی ایک مہینہ میں وہ پھر مکمل طور پر تندرست ہو گیا۔ صرف اس کے بازو کو ابھی تکلیف باقی تھی اور سب کچھ ٹھیک ہو چکا تھا۔ اب رلدو ہسپتال سے باہر آنا چاہتا تھا مگر اسے اجازت نہ تھی کہ وہ گھر چلا جائے۔ رلدو بیٹھا سوچا کرتا کہ وہ ہسپتال سے نکل کر کیا کرے گا

یعنی اس دن جبکہ اسے ہسپتال سے چھٹی ملنا تھی۔ پولیس ہتھکڑی لے کر آگئی اور غریب رلدو کو حوالات میں لے جایا گیا۔ راستے بہادر نے پولیس کو یقین دلا دیا تھا کہ رلدو کا ارادہ خودکشی کا تھا مگر وہ اتفاق سے بچ گیا ہے۔ خود رلدو کے بیان سے بھی یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ انتہا درجے کا مفلس اور قلاش ہے اور زندگی اس کے لئے وبالِ جان ہو رہی ہے۔ اکنی والا قصہ سن کر تو انسپکٹر پولیس کو بے اختیار ہنسی آ گئی تھی اور وہ "بالکل جھوٹ" کہکر ہنس پڑا تھا۔ رلدو کو بہت غصہ آیا مگر وہ کیا کر سکتا تھا۔ اب پولیس نے چالان مکمل کر لیا تھا اور دوسرے دن رلدو کو مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا جانا تھا۔

لیلا کو جب اس نئی مصیبت کا علم ہوا تو اس کا دل بیٹھ گیا اور اس کا دماغ جواب دے گیا۔ دنیا میں اسے کوئی غمخوار نظر نہ آتا تھا جسے وہ مدد کے لئے بلائے۔ کچھ دے دلا کر رلدو کو پولیس کے چنگل سے چھڑا لینا مشکل کام نہ تھا مگر لیلا کے پاس تھا ہی کیا جو وہ پولیس کی مٹھی گرم کر سکتی ایک آرسی اس کے پاس موجود تھی۔ اب وہ بھی فروخت ہو چکی تھی اور اس سے بچوں کا پیٹ پل رہا تھا۔ ڈوبتے کو تنکے کا سہارا۔ لیلا نے سوچا کہ رلدو نے سیٹھی کی پانچ سال خدمت کی ہے اس کے ذمے رلدو کی کچھ مزدوری بھی ہے۔ اور اس وقت تک سیٹھی نے ہماری مدد بھی نہیں کی۔ اگر میں اس کی منت سماجت کروں تو کچھ عجب نہیں کہ اس کا دل پسیج آئے اور وہ رلدو کو چھڑا لائے۔ اس خیال کے آتے ہی لیلا کی ڈھارس سی بندھ گئی۔ اسے معلوم تھا کہ سیٹھی کی دوکان پر جانا فضول ہے۔ سیٹھی اپنے گاہکوں کو چھوڑ کر کب اس قسم کی درخواست پر توجہ دے گا۔ اسے گھر پر ملنا ہی بہتر ہے۔ دوسرے سیٹھی کی بیوی بھی موجود ہو گی۔ عورت کا دل نرم ہوتا ہے۔ پھر ایک عورت جب دوسری عورت کو مصیبت میں دیکھے تو وہ اور بھی ہمدرد ہو جاتی ہے لیلا ان خیالات میں مستغرق شام کا انتظار کرتی رہی۔ آٹھ نو بجے کے قریب وہ سیٹھی کے مکان پر پہنچی۔ آج پہلی دفعہ وہ سیٹھی کے گھر آئی تھی۔ سیٹھی کی بیوی نے یوں تو اسے دور ہی بٹھایا مگر اس کے حالات سن کر بہت کچھ ہمدردی کا اظہار کیا اتنے میں رام لال سیٹھی بھی دوکان

بڑھا کر آ گئے۔

لیلا جھک کر آداب بجالائی اور ایک طرف کھڑی ہوگئی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے اور وہ مصائب کی داستان بیان کئے جارہی تھی۔ سیٹھی بڑے ہمدردانہ انداز میں اپنے سر کو ہلاتا گیا۔ جب لیلا خاموش ہوگئی اور التجا کرنے کے لئے اور الفاظ اس کے پاس باقی نہ رہے تو سیٹھی نے کہا۔

"مجھے تم سے پوری پوری ہمدردی ہے۔ مگر خیال کرو رلدو کی وجہ سے میرا کتنا نقصان ہوا۔ اگر وہ موٹر کے نیچے آ ہی گیا تھا تو مجھے اطلاع بھجوا دی ہوتی تاکہ میں آدمی کا فوراً بندوبست کرلیتا۔ مجھے پورا ایک دن پریشانی رہی اور کئی گاہک واپس پھر گئے۔ بھلا میں خود اتنا کام کیسے کرسکتا تھا۔ دوسرے دن مجھے اس واقعہ کا علم ہوا تو میں نے نیا آدمی تلاش کرلیا۔ اب اگر رلدو رہا کر آ بھی جائے تو میرے پاس اُس کے لئے جگہ نہیں۔ نیا نوکر بخوبی کام چلا لیتا ہے۔ اور مزدوری بھی روزانہ ساڑھے تین آنے لیتا ہے۔ پھر وہ رلدو کی طرح ضدی بھی نہیں کہ ہر شام کو ضرور مزدوری لے کر ہی ٹلے۔ باقی رہا رلدو کی مدد کا معاملہ سو تم جانتی ہو میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ میرا ایک ایک منٹ قیمت رکھتا ہے۔ آخر میں رلدو کی خاطر کیوں نقصان برداشت کروں؟ دوسرے میری کوئی خاص واقفیت بھی نہیں میں تم لوگوں کی صرف اتنی مدد کرسکتا ہوں کہ تم کل صبح کسی آدمی کو میری دوکان پر بھیج دینا۔ میں رلدو کی بقیہ مزدوری جو پونے پانچ روپے کے قریب بنتی ہے ادا کردونگا۔" لیلا نے سیٹھی کی بہت منت سماجت کی۔ مگر سیٹھی کا دل نہ پسیجا۔ سیٹھی کی بیوی کو لیلا پر ترس تو بہت آیا اور اُس نے دو ایک مرتبہ سیٹھی سے کچھ کہنا بھی چاہا مگر وہ لب نہ ہلا سکی۔ شاید لیلا ابھی اور کوشش کرتی مگر سیٹھی کی اس ڈانٹ نے کہ

"جاؤ اب میرا دماغ نہ چاٹو"۔ لیلا کے تمام حوصلوں کو پست کردیا اور وہ شکستہ دل ہو کر چلنے لگی۔ ابھی وہ مکان سے باہر نہ نکلی تھی کہ سیٹھی نے اسے پھر آواز دی۔ لیلا پلٹی کہ شاید خدا نے اس کے دل میں رحم ڈال دیا ہو۔ سیٹھی نے لیلا کو دوبارہ سامنے پا کر کہا۔

"تم نے سن لیا ہوگا کہ میں بہت مصروف آدمی ہوں۔ دیکھو دیکھو اگر تم رلدو سے ملو تو اُسے کہدینا کہ وہ مجھ سے کسی قسم کی توقع نہ رکھے۔ میں اُس کے لئے کچھ نہیں کرسکتا۔ ایسا نہ ہو کہ وہ غلطی سے مجھے بطور صفائی کے گواہ کے عدالت میں طلب کرنے کی کوشش کرے۔ میں رلدو کے متعلق کچھ نہیں جانتا اور یہی میں عدالت کے سامنے کہونگا۔ اس لئے بہتر یہی ہے کہ وہ مجھے کسی قسم کی تکلیف نہ دے مجھ ہی سے غلطی ہوگئی کہ اُسے اپنی دوکان پر نوکر رکھ لیا۔ مزدوروں کی اس وقت بھی کمی نہ تھی"۔

(۵)

تمام شہر میں مشہور ہوچکا تھا کہ کشن چند مجسٹریٹ کے روبرو ارتکاب خودکشی کا ایک ہیجان خیز مقدمہ زیر سماعت ہے۔ پہلے بھی دو ایک سماعتیں ہوچکی ہیں مگر اصل سماعت آج ہے۔ اس سے بیشتر رائے بہادر دولت رام کی گواہی ہوچکی ہے۔ رائے بہادر شہر کے معزز ترین امرا میں شمار ہوتے ہیں۔ عدالت میں وہ حاضر ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اس لئے انہوں نے علالت طبع کا بہانہ بنالیا قانون کے مطابق کشن چند نے رائے بہادر کی شہادت قلمبند کرنے کیلئے رائے بہادر کی کوٹھی پر ہی عدالت منعقد کرلی تھی۔ رائے بہادر کے ہاں کئی دفعہ کشن چند چائے پی چکے ہیں اور ان کے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ اگر رائے بہادر کہہ دیتے کہ یہ واقعہ محض ایک حادثہ کی حیثیت رکھتا ہے تو رائے بہادر کا کچھ نہ بگڑتا اور غریب رلدو صاف بچ جاتا۔ مگر رائے بہادر یہ چاہتے تھے کہ کسی طرح خود ان پر زد نہ پڑے۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ یہ ایک حادثہ تھا تو ممکن تھا کہ بعض لوگ یہ کہدیتے کہ ہوسکتا ہے رائے بہادر کی غلطی سے یہ حادثہ وقوع پذیر ہوا ہو۔ اس لئے رائے بہادر ایک قدم آگے ہی جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے صاف صاف کہدیا کہ یہ شخص میری موٹر کے آگے لیٹ گیا تھا۔ میں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی مگر میں پوری طرح کامیاب نہ ہوسکا۔ پولیس انسپکٹر کی شہادت بھی ہوچکی ہے۔ عدالت نے جب انسپکٹر کا قلمبند

کردہ بیان پڑھ کر سنایا اور پوچھا کہ کیا وہ رلدو ہی کا بیان ہے تو رلدو نے
کہہ دیا کہ اس کا ایک ایک لفظ صحیح ہے۔

آج عدالت کا تمام کمرہ تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا ہے۔
کہیں تل دھرنے کو جگہ باقی نہیں۔ رلدو سے کہا گیا تھا کہ وہ کوئی وکیل
کر لے مگر اس نے وکیل کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ سرکاری وکیل اس سے
پہلے دو مقدمات میں اچھی طرح جرح نہ کر سکنے کی وجہ سے عدالتی حلقہ
میں خفت سی محسوس کر رہا ہے۔ اب کے وہ "خان صاحب" کے
خطاب کا امیدوار ہے۔ پہلے دو مقدموں میں ملزمان اس سرکاری
وکیل کے بعض دوستوں کے رشتہ دار تھے۔ وہ دوست اسے وقتاً
فوقتاً ملحقہ دیہات سے گھی پہنچایا کرتے تھے اس لئے اس کے ان سے
خاص تعلقات تھے۔ تاہم اس نے اپنی طرف سے اچھی جرح کر دی تھی
مگر اس کا کیا علاج کہ عدالت نے ملزمان کو بری کر دیا۔ آج سرکاری
وکیل ان دو مقدموں کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ کمرہ عدالت میں
لیلا بھی اپنے بچوں کو ہمراہ لئے موجود ہے۔ اس کی آنکھوں سے
آنسوؤں کی جھڑی لگ رہی ہے اور گڑگڑا گڑگڑا کر ایشور کے حضور
پرارتھنا کر رہی ہے کہ وہ اس کے سوامی پر رحم کرے۔

سرکاری وکیل نے عدالت سے مخاطب ہو کر مختصر الفاظ میں
اس مقدمہ کی کل روئداد بیان کی اور پھر رلدو کی طرف مخاطب ہو کر
نہایت تحکمانہ انداز میں یکے بعد دیگرے متعدد سوالات کئے "کیا یہ درست
ہے کہ تمہیں سیٹھی کی دوکان سے چار آنے روزانہ مزدوری ملتی تھی؟
کیا یہ درست ہے کہ تمہیں اکثر فاقے آتے رہتے ہیں؟ کیا یہ صحیح ہے
کہ سیٹھی تمہارے حق میں گواہی تک دینے کو تیار نہیں؟ کیا یہ درست
ہے کہ تم بالعموم ہر روز سیٹھی کی دوکان سے نو ساڑھے نو بجے آ جایا
کرتے تھے مگر اس دن تم گیارہ بلکہ ساڑھے گیارہ بجے آئے؟"

رلدو نے ان تمام سوالات کا جواب اثبات میں دیا۔ وہ سچ
بولنا جانتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ عدالت ضرور سچ کا احترام کرے گی
اور اسے رہا کر دیا جائے گا۔

وکیل نے عدالت سے مخاطب ہو کر کہا:۔

"جناب والا! معاملہ بالکل صاف ہے۔ ملزم ایک ذلیل انسان کی
حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو اپنی زندگی سے تنگ
آئے ہوتے ہیں۔ اس کا منشا خودکشی کرنے کا تھا لیکن یہ اپنے ارادہ
میں کامیاب نہیں ہو سکا اس لئے اس نے ایک کہانی تراش لی ہے
جناب والا! رائے بہادر کا بیان ہے کہ وہاں کوئی فقیر موجود نہ تھا۔
اس کی اکنی والی داستان بالکل جھوٹ ہے۔ اتنے خراب حالات میں
کون کسی کو اکنی ہی سے ایک پیسہ دیتا ہے۔ یہ سب باتیں اس نے
خود بنائی ہیں۔ اصلیت سے انہیں دور کا بھی واسطہ نہیں۔ پھر
سب سے ان دلائل کی پشت پر رائے بہادر کی شہادت ہے۔ ملزم نے
اکنی والی فرضی داستان وضع کر کے گویا بالواسطہ رائے بہادر کو اس
مقدمہ میں لپیٹنے کی کوشش کی ہے۔

جناب والا! آپ کو معلوم ہے کہ رائے بہادر کتنے معزز آدمی
ہیں۔ پھر وہ خود موٹر کو چلا رہے تھے۔ اگر رلدو کی کہانی درست تسلیم
کر لی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ یہ واقعہ رائے بہادر کی غفلت سے
عمل میں آیا تھا۔

پس یہ بات بالکل ثابت ہو چکی ہے کہ ملزم نے خودکشی کی کوشش
کی اور ضرور کی مگر ناکام رہا۔"

رلدو کا منہ کھلا تھا وہ حیرانی کے ساتھ سرکاری وکیل کی
تقریر سن رہا تھا۔ یوں تو دنیا نے اس کے ساتھ کبھی بھی ہمدردانہ
سلوک نہ کیا تھا مگر آج تو کمال ہو گیا۔ رلدو کو اپنے کانوں پر اعتبار
نہ آتا تھا۔ وہ اپنی آنکھوں پر بھی اعتبار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر
حقیقت ہر حال میں حقیقت ہی ہے خواہ وہ کتنی ہی تلخ کیوں نہ ہو۔
رلدو مایوسی کا مجسمہ بنا کھڑا تھا۔ اسے یہ دنیا درندوں کی ایک بستی
نظر آ رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کٹہرے پھاڑ کر کسی سمت کو نکل جائے۔
مگر ہتھکڑی کی جھنکار اور بیڑیوں کی گرفت نے اسے جتا دیا کہ اس
وقت وہ آزاد نہیں بلکہ گرفتار ہے۔ بھاگ جانا بھی اب اس کے اختیار
میں نہیں۔

سرکاری وکیل نے اپنی تقریر کو ختم کرتے ہوئے کہا:۔

"یہ کساد بازاری کا زمانہ ہے۔ افلاس نے لوگوں کے اخلاق بہت پست کر دیئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خودکشی کی وارداتیں عام ہو رہی ہیں۔ انہیں روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ خودکشی کی کوشش کرنے والوں کو عبرت انگیز سزائیں دی جائیں۔ اگر ملزم کو بری کر دیا گیا تو کچھ عجب نہیں کہ یہ رہا ہوتے ہی کسی کنوئیں میں چھلانگ مار دے یا کسی درخت سے رسّی باندھ کر پھانسی لے لے۔ یہ کہکر وکیل نے دادطلب نگاہوں سے تماشائیوں کی طرف دیکھا۔

اس آخری فقرہ نے رلدو کو کسی گہرے سوچ سے چونکا دیا اور وہ پھر کسی نئے سوچ میں پڑ گیا۔ وقت زیادہ ہو چکا تھا اس لئے عدالت نے فیصلہ سنانے کے لئے ایک ہفتہ بعد کی تاریخ مقرر کر دی اور پولیس کو اشارہ کیا کہ وہ رلدو کو واپس حوالات میں لے جائے پولیس پھر رلدو کو کشاں کشاں لے چلی۔ لیلاں روتی اور سرپیٹتی تینوں بچوں کو ہمراہ لے کر گرتی پڑتی گھر کو چلدی۔ بڑے لڑکے کو شدت کا بخار تھا مگر وہ اسی حالت میں اسے اپنے ہمراہ لے آئی تھی۔ عدالت کے کمرہ میں ہی لڑکے نے دو تین دفعہ کراہ کراہ کر کہا تھا کہ اس کی پسلی میں درد ہوتا ہے مگر عدالت کے برخاست ہونے سے پہلے لیلاں کا وہاں سے چلے آنا خارج از بحث تھا۔ رلدو کو بھی علم ہو گیا تھا کہ اس کا بچہ بخار میں مبتلا ہے اور اب اسکے درد بھی ہونے لگا ہے

مقررہ تاریخ پر رلدو کو ہتھکڑی بیڑی سمیت پھر کشن چند کی عدالت میں لایا گیا۔ لیلاں بھی کمرے میں موجود تھی۔ مگر آج بڑا لڑکا اس کے ہمراہ نہ تھا۔ صرف لڑکی اور چھوٹا لڑکا اس سے چمٹے ہوئے تھے لیلاں کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ رنگ زرد تھا اور اس کے ہونٹوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ سر کے بال کھلے تھے اور اسے اپنے آپ کا کچھ ہوش نہ تھا۔ آج وہ رلدو کو آتے دیکھ کر دیوانہ وار اس کی طرف لپکی نہیں بلکہ بالکل خاموش رہی۔ اس کی آنکھیں بھی بالکل خشک تھیں۔ نمی کا نشان تک نہ تھا۔ اسنے رلدو کو دیکھا اور دیکھ کر گردن جھکالی۔ رلدو تمام ماجرا ایک ہی نظر میں سمجھ گیا۔ اس کا دل پہلے ہی پھٹ چکا تھا۔

اس نظارہ نے اس کے رہے سہے ہوش بھی اڑا دیئے۔ وہ چاہتا تھا کہ لیلاں کو تسلی دے اور اُسے سمجھائے کہ بڑے لڑکے کے مرنے کا کیوں غم کرتی ہو اچھا ہوا ایک فرد کو فاقہ کشی سے نجات مل گئی۔ مگر عدالت نے جلد کارروائی شروع کر دی اور پولیس نے رلدو کو اپنی بیوی سے بات نہ کرنے دی۔

رلدو کے متعلق لکھا ہوا فیصلہ کشن چند کے سامنے پڑا تھا۔ صرف اس پر دستخط کرنے باقی تھے۔ کشن چند نے رلدو سے پوچھا۔

"تم کچھ کہنا چاہتے ہو؟"

رلدو حیران تھا کہ وہ اس سوال کا کیا جواب دے۔ کیا عدالت رلدو سے دو ایک اور فقرے کہلوا کر اُسے اور جھوٹا ثابت کرنا چاہتی ہے؟ جو کچھ رلدو اس وقت تک کہہ چکا ہے کیا وہ کافی نہ تھا؟ آخر اس سوال کا مطلب؟؟ اصل بات یہ ہے کہ عدالت کا یہ سوال ہی رلدو کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس لئے رلدو بالکل خاموش ہو رہا۔

مجسٹریٹ نے آنکھوں کو چشمہ لگایا اور تماشائیوں پر ایک ایک غائرانہ نگاہ ڈالی۔ پھر کاغذوں کا ایک پلندہ اپنے دائیں ہاتھ میں اٹھا کر بلند کیا۔ اسے ایک لحظہ دیکھا۔ پھر اُسے میز پر رکھکر اس پر دستخط کئے اور رلدو سے مخاطب ہو کر کہا۔

"تمہیں دو سال قید بامشقت کی سزا دی جاتی ہے۔ سزا ختم ہونے پر تمہیں ایک سال نیک رہنے کی ذاتی ضمانت دینا ہو گی۔"

رلدو پھر بھی ایک لفظ تک نہ بولا۔ اس کی آنکھیں بے اختیار آسمان کی طرف اٹھ گئیں۔ خدا جانے اس کے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ مگر غریب آدمی کے جذبات کو سمجھنے والا وہاں کون تھا۔ سزا ملجانے کی تو اسے پہلے ہی توقع تھی۔ مگر یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آسکی کہ رلدو کے ایک سال نیک رہنے سے عدالت کی کیا مراد ہے۔ رلدو صرف ایک بدی کا مرتکب ہے اور وہ بدی غریبی ہے۔ اس سے چھٹکارا پانا اس کے اختیار

میں نہیں۔ نیکی سے اور کیا مراد ہو سکتی ہے؟ عدالت کے آخری فقرہ نے رلدو پر جنون کی سی کیفیت طاری کر دی۔ دنیا میں کون انسان ہے جو آسانی سے اپنی خودداری کو ہاتھ سے دے دے۔ پھر جس کے پاس دنیا میں صرف چند جذبات ہی ہوں۔ اگر اس کے وہ جذبات بھی مجروح کر دیئے جائیں تو اس کے پاس باقی کیا رہ جاتا ہے۔ رلدو نے بہت کچھ پیچ و تاب کھایا۔ مگر ہتھکڑی کی گرفت نے ایک دفعہ اور اُسے بتا دیا کہ تمہیں یہ توہین بھی برداشت کرنا ہو گی۔ رلدو کہنا چاہتا تھا۔

"نیکی تو بوتلوں میں بند ہو کر ولایت سے آتی ہے اور شراب خانوں میں فروخت ہوتی ہے۔ وہ میرے ایسا غریب آدمی کہاں خرید سکتا ہے۔ نیکی رات کے پچھلے پہر چکلوں میں مل سکتی ہے۔ لیکن رلدو کے پاس نہ موٹر کار ہے اور نہ روپوں کی تھیلیاں۔ وہاں بھی اسے کس طرح باریابی ہو سکتی ہے۔ آپ سن شعور سے لے کر اس وقت تک نیک ہیں اور نیک ہی مریں گے۔ کیونکہ نیکی خریدنے کی استطاعت آپ میں موجود ہے۔ میں تو پیدائشی بد ہوں اور اسی طرح مر جاؤں گا۔ جن جگہوں پر نیکی مل سکتی ہے وہاں تک میری رسائی ہی نہیں۔ پھر میں دو سال کے بعد کس طرح نیکی کی طرف مائل ہو سکونگا۔"

مایوسی رلدو کے جنون پر غالب آئی اور وہ ایک آہ کھینچکر رہ گیا۔ لیلا نے جب مجسٹریٹ کا فیصلہ سنا تو ایک پُر زور قہقہہ مارا اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر رلدو کی طرف تکنے لگی۔ تماشائیوں نے "عورت پاگل ہو گئی"۔ "مکر ہے" کہنا شروع کر دیا۔ رلدو نے دیکھا کہ بعض لوگ لیلا کو دھکے دے کر کمرہ سے باہر نکال رہے ہیں مگر وہ کر ہی کیا سکتا تھا۔ شیخ سعدی نے کہا ہے کہ اگر کوئی چاہے کہ دنیا اُس سے غمخواری کرے تو اُسے پاگل ہو جانا چاہئیے مگر یہ پرانے زمانے کی بات ہے۔ اب تو پاگلوں پر پتھر پھینکے جاتے ہیں اور ہر جگہ انہیں دھکے ملتے ہیں۔ یہی کچھ لیلا کے ساتھ ہوا۔ پولیس رلدو کو کشاں کشاں جیل لے گئی۔

(۲)

رلدو کی میعادِ قید پوری ہو گئی۔ علی الصبح داروغہ جیل نے رلدو کی کوٹھری کے باہر کھڑے ہو کر رلدو سے کہہ دیا کہ وہ اب آزاد ہے۔ اس کی کوٹھری کا دروازہ کھول دیا گیا۔ اور رلدو باہر نکل آیا۔ اس دو سال کے عرصہ میں رلدو کی صحت برباد ہو چکی ہے۔ اس کے رخسار پچک گئے ہیں۔ بال اور ناخن بڑھے ہوئے ہیں۔ اس کی ہیئت کذائی اور گہرے نقوش دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ اس انسان کو بناتے وقت فطرت نے شوخی سے کام لیا ہے۔ اس نے بالکل ویسے ہی کیا ہے جیسے کوئی مصور ایک نہایت اچھا خاکہ تیار کر کے اس میں بڑی بد مذاقی کے ساتھ رنگ بھر دے۔

رلدو جیل کی چار دیواری سے تو نکل آیا مگر اب جائے کدھر؟ جیل سے کوئی دو فرلانگ کے فاصلہ پر سڑک کے ایک طرف بہت بڑا پتھر پڑا ہوا تھا وہ اس پر بیٹھ گیا اور اپنے حالات پر غور کرنے لگا۔ سیٹھ جی کی طوطا چشمی۔ رائے بہادر کی بے رحمی اور سفا کی ہسپتال والوں کا غیر ہمدردانہ رویہ۔ مجسٹریٹ کا انصاف اور قانون کے نام پر ظلم اور داروغہ جیل کا انسانیت سوز سلوک۔ سب ایک ایک کر کے اس کی آنکھوں کے سامنے آ گئے۔ ان مظالم کی وجہ؟ کچھ بھی نہیں! رلدو نے کسی کا کچھ نہ بگاڑا تھا۔ اب رلدو کو گھر کا خیال آیا۔ ایک لڑکا اس کے دوران مقدمہ میں مر گیا تھا۔ بیوی فیصلہ سنتے ہی پاگل ہو گئی تھی۔ وہ ضرور مر گئی ہو گی۔ اگر زندہ ہوتی تو ضرور کسی نہ کسی طرح اپنے سوامی سے جیل میں ملاقات کرنے کی کوشش کرتی۔ یہ ناممکن تھا کہ لیلا جیسی شوہر پرست بیوی پورے دو سال خاموش بیٹھی رہتی۔ باقی رہے دو بچے۔ اگر وہ بھی مر چکے ہیں تو معاملہ ختم۔ لیکن اگر وہ زندہ ہیں تو جس طرح وہ رلدو کی مدد کے بغیر گذشتہ دو سال زندہ رہے ہیں اسی طرح آئندہ بھی زندہ رہ سکیں گے۔ پھر رلدو کی اس دنیا میں کیا ضرورت ہوئی؟ دنیا رلدو کو برداشت کرنے کو تیار نہیں اور گھر میں اس کی ضرورت نہیں۔ آخر وہ زندہ رہ کر کیا کرے گا۔ ایک لمحہ کے لئے رلدو کے دل میں یہ خیال آیا کہ چل کر ذرا اپنے گھر کی تو حالت دیکھے مگر وہ اپنے زخموں پر نمک چھڑکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لئے اُس نے مناسب یہی سمجھا کہ اب واپس گھر کو نہ جائے۔ بڑی دیر تک وہ سر جھکائے سوچتا رہا دو سال گذرنے پر بھی سرکاری وکیل کے الفاظ اس کے دماغ

میں گونج رہے تھے۔

"اگر ملزم کو رہا کر دیا گیا تو کچھ عجب نہیں کہ یہ رہا ہوتے ہی کسی کنویں میں چھلانگ مار دے یا کسی درخت سے رسّی باندھ کر پھانسی لے لے"۔

رلدو نے اس فقرہ کو کئی بار اپنے دل میں دُہرایا۔ پھر اس نے اٹھ کر ایک انگڑائی لی اور سڑک پر چلنے لگا۔ یہاں تک کہ وہ آبادی کے بالکل قریب پہنچ گیا۔ سڑک سے کچھ فاصلہ پر اُسے ایک چارپائی نظر آئی۔ رلدو جا کر اس چارپائی پر بیٹھ گیا۔ یہ دیکھ کر کہ قریب کوئی آدمی نہیں اُس نے چارپائی کو سر پر اٹھایا اور پھر سڑک پر ہو لیا وہ چلتا گیا۔ یہاں تک کہ تھانے کے قریب پہنچ گیا۔ تھانے سے کوئی چار سو گز کے فاصلہ پر بڑ کا ایک بہت بڑا درخت ہے۔ اس کے نیچے اس نے چارپائی رکھدی۔ اس وقت سورج کوئی سوا نیزہ بلند ہو چکا تھا۔ سڑک پر آمد و رفت بہت ہی کم تھی۔ تھانے میں بھی سوائے ایک آدھ سپاہی کے کوئی شخص نظر نہ آتا تھا۔ رلدو نے چارپائی کی ادوائن ادھیڑی اور درخت پر چڑھ گیا۔ اس نے نہایت مضبوطی کے ساتھ سب سے نچلے تنے سے اس رسّی کو دوہری کر کے باندھا۔ اور نیچے اُتر آیا۔ رلدو کے چہرے پر اضطراب یا پریشانی کا نشان تک نہ تھا۔ اب اس نے چاروں طرف دیکھا کہ اس وقت کوئی شخص قریب تو نہیں۔ تسلی کر لینے کے بعد اُس نے چارپائی کھڑی کی اور اس پر چڑھ کر رسّی کا پھندا اپنے گلے میں ڈال لیا۔ پاؤں کی ٹھوکر سے چارپائی کو اپنے نیچے گرا دیا۔ چند سکنڈ اس کا جسم تڑپا اور پیشتر اس کے کہ تھانے کے دروازہ پر پہرہ دینے والے سپاہی کی نظر اس پر پڑے وہ ہمیشہ کے لئے ساکن ہو چکا تھا۔

اُس وقت ایک اخبار فروش سڑک پر سے گزرتے ہوئے زور زور سے ہانکیں لگا رہا تھا کہ

"جنگلی جانوروں کو نہ مارنے کا قانون پاس ہو گیا۔ وزیر اعظم پنجاب کا اسمبلی میں ہنگامہ خیز بیان۔ اتحاد پارٹی غریبوں اور مزدوروں کی نمائندہ جماعت ہے۔ مہاتما گاندھی کے دل میں غریبوں کا درد —— قیمت ایک آنہ —— سب تازہ خبریں"۔

کیفیاتِ شہود

(از جناب سید شاہ انتظام الدین جمالی۔ اکبرآبادی۔ ایم ایس۔ سی۔ علیگ)

وہ مجھے دیکھ رہے تھے میں اُن کو۔ وہ تھے اور میں تھا۔ میں تھا اور وہ تھے۔ وہ میرے سامنے اور میں اُنکے۔ نمائش کے لوگ ہمکو دیکھ رہے تھے اور ہم ایک دوسرے کو۔

(۲)

چاند تھا اور چاندنی۔ باغ تھا اور اسمیں رنگ برنگ پھول کھلے تھے میں اور وہ ایک فوارہ کے قریب بنچ پر آمنے سامنے بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اشارہ کیا اور میں قریب جا کر بیٹھ گیا۔ کہنے لگے "آپ کی شادی ہونے والی ہے" میں نے کہا "مجھے نہیں معلوم" بولے "آپ کو نہیں معلوم۔ خیر"

میں نے کہا "کس سے" مسکرا کر فرمایا "مجھ سے"۔

(۳)

سلیم کے یہاں محفلِ رقص و سرود تھی۔ بڑے بڑے گویئے اور رقاصائیں آئی تھیں۔ تمام محفل مغنیہ کی نقرئی آواز سے مبہوت و مسرور ہو رہی تھی۔ اور اُسکی خوبصورتی کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن میں ان کو دیکھ رہا تھا۔ اور وہ اپنی ریشمی ساڑھی کو۔

(۴)

میرے ہاتھ میں کنول کا پھول تھا۔ وہ اپنے کمرے میں کھڑے ہوئے مجھے دیکھ رہے تھے۔ تھوڑی دیر دیکھنے کے بعد مسکرائے۔ میں سمجھا شاید پھول پسند آیا۔ نذر کر دیا۔ پھول لے کر غور سے دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کر پھول زمین پر پھینکدیا اور پھر مجھے دیکھنے لگے۔

ساقی

(عالمگیر کے خاص نمبر کے لئے)

یادِ رفتہ

از:-
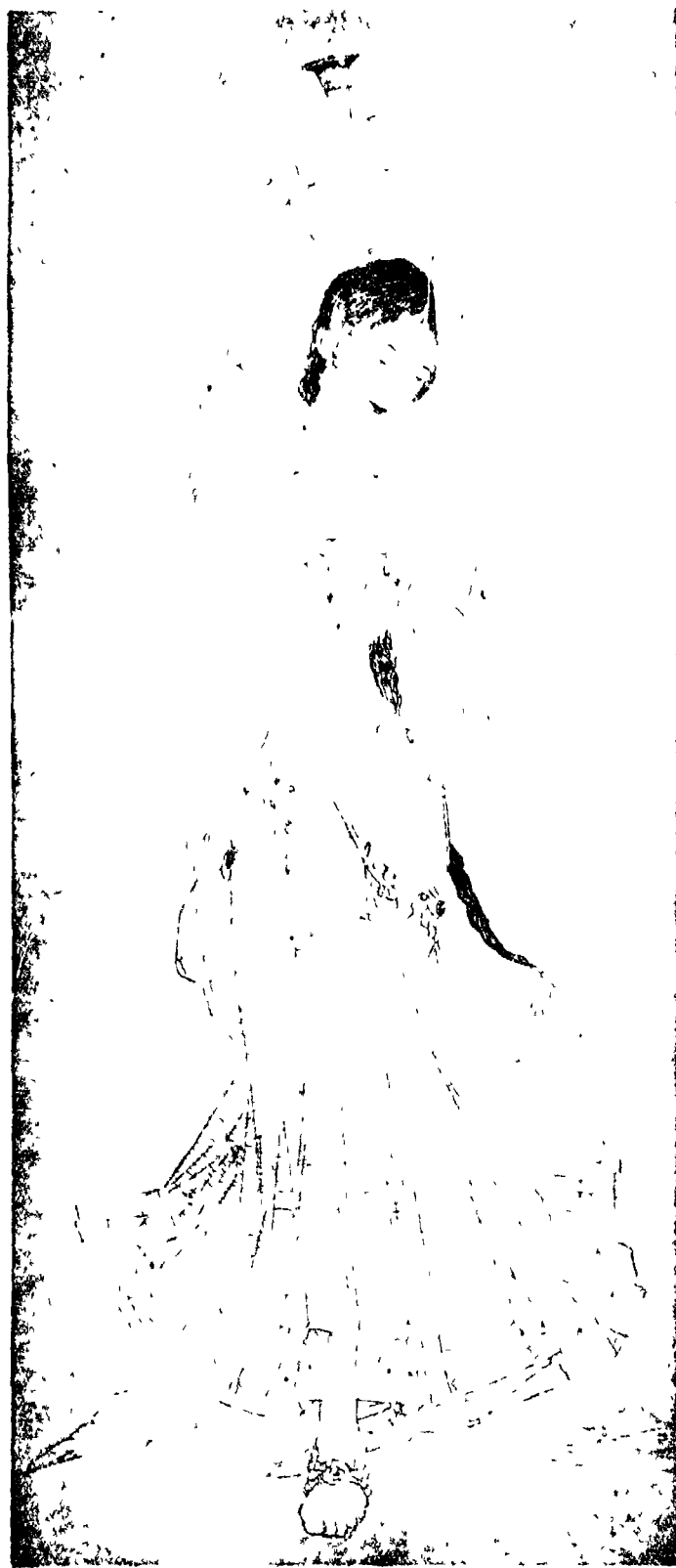
(جناب علی احمد صاحب علیؔ - فرزند حضرت جلیلؔ مد ظلہ)

یاد ایام کہ تھی بے رنگ تصویرِ حیات
محفلِ دل میں تھی روشن شمعِ تنویرِ حیات

داستانِ زندگی کا ہر ورق رنگیں نہ تھا
پھول کوئی اس گلستاں کا ابھی زریں نہ تھا

دل کے عشرت خانے میں باجا سا بجتا تھا ابھی
ہر نفس کے تار میں تھا رنگ نغمے کا ابھی

آسمانِ عیش پر غم کی گھٹا چھائی نہ تھی
گلشنِ امید میں بادِ خزاں آئی نہ تھی

بیقراری ناشکیبائی سے یارانا نہ تھا
ایک عالم کی زباں پر میرا افسانا نہ تھا

مائلِ نغمہ تھا ابتک بربطِ سازِ سکون
ہاں ابھی بکھرا نہ تھا شیرازۂ رازِ سکون

لیلئ شب کھول کر زلفِ رسا آئی نہ تھی
اوجِ بامِ چرخ پر کالی گھٹا چھائی نہ تھی

چلنے پائی تھی نہ بادِ یاس ابھی اس باغ میں
نغمہ پیرائی کا تھا احساس ابھی اس باغ میں

دل مرا فکرِ غمِ الفت سے تھا آزاد ابھی
ایک دنیا عیش کی پہلو میں تھی آباد ابھی

میں ابھی واقف نہ تھا سوز و گدازِ عشق سے
تھا ابھی ناآشنا راز و نیازِ عشق سے

بلبل و گل کی محبت سے ابھی تھا بے خبر
شمع و پروانہ کی الفت سے ابھی تھا بے خبر

دل میں خارِ نشترِ غم کی خلش بالکل نہ تھی
شعلۂ سوزِ محبت کی تپش بالکل نہ تھی

دل پہ مستولی نہ تھی یہ چاندنی پھیلی ہوئی
آنکھ کو بھاتی نہ تھی یہ چاندنی پھیلی ہوئی
شعلۂ ہر شمعِ محفل پر نہ تھی کچھ دلکشی
ارتعاشِ موجِ ساحل پر نہ تھی کچھ دلکشی
جنبشِ مضراب پر ہوش اپنے کھو دیتا نہ تھا
نغمۂ صد یاس آگیں سُن کے رو دیتا نہ تھا
بربطِ دل سے تڑپنے کی صدا آتی نہ تھی
کاروانِ اشک سے بانگِ درا آتی نہ تھی
نوحۂ غم کا گماں آوازِ بلبل پر نہ تھا
برقِ سوزاں کا تبسم ہر لبِ گل پر نہ تھا
ہمنوا میری ابھی صحرا کی آبادی نہ تھی
گوشۂ عزلت ابھی کہسار کی وادی نہ تھی

جادۂ اُلفت میں دل نالاں نہ تھا مثلِ جرس
خامشی میں خود بخود بجتا نہ تھا تارِ جرس

سازِ دل کی جنبشوں میں نغمۂ حرماں نہ تھا
چشمِ تر کی لرزشوں میں موجۂ طوفاں نہ تھا
میری خاموشی میں پنہاں تھا نہ رازِ عشق ابھی
میری گویائی سے تھا بجتا نہ سازِ عشق ابھی
بجلیوں کی ہمسری کرتے مرے نالے نہ تھے
پھوٹ کر صحرا میں روتے پاؤں کے چھالے نہ تھے
عشق کا پیغام بادِ صبح لائی ہی نہ تھی
لَن ترانی کی صدا کانوں میں آئی ہی نہ تھی
مضطرب کرتی نہ تھی موجِ صدائے ساز ابھی
دل میں کھب جاتی نہ تھی ہر غم بھری آواز ابھی

"درد سے واقف نہ تھے غم سے شناسائی نہ تھی
ہائے کیا دن تھے طبیعت جب کہیں آئی نہ تھی"

کچھ اقبال نامہ جہانگیری سے!

از جناب مولانا محمد عبداللہ صاحب قریشی بی۔ اے

آج اردو، ہندی، انگریزی اور دیگر زبانوں کے بیشمار روزانہ ہفتہ وار اور ماہوار رسالے اور اخبار ہزاروں کی تعداد میں شایع ہوکر ہندوستان کے گوشے گوشے میں پہونچ رہے ہیں اور دنیا بھر کی خبروں سے لوگوں کی معلومات میں نت نیا اضافہ کررہے ہیں۔ مگر آج سے چند صدی بیشتر ہندوستان میں یہ حالت نہ تھی۔ لوگ پریس کے فائدوں سے بے خبر اور اخبارات کے نام سے محض ناواقف تھے۔ دور تیموریہ میں اتنا ضرور تھا کہ بڑے بڑے شہروں اور قصبوں میں حکومت کی طرف سے وقائع نگار اور پرچہ نویس مقرر ہوتے تھے جو مقررہ اوقات پر اپنے ہاں کی ضروری ضروری خبریں اور اطلاعیں دربار میں بھیجتے تھے۔ یہ خبریں جس جس محکمہ کے متعلق ہوتی تھیں اس محکمہ میں ضروری کارروائیوں کے لئے بھیجدی جاتی تھیں اور خاص خاص قابل ذکر واقعات کا خلاصہ درباری مورخ کے سپرد کردیا جاتا تھا۔ وہ جس واقعہ کو مناسب سمجھتا اپنی تاریخ میں درج کردیتا۔ اس طرح شاہی تاریخیں مرتب ہوئیں۔ اس قسم کی سینکڑوں تاریخیں، ہندوستان اور یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں جو اپنے اپنے عہد کے واقعات کے لئے سند مانی جاتی ہیں۔

اقبال نامہ جہانگیری جو ابوالحسن معتمد خاں نے جہانگیر کے حکم سے مرتب کی ہے اسی قبیل کی کتاب ہے اور عہد جہانگیری کی ایک مشہور تاریخ ہے۔ اس میں تیمور سے لیکر شہنشاہ جہانگیر تک کے حالات و سوانح کے علاوہ ان عجیب و غریب اور حیرت انگیز واقعات کا ذکر بھی ملتا ہے جو اس کے زمانہ میں مختلف جگہ وقوع پذیر ہوئے۔ یہ واقعات چونکہ معلومات عامہ سے تعلق رکھتے ہیں اس لئے ان میں سے چند ایک کا خلاصہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ فتح بنگالہ!

شیر خاں نے ایک منجم کی تعریف سنی کہ علم نجوم میں بڑا کامل ہے۔ وہ اڑلیسہ کے راجہ کے پاس ملازم ہے۔ شیر شاہ نے اسے اپنے یہاں طلب کیا کہ آئندہ کے کچھ حالات اس سے دریافت کرے مگر راجہ نے اسے اجازت نہ دی۔ تاہم نجومی نے اسے وہیں سے لکھ کر بھیجدیا کہ اس سال بنگال پر اس کا قبضہ نہ ہوگا۔ البتہ فلاں تاریخ کو وہ اس پر قابض ہوجائیگا۔ اس دن دریائے گنگا ایک ساعت کے لئے پایاب ہوجائیگا۔ چنانچہ جیسا اس نجومی نے لکھا تھا، ٹھیک اسی طرح ہوا اور اس کا لفظ لفظ درست نکلا۔

۲۔ شکاری کتّا.

۲۷ جمادی الاولی سنہ ۹۷ھ کو اکبر شیخ المشایخ شیخ نظام الدین اولیا قدس سرہ کے روضہ کی زیارت کو دہلی گیا۔ واپسی پر جب اس کی سواری ماہم انگہ کے مدرسہ کے قریب پہونچی تو ایک سیاہ بخت نے شرف الدین حسین مرزا کے ایما سے بادشاہ پر ایک تیر پھینکا جو ایک انگشت کے قریب بادشاہ کے دہنے شانے میں گھس گیا۔ لوگوں میں یہ شور پیدا ہوا۔ درباریوں کے دل اس حادثہ سے سخت ملول ہوئے۔ جاں نثاروں کے جگر پارہ پارہ ہوگئے محافظوں نے دوڑ کر تیر پھینکنے والے کو گرفتار کرلیا۔ چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں کہ سازشیوں کا پتہ لگانے کے لئے تفتیش کے بعد اس کو سزا دی جائے مگر اکبر نے حکم دیا کہ اسے وہیں تہ تیغ کردیا جائے۔ کیونکہ یہ ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی زندگی

سے مایوس ہو کر بہت سے مخلص اور وفادار مصاحبوں کے نام بگڑا دیے اور ان بیچاروں کو بے گناہ مروا دیا چنانچہ اسے وہیں قتل کر دیا گیا اور بادشاہ اپنے جاں نثاروں کو تسلی دیتا ہوا اسی حالت میں محل کی طرف چلا آیا۔ حکیم عین الملک اور خواجہ خاں نے جو جراحی کے فن میں ید طولیٰ رکھتے تھے بادشاہ کا علاج کیا اور ایک ہفتہ میں زخم مندمل ہو گیا۔

اس واقعے کے سلسلے میں عجیب بات یہ ہے کہ اکبر کے پاس ایک شکاری کتا تھا جس کا نام مہوہ تھا۔ بادشاہ کو یہ کتا بڑا عزیز تھا اور وہ اکثر سیر و شکار میں اسے اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس دفعہ وہ دہلی آتے ہوئے اسے آگرہ چھوڑ آیا تھا۔ اتفاق کی بات ہے کہ جس دن بادشاہ پر حملہ ہوا اور وہ زخمی ہو کر محل میں پہونچا کتے نے کھانا پینا چھوڑ دیا۔ اس کے محافظوں کو بڑی تشویش ہوئی انھوں نے بہتیری کوشش کی کہ کسی طرح معلوم کریں کہ اسے کیا ہو گیا ہے اور وہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ مگر انھیں اس کا کچھ پتہ نہ چلا اور وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکے۔ جس دن بادشاہ کی سواری آگرہ پہونچی اور وہ محل میں داخل ہوا مہوہ اچھل پڑا اور دم ہلا ہلا کر بادشاہ کے قدم چاٹنے لگا۔ اس دن کتے نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا۔ کتے کے محافظ بڑے حیران ہوئے۔ انھوں نے تمام حالات بادشاہ کو سنائے اور وہ تاریخ بتائی جس تاریخ سے کتے نے کھانا پینا ترک کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی تاریخ تھی جس دن بادشاہ کو دہلی میں تیر لگا تھا اور کتے نے دلی رغبت اور محبت کی زیادتی سے کھانا پینا چھوڑ دیا تھا۔

۳۔ بیانِ عجیب ساز ارغنون

اکبر اعظم نے حاجی حبیب اللہ کاشی کو ایک گراں بہا رقم دے کر اہل فرنگ کی عمدہ عمدہ چیزیں اور اچھے اچھے صناع اور کاریگر لانے کے لئے گوا کے بندر کی طرف بھیجا ہوا تھا وہ سنہ ۹۸۳ھ میں بہت سی اشیائے کر واپس لوٹا اور وہاں کے چابکدست ہنرمندوں کو فرنگی لباس میں ملبوس کر کے دربار میں لایا۔ وہ اہل فرنگ کے طریقے پر نقارے اور قرنا بجاتے ہوئے بادشاہ کے حضور میں پیش ہوئے بادشاہ تحائف دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ ان میں سب سے عجیب چیز ساز ارغنون تھا جسے آرگن بھی کہتے ہیں۔ اس سے کئی کئی سریلی آوازیں نکلتی ہیں اسے سن کر سب لوگ حیران ہوئے اور ہر شخص نے اس کی تعریف کی۔

۴۔ گنگ محل

سنہ ۹۹۰ھ میں اکبر کو خیال آیا کہ انسان کی اصلی زبان کا مطالعہ کیا جائے اور دیکھا جائے کہ وہ ماں کی تعلیم کے بغیر کس طرح بولنا سیکھتے ہیں۔ اس نے حکم دیا کہ نوزائیدہ بچوں کی نگرانی کی جائے کوئی آواز ان کے کان میں نہ پہنچائی جائے اور پھر معلوم کیا جائے کہ وہ گویائی کے وقت کون سا حرف خود بخود زبان سے نکالتے ہیں۔ اس تحقیق کے لئے شہر سے باہر آبادی سے بہت دور ایک محل تعمیر کرایا گیا اور تجربے کے طور پر چند بچے اس میں رکھے گئے چند معتمد ان کی حفاظت پر متقرر تھے اور کھلائیوں کو یہ تاکید کر دی گئی تھی کہ وہ دودھ پلاتے وقت کوئی بات نہ کریں۔ لوگ اس عمارت کو گنگ محل کہتے تھے۔

جب بچے چار سال کے ہو گئے اور ان کے بولنے کا زمانہ آ گیا تو بادشاہ اس خاموش اور بے زبان وادی میں تشریف لایا اور اس نے دیکھا کہ بچے کوئی زبان نہ جانتے تھے وہ قوت گویائی سے محروم تھے اور گونگوں کی طرح کسی نامعلوم زبان میں گفتگو کرتے تھے جو کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔

۵۔ شکم دریدہ آدمی

سنہ ۹۹۶ھ میں اکبر کشمیر کی سیر کو گیا۔ وہاں ایک درویش بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا گیا جو ریشی فرقہ سے تعلق رکھتا تھا اس کا پیٹ پھٹا ہوا اور انتڑیاں کٹی ہوئی تھیں اور اس نے لکڑی کا ایک ڈبہ پیٹ کے اوپر باندھ رکھا تھا۔ کہتے ہیں کہ اس سے تین سال قبل غازی خاں والی کشمیر نے اس کے مرشد پر کوئی تہمت لگا کر اسے قتل کرا دیا تھا۔ یہ فقیر اس صدمہ کو برداشت نہ کر سکا اور اس نے مرشد کے غم میں اپنے پیٹ میں چھری بھونک لی۔ چھری کا پہلا وار خالی گیا۔ ہاتھ بھرپور نہ پڑا۔ اس نے دوسرا وار کیا۔ وہ بھی کارگر نہ ہوا تاہم پیٹ میں سوراخ ہو گیا اور انتڑیاں کٹ کر باہر نکل آئیں۔ لیکن زندگی باقی تھی بچ گیا اور رفتہ رفتہ انتڑیوں کے سرے بھی خشک ہو کر ایک بالشت کے برابر پیٹ سے باہر رہ گئے چنانچہ جب وہ کھانا کھاتا تو کھانا تحلیل ہو کر انہیں انتڑیوں کے ذریعہ باہر آ جاتا۔ اس شخص نے ان انتڑیوں کو لکڑی کے ڈبہ میں رکھ کر ڈبہ پیٹ کے اوپر باندھ رکھا تھا۔ اگرچہ اس واقعہ کا ظہور انسانی

عقل وفکر سے باہر ہے لیکن قدرت خداوندی سے کچھ بعید نہیں۔

۶۔ ہاتھ سے بات کرنے والا اندھا

۱۰۰۰ھ کا ذکر ہے کہ اکبر کے حضور میں ایک نابینا پیش کیا گیا جو ہر بات کا جواب ہاتھ سے دیتا تھا جب اس سے سوال کیا جاتا تو وہ بغل کے نیچے ہاتھ رکھ کر بغل بجاتا اور بالکل اسی طرح جس طرح دوسرے زبان سے بات کرتے ہیں۔ وہ بغل کی آواز سے سوال کا جواب دیتا۔ بلکہ اسی طرح اشعار بھی پڑھتا۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس نے کوئی جن قید کر رکھا تھا اور بعضے اس کی اس قوت کو چشم بندی پر محمول کرتے تھے۔ لیکن ان میں سے کوئی بات بھی نہ تھی معتمد خاں صاحب اقبال نامہ جہانگیری نے بارہا اس سے ملاقات کی اور یہ نتیجہ نکالا کہ نہ تو اس کے پاس کوئی جن تھا اور نہ وہ چشم بندی کا علم جانتا تھا۔ یہ سب کچھ ورزش کا کرشمہ تھا اور جو کمال اس نے حاصل کیا تھا وہ مشق کی وجہ سے تھا۔

۷۔ مکڑی اور سانپ کا مقابلہ

۱۰۱۵ھ میں جب جہانگیر کابل کو جاتے ہوئے علی مسجد پر پہونچا تو اسے ایک بہت بڑی مکڑی دکھائی دی جو کیکڑے کے لگ بھگ تھی۔ ایک دو گز لمبا سانپ آیا اور اس پر حملہ آور ہوا مکڑی نے اس کی گردن دبوچی اور اس زور سے اسے زمین پر پٹکا کہ وہ ہلاک ہو گیا۔

۸۔ شیر کی اطاعت گذاری

۱۰۱۷ھ میں ایک قلندر جہانگیر کے حضور میں حاضر ہوا اور اس نے ایک شیر پیشکش کے طور پر بادشاہ کی نذر کیا۔ یہ شیر بہت بڑا، مضبوط اور تنومند تھا۔ قلندر نے اسے چھوٹی سی عمر میں گرفتار کر کے خوب سدھایا اور لعل خاں اس کا نام رکھا تھا۔ یہ شیر اتنا مطیع اور فرمانبردار ہو چکا تھا کہ کسی آدمی کو نقصان نہیں پہنچاتا تھا۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کی زنجیر کاٹ دی جائے اور اسے جھروکہ درشن کے نیچے چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ دریا کے کنارے ادھر ادھر گھومتا رہے۔ تین چار شیربان گنگا کی لکڑیاں لے کر اس کی رکھوالی کریں چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ بادشاہ شیر کی اطاعت گذاری دیکھ کر بہت خوش ہوا اور اس نے خود شیروں کو سدھانے کا ارادہ کیا۔ بہت سے شیروں کے بچے لائے گئے اور انھیں سدھانے کے لئے دو دو موکلوں کے سپرد کر دیا گیا۔ موکل انھیں کھانا وغیرہ کھلاتے اور اپنے اشارہ پر چلاتے۔ آخر یہ بچے بڑے ہوئے ان میں سے ایک کا نام مردانہ دوسرے کا فیل جنگ اور تیسرے کا شیر دل رکھا گیا۔ بادشاہ نے کئی مرتبہ ان کو آپس میں لڑایا لیکن ان کی لڑائی شیرانہ نہیں ہوتی تھی کیونکہ وہ اس جوش وخروش سے نہیں لڑتے تھے جس طرح دوسرے حیوان آپس میں لڑا کرتے ہیں

۹۔ شیر بے زنجیر

عہد جہانگیری کا یہ حیرت انگیز واقعہ ہے کہ اس وقت شیر بغیر زنجیروں کے شہر میں پھرتے تھے۔ نہ لوگ ان سے خوف کھاتے تھے نہ وہ کسی کو نقصان پہونچاتے تھے۔ صاحب اقبال نامہ جہانگیری نے چودہ پندرہ شیر اپنی آنکھوں سے دیکھے کہ جھروکہ درشن کے نیچے پھرتے اور شیربان انکی نگرانی کرتے تھے۔

۱۰۔ امیر خسرو کے شعر پر ملا علی احمد کی موت

۱۰۱۸ھ میں ملا علی احمد کی وفات کا واقعہ جو مجلس بہشت آئین میں ظہور پذیر ہوا بڑا ہی عجیب وغریب ہے ملا علی احمد صنعت مہرکنی میں یگانۂ روزگار تھے ان کا باپ ملا حسن بھی مہرکن تھا اور نقشی تخلص کرتا تھا وہ درویش صفت اور پاک نفس آدمی تھا۔ کسی نہ کسی طرح شاہی مکتب میں داخل ہو گئے تھے، اور جہانگیر کے ساتھ سبق دہرایا کرتے تھے۔ اسی نسبت سے بادشاہ انھیں اپنا خلیفہ کہا کرتے تھے۔ ایک جمعرات کی شام کا ذکر ہے کہ جہانگیر کے سامنے قوالوں کی ایک ٹولی گا رہی تھی۔ جب قوال اس شعر پر پہونچے۔ ؎

ہر قوم راست راہے دینے وقبلہ گاہے
من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

تو بادشاہ ملا علی احمد کی طرف متوجہ ہوا اور ان سے اس شعر کی حقیقت دریافت کی۔ ملا نے عرض کیا کہ میں نے اپنے والد ملا حسن سے سنا ہے کہ ایک دن حضرت سلطان المشایخ شیخ نظام الدین دہلوی قدس سرہٗ ٹیڑھی ٹوپی سر پر رکھے دریائے جمنا کے کنارے ہندوؤں کی عبادت اور ان کے غسل کا لطف اٹھا رہے۔ اس وقت حضرت امیر خسرو آپ کی خدمت میں

حاضر ہوئے۔ آپ نے امیر خسرو کی طرف توجہ فرمائی اور کہا کہ ان لوگوں کے طریق عبادت کو دیکھو۔ اس کے ساتھ ہی یہ مصرعہ بھی پڑھ دیا۔ ؎

ہر قوم راست راہے دینے و قبلہ گاہے

امیر خسرو نے بلا تامل جواب میں کہا۔ ؎

من قبلہ راست کردم برسمت کج کلاہے

جونہی ملا احمد علی نے دوسرا مصرعہ پڑھا وجد کی حالت ان پر طاری ہوئی۔ اور وہ بیخود ہو کر تڑپنے لگے۔ اسی حالت میں زمین پر گر کر واصل بحق ہو گئے۔

۱۱۔ بکری کی محبت لنگور کے بچے کے ساتھ!

۱۲ سنہ جلوس جہانگیری کا واقعہ ہے کہ بہاء الدین برق انداز ایک دن ایک لنگور کا بچہ اور ایک بکری لے کر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ لنگورنی اپنے بچے کو سینے سے لگائے ہاتھوں سے تھامے درخت کی شاخ پر بیٹھی تھی کہ ایک بندوقچی نے لنگورنی کے گولی مار دی گولی لگتے ہی اس نے بچے کو چھاتی سے ہٹایا اور خود زمین پر گر کر مر گئی۔ اسی اثناء میں میں وہاں پہنچا میں نے اس بچے کو شاخ سے اتارا اور گھر لے آیا۔ یہ بکری جو اس وقت میں حضور کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں میرے پاس تھی۔ میں لنگورنی کے بچے کو دودھ پلانے کے لئے بکری کے نزدیک لے گیا۔ اللہ تعالے نے بکری کے دل میں رحم ڈالا۔ وہ بچے پر مہربان ہو گئی اور جونہی بچے نے بکری کے تھنوں کو منہ میں لیکر چوسنا شروع کیا دودھ اتر آیا اور وہ سیر ہو گیا۔ اس کے بعد وہ ہل مل گئے اور اب غیر جنس ہونے کے باوجود ان دونوں میں ایسی محبت ہے کہ کہ ایک دوسرے کی جدائی گوارہ نہیں کر سکتے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ بچے کو چھپا دیا جائے۔ جونہی بچہ بکری کی نظروں سے اوجھل ہوا بکری بیتاب ہو گئی اور "بھیں بھیں" کر کے شور مچانے لگی۔ لنگور کا بچہ بھی اپنی جگہ تڑپتا تھا اور اس قدر بے قرار تھا کہ اس کی بیچینی دیکھ کر لوگوں کو اس پر ترس آتا تھا۔ بچہ کی الفت پر تو خیال کیا گیا کہ یہ بکری کا دودھ پینے کی وجہ سے ہے مگر بکری کی محبت پر سب نے تعجب کا اظہار کیا۔

۱۲۔ ڈاڑھی مونچھ والی عورت

۱۰۲۸ھ میں جہانگیر کے روبرو پرگنہ دولت آباد کے ایک باغبان کی لڑکی لائی گئی جو شکل و صورت سے مرد معلوم ہوتی تھی۔ اس کی مونچھیں اگی ہوئی تھیں۔ ڈاڑھی کے بال بے حد گھنے تھے اور مٹھی سے زیادہ لمبے تھے اس کے سینے پر بھی بال موجود تھے اور پستان معدوم تھے بادشاہ نے چند عورتوں کو حکم دیا کہ وہ اسے ایک گوشے میں لیجا کر دیکھیں کہ وہ واقعی عورت ہے یا ہیجڑا چنانچہ انھوں نے تصدیق کی کہ اس میں اور دوسری عورتوں میں سر مو فرق نہیں ہے۔

۱۳۔ آہوئے مشکیں و کباب شاہی

اسی سال سرنگر میں جہانگیر کے حضور ایک آہوئے مشکیں پیش کیا گیا بادشاہ نے اس کا گوشت پہلے کبھی نہ کھایا تھا۔ اس نے تحقیق کی خاطر حکم دیا کہ اسے ذبح کر کے اس کا گوشت پکائیں تاکہ دیکھا جائے کہ اس کے گوشت کا ذائقہ کیسا ہوتا ہے۔ حکم کی تعمیل کی گئی اور اس کے کباب بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دیئے گئے۔ چکھنے پر معلوم ہوا کہ اس کا گوشت سخت بد مزہ اور بدذائقہ ہے یہاں تک کہ صحرائی جانوروں میں کسی کا گوشت اس سے زیادہ بدمزہ نہیں۔

بادشاہ نے یہ بھی تحقیق کی کہ جب نافہ تازہ ہوتا ہے تو اس میں کسی قسم کی خوشبو نہیں ہوتی۔ خشک ہونے کے بعد اس میں خود بخود خوشبو پیدا ہو جاتی ہے نیز نافہ مادہ کے پیٹ میں نہیں ہوتا۔ صرف نر کے ساتھ مخصوص ہے۔

۱۴۔ آسمانی لوہا

۱۰۲۹ھ میں ایک عجیب واقعہ پیش آیا۔ جالندھر کے ایک گاؤں میں صبح سویرے مشرق کی جانب سے ایک خوفناک شور سنائی دیا۔ مہیب صدائیں اٹھیں اور گاؤں کے چاروں طرف پھیل گئیں۔ یہاں تک کہ ان ہولناک آوازوں نے ساری فضا میں گونج پیدا کر دی۔ لوگ سہم گئے۔ ان کے دل دہل گئے اور وہ ڈر کے مارے گھروں سے باہر نکل آئے ابھی یہ شور ختم نہ ہوا تھا کہ آسمان سے کوئی شے بجلی کی سی تیزی اور برق کی سی چمک کے ساتھ نیچے آتی دکھائی دی اور زمین پر گرتے ہی آناً فاناً غائب ہو گئی۔ جب ذرا سکون ہوا اور لوگوں کی جان میں جان آئی تو انھوں نے ایک تیز رو قاصد اس پرگنہ کے عامل محمد سعید کے پاس بھیجا اور اسے تمام حالات کی اطلاع دی۔ وہ اسی وقت گھوڑے پر سوار ہو کر موقعہ پر پہونچا۔ اس نے دیکھا کہ تقریباً دس پندرہ گز لمبی چوڑی زمین جل کر راکھ ہو گئی ہے۔ وہاں سبزہ اور فصل وغیرہ کا نام و نشان تک نہیں رہا۔

اور ابھی تک اتنے ٹکڑے سے حرارت محسوس ہوتی ہے۔ محمد سعید نے حکم دیا کہ اس مقام کو کھودا جائے چنانچہ وہ جتنا کھودتے جاتے تھے اتنی ہی حرارت اور حدت زیادہ ہوتی جاتی تھی۔ آخر لوہے کا ایک تپا ہوا ٹکڑا نمودار ہوا وہ اتنا گرم تھا کہ معلوم ہوتا تھا جیسے ابھی بھٹی سے نکالا گیا ہے۔ جب اسے ہوا لگی تو وہ ٹھنڈا ہو گیا۔ محمد سعید اسے اٹھوا کر اپنے ڈیرے لے گیا۔ وہاں جا کر اس نے لوہے کے ٹکڑے کو ایک تھیلے میں بند کیا اور اپنی مہر لگائی اور تمام حالات کے ساتھ اسے بادشاہ کے حضور میں بھیجدیا۔ بادشاہ نے استاد داؤد کو جو شمشیر سازی میں اپنی نظیر آپ تھا طلب کیا اور لوہا اس کے حوالے کرتے ہوئے حکم دیا کہ وہ اس سے تلوار۔ خنجر اور چھرا تیار کرے۔ اس نے جب لوہے کو آہرن پر رکھ کر کوٹا تو وہ ریزہ ریزہ ہو گیا۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ اس میں دوسرا عمدہ لوہا ملا کر استعمال کیا جائے۔ چنانچہ تین حصے آسمانی لوہے کے اور ایک حصہ دوسرے لوہے کا ملا کر دو تلواریں دو خنجر اور ایک چھرا تیار کیا گیا اور تمام چیزیں بادشاہ کی خدمت میں پیش کر دی گئیں۔ دوسرے لوہے کی آمیزش سے ایک نیا جوہر پیدا ہوا اور کہتے ہیں کہ اس تلوار اور دوسری تلوار کی لچک اور دھار میں کوئی فرق نہ تھا۔

۱۵۔ محبت کا انجام

اسی سال معلوم ہوا کہ کسی گاؤں میں ایک لوہار کلیان نامی رہا کرتا تھا۔ وہ اپنی ایک ہم قوم عورت پر عاشق ہو گیا۔ اس نے عورت کے قدموں پر سر رکھا، اس کی منتیں کیں اور ہر طرح اظہار عشق کیا۔ مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئی۔ اس پر کوئی جادو نہ چلا۔ جھگڑا بڑھ گیا۔ چونکہ عورت بیوہ تھی اس لئے اس کے رشتہ داروں نے بہت برا منایا اور معاملہ بادشاہ کے کانوں تک پہونچا دیا۔ بادشاہ نے دونوں کو اپنے سامنے طلب کیا اور باز پرس کی پھر ایک ایک کو ڈانٹا کہ اپنے خیال سے باز آجائیں۔ عورت کو مرد کی جانب راغب ہونے کی تلقین کی مگر اس کا دل نہ پسیجا۔ وہ مرد کی طرف مائل نہ ہوئی اور برابر انکار کرتی چلی گئی۔ اس کے بعد لوہار کو سمجھایا کہ اس کا خیال چھوڑ دے مگر لوہار جو فرط محبت سے دیوانہ ہو رہا تھا بولا کہ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ بادشاہ یہ عورت میرے حوالے کر دینگے تو میں اسی وقت اپنے آپ کو شاہ برج سے نیچے گرا دوں۔ بادشاہ نے مسکراتے ہوئے کہا کہ شاہ برج تو بلند ہے اگر تم اپنے دعوی میں سچے ہو تو اپنے آپ کو اسی مکان کی چھت سے نیچے گرا دو۔ اگر تم اس امتحان میں پورے اترے تو سمجھ لیا جائیگا کہ تمہارا عشق سچا ہے پھر یہ عورت تمہیں بخشدی جائے گی۔ ان الفاظ کو سنتے ہی وہ بجلی کی سی سرعت کے ساتھ بھاگا۔ چھت سے کودا اور دھڑام سے نیچے گر پڑا خون کے چند قطرے اس کی آنکھوں سے ٹپکے اور وہ موت کی آغوش میں ہمیشہ کی نیند سو گیا۔

"ــــ عشق جسے نہ راس آئے موت ہی اسکو راس ہے"

۱۶۔ خندۂ زعفران

مدت سے سنا جاتا تھا اور کتب خصوصاً جواہر زم شاہی وغیرہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا تھا کہ زعفران کھانے سے ہنسی آتی ہے اگر کوئی شخص بہت زیادہ مقدار میں اسے کھالے تو اس کی ہنسی ضبط نہیں ہو سکتی اور بسا اوقات یہی ہنسی اس کی ہلاکت کا باعث بن جاتی ہے ۱۰۳۴ھ میں جہانگیر نے اس کا امتحان کرنے کے لئے دو قیدیوں کو جنہیں قتل کا حکم ہو چکا تھا جیل سے طلب کیا اور انہیں اپنے سامنے چالیس مثقال زعفران کھلائی لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہوا۔ دوسرے دن اسی مثقال کھلائی۔ پھر بھی ہنسی اور موت تو ایک طرف ان کے لبوں پر مسکراہٹ تک نمودار نہ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ محض ایک افسانہ ہے جسے طبیبوں نے بلا تحقیق کتابوں میں درج کر دیا ہے۔

ایک مثقال ۴½ ماشہ کے برابر ہوتا ہے اس حساب سے پہلی مرتبہ ۱۵ تولہ اور دوسری مرتبہ تیس تولہ زعفران کھلائی گئی۔

۱۷۔ تحقیق ہما

۱۰۳۵ھ میں جب جہانگیر کشمیر کی سیر سے واپس لاہور آرہا تھا تو راستے میں کسی نے بتایا کہ پیر پنجال کے پہاڑوں میں ہما رہتا ہے۔ بادشاہ کشمیر جاتے ہوئے بھی یہ قصہ سن چکا تھا۔ اس نے چند امیروں کو اس کی تفتیش پر معمور کیا انہوں نے ہر چند تلاش کیا مگر وہ جانور نہ ملا۔ ثابت ہوا کہ یہ بھی ایک گپ ہے جسے اصلیت سے کوئی تعلق نہیں۔ اور اگر کبھی یہ جانور دنیا میں موجود بھی تھا تو اب نہیں ہے۔

محمد عبداللہ قریشی۔ بی۔ اے۔

سرودِ زندگی!

جناب سید انتظام الدین شاہ صاحب جمالی۔ ایم۔ ایس سی (علیگ)

جفا چاہتا ہوں وفا چاہتا ہوں
خدا جانے آخر میں کیا چاہتا ہوں

محبّت کی یوں ابتدا چاہتا ہوں
ترا درد لا منتہا چاہتا ہوں

وہی نغمۂ دلربا چاہتا ہوں
ترے لب سے پھر اک نوا چاہتا ہوں

قسم رازِ ہستی کی تم ہی بتا دو
کہ میں کون ہوں اور کیا چاہتا ہوں

زباں میں نہیں عرضِ حسرت کی طاقت
نگاہیں بتاتی ہیں کیا چاہتا ہوں

تجھے غیرتِ حسن کیا ہو گیا ہے
میں اپنے ہی پر خود مٹا چاہتا ہوں

میری زندگی کیا ہے اک نقشِ پا ہے
سرِ رہگذر ہوں مٹا چاہتا ہوں

حقیقت بھی نکلی فریبِ محبّت
حقیقت سے بھی ماسوا چاہتا ہوں

جمالی محبّت اگر اک خطا ہے
گنہگار ہوں میں سزا چاہتا ہوں

یادِ ایّام

ایک بیحد دلچسپ اور حیرت انگیز ڈرامہ

از جناب فضل حق صاحب قریشی دہلوی

افرادِ مجلس

۱۔ نصیر:۔ ایک متمول سوداگر جو اپنی تمام جمع پونجی اپنے بھتیجے کے سپرد کرکے عزلت نشین ہو چکا ہے۔

۲۔ شریف:۔ نصیر کا خیر اندیش ملازم بمنزلہ دوست

۳۔ ستارہ:۔ بازاری رقاصہ نسیم کی محبوبہ

۴۔ اسد:۔ آوارہ فش رئیس۔ ستارہ کی محبت کا دعویدار

۵۔ نسیم:۔ نصیر کا بھتیجہ۔ ستارہ کا سچا عاشق

منظر۔ شہر کی آبادی سے کافی دور نصیر اپنے باغیچہ میں ٹہلتے ہوئے گنگنا رہا ہے ادہر اُدہر بیلیں اور پودے رنگ برنگ کے پھولوں سے لدے ہوئے ہیں۔ پرندے چہچہا رہے ہیں۔ دور کے چشمے کی آواز سنائی دے رہی ہے۔

نصیر:۔ (خفیف قہقہے کے ساتھ) ہوں۔ بے وقوف پرندو۔ تم مجھ سے بھی ڈرتے ہو۔ میری زندگی عام لوگوں سے بالکل مختلف ہے۔ اگر میں تم کو پکڑ بھی لوں تو آزادی کے ساتھ فضا میں اڑنے کے لئے پھر چھوڑ دونگا۔ تم میرا دل بہلاتے ہو میرے اطمینان قلب کا باعث بنتے ہو۔ میں تم کو قید کی زنجیروں میں نہیں جکڑ سکتا۔ میں پھولوں کو ہاتھ لگاؤں تو وہ اس وقت بھی مسکراتے ہیں۔ ڈرو نہیں! آؤ۔ دوڑ کر میرے قریب آؤ ——— (پھر گنگنانے لگتا ہے)

شریف:۔ (قریب آتے ہوئے) یہ گلدستہ حاضر ہے۔

نصیر:۔ (چونک کر) کون؟ — شریف؟ اُف تم لوگ کس قدر بدمذاق ہوتے ہو شاعرانہ فضا اور رومانی کیفیات سے لطف اٹھانا تو بڑی بات ہے۔ دوسروں کا طلسم خیال بھی توڑ دیتے ہو۔

شریف۔ میں نے آپ کیلئے گلدستہ بنایا تھا۔

نصیر۔ کمرے میں میز پر رکھ دو۔ لیکن آئندہ ایسا مت کرنا۔ میں کئی بار پہلے بھی منع کر چکا ہوں۔

شریف۔ آخر اس میں کیا بُرائی ہے۔ یہ آپ نے کبھی نہ بتایا۔

نصیر۔ اتنے عرصہ تم میرے ساتھ رہنے کے بعد بھی اس چیز کو نہ سمجھ سکے۔ یہ بدمذاقی کا ثبوت ہے شریف۔ پھولوں کا حسن اسی میں ہے کہ وہ ڈالی پر کھلے رہیں اور ایک خاص مدت کے بعد مرجھا کر گر پڑیں۔

شریف:۔ توڑ لینے میں آخر کیا ہرج ہے؟

نصیر۔ کیا تم محسوس نہیں کرتے کہ شاخ سے جدا ہوتے ہی پھولوں کی وہ تھرتھری غایب ہو جاتی ہے جو ہوا کے جھونکے ان کے اندر پیدا کرتے ہیں اور اس طرح ان کا اصلی حسن مٹ جاتا ہے۔

شریف۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ لیکن ———،

نصیر۔ اس کے علاوہ مختلف رنگ کے پھولوں کا ایک ہی جگہ جمع ہو جانا

ذوقِ نظر پر بُرا اثر بھی ڈالتا ہے۔ کسی ایک رنگ سے نگاہ کو پوری آسودگی حاصل نہیں ہوتی۔

شریف۔ بہت بہتر، آئندہ خیال رکھونگا۔

نصیر۔ شریف تم جانتے ہو، میری طبیعت کس قدر شاعرانہ ہے اور ایک شاعر کی نگری، دنیا کی عام سطح سے بلند ہوتی ہے۔ اس لئے میری ان باتوں کا بُرا نہ ماننا تمہیں تسلیم کرنا پڑیگا کہ میں نے تم کو کبھی ملازم نہیں سمجھا۔

شریف۔ جی ہاں مجھے آپ کی ذرہ نوازیوں کا اعتراف ہے۔ میں ہمیشہ سے آپ کا وفادار دوست رہا ہوں اور مرتے دم تک رہونگا۔

نصیر۔ مجھے اس کا احساس ہے۔ تم بہت نیک ہو۔

شریف۔ اچھا اب میں شہر جا رہا ہوں۔ چند ضروری چیزیں خریدنی ہیں کوئی خاص کام ہو تو فرمایئے۔

نصیر۔ کچھ نہیں، نسیم کی دوکان پر جاؤگے۔ اگر اس طرف سے گزرو تو میری دعا کہہ دینا۔

شریف۔ گستاخی معاف! جب آپنے دنیا کو چھوڑ دیا۔ دنیا والوں کی طرف سے مُنہ موڑ لیا اور شہر کی آبادی سے کوسوں دور جنگل کی ویرانی میں زندگی گزارنی شروع کردی تو کسی کیلئے دعا مانگنا یا بددعا دینا بالکل بیکار ہے۔

نصیر۔ سچ کہتے ہو شریف۔ میں زندہ ہوں، اس لئے کہ زندگی سب کو عزیز ہوتی ہے۔ دنیا رہنے کے قابل نہیں۔ دنیا والے میل جول کے لائق نہیں میں نے سب کو چھوڑ دیا لیکن نسیم میرا بھتیجہ ہے مجھے اس سے محبت ہے۔ دنیا میں میرا کوئی اور نہیں اس لئے ہر وقت اس کی خیریت کا آرزومند رہتا ہوں۔

شریف۔ اس کی خیریت کے آرزومند، شاید آپ کی یہ تمنا الفاظ تک محدود ہو عملی طور پر آپ اس کے دشمن ثابت ہو رہے ہیں۔

نصیر۔ نسیم کا دشمن اور میں، ——— تم کیا کہہ رہے ہو شریف؟

شریف۔ آپ نے تمام جائداد اس کے سپرد کرکے اور اپنی دوکان کا مالک اسے قرار دیکر اس پر ظلم کیا ہے۔ پہلے وہ پابند تھا اور آپکے اختیار میں، اب وہ بالکل آزاد ہے۔ مختارِ کل، مرضی کا بادشاہ بنا ہوا ہے جو جی میں آتی ہے کرتا ہے۔

نصیر۔ نسیم بہت عقلمند ہے۔ وہ کاروبار کو سنبھال لے گا اور اپنی زندگی خوش اسلوبی کے ساتھ بسر کریگا۔ مجھے اس پر پورا اعتماد ہے۔

شریف۔ ہوگا۔ لیکن وہ جوان ہے اور عمر کے اس عہد میں عقل سے زیادہ جذبات کے ماتحت زندگی بسر کی جاتی ہے۔ جوانی کا دوسرا نام گنہگاری ہے۔

نصیر۔ لیکن میرا بھتیجہ بہت ہی سادہ لوح ہے اور گناہ کرنے کے لئے بڑی ہنرمندی اور چابکدستی کی ضرورت ہے۔

شریف۔ جی نہیں صرف دولت کی اگر جیب میں روپیہ ہو تو دنیا وا کے ڈھنگ سکھا دیتے ہیں

نصیر۔ پھر میں کیا کروں مجھے جو کچھ کرنا تھا کرچکا اب نسیم کو چاہئیے کہ وہ اپنا مستقبل خوشگوار بنانے کی کوشش کرے۔ یہ اس کا فرض ہے۔

شریف۔ فرض؟ ——— ہوں ——— فرض کا احساس عقل کی روشنی میں ہوتا ہے۔ جس سے جوان آدمی محروم ہوتے ہیں۔

نصیر۔ پھر اس کی ذمہ داری مجھ پر کس طرح عائد ہوتی ہے؟

شریف۔ بہت خوب! ایک شخص کو دریا میں پھینک کر یہ توقع رکھنا کہ اس کا لباس پانی سے نہ بھیگے کس طرح ممکن ہوسکتا ہے اور پھر اس کی تردامنی کا ذمہ دار اسی کو ٹھہرانا کہاں کا انصاف ہے۔

نصیر۔ اگر وہ ذمہ دار نہیں تو میں بھی ذمہ دار نہیں ہوں۔ میں نے برسوں کی جمع کی ہوئی دولت قلم کی ایک جنبش سے اس کے سپرد کردی۔ اب جو چیز میری ملکیت نہیں رہی اس کے ضائع ہوجانے کا مجھے افسوس بھی نہ ہوگا۔

شریف۔ دولت کا ذکر ہی کیا۔ روپیہ آنی جانی چیز ہے۔ آج میرے پاس تو کل دوسرے کے پاس۔ لیکن روپے سے زیادہ قیمتی چیز عزت ہے۔ آپنے نسیم کو جائداد ہی کا مالک نہیں بنایا بلکہ اپنا خاندانی وقار بھی اس کے سپرد کردیا ہے آپ کا نام لیوا اب دنیا میں وہی باقی ہے۔

نصیر۔ میں نے دنیا اور دنیا والوں سے کنارہ کشی کرلی اور دنیا والوں کو مجھ سے کوئی سروکار نہیں رہا لہٰذا سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق ننگ و ناموس یا ذلت و رسوائی کی میری نگاہ میں کوئی وقعت نہیں رہی۔

شریف۔ ذاتی جذبات کے ماتحت یہ سب کچھ آپ کہہ سکتے ہیں لیکن ضمیر کی آواز آپ کو چین لینے نہیں دیگی۔ آپ کے بزرگوں کی روحیں صدائے احتجاج بلند کرینگی جن کو دبانا آپ کے بس میں نہیں ہوگا۔ پھول اپنی خوشبو سے سارے چمن کو مہکا دے لیکن خوشبو پھر بھی اس کے آغوش کو اپنا مسکن بنائے رکھتی ہے۔ اسی طرح سماج کے رسم و رواج سے آپ کتنے ہی خالی الذہن ہوجائیں لیکن ان کے نقوش آپکے دل کی گہرائیوں میں اسی طرح قائم رہیں گے۔

نصیر۔ پھر بتاؤ میں کیا کروں؟ یہ مجھ سے کبھی نہیں ہوگا کہ زندگی کے جن

ہنگاموں کو ترک کر چکا ہوں دوبارہ انہیں میں گھر جاؤں۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ میں اس تنہائی کو جو غنچوں کے تبسم پھولوں کی مہک سبزے کی طراوت چشمے کی روانی، افق کی سرخیوں، پرندوں کے چہچہوں اور نسیم سحر کے لطیف جھونکوں سے مل کر بنی ہے چھوڑ کر اس جگہ چلا جاؤں جہاں قدرت کی یہ فیاضیاں مجھے نصیب نہیں ہو سکتیں۔

شریف - یہ کون کہتا ہے کہ آپ اس جگہ کو چھوڑ کر کہیں جائیں۔ ستارے آسمان پر ہی چمک کر زمین پر بھٹکنے والے قافلوں کو سیدھا راستہ دکھا دیتے ہیں۔ آپ نسیم کو یہاں بلا کر مناسب ہدایات دیں اور تاکید کریں کہ اس کے مطابق عمل کیا جائے

نصیر - لیکن میرا خیال ہے کہ جب تک اس کی کوئی بری بات معلوم نہ ہو کسی قسم کی حرف گیری کرنی مناسب نہیں۔

شریف - آپ قطعی لاعلم ہیں۔ میں اس کی ہر نقل و حرکت کا اچھی طرح مطالعہ کرتا رہا ہوں۔ میں مصلحتاً خاموش رہا - اور شاید اب بھی آپ سے گفتگو نہ آتی لیکن کل شام ایک بازاری عورت کو اس کے ساتھ دیکھ کر مجھ سے ضبط نہ ہو سکا -

نصیر - بازاری عورت ---؟ کیا یہ حقیقت ہے؟

شریف - سرکار، یہ نمکخوار آپ سے جھوٹ نہیں بول سکتا۔ وہ بازاری عورت جس کی ماں اگرچہ زندہ ہے لیکن باپ کے متعلق کوئی اتنا بھی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا اور کہاں کا رہنے والا۔

نصیر - نسیم سے مجھے اس کی توقع نہیں تھی۔

شریف - بیشک نسیم بذات خود برا نہیں تھا لیکن وہ دولت جس کو اپنی محنت سے جمع نہ کیا ہو عموماً عیاشی ہی کی ترغیب دیتی ہے۔

نصیر - اچھا تو تم جاؤ اور نسیم کو یہاں بلا لاؤ میں اس کو سب نیک و بد سمجھا دونگا۔

شریف - صرف سمجھانے سے کام نہیں چلے گا۔ آپ اس کو حق وراثت سے محروم کر دینے کی دھمکی دے دیجئے۔

نصیر - لیکن میں ایسا کبھی نہیں کر سکتا۔ جو چیز دی جا چکی ہے وہ میری نہیں ہو سکتی

شریف - ایک لحاظ سے ہو بھی سکتی ہے کیونکہ عدالت میں پختہ کارروائی نہیں ہوئی۔ تاہم میرا مطلب صرف یہی ہے کہ اس دباؤ میں وہ اپنا چال چلن درست کر لیگا۔

نصیر - ٹھیک ہے اب جلدی جاؤ - دیر مت کرو۔

شریف - بہت بہتر۔ میں شکر گزار ہوں کہ آپ میرے کہنے کے مطابق عمل کرنے کے لئے تیار ہو گئے ہیں (چلا جاتا ہے)

نصیر - (تنہا) دنیا کے جھگڑے کسی عنوان پیچھا نہیں چھوڑتے کبھی جدا نہ ہونے والے سائے کی طرح ہمیشہ انسان کے ساتھ ہیں۔ کیا نصیر کو پھر دوبارہ شہری زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور ہونا پڑیگا۔

(جھاڑیاں گھسوٹنے اور پتوں پر چلنے کی آواز کے ساتھ
ستارہ قریب آجاتی ہے)

ستارہ - مجھے بچاؤ، نیکدل انسان مجھے بچاؤ۔ میں سخت مصیبت میں ہوں۔

نصیر - تم کون ہو۔ تم میری جھاڑیوں کو گھسوٹتی۔ میرے پھولوں کو پامال کرتی اور میری کیاریوں کو روندتی تم کدھر سے آ رہی ہو۔ تم کس سے ڈر رہی ہو اور مجھ سے کیا چاہتی ہو؟

ستارہ - میں سب کچھ بتا دونگی۔ سب کچھ۔ پہلے کسی محفوظ جگہ چھپا دو - وہ میرے تعاقب میں ہے۔ مجھے پکڑ لے گا -

نصیر - میں عورت ذات کی طرف سے بہت زیادہ مایوس ہو چکا ہوں۔ میں کسی عورت کو اپنی پناہ میں نہیں رکھ سکتا۔ اور وہ بھی ایسی عورت کو جس کی شخصیت کا مجھے علم نہ ہو۔

ستارہ - اگر تم میرا حال سننا ہی چاہتا ہو تو مختصراً سنو۔ میں رقاصہ ہوں۔ یوں بیتی

نصیر - کیا؟ رقاصہ؟ ---- فوراً یہاں سے چلی جاؤ۔ مجھے دنیا کی ہر رقاصہ سے ڈر معلوم ہوتا ہے۔ جب تم جیسی کسی عورت پر نظر پڑتی ہے تو ماضی کے پردے میرے سامنے سے اٹھنے لگتے ہیں۔ تم چلی جاؤ۔ فوراً چلی جاؤ۔

ستارہ - کیا اندھیر ہے۔ اس روشن دنیا میں جہاں چاند سورج اپنی کرنیں روزانہ بکھیرتے ہیں سچائی کے ساتھ دھڑکنے والا ایک بھی دل باقی نہیں رہا۔ دنیا کے اس ویران اجاڑ حصے میں جہاں آبادی کا نام و نشان تک نہیں ہے۔ یاس و ناامیدی کے عالم میں مجھے آپ کا مکان نظر آیا۔ اس طرح جیسے اندھیری رات میں بھٹکتے ہوئے مسافر کو ٹمٹماتا ہوا چراغ دکھائی دے۔ میں دوڑ کر یہاں چلی آئی۔ اس امید میں کہ آپ ایک غریب لڑکی پر ترس کھائیں [illegible] آبرو خطرے میں ہے۔ وہ یہاں آنا ہی ہوگا۔ خدا کے لئے مجھے بچا لو۔

نصیر - مجھے تمہارے ساتھ ہمدردی ہو چلی ہے۔ باقی باتیں پھر بتانا۔ وہ کون شخص ہے جو تمہارا تعاقب کر رہا ہے۔

ستارہ - ایک رئیس زادہ جس کی کمینہ فطرت مجھے گناہ کے غار میں دھکیل دینا چاہتی ہے۔ لیکن اگر آپ نے مدد نہ کی تو میں اس شرمناک فعل پر موت کو ترجیح دونگی۔

میں رقاصہ ہوں، رقاصہ کی بیٹی ہوں۔ لیکن میرا دل معصوم ہے۔ مجھے ایک شخص سے محبت ہے اور میں اس کے ساتھ گھریلو زندگی بسر کرنے کیلئے تیار ہوں۔

نصیر۔ تم میری پناہ میں ہو۔ اور جب تک میری رگوں میں دوڑنے والا خون گرم ہے کوئی تم کو بُری نگاہ سے نہیں دیکھ سکے گا۔ لیکن اس وقت تم کہاں سے آ رہی ہو۔؟

ستارہ۔ وہ زبردستی مجھکو اپنے ساتھ لئے فرار ہو رہا تھا۔ وہ چشمے کے قریب پانی پینے کے لئے اُترا اور میں آنکھ بچا کر اس طرف بھاگ آئی۔ میں ڈر رہی ہوں وہ یہاں نہ آجائے۔

نصیر۔ چلو میں تم کو مکان کے اندر چھپا دونگا اور باہر ایک بہادر سپاہی کی طرح پہرہ دونگا۔

(گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز۔ اسد قریب آتا ہے۔ ستارہ کی چیخ نکل جاتی ہے۔)

اسد۔ (کڑک کر) اے بڈھے۔ ٹھیرو۔ گستاخ۔ بدتمیز۔ اس لڑکی کو کہاں لئے جاتے ہو؟ (نرم لہجہ میں) پیاری ستارہ! آخر تم اسد سے بچ کر کہاں جاؤگی تمہارے یہ انداز میرے سینے میں آتش محبت کو اور زیادہ بھڑکا دینگے۔ تم جہاں چاہو چلی جاؤ میری نظریں تم کو ڈھونڈ نکالیں گی۔

نصیر۔ بس بس خبردار۔ اپنی زبان کو لگام دو۔ یہ معصوم لڑکی جس سے میں چند لمحے پیشتر ناواقف تھا میری پناہ میں ہے نہ تم اس کے سامنے اظہار محبت کرسکتے ہو اور نہ اسے ہاتھ لگا سکتے ہو۔

اسد۔ (تیزی سے) حشت! بڈھا خبیث! تو کون ہے ہمارے معاملات میں دخل دینے والا۔ یہ میری ہے میرے دل کی مالکہ ہے میں اسے ساتھ لیکر جاؤنگا۔

ستارہ۔ نہیں، ہرگز نہیں تم مجھے زندہ یہاں سے نہیں لیجا سکتے۔ پہلے جان سے مار ڈالو۔ مجھے مرنا منظور، مگر تمہارے ساتھ نہیں جاؤنگی۔

نصیر۔ سنا تم نے اپنی محبت کا جواب۔ صاحبزادے تم مجھے جس قدر برا بھلا کہنا چاہو کہہ لو۔ تمہارے کڑوے الفاظ مجھے برہم نہیں کرسکتے۔ لیکن یہ سمجھ لو کہ جو راستہ تم چل رہے ہو سیدھا نہیں ہے۔

اسد۔ (لاپروائی سے) ہاں! تمام بڈھے ایسا ہی کہتے ہیں۔

نصیر۔ اس لئے کہ وہ زمانہ کی گردشوں اور زندگی کی تلخیوں سے پورا تجربہ حاصل کرچکتے ہیں۔

اسد۔ میرے پاس وقت نہیں ہے کہ تمہاری بیکار باتیں سنوں۔ تم ان الفاظ سے میری محبت کے جذبے کو سرد نہیں کرسکتے۔

نصیر۔ میں نے کب کہا کہ تم محبت کرنا چھوڑ دو لیکن مقناطیس کی صفت پیدا کرو جو ذاتی قوت سے لوہے کو کھینچ لیتا ہے تمہاری محبت اتنی سچی اور گہری ہونی چاہئے کہ محبوب خود بخود تم سے محبت کرنے کیلئے مجبور ہوجائے۔

اسد۔ یہ شاعرانہ باتیں ہیں اور میں ان کو تسلیم نہیں کرسکتا۔ (سخت لہجہ) ستارہ تم کو میرے ساتھ چلنا پڑیگا۔

ستارہ۔ ایک دفعہ کہہ چکی۔ ہزار دفعہ کہہ چکی نہیں جاؤنگی۔ ہرگز نہیں جاؤنگی۔

اسد۔ تم میری ملکیت ہو۔ میں نے تمہارے لئے ہزاروں روپئے خرچ کئے ہیں

ستارہ۔ غلط، بالکل غلط، تم جیسے ہزاروں میری محفل میں شریک رہے ہیں لیکن میں کسی کی ملکیت نہیں ہوں۔ تم میرے اعضا کی جنبشوں اور گلے کی آواز کا سودا کرتے تھے۔ جسم کا نہیں روح کا نہیں، پھر میرے مالک کس طرح ہوگئے؟ جاؤ جہاں محبت تم کو چاندی کے سکوں کے عوض مل سکتی ہو خرید لو۔ میں اس کی سوداگری نہیں کرتی

نصیر۔ تم شریف خاندان سے تعلق رکھتے ہو۔ اس کے نام پر دھبہ نہ لگاؤ۔ شرافت کا خون تمہاری رگوں میں ہے۔ جوانی کی نادانیوں سے اسے خراب مت کرو مخمل کی چادر میں ٹاٹ کا پیوند زیب نہیں دیتا۔ تمہاری آغوش میں اس لڑکی کا ٹھکانا نہیں تم اپنے خاندان یا کسی دوسرے اعلیٰ خاندان میں ایسی لڑکی کو شریک حیات بنا سکتے ہو جو ہر لحاظ سے تمہارے لئے موزوں ہو۔

ستارہ۔ میرے محسن! یہ آپنے کیا کہا؟ آپ میری توہین کررہے ہیں۔ میری طرح میری ماں رقاصہ سہی لیکن میرے دل کی دھڑکن میری نبض کی حرکت مجھے بتاتی ہے کہ میری رگوں میں شرافت کا خون ہے۔

نصیر۔ ہوا کرے لیکن سماج کے بنائے ہوئے اصولوں کے مطابق تم بہرحال بازاری عورت ہو

اسد۔ میرے ناصح شفیق! آپ کی باتیں میرے دل میں اتر گئیں شکر گذار ہوں کہ آپنے میری آنکھیں کھولدیں۔ آئندہ آپ کے کہنے کے مطابق اس لڑکی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھونگا۔ اچھا مجھے رخصت کی اجازت دیجئے۔ پھر اس طرف سے گذر ہوا تو قدم بوسی کے لئے حاضر ہو جاؤنگا۔

نصیر۔ جا رہے ہو۔ اچھا جاؤ۔ خوش رہو۔ خدا نگہبان۔

[گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز اسد چلا جاتا ہے]

نصیر۔ اب تم بالکل محفوظ ہو اگر تم کو بھوک پیاس لگ رہی ہے میں اس کا انتظام کرسکتا ہوں اگر تھکی ماندی ہو تو میرے گھر میں بستر موجود ہے میرا ملازم شہر سے اگر آجائے تو اس کے ہمراہ تم کو تمہارے گھر تک پہنچوا دونگا۔

ستارہ۔ (متانت سے) آپ کی ہمدردی کا شکریہ۔ میں آپ کے یہاں کچھ بھی نہیں کھا پی سکتی۔ آپ کے برتن نجس ہو جائینگے۔ آپ کے بستر پر آرام نہیں کر سکتی میرا جسم اسے ناپاک کر دیگا۔ آپ نے مجھے بچا لیا یہ آپ کی عنایت ہے۔ اب جاتی ہوں۔ خدا میرا مالک ہے ۔۔۔ (اس کی آواز بھرا جاتی ہے)

نصیر۔ نہیں اس راستے سے تنہا جانا ٹھیک نہیں۔ اگر کوئی اور خبیث انسان مل گیا تو بڑی مشکل پیش آئیگی۔

ستارہ۔ خبیث انسان ہی نہیں شیطان مل جائے تو کیا ہے جب میں آپ کی نظر میں بازاری عورت ہوں۔ عزت و آبرو سے محروم ہوں تو پھر کس چیز کے چھن جانے کا ڈر ہے۔ مجھے اکیلا ہی جانے دو۔

نصیر۔ معلوم ہوتا ہے میری باتیں تم کو بہت ہی ناگوار گذری ہیں۔ میں حیران ہوں تمہاری اصلیت کو ابھی تک نہیں سمجھ سکا۔

(پاؤں کی چاپ۔ نسیم قریب آتا ہے)

نسیم۔ آہ! ستارہ تم یہاں کیسے؟ ۔ } بیک وقت
ستارہ۔ نسیم پیارے تم ہو؟ ۔

نسیم۔ آداب عرض کرتا ہوں چچا جان۔

نصیر۔ تم آ گئے نسیم؟ اور شریف کہاں ہے؟ وہ ساتھ نہیں آیا۔؟

نسیم۔ مجھے کیا معلوم۔ میں اس سے نہیں ملا۔

نصیر۔ تو کیا تم خود آئے ہو، مجھ سے ملنے کے لئے۔

نسیم۔ جی ہاں آپ سے بھی ملنا چاہتا تھا۔ اور مجھے معلوم ہوا تھا کہ کوئی شخص ستارہ کو لے بھاگا ہے اسی سمت میں۔ میں تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ پہونچا۔

نصیر۔ تم اس لڑکی کو جانتے ہو؟۔

نسیم۔ جانتا ہی نہیں دل وجان سے چاہتا ہوں، چچا جان یہ لڑکی بہت نیک ہے، ستارہ تم پر کیا گزری؟ ہو تو اچھی طرح؟۔

ستارہ۔ بچ گئی۔ شکر ہے خدا کا اور تمہارے ان چچا جان کا ورنہ عزت و آبرو کے ساتھ میری جان کی بھی خیر نہیں تھی۔

نسیم۔ چچا جان! ۔۔۔ میں

نصیر۔ (بات کاٹ کر) چپ رہو نسیم۔ تم بہت جلد بیباک ہو گئے ہو۔ شریف نے تمہارے اس نئے تعلق کی بابت اطلاع دی تھی۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ تمہارے معاملات سے سروکار نہ رکھوں لیکن اس کے سمجھانے سے میں نے ارادہ کیا کہ تم تاکید کر دوں۔ تاکید ہی نہیں سخت تنبیہ۔ تم اپنی ان حرکتوں سے باز آؤ۔ ورنہ تمہارے حق میں برا ہوگا۔

نسیم۔ میں اچھی طرح نہیں سمجھا کہ آپ کا مطلب کیا ہے، ستارہ سے محبت کرنا کیا آپ کے نزدیک معیوب بات ہے۔

نصیر۔ معیوب ہی نہیں حد درجہ ذلیل۔ تم کو معلوم بھی ہے کہ یہ کون ہے۔ ایک بازاری عورت جس کی ماں اگرچہ زندہ ہے لیکن باپ کے متعلق کوئی نہیں جانتا کہ وہ کون تھا اور کہاں کا رہنے والا۔

نسیم۔ یہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے لیکن ستارہ بذات خود معصوم اور نیک چلن ہے اس کا کوئی قصور نہیں لائق نفرین وہ شخص ہے جو اس کے وجود کا باعث ہوا۔

ستارہ۔ نہیں نسیم ایسا مت کہو۔ میں اپنے اس باپ کی بابت جسے آج تک نہیں دیکھا اور جس نے میری ماں کے ساتھ بیوفائی کی ہے کسی قسم کی برائی سننا نہیں چاہتی لائق نفرین میں ہوں اس لئے کہ میں عورت ہوں۔

نسیم۔ عورت و مرد کا سوال نہیں ہے ستارہ۔ ہمیں نتیجہ کو چھوڑ کر اصل سبب پر نظر ڈالنی چاہئے۔ تم نتیجہ ہو ایک مردود انسان کا اسلئے تمہارا قصور نہیں۔

ستارہ۔ نہیں نسیم پیارے۔ دنیا کا یہی دستور ہے کہ سبب پر غور نہ کیا جائے گلاب کو ساری دنیا سینے سے لگاتی اور سر پر جگہ دیتی ہے اور دھتورے کے پھول کو ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ حالانکہ ہوا کا ایک ہی جھونکا۔ بارش کا ایک ہی چھینٹا اور زمین کا ایک ہی مخصوص حصہ ان کی نشو و نما کا سبب ہوتا ہے۔

نصیر۔ بس خبردار! اب میں برداشت نہیں کر سکتا۔ اپنی بکواس کو بند کرو اور ایک دوسرے سے جدا ہو جاؤ ہمیشہ کیلئے اور یاد رکھو نسیم۔ اگر تم نے میری مرضی کے خلاف کیا تو تمام جائداد کی وراثت سے محروم کر دونگا۔

نسیم۔ جو چیز میری نہیں ہے اس سے محروم ہو جانے کا مجھے رنج نہیں ہوگا۔ آپ کا عطیہ اب بھی آپ ہی کی ملکیت ہے جب چاہیں واپس لے لیں مجھے آپ سے ہرگز شکایت نہیں ہوگی

نصیر۔ عاقبت نااندیش انسان! ذرا اپنے ماضی پر نظر ڈالو۔ تمہارے باپ نے جو میرا بھائی تھا مرتے وقت تمہاری پرورش میرے سپرد کی تھی کیونکہ تمہاری ماں اس سے بھی پہلے مر چکی تھی۔ میں نے تم کو اپنی اولاد کی طرح پالا ہے۔ میں تمہارا چچا ہی نہیں باپ بھی ہوں اور تم میری نافرمانی کر رہے ہو۔

نسیم۔ میں اپنی زندگی آپ کی فرمانبرداری میں قربان کر سکتا ہوں۔ لیکن

محبت کا تعلق دل سے ہے جس کا دھڑکنا خود انسان کے قبضہ میں نہیں ہوتا اس لئے میں قطعی مجبور ہوں۔

نصیر۔ مجبور ہو تو اچھا ذرا اپنے مستقبل کا بھی خیال کرو۔ تم کسی ہنر سے واقف نہیں اور ناتجربہ کار ہو۔ دنیا میں تم جیسے انسان کی کھپت مشکل سے ہوگی۔ اگر میں نے حق وراثت سے محروم کر دیا تو زندگی بسر کرنی دشوار ہو جائیگی۔

نسیم۔ اس وقت جب میں ہاتھ پاؤں ہلانے کے قابل بھی نہیں تھا قدرت نے والدین کے سایہ سے محروم کرکے میری پرورش کے دوسرے سامان پیدا کر دیئے اب آپ حق وراثت سے محروم کر دینگے تو کیا وہ خدا جس نے مجھے زندگی بخشی ہے زندہ رہنے کا راستہ نہیں دکھائیگا ضرورت ایجاد کی ماں ہے اور زمانہ کا رنگ انسان کو سب کچھ سکھا دیتا ہے۔

نصیر۔ گویا تم آخری فیصلہ کر چکے ہو اور تباہی کے غار میں گر جانے کے لئے تیار ہو۔

نسیم۔ جی ہاں، اب جبکہ آپ کے جسم کا خون پانی سے زیادہ بے مزہ ہو چکا ہے اور میرے جسم کا خون ہنوز شراب سے زیادہ نشیلا ہے۔ آپ یہ تسلیم نہیں کر سکتے کہ باقتضائے عمر جو کچھ کہہ رہا ہوں بالکل درست ہے۔

ستارہ۔ نہیں پیارے نسیم، تم غلطی پر ہو، تمھارے چچا جان جو میرے بھی محسن ہیں حقیقتہً تمھاری بھلائی کی بات کہہ رہے ہیں۔ تمھیں اپنے خاندان کا وقار قائم رکھنے کے لئے کسی اعلیٰ خاندان کی لڑکی سے شادی کرنی ہوگی اور عیش و نشاط کی زندگی بسر کرنے کے لئے دولت بھی درکار ہوگی۔ لہٰذا مجھ کو شریک حیات بنانے کا خیال دل سے نکال دو۔

نسیم۔ (تعجب سے) کیا؟ یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ کیا تمھارے دل میں بھی میری محبت نہیں رہی۔ کیا تم مجھے فراموش کر دوگی۔

ستارہ۔ نہیں، نہ بھولنے والی چیزوں کو کیسے بھلایا جا سکتا ہے میں تو صرف جسمانی طور پر علیحدہ ہو جانا چاہتی ہوں۔ کیونکہ تمھارے لئے اسی میں بہتری ہے تم کاروباری زندگی بسر کرو۔ رقص و سرود میرا پیشہ ہے اور یہی میرے لئے موزوں ہے۔ میں تمام دنیا کے سامنے ناچونگی۔ تمام دنیا کے سامنے گاؤں گی لیکن دل میں سمجھوں گی کہ صرف نسیم کے سامنے ناچ رہی ہوں صرف نسیم کے سامنے گا رہی ہوں مجھے کائنات کے ہر ذرہ میں تمھارا ہی جلوہ نظر آئیگا۔

نصیر۔ عورت اپنی مصنوعی محبت کا اظہار کس کس پیرائے میں کرتی ہے لیکن اس کے رنگین فریب کی حقیقت کھلے بغیر نہیں رہتی۔ تم خود سوچ سکتے ہو نسیم کہ اگر ستارہ کو ذرا بھی محبت ہوتی تو وہ کبھی تم سے علیحدگی گوارا نہ کرتی۔

ستارہ۔ یہ آپ کی بھول ہے میرے محسن۔ میری محبت اتنی بلند ہے کہ میں نسیم کو اپنا بنائے بغیر بھی اس کی یاد اپنے دل میں قائم رکھ سکتی ہوں۔ عورت کی فطرت چاند کے مانند ہے جو خاموشی کے ساتھ اپنی نورانی کرنیں سطح ارض پر بکھیرتا ہے محض اس لئے کہ کسی زمانے میں وہ بھی زمین کا ایک جزو تھا۔ اسی لئے عورت مرد سے اس لئے محبت کرتی ہے کہ وہ اسکی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔

نسیم۔ تم چچا جان کو نہیں سمجھا سکتیں اور نہ وہ سمجھ سکتے ہیں تاہم مجھے تمھاری محبت پر پورا اعتماد ہے۔ اگر ان کی مرضی یہی ہے اور تم بھی مناسب سمجھتی ہو۔ تو میں ہمیشہ کے لئے تم سے جدا ہو جانے کا فیصلہ کرتا ہوں لیکن اس عہد کے ساتھ کہ دنیا کی کسی دوسری عورت کو شریک حیات نہیں بناؤں گا۔

ستارہ۔ خیر اب میں جاتی ہوں۔ آئندہ اگر اتفاق سے تم کہیں نظر پڑ گئے تو میں آنکھیں بند کر لونگی، اور اگر تم کسی سے باتیں کرتے سنائی دیئے تو کان بند کر لونگی اچھا اب اجازت دو۔

نسیم۔ نہیں، تم کو واپس جاتے ہوئے دیکھکر ایسا نہ ہو کہ میرے جذبات آخری فیصلے میں تبدیلی پیدا کر دیں۔ اس لئے ذرا ٹھیرو۔ میں خود گھر کے اندر جا کر جدائی کے سوگوار دامن میں منہ چھپائے لیتا ہوں تاکہ اطمینان سے آنسو بہا سکوں، اس کے بعد تم چلی جانا ـــــ خدا حافظ ـــــ (ایک لمحہ خاموشی)

نصیر۔ (سنجیدگی سے) ستارہ! تم نے غیر معمولی جرأت سے کام لیا ہے۔ عورت جو جذبات سے مغلوب ہو جانے والی ہستی ہے اپنے دل میں اتنی ہمت نہیں رکھتی میں تم کو کبھی نہیں بھولوں گا۔ جب کبھی روپے کی ضرورت ہو بلا تکلف مجھ سے طلب کر لینا۔

ستارہ۔ روپیہ کی ضرورت اور آپ سے طلب کروں۔ آپ میرے زخموں پر نمک چھڑک رہے ہیں (روتے ہوئے) آپ نے میری عصمت یعنی میری جان بچائی یہی سب سے بڑی عنایت ہے جس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

نصیر۔ تمھاری باتیں سن سن کر مجھے حیرت ہو رہی ہے کہ آخر تم کون ہو۔ کیا تم چند منٹ ٹھہر کر اپنے مزید حالات سے آگاہ کر سکتی ہو؟

ستارہ۔ میں کیا اور میرے حالات ہی کیا۔ بلبل پر شکستہ ہوں۔ گل پژمردہ، نہیں نہیں، بلکہ صرف ایک بازاری عورت ہوں۔

نصیر۔ خدا کے لئے میرے الفاظ کی گرفت مت کرو۔ مجھے اپنا حال بتاؤ۔

کیا تم اپنے باپ کے متعلق کچھ بھی نہیں جانتیں؟ -

ستارہ - صرف اسی قدر کہ انھوں نے میری ماں سے بیوفائی کی انھیں ہمیشہ کے لئے بیکسی کی دنیا میں چھوڑ دیا - میری پیدائش ہی سے قبل، صرف اس وجہ سے کہ ان کے بھائی اس تعلق کے خلاف تھے۔

نصیر - (حیرت سے) ان کے بھائی خلاف تھے - تمھاری ماں کا نام کیا ہے؟

ستارہ - میری ماں کو ناہید کہتے ہیں -

نصیر - خدا کے لئے جلدی بتاؤ - ان کے چہرے کا کوئی نشان، جسم کی کوئی علامت جس سے بآسانی ان کی شناخت ہوسکے -

ستارہ - (ذرا سوچ کر) نشاں؟ ہاں رخسار پر قدرتی سیاہ خال اور کلائی پر چپکے کے کسی زخم کا نشان - ان کے علاوہ .

نصیر - (بیتاب ہو کر) تم میری بیٹی ہو ستارہ! میری تمھارا باپ ہوں - میں کم بخت، وحشی، ذلیل، کتا - میں تمھارا باپ ہوں آؤ میری بچی! میرے گلے سے لگ جاؤ - (آہستہ لہجہ میں) لیکن نہیں، یہ میں کیا کہہ رہا ہوں - لوگوں کی نگاہ میں میری عزت ہے، میرا خاندان ذی وقار ہے (تیز لہجہ میں) اور تو میری بیٹی، ذلیل رقاصہ بازار کی بیٹھنے والی - میرے جسم کو دنیا تھوکیگی - نہیں نہیں یہ مجھ سے کبھی نہیں ہوگا - دور ہوجا میری نگاہ کے سامنے سے - تو مردود ہے - مقہور ہے شیطان کی اولاد ہے (آہستہ لہجہ میں) لیکن کیا میں حقیقت کو جھٹلا سکتا ہوں - کیا چاند کے چہرے پر نقاب ڈالی جاسکتی ہے - میرا خون تیری رگوں میں دوڑ رہا ہے میرا خون - کیا اسے واپس چوس لوں - تجھے جان سے مار ڈالوں .

[پاؤں کی چاپ - اسد قریب آتا ہے -]

اسد - کیا آپ میری دخل اندازی کو معاف فرمائینگے -

نصیر - کون ـــــ؟ اچھا تم ہو اسد! دوبارہ آگئے ـــــ ستارہ کو لینے کے لئے ـــــ لے جاؤ - بخوشی لے جاؤ ـــــ میں ہرگز منع نہیں کرونگا - میری اجازت ہے -

اسد - میں دوبارہ نہیں آیا بلکہ اسی وقت سے جھاڑیوں کے پیچھے چھپا ہوا آپ کی گفتگو سن رہا تھا - آپ سے رخصت ہو کر میں چند قدم چلا تھا کہ آپ کے بھتیجے کو آتا دیکھ کر ٹھٹک گیا - یہ معلوم کرنے کے لئے کہ وہ کون ہے - اور یہاں کس غرض سے آیا ہے -

نصیر - غضب ہوگیا - تم نے ساری باتیں سن لیں، تم نے یہ بھی سن لیا کہ ستارہ میری بیٹی ہے - میں اس کا باپ ہوں -

اسد - خدا کا شکر ہے کہ اس راز کا انکشاف ہوگیا - لیکن آپ نادم کیوں ہیں کیا اس وقت آپ کے ضمیر نے ملامت نہیں کی تھی جب جوانی کی نادانیوں نے آپ کو ایک گناہ کے ارتکاب کے لئے مجبور کیا تھا - اگر اس وقت آپ ایک عورت کے مستقبل کو تاریک بنانے کے لئے تیار ہوگئے تھے تو اب اپنے ماضی کو اعادہ کرنے کیلئے کیوں جھجکتے ہیں - ستارہ آپکی بیٹی ہے - اس سے انکار نہیں ہوسکتا -

نصیر - میں کبھی تسلیم نہیں کرونگا کہ یہ ذلیل پیشہ لڑکی میری بیٹی ہے - اُف میری روح کانپ رہی ہے - دیکھو دیکھو، دوزخ کے فرشتے آسمانی کھڑکیوں سے جھانک جھانک کر میرے اوپر ہنس رہے ہیں ـــــ خدا کے لئے مجھے دریائے انفعال میں غرق مت کرو -

اسد - منفعل ہونے کی ضرورت نہیں، اس قدر پشیمان مت ہو - نسیم کے ساتھ شادی ہوتے ہی ستارہ کی شخصیت پر ایک پردہ پڑ جائیگا - آج اس دنیا میں دولتمند گھرانے کا کتا بھی باوقعت سمجھا جاتا ہے - ٹھہرو، میں نسیم کو بلاتا ہوں (باآواز بلند) نسیم ـــــ نسیم! -

نسیم - (دور سے) کون ہے؟ ـــــ مجھے کون بلا رہا ہے؟

اسد - یہاں آؤ - میں تم کو ایک خوشخبری سناتا ہوں آؤ، سنو، ستارہ تمھاری چچا زاد بہن ہے - بہن -

نسیم - (قریب آتے ہوئے) یہ میں کیا سن رہا ہوں - میرے کان دھوکا تو نہیں دے رہے - اور خود تم کون ہو؟ -

اسد - میں تمھارا رقیب تھا لیکن اب حامی اور مددگار ہوں میرے دل میں تمھارے سچے جذبات محبت کی قدر ہے - ستارہ تمھاری ہے - تمھاری شریک حیات بنیگی -

نسیم - چچا جان، یہ کیا معمہ ہے، کیا حقیقتہً ستارہ آپ کی

نصیر - ہاں یہ حقیقت ہے - جب میں جوان تھا - تو مجھے بھی تمھاری طرح ایک رقاصہ سے محبت ہوگئی تھی - جسے بڑے بھائی یعنی تمھارے والد نے برا سمجھا میں نے محض ان کے فرمان کی تعمیل میں اپنی محبوبہ سے بیوفائی کی - مگر ستارہ کا قالب ڈھلنا شروع ہوگیا تھا جس کا علم مجھے بعد میں ہوا - تمھارے والد کا انتقال ہوجانے کے بعد بھی میں اپنے عہد پر قائم رہا - خدا جانتا ہے کہ اس دن سے میری روح کو حقیقی مسرت کبھی نصیب نہیں ہوئی -

اسد - لیکن اب مسرت و شادمانی کے دن آگئے ہیں ستارہ آپکی لخت جگر ہے

نسیم کے ساتھ اس کی شادی کرکے گذشتہ آلامِ حیات کو بھلا دیجئے۔

نصیر۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ نسیم کی شادی اس لڑکی سے نہیں ہوسکتی ہیں تمام دنیا کے سامنے کس طرح تسلیم کر سکتا ہوں کہ ایک رقاصہ میری بیٹی ہے۔

اسد۔ اگر آپ اس حقیقت کو تسلیم کرنا معیوب سمجھتے ہیں، تو خیر لیجئے میں اقرار کرتا ہوں اور ہر شخص کے سامنے اقرار کروں گا کہ ستارہ میری بہن ہے میری مُنہ بولی بہن ۔۔۔۔ اس سے پہلے آپ میری خاندانی شرافت کا اعتراف کرچکے ہیں۔ کیا اس صورت میں بھی نسیم کے ساتھ اس کی شادی کرنے میں آپ کو پس و پیش ہوگا؟

نصیر۔ آپ کی مُنہ بولی بہن ۔۔۔ نہیں میرا باپ دوسرے کے گلے کیوں پڑے۔ میں اپنا بوجھ اپنے ہی کندھوں پر سہار لونگا۔ تمہارے مجبور کرنے سے میں تسلیم کرتا ہوں کہ ستارہ میری بیٹی ہے۔

ستارہ۔ میرے پیارے ابا جان ۔۔۔ (سسکیاں)۔

وہ وقت تجھے اب یاد بھی ہے؟

۱

جب آدھی آدھی راتوں کو
ہم چپکے چپکے ملتے تھے
تاروں کی سہانی چھاؤں میں جب غنچۂ دل کے کھلتے تھے!
وہ وقت تجھے اب یاد بھی ہے

۲

وہ شام کے بڑھتے سایوں میں
جب سورج ڈوبتا جاتا تھا
ہر چشمہ نغمے گاتا تھا جب سینہ تھا الہام کدہ
وہ وقت تجھے اب یاد بھی ہے

۳

ہوں میں بھی وہی اور تو بھی وہی
لیکن وہ پُرانی بات نہیں!
ساون کی راتیں، راتیں ہیں
پُرکیف مگر برسات نہیں جب دل میں بوندیں پڑتی تھیں
وہ وقت تجھے اب یاد بھی ہے؟

نسیم حسین ظفر

سحرِ نغمہ

نقشِ وفا

جناب شیخ باقر حسین صاحب وفا اکونٹنٹ اناؤ

روداد وفا ان کو اک روز سنانی ہے
پھولوں کی کہانی ہے بلبل کی زبانی ہے

نامہ ہے نہ اب کوئی پیغام زبانی ہے
ہم ہیں دل مضطر ہے فرقت کی کہانی ہے

بیکار غریبوں کی کب اشک فشانی ہے
ہر قطرۂ خوں میں اک غم کی کہانی ہے

کس بات کا اندیشہ جب ختم جوانی ہے
وہ موت ہو یا پیری آجائے جو آنی ہے

کمبخت شب غم کو کیوں موت نہیں آتی
کہتے ہیں کہ دنیا کی جو چیز ہے فانی ہے

ہم رات کے جاگے تھے اب صبح کو سوتے ہیں
پیری تھی جوانی میں پیری میں جوانی ہے

تھوڑی سی خوشی کا ہے ثمرہ غم طولانی
دو روز جوانی تھی اب یاد جوانی ہے

آنے سے ترے کیا کیا عاید ہوئیں تکلیفیں
تو صبح مصیبت ہے یا شام جوانی ہے

دل کی تو حقیقت کیا پتھر بھی پگھل جائیں
خورشید قیامت ہے یا ان کی جوانی ہے

مڑ کر نہ کبھی دیکھا چھوٹی ہوئی منزل کو
اے عمر رواں تجھ میں دریا کی روانی ہے

گلشن پہ تصرف ہے یہ سبزۂ عارض کا
عکس رخ رنگیں سے جو پھول ہے دھانی ہے

ساقی کے کرم سے ہی رندوں کو مئے جنت
مٹی کے پیالے میں دو گھونٹ جو پانی ہے

دامن پہ مرے کیا ہے ان چھیڑ سے کیا مطلب؟
آنسو ہیں تو آنسو ہیں پانی ہے تو پانی ہے

ہے خون وفا شامل پہچان نہیں سکتے
میں کہتا ہوں آنسو ہیں، وہ کہتے ہیں پانی ہے

ادب اور ہیئت اجتماعی

ایک قابلِ غور بہترین علمی مقالہ

از

(جناب پروفیسر احمد صدیق صاحب مجنوں گورکھپوری۔ ایم اے)

یہ مقالہ دراصل میرے "دل کے غبار عقیدہ ساز" کا جواب ہے۔ جو میں نے ۱۔ اگست ۱۹۳۷ء کو حضرت مجنوں کی خدمت میں بھیجا تھا

کرمی حضرت مجنوں۔ تسلیم و نیاز۔

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ بے موقع نہ ہو گا اگر آپ سے یہ پوچھوں کہ اس وقت جبکہ ہندوستان میں زبان کا مسئلہ ایک اہم سیاسی مسئلہ بن رہا ہے۔ آپ کی خموشی کیا معنی رکھتی ہے؟

"ادبیات" قوموں کے عروج و زوال کی تصویریں ہوتی ہیں اور کوئی قوم اس وقت تک آبرو دار ہو کر نہیں رہتی جبتک وہ اپنی زبان اور ادب کو اوڑھنا بچھونا نہ بنالے۔

"کرم ہائے تو مارا کرد گستاخ"

میں نے ایڈیٹر صاحب رسالہ "عالمگیر" جناب حافظ محمد عالم صاحب سے (جو میرے بڑے مہربان ہیں) وعدہ کر لیا ہے کہ ان کے رسالہ کے "خاص نمبر" کے لئے آپ سے ایک "مضمون" اور آپ کی "تصویر" حاصل کر کے بھیجوں گا۔

یہ فرمائیے کہ آپ جیسی "تاریخی شخصیتیں" اگر "اردو زبان اور ادب" کی خدمتوں سے کنارہ کش ہو گئیں تو "غریب زبان" کس کے سہارے جئے گی؟ ان کے "حروف الف" کے "نام بے" بھی نہیں جانتے مگر "علامگی" کے لئے مرے جاتے ہیں؟

خدا کے لئے "غریب اردو زبان اور ادب" پر رحم کیجئے اور پھر اسی انداز سے میدان میں آئیے جس طرح اس "جمود ادبی" سے پہلے تشنگان ادب کی پیاس بجھا رہے تھے۔

(خیر بھوروی)

ایوان اشاعت گورکھپور ۲۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء

بندہ نواز

"سراپا صفحۂ تحجالت نگارم
بہر رنگے کہ ہستم شرمسارم"

عنایت نامہ کا شکریہ۔ آپ نے مجھ کو اور میرے "ہذیان تحریر قلم" کے انتشارات کو جو کچھ سمجھا ہے اور جن رفیع و جلیل الفاظ کے ساتھ یاد کیا ہے۔ ان کو میں صرف آپ کے حسنِ ظن اور حسنِ عقیدت کے ساتھ منسوب کر سکتا ہوں۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ میں خود اپنے اکتسابات کی اہمیت کا قائل نہیں۔ مجھے اکثر یہ خیال ستاتا رہتا ہے کہ جو کام میں نے زندگی میں کئے میں ان کے لئے بنا نہیں تھا اور جس کام کے لئے بنا تھا وہ مجھ سے سرانجام نہ پا سکا میرا یہ خیال یقین کے درجے تک پہنچا ہوا ہے اور آج سے نہیں بلکہ جب سے ہوش سنبھالا۔ مرزا بیدل کا ایک شعر ہے:۔

"نبودم شمع تا از سوختن حاصل کنم رنگے
دریں محفل بہ امید چہ یارب چشم وا کردم"

میں بیدل کی طرح اپنے مقدر اور اپنے مقصد سے ناواقف تو نہ تھا۔ مجھے شدید احساس تھا کہ اس "محفل" میں میں نے جو آنکھ کھولی تو اس کی غایت کیا ہے اور مجھے کیا کرنا چاہئے۔ لیکن جو کرنا چاہئے تھا وہ کر نہ سکا۔ اس کے ذمہ دار کچھ تو خارجی حالات و عوارض تھے اور کچھ اپنی

"نامردی"۔ اگر اپنے اندر توانائی اور مردانگی موجود ہو تو میں حالات و عوارض کو اسقدر قوی نہیں مانتا کہ ان پر فتح نہ پائی جاسکے۔ بہرحال مجبوراً میں "شمع" کی طرح اپنے کو پگھلاتا رہا اور التہابی رنگ حاصل کرنے کی کوشش کرتا رہا جو دراصل میرا مقدر نہیں تھا۔ بقول اسی بیدل کے۔

"زآہ بے اثرم داغ نارسائی خویش"
"بہ آتشے کہ ندارم برشتہ اند مرا"

یوں تو یہ احساس "بے اثری" اکثر میرے قوٰی کو افسردہ اور مضمحل رکھتا تھا لیکن گذشتہ چند سال سے متصل طور سے اس نے مجھے مغلوب اور بیکار کر رکھا ہے:

آپ کی طرح ابتک نہ جانے کتنے مجھ سے یہی سوال کر چکے ہیں کہ میں نے لکھنا اس طرح یکلخت کیوں ترک کر دیا۔ میں نے اکثر اس سوال کا جواب بھی سکوت ہی سے دیا۔ اس لئے کہ جب "حکایت" نے پایاں ہو تو اسکو تو خاموشی ہی میں ادا کیا جاسکتا ہے۔ آج نہ جانے کس رَو میں یہ قصہ لے کر بیٹھ گیا۔ جس کو کسی طرح مختصر نہیں کیا جاسکتا:

میرے سکوت و جمود کی ابتدا یقیناً ایسے خارجی اسباب کی بنا پر ہوئی جنکو ہر لحاظ سے ذاتی کہنا چاہئے اور جن کا تعلق صرف نجی کی زندگی سے تھا۔ آپکو معلوم نہیں کہ ۱۹۳۲ء میں میں نے "ایوان اشاعت" کے کاروبار کی ابتدا کس امنگ اور کس نشاط کار کے ساتھ کی تھی۔ دو سال تک سوا رسالہ کی ادارت اور فسانہ نگاری اور مطالعہ کے کچھ نہیں کیا لیکن میری اپنی زندگی نے بہت جلد میرے اندر یہ احساس پیدا کرنا شروع کر دیا کہ ہندوستان میں تصنیف و تالیف کو اپنا پیشہ یا معاش بنانا اپنی زندگی پر سخت تشدد کرنا ہے۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ میں جو کچھ غلط یا صحیح کوششیں کر رہا تھا ان کے قدر دانوں کی کمی تھی۔ ملک کی حالت پر نظر رکھتے ہوئے اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ مجھے اپنی امید سے زیادہ قدر کرنے والے ملے۔ لیکن پھر بھی یہ حقیقت آفتاب کی طرح روشن تھی کہ میرا یہ ادبی مشغلہ میری روزی کا ذریعہ نہیں بن سکتا اور مجھے روزی کے لئے دوسرے مشاغل بھی جاری رکھنا ہے۔ آپ تو پھر بھی کسی نہ کسی حد تک واقف ہیں لیکن میرے وہ احباب جنہوں نے مجھ کو صرف کاغذ کے صفحات پر دیکھا ہے بہت کم اس راز سے واقف ہیں کہ اگست ۱۹۳۲ء کے بعد "ایوان" اور "ایوان اشاعت" کے کاروبار کو یکایک کچھ دنوں کے لئے ملتوی کر دینے کا سبب کیا تھا۔ میری بصارت دھیرے دھیرے خراب ہونے لگی تھی۔ آنکھوں میں مستقل درد رہنے لگا تھا۔ اور ایک دن تو تھوڑی دیر کے لئے یکایک آنکھوں کی روشنی بالکل غائب ہو گئی تھی اور مجھے یقین ہو گیا تھا کہ میں ہمیشہ کے لئے اندھا ہو گیا۔ اسی کے ساتھ ساتھ عام صحت خراب ہو رہی تھی۔ بائیں پسلیوں میں اکثر درد رہتا تھا۔ اس لئے کہ میں رات رات بھر بائیں طرف جھکا ہوا بیٹھا لکھتا رہ جاتا تھا۔ آخرکار مجھے اپنی محنتوں میں کمی کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اور ظاہر ہے کہ سوا "ایوان" اور "ایوان اشاعت" کے کسی دوسرے کام کو ترک نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے کہ یہی ایک کام تھا جسکو سب فاضل سمجھتے تھے اور جو اقتصادیاتی نقطۂ نظر سے واقعی تھا بھی "سودائے عشق" کی طرح محض فاضل اور بے سود۔ یہ سوچ کر میں کچھ دنوں تک اپنے "ذوقِ خامہ فرسا" کو بالکل محو کئے رہا اس درمیان میں سوا کالج کے لڑکوں کو جا کر پڑھا آنے کے میں نے اور کوئی کام نہیں کیا۔ دو سال کے بعد خیال ہوا کہ اب چونکہ صحت کافی حد تک قابلِ اطمینان ہے لاؤ۔ ماضی کو دوبارہ زندہ کروں۔ پھر بقول غالب۔

"کار فرمائی شوقِ تو بیابانم برد"
"مردم و بار بہ ایجادِ دل و جاں رفتم"

لیکن ایک بار مرنے کے بعد "دل و جاں" کو از سر نو ایجاد کرنا کسی خلاق ہی کا کام ہو سکتا تھا۔ میرے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی اپنے عہد کی لاج رکھ رہا تھا۔ مشکل سے سال پورا ہوا تھا کہ وہی حالات و اسباب جن کو عملاً "فکرِ دنیا" کہتے ہیں مجھے گورکھپور سے علیگڈھ لے گئے۔ اور میں مجبور ہوا کہ "ایوان" اور "ایوان اشاعت" کو پھر بند کر دوں۔ اس دو سال کے "دورِ سکوت" میں یوں بھی میری قوتیں کافی مضمحل ہو چکی تھیں لیکن علیگڈھ کی ثقیل اور غیر شاعرانہ فضا میں چند ماہ کی نہایت ثقیل اور غیر شاعرانہ زندگی نے میری رہی سہی قوت اور صلاحیت کو کند اور محض بیکار کر کے رکھ دیا۔ پھر بھی علیگڈھ چھوڑ دینے کے بعد اس کا امکان تھا کہ میں اپنی قوتوں میں از سر نو زندگی کے کچھ آثار پیدا کر لیتا اور پھر اسی "سعیِ بے حاصل" کی لذتوں میں کھو جاتا۔ لیکن اتنے عرصہ تک جو مجھے

خالی الذہن ہوکر غور کرنے کا موقع مل گیا تو میرے بہت سے اوہام و التباسات کے پردے فاش ہوگئے اور مجھے یقین ہوگیا کہ میری ساری "ادب شعاری" ایک نہایت شدید قسم کی خود فریبی ہے اور اپنی جس زندگی کو میں دوسروں کی خدمت سے تعبیر کر رہا ہوں وہ میری اپنی دماغی عیاشی اور نفس پروری کے سوا کچھ نہیں ہے ؛

یہاں کبھی [illegible] اس حقیقت کی طرف توجہ کی ہے کہ ہندوستان کی پینتیس کروڑ بیس لاکھ کی آبادی میں بتیس کروڑ ایسے ہیں جنکے لئے ہمارے ادبی کارنامے صرف کاغذ پھیلی ہوئی سیاہی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جس ملک میں بے پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد اس حد تک بڑھی ہوئی ہو اس ملک میں "ادبیات" کو [illegible] سمجھنا [illegible] کی دلیل ہے اور اگر کوئی ایسا کر رہا ہے تو اس کو میں حماقت کا مترادف سمجھتا ہوں اس لئے کہ وہ صرف اپنے ذوق کی تسکین کے لئے ان حقیقتوں سے [illegible] کرتا ہے جو اس کے ذوق سے کہیں زیادہ مکمل اور کہیں زیادہ اہم ہیں۔ ہر مشہور ایک [illegible] ادبیات کو "دولت کا [illegible] اور کاہل [illegible] کا ابلا ہوا جہر" کہا تھا۔ مثلا کے ملک میں اگر ادب کی اس تعریف کو زبردستی سے تعبیر کریں تو شاید زیادہ بیجا نہ ہو لیکن ہندوستان میں ادبیات کی واقعی یہی حیثیت ہے۔ ہمارے ملک میں ادبیات صرف طبقۂ اعلےٰ کا پیدا کیا ہوا جھاگ ہے جسکو عوام الناس کی زندگی سے دور کی بھی کوئی نسبت نہیں ہے ؛

ادبیات قوموں کے عروج و زوال کا آئینہ ہوتی ہیں۔ یا کم سے کم انکو ہونا چاہئے۔ اور دوسرے ممالک میں کسی نہ کسی حد تک ایسا ہے بھی لیکن ہندوستان میں قدیم ہندو ادبیات (سنسکرت اور ہندی وغیرہ) کو چھوڑ کر ادبیات کو کبھی بھی عوام کی زندگی سے کوئی واسطہ نہیں رہا۔ اور اردو ادب تو اور کبھی خدا کی خدائی سے کوسوں دور چند چیدہ اور برگزیدہ لوگوں کے حلقے کے اندر محدود رہا ہے۔ تلسی داس اور جائسی کچھ بھی اپنے اپنے عہد میں خواص اور عوام دونوں میں یکساں مقبول رہے اور حسب توفیق و استعداد سمجھے گئے۔ لیکن میر اور غالب کو ان کے زمانہ سے لے کر اب تک کتنوں نے سمجھا اور انہوں نے کتنوں کی تہذیب اور جلا کی جن ادبیات کے پڑھ سکنے والوں کی تعداد کچھ نہ ہو تو انکو سمجھنے والے اور انکو اپنی زندگی میں جذب کر لینے والے کہاں سے آئیں گے؟

بندہ نواز قومیں پہلے آزاد اور آبرو دار ہولیتی ہیں۔ اس کے بعد ادبیات اور دوسرے فنون لطیفہ پیدا کرتی ہیں۔ جمالیاتی اکتسابات اسباب میں اس قدر دخل نہیں ہیں جسقدر کہ علامات ہیں۔ جب سے اس حقیقت کا احساس ہوا نہ پوچھئے کس حال میں رہتا ہوں :-

"مپرس از تپشہائے نبض دلم
کہ پرواز محو است و من بسملم"

میرا خیال ہے کہ یسینین اور میا کافسکی نے ایسے ہی اندرونی انتشار و تصادم کے مار ڈالنے والے احساس سے مجبور ہو کر خودکشی کی ہوگی یہ دونوں روس جدید کے مشہور شاعر گذرے ہیں جنکو خودکشی کئے ہوئے چند ہی سال گذرے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دونوں اپنے معاملات عشق میں ناکام رہے، اور اس وجہ سے خودکشی کر لی۔ لیکن اس بیسویں صدی میں "درد محبت" کے مریض جان نہیں دیا کرتے۔ یہ تو زمانۂ تاریک کا دستور تھا۔ بعض کا خیال ہے کہ ان دونوں کی خودکشی کا سبب روس کی موجودہ انقلابی حکومت اور اس کا اشتراکی اور افادی نظام تمدن ہے۔ میرا خیال ہے کہ ان دونوں شاعروں کو اس احساس نے خودکشی پر مجبور کر دیا کہ وہ غلط وقت اور غلط جگہ ہیں۔ اور ان کی ذات اور ان کے ماحول میں کوئی موافقت نہیں ہے۔ یسینین کی شاعری کا لب و لہجہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ وہ اپنے کو روس کے پنج سالہ دستور العمل میں اجنبی پا رہا تھا اور اسکو یقین تھا کہ اسوقت روس کو اسی پنج سالہ دستور العمل کی ضرورت ہے اسکی شاعری درکار نہیں ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ اپنی فطرت سے بھی مجبور تھا۔ اس کی شاعری اس کشمکش کا آئینہ ہے۔ وہ اپنے وقت کی ہر معاشرتی تحریک کو تسلیم کرتا تھا۔ اور اس سے اپنے کو مانوس بنانے کی کوشش کرتا تھا۔ وہ اپنی ساری ہستی "اکتوبر اور مئی" کے حوالہ کر دینے کیلئے تیار تھا۔ لیکن اپنے "محبوب مزمار" یعنی اپنی شاعری کو قربان کرنیکے لئے تیار نہیں تھا۔ خدا نہ کرے کہ کوئی ایسے تاب شکن اور جاں گسل تصادم کا شکار ہو۔ آج اگر میں بھی شاعر ہوتا اور اتنا ہی حساس جتنا کہ روس کے

یہ دو بدنصیب شاعر تھے تو شاید میں بھی اپنی نجات خودکشی ہی میں دیکھتا۔

آئرلینڈ کے مشہور طنز نگار سوفٹ نے اپنی تصنیف کتابوں کی جنگ (______) قدیم مصنفوں کو شہد کی مکھیوں اور جدید مصنفوں کو مکڑیوں سے تشبیہہ دی ہے۔ قدیم مصنف شہد کی مکھی کی طرح اپنی زندگی کو سماج کی چیز سمجھتا تھا اور اپنے کو قدرت کے اس وسیع کارخانہ کا صرف ایک جزو تسلیم کرتا تھا۔ اور اگر وہ دوسروں کی زندگی سے فائدہ اُٹھاتا تو اکیلے اپنے لئے نہیں بلکہ ایک پوری جماعت کیلئے بالکل اسی طرح جس طرح شہد کی مکھی پھولوں سے فائدہ اٹھاتی ہے لیکن آج کل کا مصنف مکڑی کی طرح صرف اپنی ذات کو آسودہ کرنے کی غرض سے دوسروں کو اکثر جماعت کی جماعت کو شکار کرنیکے لئے جال تنتا ہے اور پھر یہ فخر کرتا ہے کہ وہ نہ کسی کا محتاج ہے نہ ممنون اور اس نے جو کچھ پیدا کیا خود اپنی تخلیقی قوت سے پیدا کیا۔

اشتراکیت مذہب اور تصوف کے ساتھ ساتھ فلسفہ اور ادب کو بھی آج یہ الزام دے رہی ہے کہ ان چیزوں نے بنی نوع انسان کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ اسی لئے اشتراکیت کے حامیوں کا یہ اصرار ہے کہ ادبیات کو جماعت کی خدمت میں ایک آلۂ کار ہونا چاہئے اور جو ادب تمدنی تحریک و تبلیغ میں کام نہ آسکے۔ اس کو رد کر دینے کی ضرورت ہے۔ مجھے یہ ساری چیخ و پکار "بہ مرگش بگیر تا بہ تپ راضی شود" کی مثال معلوم ہوتی ہے۔ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ہمارے شاعروں اور ادیبوں نے بڑی ہٹ دھرمیوں سے کام لیا ہے اور بڑی بڑی بے عنانیاں کی ہیں اور اب اسی کی ضرورت ہے کہ ان کو سخت بندشوں میں جکڑ دیا جائے۔ ورنہ وہ اپنی "جنوں جولانیوں" میں نہ جانے کہاں چلے جائیں گے۔ اور ہم کو نہ جانے کہاں لیجا کر ٹھکانے لگا دینگے لیکن میں ادبیات کو صرف کسی جماعت کا آلۂ کار نہیں مانتا۔ ادبیات ہو یا کوئی اور فنِ لطیف اس کے ہمیشہ دو متناقص پہلو ہوتے ہیں۔ ایک تو عملی یا افادی یا خارجی اور دوسرا تخئیلی یا جمالیاتی یا داخلی اور ہمارا کام ان دونوں پہلوؤں میں ایک آہنگ اور توازن قائم رکھنا ہے ورنہ جہاں ان میں سے کسی ایک کا غلبہ ہوا وہیں فساد اور انتشار پیدا ہونے لگے گا۔ اس سے انکار نہیں کہ ادبیات کو زمانہ اور ماحول سے بیگانہ نہیں ہونا چاہئے لیکن پھر ان عوارض کا غلام بھی نہ رہنا چاہئے۔ ادبیات کو اگر ایک طرف حال کا آئینہ رہنا ہے تو دوسری طرف مستقبل کا اشاریہ بھی ہونا ہے۔ اور اس کے لئے کسی نہ کسی مقدار میں تخئیلیت کی ضرورت ہے اسی تخئیلیت کی جس کا نام آتے ہی اشتراکیت گالیوں کی بوچھار کرنے لگتی ہے۔ اگر تخئیلیت نہ ہوئی تو ادبیات مستقبل کی تشکیل و تعمیر میں کوئی حصہ نہ لے سکیگی۔ آج کل کے مشہور انگریزی نقاد جے۔ بی پریسٹلے (______) کا یہ خیال بہت درست ہے کہ فنون لطیفہ کو زندہ رکھنے کے لئے تھوڑی سی "افیون" بے حد ضروری ہے۔ صناع کو بیک وقت حال اور مستقبل دونوں میں سانس لینا ہے۔ یہ اس کی واقعیت ہے اور یہ اسکی تخئیلیت۔

مگر بہرحال میں اس حقیقت کو بھی مانتا ہوں کہ اس وقت دنیا کو عام طور سے اور ہندوستان کو خصوصیت کے ساتھ ادبیات کی نہیں ہے بلکہ تمدنی تحریکوں اور معاشرتی انقلابات کی ضرورت ہے۔ اس وقت دنیا میں جو بےچینی پھیلی ہوئی ہے وہ اقتصادی ہے اور اس کا علاج بھی اقتصادی ہی ہے۔ مختلف دور میں دنیا کو مختلف مسکنات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لئے کہ زندگی کی وہ قوت جس کو ہیگل اور مارکس "جدلیات" (______) کہتے ہیں مختلف دور میں مختلف سطح پر کام کرتی ہے۔ کبھی ہماری زندگی کی مادی سطح پر۔ کبھی اخلاقی سطح پر۔ کبھی روحانی سطح پر۔ اسوقت ساری دنیا میں یہ قوت مادی اور وہ بھی خصوصیت کے ساتھ اقتصادی اور معاشیاتی سطح پر کام کر رہی ہے لہذا اس وقت خالص ادبیات کے سوال کو لے کر بیٹھنا یقیناً بے وقت اور بے محل ہے۔ کم سے کم ہندوستان کی فلاح اس وقت اسی میں ہے کہ وہ اپنی مادی حالت کو سدھارنے کی کوششیں کرے۔ اس وقت ساری دنیا کے سامنے روٹی کا سوال ہے۔ جس کے ہوتے ہوئے کسی دوسرے سوال کو اُٹھانا سراسر فریب ہے، یہ سچ ہے کہ انسان صرف روٹی سے زندہ نہیں رہ سکتا۔ لیکن آج تک بغیر روٹی کے بھی کوئی زیادہ عرصہ تک زندہ نہیں رہ سکا ہے۔

غرضکہ ہمارا ملک اور ہماری قوم کا اس وقت تک آبرو دار

ہونا معلوم ہے۔ جب تک ہم آزاد نہ ہولیں۔ اور ہم کو پیٹ بھر کھانا۔ صحت بخش محنت اور حسب ضرورت فرصت نہ میسر ہولے۔ اس وقت ادبیات پیدا کرنے سے کہیں زیادہ یہ ضروری ہے کہ ملک کا پیٹ بھرنے، اور تن ڈھانکنے اور اس کو نوشت و خواند کے قابل بنانے کی تدبیریں سوچیں۔ اس وقت اگر ہمارے ملک کو کسی ادبیات کی ضرورت ہے تو یقیناً وہی ہے جسکو اشتراکیت" جماعت کا آلۂ کار" کہتی ہے۔

یہ ہیں وہ احساسات جو آجکل میری تمام ادبی قوتوں کو سلب کئے ہوئے ہیں۔" ذوق خامہ فرسائی" ستم زدگی" کی اور بات ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ کچھ لکھنے پڑھنے کے لئے جی نہیں ابھرتا۔ حالانکہ میں نے اپنے کو کسی اور کام کے قابل بھی نہیں رکھا۔ مختصر یہ کہ عجیب کشاکش میں بسر ہو رہی ہے اور عجیب حالت ہے۔

" نہ سود اسے عشق و نہ راہ صواب
نہ در سینہ آتش نہ در دیدہ آب"

میرے بعض ارادتمند احباب کا خیال ہے کہ میں اپنی زندگی کو ملک کی موجودہ تحریک و شورش میں بھی اسی طرح کام میں لا سکتا ہوں اور اپنے سارے میلانات و اکتسابات کو اس سمت میں منتقل کر سکتا ہوں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک صاحب نے جن کو میرے ساتھ خواہ مخواہ کا حسن ظن ہے اور جو یہ سمجھتے ہیں کہ میں زندگی کے جس شعبہ میں بھی آؤں گا، اس میں ایک نئی زندگی پیدا کر دونگا۔ مجھ سے کہا تھا۔

" نظیری کاش بنمائی کہ در ساغر چہ می داری"
" کہ پیش زاہداں قدر گنہگاراں شود پیدا"

مطلب یہ تھا کہ اب سب کچھ چھوڑ کر ان کی طرح ملک اور قوم کا سودا لے کر بیٹھ جاؤں۔ اگر میری زندگی وہ ہوتی جو اب سے ۱۲ سال پہلے تھی تو ان کی اس تجویز پر دل سے اور خلوص کے ساتھ غور کرتا۔ اگرچہ اس وقت بھی اس حقیقت کو مشکل ہی سے بھول سکتا تھا!

" بہ سوز و ساز حریفم بہ آہ و نالہ حریف"
" غم است دار وئے درد ے کہ سازگار من است"

لیکن اب تو حالات اِس کی بھی اجازت نہیں دیتے کہ اِس قسم کی تجویز پر دور سے بھی کوئی جواب دے سکوں۔

آپ مجھ سے عالمگیر کے لئے تصویر اور مضمون مانگتے ہیں۔ تصویر کیلئے تو آپ نے مصور کو مسلط کر دیا۔ اب یہ آپ کے اور اس کے درمیان کا معاملہ ہے۔ مگر اب آپ ہی بتایئے مضمون یا افسانہ طلب کرنا مجھ پر کتنا بڑا ظلم ہے؟ یہ ہذیانات حاضر ہیں، اس کو معذرت سمجھئے یا مضمون۔ بہرحال اب مجھے معذور سمجھ کر معاف کر دیجئے تو میرے حق میں بہتر ہوگا۔

ہاں ابھی الہ آباد سے پروفیسر رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری کا خط آیا جس میں انھوں نے مجھ کو ایک تازہ غزل لکھ کر بھیجی ہے ــ فراق بہ حیثیت اردو غزلگو کے ملک میں اچھی طرح روشناس ہو چکے ہیں انھوں نے اردو غزل میں نئی گہرائیوں کا پتہ دیا ہے۔ انکی شاعری اس بات کا ثبوت ہے کہ غزل حیات انسانی کی تہ در تہ پیچیدگیوں کو بیان کرنے پر کسقدر قادر ہے۔ ان کا ہر شعر ایک نیا انکشاف ہوتا ہے۔ اردو شاعروں میں مجھے کوئی دوسرا نظر نہیں آتا جو زندگی کے تناقضات کو اس اطمینان اور سہولت کے ساتھ بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہوں۔ اردو غزل جس کو لوگ فرسودہ سمجھ کر ترک کر رہے تھے ــ فراق کے ہاتھ میں بالکل نئے امکانات کی حامل نظر آ رہی ہے اور اس اردو شاعری میں یقیناً ایک نئے میلان اور ایک نئی تحریک کی ابتدا ہو رہی ہے۔ میں فراق کی شاعری کا مطالعہ کرتا ہوں تو وہ مجھے میر اور غالب کا ایک نہایت مکمل امتزاج معلوم ہوتے ہیں۔ بہرحال میں ان کی وہ غزل آپ کے پاس بھیج رہا ہوں آپ عالمگیر میں اشاعت کے لئے بھیجدیجئے۔

" نیازمند محوی"

تالاب کے کنارے

(از جناب خلیق برہانپوری)

حدِ نگاہ میں تھا دلکش حسین منظر — اُٹھا ہوا فضا میں رنگینیوں کا محشر
ہر ذرہ زمیں تھا کیفِ نشاط در بر — سنتے تھے سازِ دل سے نغمات روح پرور
کھوئی ہوئی تھی ہستی رنگینیوں میں یکسر — فطرت حسیں مناظر ہر سمت تھی سنوارے

کیا یاد ہیں تمہیں بھی رنگین وہ نظارے
تالاب کے کنارے

معمورِ مستیوں سے ماحول کی فضائیں — چھائی ہوئی فلک پر گھنگھور وہ گھٹائیں
پُر کیف و عنبر افشاں تازہ خنک ہوائیں — یاد آتی ہیں تمہارے آنے کی وہ ادائیں
وہ دیکھنا تمہارا گھبرا کے دائیں بائیں — ڈوبے ہوئے اثر میں انداز تھے تمہارے

کیا یاد ہیں تمہیں بھی رنگین وہ نظارے
تالاب کے کنارے

معمول ہو گیا تھا شام و سحر کا آنا — شام و سحر کی باتیں گذری ہوئی سنانا
دورانِ گفتگو میں رہ رہ کے جھینپ جانا — میری شکایتوں پر ہنس کر وہ منہ چڑانا
اظہارِ عشق پر وہ سوگند میری کھانا — کانوں میں گونجتے ہیں الفاظ پیارے پیارے

کیا یاد ہیں تمہیں بھی رنگین وہ نظارے
تالاب کے کنارے

معمورِ نعریت سے دونوں کی تھی جوانی — چھایا ہوا دلوں پر تھا کیفِ جاودانی
میری خوشی سے حاصل تھی تمکو شادمانی — تم اپنی گفتگو سے کرتے تھے گلفشانی
کہتا تھا روز میں بھی دل کی مرے کہانی — تکمیلِ آرزو کے تھے جسمیں کچھ اشارے

کیا یاد ہیں تمہیں بھی رنگین وہ نظارے
تالاب کے کنارے

خانم نے انگریزی پڑھی

از جناب آصف صاحب بریلوی

موسم برشگال بھی عجیب جادو اثر و فرحت افزا موسم ہے صاف و شفاف آسمان کا بھورے بھورے بادلوں سے چھا جانا۔ ننھی ننھی بوندوں سے بارش کا شروع ہوکر طوفان میں تبدیل ہو جانا۔ برق کی جلوہ ریزی۔ ہیبت اور لرزہ براندام کرنے والی سحابی صدائیں۔ یہ سب مل کر کچھ ایسا سماں نظروں کے سامنے پیش کرتے ہیں کہ پژمردہ اور افسردہ ترین قلوب بھی شوخی و زندہ دلی کی حرارت سے شگفتہ و بشاش ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب چمنستان کے مناظر قابل پرستش تسلیم کئے جاتے ہیں۔ سرو و شمشاد کا جھومنا۔ سبزے کا لہلہانا۔ پھولوں کا کھلنا۔ کوئل کی کوک پپیہے کی پی کہاں، بلبل کی نغمہ سنجی، بھونروں کا رقص اور سب سے بڑھ کر دوشیزاؤں کا جھولنا گل اندامون کی ملہاریں، دلوں میں ارمان، ارمان میں جوش اور جوش میں سرمستی و بیخودی پیدا کر دینے کے لئے سحر سامری کا درجہ رکھتے ہیں اور پھر ان لوگوں کی خوش قسمتی کا کیا کہنا جن کی "وہ" بھی ان کی مسرتوں میں برابر کی شریک ہوں۔

غرضیکہ ایسا ہی موسم تھا۔ کالے بادل فیلان مست کی طرح جھومتے ہوئے آسمان پر دوڑے چلے جا رہے تھے۔ کبھی کبھی گرج کی سمع خراش آواز گونج جاتی پھوار پڑ رہی تھی اور میں اپنی چھوٹی سی کوٹھی کے اندرونی برآمدے میں ایک آرام کرسی پر لیٹا ہوا جون سفیلڈ" کی ایک حزنیہ تمثیل کے مطالعہ میں مستغرق تھا۔ خانم برابر والی کرسی پر دراز بارش کے دلچسپ منظر میں جذب ہو جانے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر شاید میری اس بے توجہی کے سبب وہ اپنے ارادہ میں ناکام ہو رہی تھیں۔ اس لئے بار بار میرے ساکت اور غیر متاثر چہرے پر ان کی حسین نظریں پڑ جاتیں اور چہرے سے کتاب اور کتاب سے ہٹ کر پھر موسم کی دلفریبی کا حظ اٹھانے لگتیں شام کے پانچ بجنے والے تھے۔ ان رنگین لمحات میں دنیا کا ہر شخص کسی نہ کسی تفریح میں شریک ہونے کے لئے بے چین نظر آتا ہے۔ مگر یہاں جب سے خانم رونق افروز ہوئی تھیں میں نے تمام کھیلوں اور تفریحوں سے ہاتھ اٹھا لیا تھا دوست احباب شکوہ سنج تھے۔ تھیٹر و سینما بے رونق پڑے تھے۔ باغ و بازار میں کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ مختصر یہ کہ آفس کے چند گھنٹوں کے علاوہ میرا تمام وقت انہیں کی صحبت میں گذرتا تھا۔ یہ کچھ اس وجہ سے نہیں کہ ان کے آنے سے دل کے تمام تفریحی خانے یکدم بند ہو چکے تھے۔ یا دنیا کی نیرنگیوں، احباب کے جلسوں یا تفریح گاہوں کی چہل پہل مٹ چکی تھی اور نہ اس وجہ سے کہ خانۂ محبت وسیع ہو کر دشت عشق بن گیا تھا۔ بلکہ اس وجہ سے —— مجھے کہنے میں تامل نہ ہونا چاہئے —— کہ ان میں سیکڑوں ہزاروں بلکہ ان گنت خوبیوں کے علاوہ ایک برائی یا ایک کمی بھی تھی۔ جس کی وجہ سے مجھے اکثر شرمندگی کا زرد چہرہ دیکھنا پڑا اور وہ تھا ان کا —— ہاں ہاں کہہ دوں ان کا —— جاہل ہونا۔ مطلب یہ کہ بے پڑھا ہونا۔ یعنی انگریزی سے بے بہرہ ہونا۔ گویا کہ وہ مروجہ انگریزی طرز بود و باش سے قطعاً ناآشنا تھیں اور نہ صرف ناآشنا ہی بلکہ متنفر اور متنفر بھی سخت ترین قسم سے۔

ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ بہترین موسم کی بہترین شام تھی اور میں اس کو اس طرح رائگاں کر رہا تھا۔ خانم کے جذبات کا خدا کو علم مگر میں تو کتاب کے مطالعہ میں سراپا غرق تھا۔ مجھے موسم کی رنگینی اور ان کے جذبات سے اس وقت کچھ سروکار نہ تھا۔ میں پڑھ رہا تھا . . . پڑھے جا رہا تھا، برابر اور سرعت کے ساتھ —

یکایک میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر ایک قہقہہ۔

"کیوں ہ کیا ہے ؟" خانم نے عجیب انداز سے متبسم ہو کر کہا۔ ان کے تعجب سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اس کے قبل میرے چہرے سے المیہ و حزنیہ اثرات کا جائزہ لے چکی ہیں۔

"کچھ نہیں" میں نے کتاب بند کر کے انکی طرف پر شوق نظریں ڈالتے ہوئے کہا

"کچھ تو ہے ضرور" اس وقت آپ کا قہقہہ بے معنی نہیں ہو سکتا"

"مگر تمھیں بتانے سے کیا فائدہ؟ جبکہ تم اس ادب سے متنفر رہنے کی قسم کھا چکی ہو"
وہ کچھ ناراض ہو کر بولیں۔ "خیر ـــــ رہنے دیجئے"۔ ایسا معلوم ہوتا
تھا کہ میرے الفاظ تیر و نشتر سے کم نہ تھے۔

"سنئے تو" میں نے خوشامدانہ طور پر کہا "کیا ناراض ہو گئیں۔ اچھا سنئے
تو میں بتاتا ہوں۔ دیکھئے میں بتاتا ہوں۔

"نہیں اب کوئی ضرورت نہیں ہے" انھوں نے تنک کر کہا۔

"تمھیں سننا پڑے گا" میں نے تمنا میں زور پیدا کرنے کی کوشش کی۔
"سنو گی؟ سنو خانم بڑا دلچسپ فقرہ ہے"۔

"اچھا سنئیے" کچھ اشتیاق ظاہر کیا گیا۔

"لیکن ایک شرط پر" میں نے انگلی سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"پھر وہی بے سر دپا"

"مگر تمھیں شرط ماننا پڑیگی" میری التجا میں ضد کا پہلو بھی تھا۔

"اچھا وہ کیا؟"

"مانو گی؟ وعدہ کرتی ہو؟"

"جی ہاں ــــ!"

"تمھیں انگریزی پڑھنا پڑیگی"

"خوب ــــ یہ اچھی شرط ہے"

"مگر تم وعدہ کر چکی ہو"

"اچھا اب سنئیے گا بھی"۔ ان کے انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ شرط
منظور ہے"

میں نے اس بات سے خوش ہو کر کہ چلو "کفر ٹوٹا خدا خدا کر کے" ان کو انگریزی
ادب کی بہت سی خوبیاں سمجھائیں۔ ان کے تمدن و معاشرت کی رنگینیاں ظاہر کیں
اور آخر میں زیر مطالعہ تمثیل پر تبصرہ کرتے ہوئے بولا۔

"Faithful" جون مسفیلڈ کا ایک نہایت المناک ڈرامہ ہے
جس میں ایک دوست کی جاں نثاری و وفاداری کا دلدوز واقعہ بیان کیا گیا ہے
ایک دوست جب قتل ہو جاتا ہے تو دوسرا اس کے قاتل سے انتقام لینے کی
قسم کھاتا ہے۔ مگر چونکہ قاتل ذی اثر و مالدار شخص ہے اس لئے وہ اس تک رسائی
حاصل کرنے کے لئے پاگل بن جاتا ہے۔ اس پاگل کو گرفتار کرنے کے لئے دو شخص
روانہ ہوتے ہیں۔ دونوں بنظر عمیق اس کی دیوانگی کا مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک
شخص جو فوج کا کپتان ہے اس کو قابل رحم تصور کرتا ہے مگر دوسرا جو قاتل کا
مصاحب ہے اس کو مجنون نہیں مانتا بلکہ گرفتاری پر روز دیتا ہے۔ دونوں
آپس میں مباحثہ کرنے لگتے ہیں مگر یہ مجنون ان کی کوئی بات نہیں سنتا بلکہ اپنی
بے پر کی اڑائے جاتا ہے۔ دوران کلام میں وہ انکو مخاطب کرتا ہے۔

"کیا تم دیوتاؤں پر یقین نہیں رکھتے ہو" پاگل نے کہا۔

اس پر وہ شخص جو اس کو مکار سمجھ رہا تھا بولا ــــ "تم مجھے دھوکا نہیں
دے سکتے میں سب سمجھتا ہوں"۔

دیوانہ اس جواب کی پروا کئے بغیر گفتگو جاری رکھتا ہے۔ "اگر دیوتاؤں
پر تمھارا ایمان ہے تو تمھیں شکر گذار ہونا چاہئے"۔

دوسرا شخص اس جملہ سے یہ نتیجہ اخذ کرتا ہے کہ وہ اب عقل کی کوئی بات
کہنے والا ہے اس لئے وہ کپتان کو بھی متوجہ کرتا ہے۔ تاکہ وہ اچھی طرح اس کی بات
سمجھ کر یہ فیصلہ کرے کہ دراصل وہ خرابی دماغ کا شکار نہیں ہے۔

"اس پر غور کرو کپتان ا ــــ ہاں کیوں شکر گذار ہونا چاہئے؟"

"اس لئے کہ تمھاری ماں   تھی" پاگل نے کہا۔

یہ تھا وہ جملہ جس پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ دوسرا شخص ندامت سے
زمین میں گڑ گیا اور اس کو قبول کرنا پڑا کہ دراصل وہ پاگل ہے۔ اب تم بتاؤ انگریزی
کب سے شروع ہو گی؟

"کل سے؟"

"ضرور ــــ؟"

"ضرور ــــ!"

دوسرے روز انگریزی کی پہلی کتاب منگائی گئی۔ ہم ماسٹر بن کر بیٹھے
اور خانم بطور شاگرد"

"ہاں پڑھو خانم"

"واہ ایسے ہی"

"اور کیسے؟ ــــ"

"پہلے مٹھائی کھلوائیے ــــ!"

"ہم کھلائیں یا تم ــــ؟"

"ہم کیوں کھلائیں جس کو پڑھانا ہو وہ کھلائے"

یہ ایسا جواب تھا کہ اس کے آگے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ ہم تو

قائل ہوگئے اگر اس وقت ہمارے ماسٹر صاحب بھی ہوتے تو وہ بھی ضرور قائل ہو جاتے اور اس بات کا افسوس بھی ہوا کہ یہ راز پہلے سے کیوں نہ معلوم ہوگیا اس لئے کہ ہزار دو ہزار نہیں تو دس بیس سکولوں کے ماسٹروں کی جیب پر ضرور ڈاکہ ڈالتے اور اب بھی اگر یونیورسٹی اور سکولوں کے علاوہ کو یہ راز معلوم ہو جائے تو پروفیسروں اور ماسٹروں کی تنخواہ پر قُل اور اُن کے بال بچوں کے لئے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھنا پڑے۔ بہرحال ہم نے فوراً ملازم کو بازار سے مٹھائی لانے کیلئے بھیجدیا۔

"اچھا اب پڑھو خانم"۔ ہم نے مٹھائی کھانے اور کھلانے کے بعد کہا۔ "یہ جو دو شاخا A سا ہے اس کو کہتے ہیں"۔ "اِے"

"اَے"۔ انھوں نے منہ کھول کر کہا۔

"اَے نہیں بلکہ اِے"۔ ہم نے منہ بنا کر کچھ تیکنیں بھی جبین پر ڈالیں۔

"اِے"۔ کیا میں ابھی نہیں کہہ سکتی"۔

"کیوں نہیں صاحب بالکل ٹھیک اور یہ جو دو چشمی ھ کی طرح ہے، اس کو کہتے ہیں"۔ بی"۔

وہ نہایت سادگی سے بولیں "بی"

"ٹھیک بھئی شاباش خانم۔ ماشاءاللہ تم بہت جلد پڑھ جاؤگی اور دیکھو یہ ہے سی اور یہ ڈی۔ بس آج یہاں تک یاد کرلو"۔

"اے لو، اس میں کیا رکھا ہے مجھے سب یاد ہے"۔ خانم نے تن کر کہا۔

"اچھا تو سناؤ"۔

"اِے۔ بی۔ سی۔ ڈی"۔

"واہ خانم واہ"۔

غرضکہ پڑھائی ہوتی رہی۔ تین روز میں تمام حروف تہجی ختم ہوگئے خانم نے کمال ذہانت سے کام لیکر مجھے غرق حیرت کردیا۔ اب دوسرا سبق شروع ہوا۔ میں نے کہا۔

"دیکھو اِے کی آواز آ نکلتی ہے سمجھیں کبھی اِے اور کبھی اَے بھی"۔

"ارے"۔ انھوں نے گھبرا کر کہا۔ "پھر یہ کیسے معلوم ہوگا کہ کہاں آ۔ کہاں اِے اور کہاں اَے ہے"۔

"میں جو ہوں بتانے کیلئے"۔ میں نے متبسم ہوکر جواب دیا۔

"تو کیا آپ ہر وقت میرے پاس رہکر یہی بتایا کرینگے"۔

"نہیں۔ بعد کو تم خود سمجھ جایا کروگی۔ میں تمھیں چند اصول بتادونگا"۔

میں نے چڑ کر کہا۔

"اچھا ــــ اب اصول الگ یاد کرنا پڑیں گے؟"

"اس میں تمھیں دقت نہیں ہوگی۔ اچھا پڑھو اِے۔ ٹی اَیٹ معنی پر سی۔ اَے۔ ٹی۔ کَیٹ یعنی بلّی۔ آر۔ اَے۔ ٹی۔ رَیٹ، معنی چوہا"۔

"تو بھئی شروع شروع میں یہ آگیا بلّی۔ چوہا"۔ وہ عجیب انداز سے بولیں

"اور نہیں کیا ہاتھی، گھوڑے"۔ میں نے ہنسکر کہا۔

اسی طرح ہنستے کھیلتے سبق ہوتا رہا۔ اب کتاب آدھی کے قریب ختم ہوچکی تھی میں خوش تھا کہ خانم کا تنفر دور ہوچلا ہے اور خانم بھی بظاہر مسرور نظر آرہی تھیں۔ سمجھتی تھیں کہ انگریزی بولنا سیکھ رہی ہیں اور وہ زمانہ قریب ہے جب بیرسٹر اعجاز صاحب کی انگریز بیوی کو شکست دیدیں۔

ایک دن صفحہ لوٹا سبق شروع ہوا۔ میں نے کہا۔

"پی۔ اے۔ ایل۔ ایم۔ پام"۔

خانم آنکھیں پھاڑ کر بولیں۔ "اور ایل کہاں گیا؟"

میں نے سمجھایا۔ "ایل کی آواز نہیں نکلتی ہے"۔

"آپ نے پہلے تو نہیں تبلایا تھا"۔

"پہلے ایسا لفظ نہیں آیا ہوگا!"

"واہ، آیا تو تھا! پی۔ ایل۔ اے۔ این۔ پلین۔ اس میں ایل کی آواز کیوں نکلی؟"

"تم بیوقوف ہو۔ جس طرح میں بتاؤں اسی طرح پڑھو"۔

اتنا سننا تھا کہ خانم کا چہرہ دھوپ میں تپے ہوئے انگریز کی طرح سرخ ہوگیا۔ میں نے دل میں کہا کہ لیجئے اس ڈرامہ کا ڈراپ سین ہونے والا ہے اب بیچاری کتاب کی خیر نہیں مگر شکر ہے کہ وہ سنبھل گئیں اور کچھ غصہ کچھ خفگی اور کچھ دھمکی کے طور پر بولیں۔

"اگر آئندہ ایسے الفاظ استعمال ہوئے تو میں پھر کتاب کی شکل بھی نہیں دیکھونگی"۔

"خانم تم بیچ میں بغیر سمجھے ٹانگ اڑا دیتی ہو۔ پہلے سمجھ لیا کرو"۔ ان کا تحمل دیکھ کر اب میں بھی نرم پڑ چکا تھا۔

وہ بولیں۔ "ڈبلو۔ ڈبل ای۔ کے"۔

میں نے کہا۔ "وِیک"۔

پھر استفسار ہوا۔ "اور ڈبلو۔ای'اے۔کے۔؟"

میں نے کہا "وِیک۔" weak

وہ تیزی سے بولیں۔ "یہ بھی وِیک وہ بھی وِیک"۔

"ہاں ۔۔۔!"

"ذرا ہجے تو دیکھئے دونوں میں فرق ہے"۔

"ہاں، مگر تلفظ ایک ہے"۔

وہ کچھ قائل ہو کر پڑھنے لگیں۔ آگے چل کر بولیں۔ "ڈبلو۔ای۔اے۔آر۔ وِیَر" wear

میں نے ٹوکا۔ "نہیں خانم یہ وِئیَر ہے"۔

"اچھا خیر ۔۔۔!" ان کی نگاہوں سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یا تو مجھے یا مولف کتاب کو اور یا کم از کم ان زباندانوں کو ضرور پاگل سمجھ رہی ہیں۔

اگلا لفظ تھا۔ بی۔ای۔اے۔کے۔ تلفظ کیا گیا "بی ئیک"۔

میں ان تلفظات کو سنتے سنتے کچھ پریشان سا ہو چکا تھا مگر کسی نے سچ کہا ہے قہر درویش بر جان درویش۔ اپنا شوق تھا ان سے کہنا بھی تو کیا لیکن ڈرتے ڈرتے خفگی کا اظہار کر ہی دیا۔ "خانم تم نے پریشان کر دیا بھئی۔ بی ئیک نہیں۔ بِیک ہے"۔ Beak.

ترش رو ہو کر بولیں۔ "اچھا تو میں نہیں پڑھتی"۔

"پڑھو پڑھو اس میں تمھاری خطا نہیں بلکہ زبان ہی اتنی ناقص ہے"۔

"ہاں بڑی لغو زبان ہے"۔ تائید کی گئی۔ پھر یاد کرنے لگیں۔ "ڈبلو ڈبل ای۔کے وِیک، ڈبلو' ڈبل ای۔کے 'ویک' معنی ہفتہ۔ ۔ویک۔ ۔ویک ۔۔۔ ویک۔۔۔ ۔۔۔ ویک معنی ہفتہ ۔۔۔ بی۔ڈبل ای۔آر بِیئر۔ ۔۔ ۔بی۔ڈبل' ای' آر' بِیئر ۔۔۔۔۔" Beer

اب میں کیا کرتا۔ سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور جھنجھلا کر بولا۔ "پھینک دو کتاب بس ہو چکا پڑھنا۔ لاکھ دفعہ سمجھایا 'بِی یَر' مگر پھر وہی بیئر۔ بیئر کی رٹ۔ غبی کند ذہن ۔۔۔۔۔۔"

اب غصہ و نفرت کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا۔ بھلا اتنا سُنتیں اور وہ خاموش رہتیں انھوں نے دوسرے ہی لمحہ میں کتاب کے پرزے پرزے کر کے ہواہیں اڑا دیئے۔ اور وہاں سے اُٹھ اور کروشیا کا سامان لے کر دور ایک آرام کرسی پر جا کر لیٹ گئیں۔ اپنے شوق اور کتاب کی یہ حالت دیکھ کر میرا سر چکرانے لگا آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا۔ اب خانم کو بلاتا ہوں تو وہ ناراض۔ یا اللہ یہ کیا آفت آگئی۔ لاکھ لاکھ سمجھایا خوشامد کی۔ مگر وہ سنگ مرمر کی پتلی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوئی۔

ہماری بات چیت کیا بند ہوئی اچھی خاصی مورچہ بندی شروع ہو گئی گویا جنگ عظیم کی پُراسرار تیاریاں ہونے لگیں۔ کسی نازی نے ہر ہٹلر کی اتنی خوشامد نہ کی ہوگی جتنی ہم لے ہر ہائینس کی۔ مگر وہ صلح کرنے پر آمادہ نہ ہوئیں۔ خدا معلوم "ہر" میں اتنا ضد کا مادہ کیوں ہے؟

آپ جانتے ہی ہونگے کہ گھر کی لڑائی مردوں کے لئے دوزخ کا نمونہ ہوتی ہے۔ نہ سونے کا کمرہ صاف، نہ بستر بدلا ہوا، نہ لیمپ میں تیل۔ نہ کپڑوں کا انتظام، نہ غسل کا اہتمام، نہ ناشتہ کی فکر، نہ کھانے کی تیاری بھلا اتنی مشکلات میں زندگی کس طرح بسر ہو سکتی ہے۔ مگر ہم نے بھی اب اپنا دل سخت بنا لیا تھا اور قسم کھالی تھی کہ جب تک وہ خود صلح کی درخواست نہ کرینگی ہم بھی اپنا مورچہ قائم رکھیں گے۔

ایک دن اتفاق سے ملازمہ باورچیخانہ میں تالہ دینا بھول گئی وہاں دوسری چیزوں کے علاوہ صبح کے ناشتے کا ڈھائی سیر دودھ بھی رکھا ہوا تھا۔ ہم نے باورچی خانہ کی حالت دیکھ تو لی تھی مگر قصداً اغماض کیا اور بستر پر جا کر لیٹ رہے نصف شب کے قریب ایک بلی صاحبہ نے باورچی خانے کا جائزہ لیا کچھ برتنوں سے ٹکرائیں کسی کو الٹ دیا اور کسی کو سیدھا۔ دودھ جیسی مرغوب غذا ان کو دعوت طعام دے رہی تھی وہ کچھ گھبرا کر جو اس طرف جھپٹیں اور برتن ایک دلدوز جھنکار کے ساتھ گر پڑے خانم کی آنکھ کھل گئی۔ سمجھیں چور گھس آیا ہے۔ ڈرتے ڈرتے آہستہ آواز میں مجھے جگانے کی کوشش کی گئی۔

"چور۔چور! ۔ اے اٹھئے چور گھس آیا ہے ۔۔۔۔۔۔ ارے توبہ ایسا سونا بھی کس کام کا ۔۔۔۔۔ لیجئے کیسے سو رہے ہیں، انکا کیا ہے ۔ برتن تو میرے ہیں۔" (واقعہ یہ تھا کہ برتن ان کے جہیز کے تھے۔)

اتنے میں باورچی خانہ سے پھر آواز آئی۔ شاید وہ دودھ پینے کی جد و جہد کر رہی تھی۔ خانم سمجھیں چور برتن جمع کر رہا ہے اس خیال کے ساتھ ہی گھبرا گئیں۔ اور پہلے سے زیادہ ملتجیانہ لہجہ میں بولیں۔

"اٹھئے نا؟ ۔۔۔۔۔ جب چور صفائی کر دے گا ۔۔۔۔۔"

"اچھا ہے"۔ ہم نے بات کاٹ کر کہا۔ "فرش ہم جا کر بچھا دیں گے۔ شیرینی

تمھاری پڑھنے کے لئے مولوی صاحب کو بلالیں گے۔ اچھا خاصا میلاد مبارک کا جشن ہوجائیگا۔ اس سال ہوا بھی نہیں ہے۔ کیوں خانم ؟"

"ارے آپ مذاق سمجھ رہے ہیں۔ چور باورچی خانے میں ہے۔"

"مذاق بالکل نہیں، یہ تو ہم بھی جانتے ہیں چور باورچی خانہ میں ہے۔"

"تو اٹھئے نا ؟ ——"

"کیوں —— ؟"

"پکڑنے کے لئے۔"

"چور بھلا جا کہاں سکتے ہیں۔ ان کو تو ہم پکڑ لینگے۔ مگر یہ تاؤ اب صلح ہے۔"

"ہاں ہاں ہے۔" وہ نہایت سرعت سے بولیں۔ "اب جلدی کیجئے۔ وہ نکل نہ جائے۔"

ہم اپنی فتح کے نشہ میں سرشار کہ چلو بہ مورچہ بھی فتح ہوا اپنے گرم گرم بستر سے بلی کی جان کو سینکڑوں دعائیں دیتے ہوئے اٹھے۔ خانم کہتی بھی رہیں کہ "بندوق لے لو" مگر ہم اپنی بہادری کے زعم میں کہاں سنتے ہیں ویسے ہی باورچیخانے کی طرف روانہ ہوئے اور دبے پیروں جا کر اپنی محسنہ کو رات بھر کے لئے بلیک ہول میں مقید کر کے اجازت دیدی کہ وہ جی بھر کر بلا کسی خوف و خدشہ کے اچھی طرح دودھ سے فیضیاب ہولے۔

کبھی کبھی برتنوں کی صدائے بے ہنگام سے خانم کو بھی یقین ہوتا رہا کہ چور جال میں پھنس گیا ہے۔

شب صلح کی صبح ہوئی تو ہم نے کہا۔ "کہو خانم! آج سے پھر وہی سل و نہار —— ؟"

بولیں۔ "پہلے چور کو تو باورچی خانے سے نکالئے۔"

"وہ تو نکل آئیگا مگر تم اپنے وعدے پر قائم ہو نا ؟"

"ہاں!" اعتراف شکست کے مخصوص انداز میں کہا گیا۔

ہم نے جاکر باورچی خانہ کا دروازہ کھولا۔ دروازہ کھلتے ہی گربۂ مسکین یعنی ہماری صلح و امن کی دیوی نہایت سکینیت اور عجز کے ساتھ برآمد ہوئیں اور اپنے دونوں پرستاروں پر ایک مشفقانہ اور والہانہ نظر ڈال کر آگے جھپٹیں اور دیوار سے سیڑھی کا کام لے کر فضائے بسیط میں غایب ہوگئیں

"ارے" کہہ کر خانم ایسی کھڑی رہ گئیں گویا انھیں اپنی حماقت آمیز صلح پر حد درجہ ملال ہے۔

"کچھ نہیں خانم! آخر تھی یہ بھی چور۔" ہم نے ان کے رنج و ملال کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "اب جو کچھ ہونا تھا ہو گیا۔ تمھاری گورنمنٹ صلح کی دفعات پیش کر چکی ہے جس پر ہماری منظوری کی مہر بھی ثبت ہو چکی ہے۔ اب بتاؤ کب سے سلسلۂ تعلیم شروع ہو ؟"

"پہلے چند شرطیں طے ہوجانا چاہئے۔" خانم نے اپنی میگوں نظروں سے ساقی کا کام لیتے ہوئے کہا۔ بھلا ہم کہاں کے ایسے تھے جو پیتے اور مدہوش نہ ہوتے۔ اب صلحنامہ کی شرطیں تحریر کی گئیں۔

۱۔ تعلیم کا کوئی وقت مقرر نہیں۔

۲۔ جب استاد و شاگرد کو فرصت ہو تعلیم دی جائے۔

۳۔ استاد اپنی مرضی سے کسی وقت شاگرد کو مجبور نہیں کر سکتا۔

۴۔ شاگرد کو اختیار ہے جب چاہے پڑھے یا نہ پڑھے۔

۵۔ شاگرد کو اختیار ہے جتنا سبق وہ مناسب سمجھے لے۔

۶۔ تلفظات میں شاگرد کو مجبور نہ کیا جائے۔

۷۔ سبق یاد کرنے یا نہ کرنے پر زیادتی نہ کی جائے۔

۸۔ ہر جمعہ اور اتوار کو چھٹی دی جائے۔

۹۔ جس دن دفتر میں تعطیل ہو پڑھائی موقوف۔

۱۰۔ استاد کی مناسب یا نامناسب زیادتی پر شاگرد کو تعلیم چھوڑ دینے کا اختیار ہے۔

صلحنامہ فریقین کے دستخطوں سے مزین ہو کر مکمل ہوگیا اور پھر باقاعدہ تعلیم جاری ہو گئی۔ کچھ دنوں تک یہ سلسلہ درس و تدریس چلتا رہا مگر ایک روز جب خانم کو ایک ہی سبق لیتے ہوئے کامل ایک ہفتہ ہوگیا اور کبھی اس کے سنانے کی باری ہی نہیں آئی تو میرے دست برق وش نے ان کی مزاج پرسی کر دی۔ بس پھر کیا تھا —— شام کی چائے صلحنامہ کی دفعہ ۱۰ کی بموجب الف کی کتاب سے بنائی جارہی تھی۔

آصف بریلوی

تمہیں مری ہی [illegible] یارب

[illegible] بادل [illegible]

[illegible] سے گل شگفتہ

[illegible] بلبل [illegible]

روداد محبّت

حضرت روشؔ صدیقی

وصالِ شاہدِ معنی کی صورت ہوتی جاتی ہے
محبّت خود ہی مقصودِ محبّت ہوتی جاتی ہے

وہ اک تسکین جو اک چارہ سازِ دردِ الفت تھی
وہ تسکین بھی شریکِ دردِ الفت ہوتی جاتی ہے

خموشی سے بھی بارِ ترجمانی اٹھ نہیں سکتا
بہت غمناک روادِ محبّت ہوتی جاتی ہے

یہ کیا معلوم ہے ان زندگی پر مرنے والوں کو
کہ آخر کیوں مجھے جینے سے نفرت ہوتی جاتی ہے

ہر اک افتادگی ہے دستگیرِ عشق کی رحمت
ہر اک لغزش پہ معراجِ محبّت ہوتی جاتی ہے

دلِ بے آرزو ہے اور حریمِ حسن بے پردا
لطافت خلوتِ آرائے لطافت ہوتی جاتی ہے

نقوشِ حسرتِ وصل و جدائی مٹتے جاتے ہیں
کہ ہر تصویر تصویرِ محبّت ہوتی جاتی ہے

روشؔ اب ہم ہیں اور رازونیازِ سوزِ محرومی
بہت محبوب شمعِ شامِ فرقت ہوتی جاتی ہے

ہندوستان کا لرزہ خیز افلاس[1]

ایک بلند پایہ تحقیقی معیشی مقالہ

از:- (جناب عبدالرحیم شبلی - بی کام)

میں اپنی اس تحقیق و تدقیق کو اپنی بے بضاعتی کے نام معنون کرتا ہوں - کاش سرمایہ داروں "میں" مزدوروں "کے متعلق جذبۂ رافت پیدا ہو سکتا -!!

(شبلی بی کام)

حکومت اور عوام دونوں اس فیصلہ پر مجتمع ہیں - کہ ہندوستان ایک نادار اور مفلس ملک ہے - لیکن چونکہ "مفلسی" اور "امارت" اضافی مصطلحات ہیں اور ان کو جانچنے کے لئے مختلف ممالک کے لئے مختلف اصول برتنا پڑتے ہیں - اس لئے یہ معلوم کرنا کہ کن وجوہ کی بنا پر اور کن پہلوؤں کے لحاظ سے ہمارا ملک دوسرے ممالک کی نسبت نادار و قلاش ہے - ایک نہایت ہی پیچیدہ اور تحقیق طلب مسئلہ ہے -

(اعداد و شمار کا فقدان)

بالعموم کسی ملک کی "بے زری" یا "امارت" کو پرکھنے کے لئے ہمارے پاس تین ذرائع ہیں:-

(۱) اس ملک کے انکم ٹیکس کے اعداد و شمار اکٹھا کئے جائیں - اگر حیثیتی ٹیکس دینے والے زیادہ ہوں تو وہ ملک امیر ہوگا - ورنہ غریب

(۲) پیشوں کے لحاظ سے اعداد و شمار جمع کئے جائیں اور دیکھا جائے کہ کون سے پیشے ملک کی امارت یا فلاکت کے ذمہ دار ہیں

(۳) ملک کی مجموعی پیداوار کا مقابلہ آبادی سے کیا جائے - اور دیکھا جائے کہ وہ اس کے لئے کافی ہے یا نہیں -

لیکن شومئی قسمت سے ہندوستان میں ایسے اعداد و شمار کے فراہم کرنے کا تا حال کوئی منظم طریق مروج نہیں ہوا جو اعداد و شمار حکومت کی طرف سے پیش کئے جاتے ہیں وہ بالکل ناقص اور ملک کی

نوٹ:- دو سال ہوئے اسی موضوع پر میرا ایک مضمون رسالہ "کلیم" دہلی میں شائع ہوا تھا - لیکن اب میں نے نئے سرے سے تحقیقات کر کے اس میں بہت کچھ ردو بدل کیا ہے - علی الخصوص باؤلے رابرٹسن کی رپورٹ جو اس وقت میسر نہ آسکی تھی اس کا خلاصہ اس میں شامل کر دیا ہے اعداد و شمار بھی تازہ ہیں ؛

[1] اس مضمون کی تیاری کے لئے میں نے مندرجہ ذیل کتب اور مصنفین کے خیالات سے استفادہ کیا ہے :-

(۱) "رپورٹ مجلس تحقیقات معاشیات ہند"
(۲) "ہندوستان کے اعداد و شمار کے لئے ایک سکیم"
(۳) "غربت اور ہندوستان میں برطانوی راج" دادا بھائی نیروجی
(۴) "دولت اور قوت محصول دہندگی" شاہ او کھمباٹا
(۵) "معاشیات ہند" جتھار دبیری
(۶) "مالیات عامہ" فنڈلے شیراز
(۷) "افلاس اور ہندوستان کے متعلقہ مسائل" (")
(۸) "ہندوستان کی دولت" وادیا و جوسی
(۹) "گزشتہ پچاس برس میں ہندوستانی نظام حکومت کے نتائج"

طرف سے پیش کئے جاتے ہیں وہ بالکل ناقص اور ملک کی اقتصادی حالت کا اندازہ کرنے کے لئے قطعی ناکافی ہوتے ہیں۔ مثلاً انکم ٹیکس کے اعداد و شمار صرف ان لوگوں تک محدود ہوتے ہیں۔ جنکی سالانہ آمدنی دو ہزار روپیہ یا اس سے زائد ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ ہندوستان میں صرف معدودے چند ہیں۔ اور لاکھوں باشندے ایسے باقی رہ جاتے ہیں جنکی آمدنی پچاس روپے سالانہ بھی نہیں ہوتی۔

اسی طرح ہندوستان میں ہزارہا چھوٹے چھوٹے پیشے ہیں جن کے متعلق کوئی اعداد و شمار ہمارے پاس موجود نہیں۔ پیداوار کے لحاظ سے زراعت اور کان کنی کے متعلق اعداد و شمار قدرے مکمل ہیں۔ لیکن گھریلو مصنوعات اور چھوٹے چھوٹے پیشوں کی مجموعی آمدنی اور بافت وغیرہ کے متعلق کوئی اعداد و شمار جمع نہیں کئے جاتے اور نہ ایسا کرنا ممکن ہے۔ کیونکہ ہندوستان کے باشندے ابھی تہذیب کی اُس منزل تک نہیں پہونچے۔ کہ وہ صحیح صحیح تفصیلات کا علم اپنی گورنمنٹ کو پہونچا سکیں۔ مثلاً اگر آپ کسی زمیندار سے اُس کی صحیح آمدنی یا پیداوار کے متعلق معلومات حاصل کرنا چاہیں تو وہ ازدیادِ محصول کے خوف سے اپنی اصل پوزیشن واضح نہیں کرے گا۔

بس ہمارے پاس کوئی ایسے سائنٹیفک اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کے ذریعہ سے ہم ہندوستان کی اقتصادی حالت کا صحیح اندازہ لگا سکیں تاہم مختلف زمانوں میں مختلف مفکرین نے اپنی توجہ اس طرف مبذول کی ہے۔ اور انہوں نے اپنی اپنی تحقیقات کے مطابق مختلف اندازے لگائے ہیں جن کا خلاصہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

(دادا بھائی نیروجی کی تحقیقات)

سب سے پہلی تحقیقات سنہ ۱۸۶۷-۷۰ء میں مسٹر دادا بھائی نیروجی نے کی جو اُنکی کتاب موسومہ "غربت اور ہندوستان میں برطانوی راج"۔ پر مشتمل ہے۔

دادا بھائی نے جس اصول پر اپنی تحقیقات مرتب کی۔ وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:-

"میں نے ہر صوبہ کی ایک دو نمائندہ پیداواریں منتخب کی ہیں۔ پھر ہر ضلع کا کل زیرِ کاشت رقبہ فی ایکڑ پیداوار اور اس کی قیمت کا اندازہ لے کر سادہ ضرب اور جمع کی مدد سے کل پیداوار اور اس کی قیمت کا اندازہ لے کر سادہ ضرب اور جمع کی مدد سے کل پیداوار اور اُسکی قیمت دریافت کی ہے"۔ (صفحہ ۳۱)

اِس طریق سے اُن کا اندازہ ہے کہ کل زرعی پیداوار کی قیمت ستائیس کروڑ ستر لاکھ پونڈ ہوتی ہے۔ جس میں سے اگر چھ فیصدی بیجوں وغیرہ کی قیمت نکال دی جائے۔ تو بالمقطع پیداوار کی مجموعی قیمت چھبیس کروڑ پونڈ رہ جاتی ہے۔ جو ایک اوسط درجہ کے موسم میں۔ ایک سال کے لئے ہمارے پاس انسانی خوراک کیلئے موجود ہے"۔ پھر اگر اس میں ایک کروڑ ستر لاکھ پونڈ نمک۔ افیون کوئلہ اور تجارتی منافع کے ایک کروڑ پچاس لاکھ پونڈ مصنوعات کی قیمت کے اتنے ہی پونڈ کا دودھ۔ گوشت۔ مچھلی اور حیواناتی پیداوار اور تین کروڑ اتفاقیہ پیداوار کے جمع کر لئے جائیں تو یہ کل آمدنی جسکو "اجتماعی آمدنی" کہتے ہیں۔

چھتیس کروڑ پونڈ سے زیادہ نہیں بنتی۔ اگر ہم اس رقم کو ستر کروڑ باشندوں کی آبادی پر (جو دادا بھائی کے زمانہ میں تھی) تقسیم کریں تو فی کس چالیس شلنگ۔ یا بیس روپے سالانہ حصہ میں آتے ہیں۔

یہ بیس روپے بھی مسٹر دادا بھائی کا خیال ہے کہ تمام باشندگانِ ہند پر مساوی طور پر تقسیم نہیں ہوتے۔ کسی کو زیادہ حصہ ملتا ہے اور کسی کو کم۔ غرضیکہ فی کس آمدنی اسقدر قلیل ہے کہ ہندوستان کے لوگ اپنی ابتدائی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتے کجا یہ کہ وہ آسودگی یا التعیش کا خیال ہی کریں۔

بعض لوگوں نے اس نتیجے کے خلاف یہ اعتراض کیا ہے کہ ہندوستان کے لوگ چونکہ زندہ موجود ہیں۔ اس لئے اُن کی مطلق احتیاجات ضرور پوری ہو جاتی ہونگی۔

لیکن دادا بھائی نے اس اعتراض کا یوں جواب دیا ہے کہ جب لوگوں کی سالانہ آمدنی سارے سال کی ضروریات کیلئے

ملتفی نہیں ہوتی تو وہ ملک کی اساسی دولت کے ذریعہ اپنی ضروریات پوری کرتے ہیں۔ اس سے ملک روز بروز قلاش ہو رہے اور اہلیت کارکردگی بھی کم سے کمتر ہو رہی ہے۔

مطلب یہ کہ چونکہ ہندوستان کے لوگ زیادہ تر زراعت پیشہ ہیں۔ اس لئے جب ان کی ضروریات پوری نہیں ہوتیں تو وہ اپنی اراضیات غیر زرعی مقاصد کے لئے بیچنا شروع کر دیتے ہیں۔ جو بہرحال قومی نقصان ہے اور پیداوار کے لئے ضرر رساں۔

پھر دیہاتی مقروضات کی بھی بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگوں کی آمدنی اُن کی ضروریات کے لئے مکتفی نہیں ہوتی۔

بیرنگ و باربر کا اندازہ

سنہ ۱۸۸۲ء میں ارل کرومر (اس وقت میجر اولین بیرنگ) اور سر (اس وقت مسٹر) ڈیوڈ باربر نے ہندوستان کی فی کس آمدنی کے متعلق جو تحقیقات کی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک ہندوستان کی زرعی آمدنی تین ارب پچاس کروڑ روپیہ اور غیر زرعی آمدنی ایک ارب پچھتر کروڑ روپیہ تھی۔ گویا ہندوستان کی کل قومی آمدنی پانچ ارب پچیس کروڑ روپیہ ہوئی جو اگر اس وقت کی انیس کروڑ چھیالیس لاکھ اکتالیس ہزار لوگوں کی آبادی پر تقسیم کر دی جائے تو فی کس آمدنی ستائیس روپیہ ہوتی ہے

(ڈگبی اور لارڈ کرزن)

ڈگبی کے تخمینہ کے مطابق سنہ ۱۸۹۸-۹۹ء میں ہندوستان کی زرعی آمدنی دو ارب بیاسی کروڑ روپیہ تھی۔ اور غیر زرعی آمدنی ایک ارب تینتالیس کروڑ روپیہ۔ گویا کل آمدنی چار ارب اکتالیس کروڑ روپیہ تھی۔ جو اگر سنہ ۱۹۰۱ء کی تینتیس کروڑ آبادی پر تقسیم کر دی جائے تو فی کس آمدنی قریباً اٹھارہ روپیہ آٹھ آنے ہوتی ہے۔

لارڈ کرزن نے جو اس وقت وائسرائے ہند تھا۔ ان تمام بیانات کی تردید اس علیحدہ تحقیقاتی کمیشن کے ذریعہ کرنا چاہی جو سنہ ۱۸۹۸ء میں قحط کی تحقیقات کے لئے مقرر کیا گیا تھا۔

اس نے ثابت کیا کہ ہندوستان کی زرعی آمدنی چار ارب اسی کروڑ روپیہ سالانہ سے کم نہیں ہے۔ اس لئے سنہ ۱۹۰۱ء میں فی کس آمدنی بیس روپیہ سالانہ ہونا چاہئے جو سنہ ۱۸۸۰ء سے بقدر دو روپیہ کے زیادہ ہے۔ اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ غیر زرعی آمدنی بھی اسی نسبت سے بڑھی ہے تو سنہ ۱۹۰۱ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی تیس روپیہ ہونا چاہئے۔ جو سنہ ۱۸۸۰ء کے مقابلہ میں بقدر تین روپیہ زیادہ ہے۔ لارڈ کرزن نے لکھا ہے کہ اگرچہ یہ ترقی کوئی قابلِ ستائش نہیں تاہم ترقی روزافزوں ہے معکوس نہیں۔

ڈگبی نے اس کا جواب پھر ایک نئی تحقیقات کی بناء پر دیا۔ جس کی رُو سے ہندوستان کی فی کس آمدنی سترہ روپیہ چار آنہ ہوتی تھی۔ اور کہا کہ لارڈ کرزن نے خوش خیالی کا پہلو اختیار کیا ہے۔

فروری سنہ ۱۹۲۱ء میں آنریبل ای۔ ایم۔ کک نے کونسل آف اسٹیٹ میں یہ بیان دیا کہ اگر ہم سنہ ۱۸۸۲ء اور سنہ ۱۹۰۱ء کی تحقیقات کو صحیح تسلیم کر لیں تو سنہ ۱۹۱۱ء میں فی کس آمدنی پچاس روپیہ تک بڑھ گئی تھی۔ لیکن اگر زیادہ سائنٹیفک طریق اختیار کیا جائے تو آمدنی اسی روپیہ سالانہ ہوتی ہے۔ (منقول از پلے)

(وادیا اور جوشی کا تخمینہ)

اس کے بعد سنہ ۱۹۱۳-۱۴ء میں وادیا اور جوشی کی تحقیقات آتی ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے :-

زرعی پیداوار	۸,۵۸,۳۹,۹۴,۲۶
کان کنی	۱۱,۵۲,۷۶,۰۰۰
متفرق پیداوار اور دستکاروں کی آمدنی	۱,۵۴,۳۹,۵۸,۷۵۰
حیوانانی پیداوار	۱,۴۵,۱۰,۳۴,۶۳۴
مصنوعات	۴۰,۹۵,۳۲,۰۰۰
کُل	۱,۲۱,۰۲,۷۹,۷۰,۱۰

اس بارہ ارب دس کروڑ کی آمدنی سے وہ اس رقم کو منہا کر دیتے ہیں جو ہمیں بطور "اخراجات غیر ملکی"

(از قسم پنشن یافتہ افسروں کی تنخواہیں۔ غیر ملکی سرمایہ پر سود

مغل فن مصوری کا ایک شاہکار

رقص

اخراجاتِ انڈیا آفس وغیرہ) ہر سال انگلستان بھیجنا پڑتے ہیں۔ اگر یہ رقم ۱۴-۱۹۱۳ء میں بارہ کروڑ بھی فرض کر لی جائے تو ہماری مطلق آمدنی دس ارب ستاسی کروڑ روپیہ رہ جاتی ہے۔ اگر اس آمدنی کا اوسط فی کس نکالا جائے تو چالیس روپیہ پانچ آنہ چھ پائی ہوتی ہے۔

کے۔ ٹی شاہ کی تحقیقات

اسی طرح مسٹر کے۔ ٹی۔ شاہ اور کھمباتا کے اندازے میں جو سنہ ۱۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۲۲ء تک اپنی تحقیقات کا خلاصہ یوں بیان کرتے ہیں۔

سنہ ۱۹۰۰ء سے لے کر سنہ ۱۹۱۴ء تک فی کس آمدنی = ۳۶ روپیہ
سنہ ۱۹۱۴ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۲ء تک فی کس آمدنی = ۵۸½ روپیہ
سنہ ۱۹۰۰ء سے لیکر سنہ ۱۹۲۲ء تک 〃 〃 = ۴۴½ روپیہ
سنہ ۱۹۲۱ء اور سنہ ۱۹۲۲ء میں 〃 〃 = ۷۴ 〃

اس آمدنی سے مصنفین نے بطور "اخراجاتِ غیر ملکی" وغیرہ بہت سی رقم منہا کی ہے اور اُن کا اندازہ ہے کہ یہ رقم سات روپیہ فی کس ہوتی ہے۔ اس لئے سنہ ۲۲-۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی سڑسٹھ (۶۷) روپیہ تھی۔

فنڈ ے شیراز کے اعداد و شمار

سب سے تازہ اندازہ فنڈے شیراز کا ہے جس نے سنہ ۱۹۲۱ء میں ہندوستان کی فی کس آمدنی ۱۰۷ روپیہ اور سنہ ۱۹۲۲ء میں ۱۱۶ روپیہ قرار دی تھی۔ مسٹر شیراز نے اپنے تخمینہ میں غیر زرعی آمدنی کے بیجوں وغیرہ کی قیمت منہا کئے بغیر درج کی ہے جو گزشتہ تحقیقاتوں سے مختلف طریقہ ہے۔ دوسرے اُس نے کئی نئے پیشے غیر زرعی آمدنی میں شامل کر لئے ہیں۔ اس لئے اُسی کا اندازہ غیر معمولی طور پر زیادہ ہے۔

اپنی ایک تازہ کتاب "افلاس اور ہندوستان کے متعلقہ مسائل" میں وہ بعد کے دس سال کے اعداد و شمار حسب ذیل دیتا ہے۔

سال	فی کس آمدنی	سال	فی کس آمدنی
۱۹۲۳	۱۱۷	۱۹۲۸	۱۰۶
۱۹۲۴	۱۲۶	۱۹۲۹	۱۰۹
۱۹۲۵	۱۱۴	۱۹۳۰	۸۴
۱۹۲۶	۱۰۸	۱۹۳۱	۶۳
۱۹۲۷	۱۰۸	۱۹۳۲	۵۸

اسی بنا پر موجودہ کساد بازاری کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی فی کس آمدنی ۵۵ روپے ہے۔

(خلاصہ بیانات)

اب میں قارئین کی سہولت کے لئے تمام تحقیقات کا خلاصہ درج کئے دیتا ہوں۔ تاکہ بیک نظر جانچا جا سکے کہ مختلف زمانوں میں مختلف مفکرین نے کیا اندازے لگائے ہیں۔

اندازہ کنندگان	سن عیسوی	آمدنی فی کس
دادا بھائی نیروجی	۱۸۷۰	بیس روپے
بیرنگ و باربر	۱۸۸۲	ستائیس روپے
ڈگبی	۹۹-۱۸۹۸	اٹھارہ روپے نو آنے
لارڈ کرزن	۰۱-۱۹۰۰	تیس روپے
واڈیا و جوشی	۱۴-۱۹۱۳	چالیس روپے پانچ آنہ چھ پائی
شاہ و کھمباتا	۲۲-۱۹۲۱	سڑسٹھ روپے
فنڈے شیراز	۱۹۲۱	ایک سو سات روپے
〃	۱۹۲۴	ایک سو چھبیس روپے
〃	۱۹۳۲	اٹھاون روپے

(آخری فیصلہ کے لئے احتیاط)

ان مختلف اندازوں سے ملک کی معاشی حالت کے متعلق فیصلہ کرنے کے لئے بہت ہی احتیاطوں کی ضرورت ہے ورنہ بہت ممکن ہے کہ اندازہ غلط ہو جائے۔

(۱) سب سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ اندازے مختلف زمانوں اور مختلف تاریخوں کے ہیں اس لئے اس عرصہ کی قیمتوں کا فرق معلوم کرنا بھی اشد ضروری ہے۔

مثلاً یہ کہنا سخت غلطی ہوگی کہ ۱۸۷۰ء کے لوگ ۱۹۲۲ء کے لوگوں سے غریب تھے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں اشیاء کا بھاؤ بھی اِس زمانہ سے اسّی فیصدی کم تھا۔

(۲) ہر محقق نے اپنی تحقیقات کے لئے مختلف طریقے اختیار کئے ہیں۔ مثلاً کسی نے برطانوی ہند کا رقبہ ملحوظِ خاطر رکھا ہے اور کسی نے ہندوستانی ریاستیں بھی شامل کرلی ہیں۔ کسی نے غیر زرعی آمدنی سے بیجوں وغیرہ کی قیمت منہا کی ہے اور کسی نے نہیں کی ہے پھر کسی نے غیر زرعی پیشوں میں ادنےٰ ملازمین کو شامل کیا ہے اور کسی نے نہیں کیا ہے پس ہمیں صحیح اندازہ کرنے کے لئے اِن تمام باتوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔

(۳) اگر ہمیں فی کس آمدنی معلوم بھی ہو جائے تو ہم ملک کی خوشحالی یا پستی کے متعلق کوئی آخری فیصلہ نہیں کرسکتے۔ کیونکہ علی الخصوص ہندوستان کے بارہ میں ہمیں یہ بھی دیکھنا ہوگا کہ فی کس آمدنی کے جزئیات کیا ہیں۔ اور ان میں اغذیہ کا حصہ کتنا ہے۔

(۴) پھر ان تحقیقات کے متعلق یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ ہر شخص کے تعصبات اور خاص مقاصد ہوتے ہیں۔ جن کو لے کر وہ تحقیقات کرتا ہے۔ اور بقول ایک ماہر اعداد و شمار "ہندسوں سے برا بھلا سب کچھ ثابت کیا جاسکتا ہے"۔ مثلاً اگر اُس وقت تحقیقات کی جائے جب قیمتیں گر رہی ہوں تو قدرتی طور پر ملک کی زبوں حالی ثابت کی جاسکتی ہے۔ اسی طرح اگر تحقیقات چڑھتے ہوئے بھاؤ کے زمانہ میں کی جائے تو ملک کو غیر معمولی طور پر خوشحال ثابت کیا جاسکتا ہے

(غیر مساوی تقسیم دولت)

باوجودیکہ یہ سب تخمینے مختلف ہیں۔ لیکن ایک بات جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا وہ یہ ہے کہ ہندوستان کے اکثر لوگ ضروریاتِ زندگی پورا کرنے سے بھی قاصر ہیں۔ اگر ہم فنڈلے شیراز کا سب سے بڑا اندازہ لے لیں تو بھی فی کس آمدنی ساڑھے پانچ آنہ کے قریب روزانہ بنتی ہے۔ جس میں سے ایک اوسط درجہ کے آدمی کو نہ صرف اپنی ضروریاتِ زندگی پوری کرنا ہوتی ہیں بلکہ اپنے بیوی بچوں اور دیگر متعلقین کا پیٹ بھی پالنا ہوتا ہے۔ پھر اسی میں سے کپڑے بنوانا ہوتے ہیں۔ اور مکان پر بھی خرچ کرنا ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ پانچ چھ آنے روزانہ بھی ہر ایک کو نہیں ملتے۔ بڑے بڑے زمینداروں اور تاجروں کے حصہ میں شاید چھ سات آنے روزانہ آجاتے ہوں گے۔ لیکن ایک معمولی مزدور تین آنے روزانہ سے زائد بمشکل کماتا ہے۔ چنانچہ شاہ اور کھمباتا نے اندازہ لگایا ہے کہ ہندوستان میں دولت از حد غیر منصفانہ طریق پر منقسم ہے۔ اُنکی تحقیقات کے مطابق اعداد و شمار کا ملخص مندرجہ ذیل ہے۔

چھ ہزار باشندے جنکی سالانہ اوسط آمدنی ایک لاکھ روپیہ فی کس ہے۔ صرف تیس ہزار آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

دو لاکھ ستر ہزار باشندے جنکی سالانہ آمدنی پانچ ہزار روپیہ فی کس ہے۔ تیرہ لاکھ پچاس ہزار آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

پچیس لاکھ باشندے جنکی سالانہ آمدنی صرف ایک ہزار روپیہ فی کس ہے۔ ایک کروڑ پچیس لاکھ آدمیوں کا پیٹ پالتے ہیں۔

باقی باشندے جنکی فی کس آمدنی پچاس روپیہ سالانہ سے زیادہ نہیں بقیہ تمام آبادی کا پیٹ پالتے ہیں۔

دوسرے معنوں میں جتنی جتنی فی کس آمدنی ہوتی چلی جاتی ہے۔ متوسلین اور متعلقین کی تعداد اُتنی ہی زیادہ ہوتی چلی جاتی ہے پھر یہ آمدنی بھی مساوی طور پر ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ ملکی دولت کا قریبًا ایک تہائی حصہ صرف ایک فیصدی حصہ آبادی استعمال کرتا ہے۔ یا اگر اُن کے متوسلین کو بھی شامل کرلیا جائے تو زیادہ سے زیادہ صرف پانچ فیصدی حصہ آبادی ایک تہائی حصہ دولت کو اپنے استعمال میں لاتا ہے۔ اور دوسرا تہائی حصہ آبادی کے پینتیس فیصدی لوگوں کے درمیان تقسیم ہوتا ہے۔ دولت کی بقیہ تہائی آبادی کے ساٹھ فیصدی لوگ استعمال کرتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں آبادی کا قریبًا ⅔ حصہ ہندوستان میں

"ملعون" ہے اور صرف ایک تہائی حصہ "متقی" !!

(بین الاقوامی موازنہ)

اگر ہم ہندوستان کی فی کس آمدنی کا مقابلہ دیگر ممالک کی آمدنی سے کریں تو ہماری ناامیدی اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ لیکن ایسا کرنے میں ہمیں بہت سی باتوں کو ملحوظِ خاطر رکھنا ضروری ہے۔ مثلاً مختلف ممالک کی قیمتوں اور معیارِ زندگی میں فرق ہے جن کا مقابلے کے وقت خیال رکھنا چاہئے۔ اگر ہندوستان کی فی کس آمدنی انگلستان سے کم ہے تو یہ بھی سمجھ لینا ضروری ہے کہ ہندوستانیوں کا معیارِ زندگی بہت پست ہے۔ اس لئے اُسی آمدنی میں اُن کے اخراجات پورے ہو سکتے ہیں۔

مگر ان سب باتوں کا خیال رکھتے ہوئے اگر ہم مختلف ممالک کی فی کس آمدنیوں کا موازنہ کریں تو ہمیں معلوم ہوگا۔ کہ ہندوستان اس معاملے میں سب سے زیادہ بدقسمت ملک ہے[1]

ملک	سال	آمدنی فی کس پونڈوں میں
برطانوی ہند	۱۹۳۱	۵
برطانیہ عظمیٰ	۱۹۳۱	۷۶
آسٹریلیا	۱۹۲۴	۹۸
امریکہ متحدہ	۱۹۳۲	۸۹
فرانس	۱۹۲۸	۴۱
زیکوسلوواکیا	۱۹۲۵	۳۵
ڈنمارک	۱۹۲۷	۵۵
جرمنی	۱۹۲۵	۳۹
اطالیہ	۱۹۲۷	۲۴
مصر	۱۹۲۸	۲۱
جاپان	۱۹۲۵	۱۴
بلگیریا	۱۹۳۲	۹
روس	۱۹۲۵	۱۰

اِس نقشہ سے ظاہر ہے کہ بڑے بڑے ملک تو کجا ہندوستان ابھی بلگیریا۔ جاپان اور مصر وغیرہ سے بھی آمدنی کے لحاظ سے کوسوں دور ہے۔

(کیا افلاس دُور ہو رہا ہے؟)

بس اِن اعداد و شمار کی رُو سے ظاہر ہے کہ ہندوستان کے لوگ سب سے مفلس ہیں۔ لیکن اب سوال یہ ہے کہ آیا اُس کی یہ غربت نئے زمانہ کی ہے اور بڑھ رہی ہے۔ یا وہ ہمیشہ اسی طرح غریب چلا آرہا ہے؟ [illegible] اور [illegible] ماہرین کا خیال ہے کہ گذشتہ [illegible] اور ۱۹۱۷ء کے درمیان لوگوں کی حالت بالکل یکساں رہی ہے اور اس میں اضافہ نہیں ہوا۔ لیکن سرکاری بیان یہ ہے کہ اس عرصہ میں لوگوں کی معاشی حالت غیر معمولی طور پر روز افزوں رہی ہے۔ چنانچہ گزشتہ پچاس برس میں ہندوستانی نظامِ حکومت کے نتائج میں لکھا ہے۔

"جہانتک عام مشاہدہ سے معلوم ہو سکتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ ایک متوسط حال زمیندار۔ مزارع۔ تاجر یا صناع گزشتہ پچاس برس سے کہیں زیادہ خوشحال ہے۔ اُس کی نمک کی خوراک زیادہ ہو گئی ہے کھانڈ کی زیادہ ہو گئی ہے۔ تمباکو کی زیادہ ہو گئی ہے۔ اور در آمدہ تعیش اور آسائش کی چیزوں کو وہ اپنی پہلی پشت سے کہیں زیادہ استعمال کر رہا ہے۔ جن مقامات پر مختلف گھرانوں کے متعلق تحقیقات کی گئی ہے۔ وہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک اوسط درجہ کا دیہاتی اپنے آبا و اجداد کی نسبت زیادہ خوراک کھاتا ہے۔ اور ان سے بہتر گھر میں مکیں ہے۔ مٹی کے بدنما برتنوں کی جگہ پیتل۔ تانبے اور دیگر دھاتوں کے برتنوں نے لے لی ہے۔ اور اُس کے خاندان کے پاس پہلے سے زیادہ کپڑے اور پارچات ہیں"۔

اِس بیان کی صداقت کو کئی غیر سرکاری مفکرین نے اپنی دلائل کی رُو سے رد کیا ہے اور اُن کے نزدیک یہ بیان بعض جزئیات کے لحاظ سے بالکل غیر مصدقہ ہے۔ مثلاً اُن کا خیال ہے کہ یہ بات کہ ایک

[1] منقول از "افلاس اور ہندوستان کے متعلقہ مسائل" مصنفہ [illegible] تیسرا ایڈیشن صفحہ ۴۴

اُوسط درجہ کا دیہاتی اپنے آبا و اجداد سے زیادہ کھاتا ہے۔ بالکل صحت پر مبنی نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ مقدار کے لحاظ سے اشیأ زیادہ استعمال کرتا ہوگا۔ لیکن اس کی خوراک کا معیار تاحال وہی دیرینہ ہے۔ بلکہ بعض حالات میں بالکل گر چکا ہے۔ مثلاً پہلے وہ دودھ۔ مکھن اور گھی بکثرت استعمال کیا کرتا تھا۔ لیکن بحالت مجبوری اُس نے یہ اشیا فروخت کرنا شروع کر دی ہیں۔ اس کی صحت پر بُرا اثر پڑ رہا ہے ؛

(دیگر ممالک کا مقابلہ)

اگر ہم سرکاری بیان کو صحیح بھی تسلیم کر لیں تو بھی یہ مسئلہ قابلِ تصفیہ رہ جاتا ہے کہ آیا یہ ترقی دیگر ممالک کی حیرت انگیز خوشحالی سے مقابلہ کر سکتی ہے ؟

دوسرے ملکوں میں "افلاس" (جس سے ہماری مراد وہ افلاس ہے جو انسان کو خطرناک جرائم کا مرتکب ہونے کے لئے مجبور کرتا ہے) بہت حد تک دور ہو گیا ہے۔ غربت اور بیماری کی وجہ سے جو اموات ہوا کرتی ہیں۔ اُنکی شرح میں خاطر خواہ کمی واقع ہوگئی ہے۔ مزدوروں کے معاوضہ میں گرانقدر اضافہ ہو چکا ہے۔ اوقاتِ کار کم ہو گئے ہیں۔ تعلیم و تربیت کی اشاعت پہلے سے زیادہ ہے۔ تفریح کے سامان لوگوں کو زیادہ میسر ہیں۔ اور وہ پہلے سے بہتر گھروں میں مکین اور پُر فضا شہروں میں آباد ہیں۔ دوسرے الفاظ میں وہ صحیح طور پر زندگی کا لطف اُٹھا رہے ہیں۔

لیکن کیا ہندوستان میں ابھی اِن ترقیات کی بُو بھی آئی ہے ؟ حکومت نے اِن مسائل میں سے کسی کو بھی در خورِ اعتنا سمجھا ہے ؟ اور کیا وہ دل و جان سے لوگوں کی بہتری اور بہبودی کے لئے کوششیں عمل میں لا رہی ہے ؟

میں یہ نہیں کہتا کہ حکومت نے اس باب میں کچھ بھی نہیں کیا لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اُس کی کوششیں وہی نتیجہ پیدا کر رہی ہیں جو امریکہ میں روزولٹ کی۔ روس میں جوزف اسٹیلن کی۔ اطالیہ میں مسولینی کی۔ جرمنی میں ہٹلر کی۔ اور ترکیہ جمہوریہ میں مصطفیٰ کمال پاشا کی پیدا کر رہی ہیں ؟؟

(افلاس کی انتہا)

ہمارا سر ندامت سے جھک جاتا ہے۔ اور ہماری اُمید یکسر نا اُمیدی اور یاس سے بدل جاتی ہے۔ جب ہم اِن تمام سوالوں کا جواب صرف نفی میں پاتے ہیں۔

ہندوستان میں کتنے لوگ ایسے ہیں جن کو دو وقت کھانا برابر ملجاتا ہے ؟ کتنے ہیں جن کو محنت کم کرنا پڑتی ہے اور معاوضہ زیادہ ملجاتا ہے ؟ کتنے ہیں جن کو رفتارِ واقعات کا علم ہوتا رہتا ہے ؟ کتنے ہیں جو باصحت اور خوش و خرم زندگی بسر کر رہے ہیں ؟

قارئین شاید سنکر حیران ہوں گے کہ ہندوستان میں صرف بارہ فیصدی لوگ دونوں وقت کھانا کھاتے ہیں۔ باقی سب نانِ شبینہ کے بھی محتاج ہیں !!

صرف آٹھ فیصدی تعلیم یافتہ طبقہ ہے اور ان میں سے بھی اکثر الف۔ بے ہی جانتے ہیں۔ باقی سب جاہل اور علومِ جدیدہ سے بھی بے خبر ہیں۔

شرح اموات کا یہ حال ہے کہ دُنیا کے کسی حصہ میں اسقدر اموات نہیں ہوتیں جتنی کہ یہاں ہوتی ہیں۔

محنت و مزدوری کا معاوضہ شاید دُنیا بھر میں سب سے کم ہے رہائش کا یہ عالم ہے کہ ایک مفکر کے الفاظ میں "یہاں کے مکانوں میں ایک یورپین اپنے مویشی بھی رکھنا پسند نہیں کرے گا"

اِن باتوں کے باوجود کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی حالت پہلے سے بہتر ہو رہی ہے ؟

جس ملک میں آبادی خوراک کی نسبت زیادہ ترقی کر رہی ہو۔ جس ملک میں بیماریوں اور وباؤں کا یہ حال ہو کہ ایک مصنف کے الفاظ میں "لوگ کتوں اور مکھیوں کی طرح مرتے" ہوں۔ جس ملک کے لوگ اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے روزانہ محنت کرتے ہیں اور پھر اُن کی مزدوری چھ سات آنے سے زیادہ نہ بڑھتی ہو۔ کیا وہ ملک امیر ہے ؟ کیا وہ تمدن و عمرانیت کے لحاظ سے مہذب ممالک میں شمار

ہو سکتا ہے؟؟

اعداد و شمار کی فراہمی

ان تمام باتوں میں جو چیز زیادہ اندوہناک اور قابلِ تاسف ہے وہ یہ ہے کہ ہمارے پاس کوئی ایسے ٹھوس اعداد و شمار موجود نہیں ہیں جن کے سہارے پر ہم اپنے دعوے کی بنیاد رکھ سکیں۔

مختلف تحقیقاتوں اور اپنے مشاہدہ کی بنا پر جو ہم کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ ہندوستان ایک انتہا درجہ کا مفلس ملک ہے۔ اور اس کے ثبوت میں ہم اس کے منکرین کو صرف یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ "اپنی آنکھیں کھولو اور مشاہدہ کر لو" اعداد و شمار کا اس صاف اور بیّن بات کے ثبوت کے لئے پیش کرنا محض سورج کو چراغ دکھانا ہے۔

اسمیں شک نہیں کہ ہندوستان میں اعداد و شمار کا فراہم کرنا کوئی آسان امر نہیں۔ ایک تو ملک کی وسعت اس باب میں سخت حارج ہے۔ دوسرے آبادی زیادہ تر مختلف دیہاتوں میں پھیلی ہوئی ہے۔ اور ایک جگہ چند شہروں اور قصبوں میں موجود نہیں ہے۔ تیسرے لوگ اس قدر جاہل اور علومِ جدیدہ سے ناواقف ہیں کہ برطانیہ اور دیگر یورپی ممالک کی طرح یہاں تحریری سوالات سے کام نہیں بنتا۔ اُن ممالک میں تو یہ ہوتا ہے کہ تحریری سوالات مختلف اداروں اور لوگوں کو بھجوا دیئے جاتے ہیں جن کے جواب اُن کو فی الفور مہیا ہو جاتے ہیں۔ لیکن یہاں اس کام کی قدر و منزلت سمجھانے کے لئے بھی ایک عرصہ درکار ہے۔ چوتھے یہاں کے کاموں اور پیشوں میں کوئی تنظیم نہیں ہے جس کے ذریعہ سے ہم مختلف لوگوں کی معاشی حالت کا اندازہ لگا سکیں۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود "انڈین اکونامک کمیٹی رپورٹ" میں پروفیسر برنٹ ہرسٹ اور دیگر مفکرین کی طرف سے بعض ایسی مفید تجاویز کی گئی ہیں جن کو ہندوستان کے اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے لئے کافی حد تک زیرِ عمل لایا جا سکتا ہے۔ مثلاً کمیٹی کی اس باب میں سفارشات مندرجہ ذیل ہیں۔

(۱) ہر سال زراعتی پیداوار کے اعداد و شمار فراہم کئے جائیں اور اُن پر ایک دس سالہ تبصرہ کیا جائے۔

(۲) صنعتی پیداوار کی بھی ایک تفصیلی تفتیش ہر پانچ سال کے بعد کی جائے۔

(۳) تمام اعداد و شمار کا کام ایک مرکزی ادارہ کے سپرد کیا جائے تاکہ مقصد میں ہم رنگی اور یکسانیت پیدا ہو۔

(۴) ہر صوبہ میں ایک "صوبائی دائرہ اعداد و شمار" قائم کیا جائے جس کا تعلق ایک "مرکزی دائرہ اعداد و شمار" سے ہو۔ تاکہ سب دریافت کردہ حقائق ایک صدر مقام پر جمع ہوتے رہیں۔

(باؤلے رابرٹسن کی سفارشات)

نومبر ۱۹۳۳ء میں حکومت ہند نے پروفیسر باؤلے اور مسٹر رابرٹسن کو ہندوستان میں اعداد و شمار اکٹھا کرنے کے متعلق تجاویز پیش کرنے کے لئے مقرر کیا۔ ان دو ماہرین کو تین ہندوستانی معاشین نے بھی امداد دی اور اُن کی مشترکہ کوشش کے نتیجہ میں "ہندوستان کے اعداد و شمار کے متعلق ایک سکیم" کتاب مرتب ہوئی جو ۱۹۳۴ء میں شائع کی گئی۔

اس کتاب کے مصنفین نے سفارش کی کہ گورنر جنرل کی مجلس انتظامیہ کے ساتھ ایک معیشی سٹاف بھی مقرر کیا جائے جو چار ممبروں پر مشتمل ہو۔ ان میں سے سینئر ممبر کونسل کی مجلس معاشیات کے سکرٹری کا کام کرے۔ اور تمام اعداد و شمار کو منظم کر کے رپورٹ مرتب کرے۔ باقی تین ممبروں میں سے ایک ناظم اعداد و شمار اور دو ماہرین معاشیات ہوں۔

پھر مصنفین اس بات کو تسلیم کرتے ہوئے کہ "قومی آمدنی" کا اندازہ لگانے کے لئے موجودہ اعداد و شمار بالکل ناکافی ہیں اسی بات کی سفارش کرتے ہیں کہ تمام مسئلہ پر از سرِ نو غور و خوض کیا جائے۔

معیشی تفتیش کے لئے وہ کہتے ہیں دو طریق ہیں۔ ایک یہ کہ اموال و خدمات مالیت معلوم کی جائے اور دوسرے یہ کہ انفرادی آمدنیوں کا اندازہ لگایا جائے۔

سلے جتھار اینڈ بیری۔ "معاشیاتِ ہند" جلد دوم

اموال و خدمات میں مندرجہ ذیل باتیں شامل ہیں :۔

(۱) زراعت۔ کان کنی۔ صنعت وغیرہ کی پیداوار۔
(۲) درآمدہ مال۔
(۳) ملکی مال اور درآمد پر چنگیاں۔
(۴) ذاتی خدمات۔
(۵) رہائشی مکانات کی قیمت۔
(۶) کفالتیں اور ان کی قیمتوں میں اضافہ۔

ان میں سے برآمدہ مال اور اس کا محصول وغیرہ منہا کیا جانا چاہیئے۔

انفرادی آمدنیوں کے اندازہ لگانے میں مندرجہ ذیل احتیاطیں رکھنا لازمی ہیں۔

(۱) تمام وہ اجناس جو ذاتی استعمال میں آتی ہے آمدنی میں شامل کرنی چاہیئے۔
(۲) تمام سودی موجبات منہا کر لئے جائیں۔
(۳) ٹیکس اور مالیہ وغیرہ دینے سے پہلے کل آمدنی شمار کی جائے
(۴) محاصل برآمد۔ چنگیاں۔ محصول ٹکٹ وغیرہ یعنی تجارتی اخراجات کل میزان میں شامل کر لینا چاہئیں۔

علاوہ ازیں مصنفین نے سفارش کی کہ دیہاتی اور شہری آمدنیوں کو علیحدہ علیحدہ شمار کیا جائے۔ اس کے لئے دیہاتوں اور شہروں کی مفصل تفتیش ہونا چاہیئے۔

(افلاس کے اسباب)

ہندوستان کے افلاس کا مسئلہ نہایت پیچیدہ اور ادق ہے اس لئے اس کی وجوہات بھی اس قدر پیچیدہ ہیں کہ ہم اس کا تجزیہ نہیں کرسکتے۔ تاہم موٹی موٹی وجوہات کا تذکرہ ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) مذہبی اور معاشرتی رسومات جنکی وجہ سے لوگوں کا نظریہ مادی ترقی کی طرف نہ تمام ہو گیا ہے۔ مثلاً ترکِ دنیا اور ترکِ لذات کے مسائل لوگوں کو دنیا سے بے پرواہ کر دینے کے ذمہ دار ہیں۔ اور وہ عاقبت کے سہانے خوابوں کے تصور میں اس قدر مستغرق ہیں کہ ان کو دنیاوی خوشحالی کی کوئی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ پھر معاشرتی رسومات ہیں۔ مثلاً صغری سنی کی شادی۔ مروجہ پردہ (جو میرے نزدیک حجاب اور شرم سے بالکل مختلف) ذات پات قوانین وراثت۔ اشتراک خاندانی۔ غیرہ جو سوسائٹی کی بیخ کنی کر رہی ہیں۔

(۲) ہندوستان کے جملہ اقتصادی شعبہ جات مثلاً زراعت۔ صنعت۔ حفظانِ صحت۔ مالیات بنکنگ وغیرہ سب غیر ترقی یافتہ ہیں۔ اس لئے دولت آفرینی آبادی کی نسبت کم ہے جسکی وجہ سے تقسیم دولت بھی غیر مساوی ہے۔ اور ہندوستان کے لوگ غریب ہیں۔

(۳) حکومت کا نقطۂ نظر ہندوستان کی طرف کوئی ہمدردانہ معلوم نہیں ہوتا جس کی وجہ سے ملک ابھی اس جادۂ ترقی پر گامزن نہیں ہوسکا جس پر کہ دیگر ممالک مثلاً روس۔ امریکہ اور جاپان وغیرہ ہیں۔ ہندوستان کو ہر سال کروڑوں روپیہ صرف پنشن یافتہ افسروں اور وائٹ ہال کی جیبوں کو گرم کرنے کے لئے بھیجنا پڑتا ہے جو اگر محض ملک کے اندر صرف ہو تو ہماری دولت میں گرانقدر اضافہ ہوسکتا ہے

(۴) ہندوستان کا طریقۂ تعلیم نہایت ناقص ہے۔ اور ایک گریجویٹ جب اپنی یونیورسٹی سے نکلتا ہے تو بقول پروفیسر کیور جس طرح مغرب میں ایک نوجوان لڑکی کو شادی کی درخواست کے وقت معلوم نہیں ہوتا کہ وہ "ہاں" کرے یا "نہ" اسی طرح وہ بھی اپنے مستقبل کے متعلق کوئی قطعی فیصلہ کرنے سے عاجز ہوتا ہے۔

پس ملک سے افلاس اور بیکاری کی لعنت کو دور کرنے کیلئے ضروری ہے کہ ایک معاشی منصوبہ بنایا جائے جسکی رو سے قرار دیا جائے کہ ایک معینہ عرصہ میں ملک نے ایک معینہ ترقی کرنی ہے۔ روس نے اسی طرح کیا۔ اس نے پانچسالہ پروگرام بنائے اور وہ کامیاب ہوا۔ پس کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان میں بھی ایسے پروگرام بنائے جائیں اور ان کا اثر سریع اور خاطر خواہ نہ ہو۔

اب ہندوستان کے گیارہ صوبوں میں سے آٹھ صوبوں میں کانگریس نے وزارت پکڑ لی ہے۔ اور ایسی تجاویز زیر عمل ہو رہی ہے جن سے کافی حد تک امید ہو سکتی ہے کہ عنقریب ہندوستان کا افلاس جڑ سے اکھیڑ کر پھینکا جا سکے گا۔

نذرِ تباں حرم

ناظم الملک حضرت ابوالاقبال علامہ عیش فیروزپوری

قربان یہ ہوا تو وہ صدقے اُتر گئی　　ہمراہ دل کے دل کی تمنا بھی مر گئی
پلٹی اگر یہ بام سے تو سوئے در گئی　　ہر جا تری تلاش میں میری نظر گئی
دل میں سما سکے گا نہ اب غیر کا خیال　　جتنی جگہ تھی تیری محبت سے بھر گئی
یہ بے رخی بھی عہد محبت کے ساتھ ساتھ　　عادت ستمگری کی نہ اُو فتنہ گر گئی
حیرانیوں کا دل کی اثر کچھ نہ پوچھئے　　تصویر یار دیکھ کے تصویر اُتر گئی
بل اس کا بھی کسی طرح نکلا نہ آج تک　　قسمت ہماری یار کی تلوار پر گئی
کچھ پاس چاہئے تمھیں ایفائے عہد کا　　اس انتظار میں تو قیامت گزر گئی
اس حور وش کے سامنے تصویر کائنات　　نظروں سے گر گئی مرے دل سے اُتر گئی
بسمل کی طرح لوٹ رہی ہے سرِ فلک　　یہ برق بھی مرے دلِ بیتاب پر گئی
رخصت دمِ سحر وہ ہوئے جب تو ساتھ ساتھ　　ہمراہ دل کے دور تک اپنی نظر گئی
کیا پوچھتے ہو عہدِ گذشتہ کا ماجرا　　گذری ہے انتظار میں جتنی گذر گئی
اُٹھی گھٹا جو گیسوؤں والے کی یاد میں　　روتی ہوئی وہ سر سے ہمارے گذر گئی
اک دنیا عشق یار میں با حال زار ہے　　کچھ مٹ گئی کچھ اسکی اداؤں پہ مر گئی
ہے مختصر سی صحبتِ ساقی کی داستاں　　شیشے سے مے سے جام سے بیگانہ کر گئی
کس رات حسب وعدہ وہ آئے ہیں میرے گھر　　کس رات شام غم مرے دشمن کے گھر گئی
ہے مختصر یہ اُن کی محبت کا تذکرہ　　آباد کرنے آئی تھی برباد کر گئی
چمکا ہوا ہے نام جو فیروزپور کا　　اے عیش اپنی طبعِ رسا نام کر گئی

قطن کی آنکھ کا صدقہ

صحرائے عرب کا ایک رومان انگیز واقعہ

حضرت ابن حزیں بہاولپور

مسٹر سی برک کی Adventures in Arabia، ایک ایسی کتاب ہے جو میرے نزدیک اکثر انگریز مصنفین کی عرب کے متعلق کتابوں میں واقعات کی سچائی اور فیصلہ کی بے لوثی کے اعتبار سے ایک معتبر کتاب ہے۔ اگرچہ ماحول کی کلی غیر مطابقت کی وجہ سے ایک مغربی مصنف کا مشرقی تہذیب اور تمدن کے متعلق بعض اہم و غیر اہم لغزشیں کرنا ایک ضروری امر ہے۔ تاہم جہاں تک واقعات کا تعلق ہے اس میں کسی قسم کی کمی یا تعصب کی جھلک نہیں ہے۔

"For The eyes of Gutne" اس میں مصنف نے ایک ایسا واقعہ لکھا ہے جو محبت، کشمکش اور ناکامی کے لحاظ سے مختصر افسانہ کے مقابلہ میں کسی پہلو سے تشنۂ تکمیل نہیں ہے۔ میں نے اسے "عالمگیر کے خاص نمبر" کے لئے ترجمہ کیا ہے تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ بدوی عرب کی درشت اور بیابانہ زندگی میں بھی جہاں مذہب اور اخلاق کی دیواریں تمام دنیا سے زیادہ سخت اور کڑی ہیں۔ "محبت" بعض اوقات کیسے اہم انقلابات پیدا کر سکتی ہے۔

ابن حزیں

عرب کے تمام صحراؤں عموماً اور شام کی شمالی خشک پہاڑیوں میں خصوصاً کوئی پھول وغیرہ نہیں پیدا ہوتا۔ جب ایک خشک خزاں کے موسم میں سرتہ کا شیخ ابن الگنج وادی فرات میں لوٹ مار کر رہا تھا اس نے کپاس کا ایک لہلہاتا ہوا کھیت دیکھا جس کی تازگی نے اس کے سخت دل کو بہت متاثر کیا۔

دو سال بعد جب اس کی سب سے چھوٹی عورت کے بطن سے ایک لڑکی پیدا ہوئی تو اس نے کہا "ہم اس کا نام رکھیں گے "قطن" —— کپاس کا پھول۔

ایک نسل بعد کا ذکر ہے —— میں نے بنی سردیہ، بنی سخر اور بنی حسن کے قبائل سے لگا ہے بگاہے قطن کے واقعات مہینوں تک تھوڑے تھوڑے کر کے سُنے ہیں اور جن میں بہت سے انسان ایسے اب بھی زندہ ہیں جو قطن کے ساتھ گفتگو کر چکے ہیں اور جن کے باپ اور بھائی قطن کی نگاہوں کی خاطر قربان ہو چکے ہیں۔

جب اس کے بچپن کا حسن ایک شعلے کی صورت میں نمایاں ہوا تو اس نے تمام صحرا یا میرا کی مشرقی سمت سے لیکر بغداد کے باغوں تک خون آلود کر دیا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ کسی نے اس کا آج تک عکس نہیں اُتارا۔ بدو اس کے حسن کے بیان میں شاعرانہ زبان استعمال کرتے تھے۔ اس لئے صحیح شکل صاف طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ وہی پرانی تشبیہات، بادلوں کی کالی گھٹاؤں کی طرح۔ جب "القمر" چاند ریت کی گود میں چھپ لیتا ہے نگاہیں نخلستان میں تالابوں کی طرح۔ کمر ایک چھوٹے کھجور کے پیڑ کی طرح پاؤں غزال صحرائی کی طرح، ایسی تشبیہات جو کوئی خاص شکل پیش نہیں کرتیں۔ صرف ان آدمیوں کے چہروں سے جنھوں نے اس کے حسن کی تشریح میرے سامنے کرنے کی کوشش کی —— معمر بزرگ جن کی نگاہیں معجزانہ طریق پر اس عظیم یادگار سے روشن ہو جاتیں —— میں اس کے حسن کا اندازہ کر سکتا تھا۔

سردار عرب، امیر امین ارسلان —— دنیا کا ایک اہم شہری جو یورپ کے

تقریباً ہر دارالسلطنت میں خوبصورت عورتوں کو دیکھ چکا ہے جس نے دو مرتبہ قطن کو عمان میں دیکھا ہے، اس کے حُسن کی میرے سامنے تشریح کرنے کی کوشش کی اور بیروت کی فوجی او ربحری کلب میں چاء اور شراب پر نہایت فصیح اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا، مگر سوائے اس تعریف کے جو مجھے یاد ہے وہ مکمل طور پر کامیاب نہ ہوسکا۔ "میں نے آج تک ایسی جیسی عورت نہیں دیکھی۔ وہ اگرچہ ایک عورت تھی لیکن میں نے اس کے حُسن میں نزاکت یا آوارگی نہیں دیکھی اس کا حسن اندوہگیں اور تلوار کی دھار کی طرح تیز تھا۔ . . . ."

صحرا کی وسیع فضا میں جب شہسواران عرب اپنے سیاہ خیموں کے نیچے آگ کے اردگرد ایک دائرے کی صورت میں بیٹھتے ہیں تو وہ بدوی رباب پر قطن کے حسن کی تعریف میں نغمے الاپتے ہیں۔ لیکن قطن کے متعلق بہترین نغمہ قطن کا اپنا نغمہ ہے جو اس نے خود بنایا اور گایا۔ جب اس کا چھوٹا بھائی علی انزئی کے قبیلہ کے ہاتھوں قتل ہوا۔ صحرا کی ریت پر آرام کر رہا تھا — اور یہ وہی نغمہ ہے جس سے قطن کا افسانہ باقاعدہ طور پر شروع ہوتا ہے۔

جب میں بنی سخر کے قبیلہ میں ایک اجنبی کی طرح نہیں بلکہ شیخ متجبل کے دوست اور بھائی کی حیثیت سے اس کی چاء کی مجلسوں میں متواتر کئی راتوں تک بیٹھا کیا یہ تمام افسانہ آہستہ آہستہ میرے گوش گذار کیا گیا۔

قطن کا بوڑھا باپ شیخ ابن الکنج، جب قطن صرف تیرہ سال کی تھی اور جوانی کی ابتدائی رعنائیوں سے روشناس ہورہی تھی وفات پا گیا۔ اس کے دو بھائی اس سے بہت محبت کرتے تھے۔ علی جو اس سے ایک سال چھوٹا تھا۔ اور ھتاب کم سخن، غیر مستقل مزاج اور جوشیلا تیس برس کا آدمی تھا جو اپنے باپ کی وفات کے بعد اس کے جانشین کی حیثیت سے سردیہ کے شیخ کی صورت میں حکومت کرتا تھا۔

ایک رات جب ھتاب اپنے منتخب شدہ سواروں کی معیت میں اپنے خیموں سے بہت دور سفر کر رہا تھا۔ قبیلہ انزئی سردیہ کے خیموں پر حملہ آور ہوا اور علی اور ایک درجن جنگجوؤں کو قتل کرکے مشرق کی طرف غایب ہوگیا۔ سردیہ انتقام کے لئے بہت جلد تیاری کر لیتا لیکن ان کا شیخ ایک تہائی سے زیادہ شہسواروں کے ہمراہ موجود نہیں تھا۔ کیونکہ یہ ایک چھوٹا سا قبیلہ تھا۔ اور جو جنگجو باقی رہ گئے تھے وہ انزئی کے خلاف غم و غصہ کا اظہار کرتے ہوئے اپنے شیخ ھتاب کی آمد کے منتظر تھے۔

شہیدوں کی ماؤں، بہنوں اور بیویوں نے اپنے سب سے پرانے کپڑے پہن لئے اور بال کھلے چھوڑ کر اپنے چہروں پر اونٹ کے گوبر کی سیاہ راکھ ملی اور آہ وزاری کرتی ہوئی خیموں میں داخل ہوئیں۔ جب صبح اپنی رنگین کرنوں کے ساتھ سردیہ کے خیموں پر نمودار ہو رہی تھی عورتیں اپنے شہیدوں کے ماتم میں مصروف تھیں۔ اگرچہ علی بھی شہیدوں میں بے جان پڑا تھا مگر اس کی بہن قطن ان عورتوں میں نہیں تھی۔ اس لئے مردوں نے آوازے کسنے شروع کئے اور کہنے لگے "قطن کون ہے؟" دوسرے نے جواب دیا وہ علی کی بہن ہے اور اگرچہ وہ شہیدوں میں بے جان پڑا ہے مگر وہ ان ماتم کناں عورتوں میں نہیں" اور پھر سب یکزبان ہوکر بولے "لعنت ہے اس پر کہ اس کے بھائی کے چہرے پر جو مُردوں میں پڑا ہوا ہے"

جس وقت وہ بڑبڑا رہے تھے ایک عورت ارغوانی رنگ کے لباس میں ملبوس اپنے بالوں کو سنہری سکوں سے مزین کئے اور سینے کو چمکتے ہوئے سونے سے سجائے ایک دلہن کی طرح رعنائیوں میں گم۔ ایک سفید روشن رنگ کے پالانوں سے سجے ہوئے اونٹ پر سوار نمودار ہوئی — وہ قطن تھی اور جس کسی نے بھی اسے دیکھا بہت حیران ہوا۔

اس کے پیچھے ایک دوسرے سفید اونٹ پر اس کی خادمہ سوار تھی جس کی گردن، کمر اور باہوں کے گرد قطن کی صندوقچی کے تمام زر و جواہر اور زیورات حائل تھے۔ ٹھوس چاندی کی ہنسلی اور پازیب چھوٹی چھوٹی جھانجھوں کے ساتھ شور کرتی ہوئی اور سنہری سکوں کے اتنے زیادہ ہار کہ ان میں سے اس کا جسم اس طرح نظر آتا تھا جیسے زرہ بکتر کے اندر سے پہلوان کا جسم نظر آتا ہے اس طرح قطن شہیدوں کے خیموں کے گرد چکر لگا رہی تھی۔ جہاں مرد بہت پریشاں حال بیٹھے تھے اور عورتیں آہ وزاری کرتی ہوئی پھر رہی تھیں۔

"کیا تم پاگل ہوگئی ہو قطن؟" انھوں نے چلا کر کہا "تمھارے بھائی کا خون تو ابھی تک ریت میں خشک بھی نہیں ہوا۔ کیا تم پر دیوانگی کا بھوت سوار ہوگیا ہے"

جب وہ اس طرح چلائے اور حیرت و وارفتگی سے اس کی طرف گھور کر دیکھنے لگے۔ وہ پرامن طریق پر خیموں کے گرد چکر لگاتی ہوئی ایک گیت الاپتی رہی جو اس کا اپنا تیار کردہ تھا۔

گیت کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

"شرم ہے ان کے لئے جن کی چھاتیاں حبت کی گدیوں سے مزین ہیں۔
شرم ہے ان کے لئے جو خمدار تلواریں پہنے ہوئے ہیں۔
شرم ہے ان کے لئے جو تیز عربی گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں۔
انھیں وہ سفید گھوڑی دیدو ـــ جو کبھی نر گھوڑے کے پاس گئی ہو۔
اور اسے تحائف اور بیش قیمت زینوں سے سنوار کر ـــ
پیدل، ندامت اور شرمندگی اس کی رہنمائی کرتے ہوئے ـــ
شیخ انزئی کے پاس اسے پیشکش کے طور پر لے جاؤ۔ ـــ"

"پیدل چل سفید کنواری گھوڑی" کا محاورہ بدوؤں میں اس وقت پیش کیا جاتا ہے جب وہ ایک لعنت آمیز معاہدہ امن یا رحم کی درخواست کرنے پر مجبور ہوں۔ لیکن قطن کے گیت میں سفید گھوڑی کی مثال اس کے اپنے متعلق تھی اور اس کے گیت کا مطلب تھا کہ "اے سردیہ کے جنگجوؤ! شرم کرو۔ یہ بھائی تمہارے شیخ کا بھائی انزیوں کے ہاتھوں قتل ہو کر ریت پر مردہ پڑا ہے اور تم اس کی تعاقب اور انتقام کے بجائے بزدلوں کی طرح یہاں بیٹھے ہو۔ مجھے سنوارا ہوا اور اپنی ندامت کی تکمیل کے لئے تیار دیکھو۔ ایک غلام۔ ایک تحفے کی حیثیت سے انزئی کے شیخ کے پاس جا رہی ہوں تاکہ وہ میرے جسم کے بدلے تمہاری جان بخشی کر دے۔"

اس طرح قطن نے اپنے حسن اور طعنوں سے ان میں ایک آگ سی لگا دی۔ اور انھوں نے محسوس کیا کہ وہ قبیلہ سردیہ سے متعلق ہیں۔ وہ اپنے گھوڑوں کی طرف لپکے اور ان پر سوار ہو کر "قطن کی آنکھوں کے صدقے" کے نعرے لگاتے ہوئے انتقام کیلئے روانہ ہو گئے۔ لیکن وہ چند جو پہلے قتل ہوئے تھے ان کے مقابلے میں کچھ بھی نہیں تھے جو بعد میں مارے گئے۔ جب قطن کی نگاہیں محبت کی قاتل آگ سے منور ہو رہی تھیں۔

جب اس کی جرأت اور شعلہ فگن حسن کی شہرت تمام صحرائے عرب میں پھیلنی شروع ہوئی۔ سینکڑوں جنگجو نوجوان، معزز شیوخ کے مغرور لڑکے اور تمام شمالی قبائل کے سردار عقابی چہروں۔ پتلے جسموں اور گھنی ڈاڑھیوں کے ساتھ اپنے سیاہ بالوں کو چھوٹی چھوٹی لٹوں میں گوندھے اور سنہری تاروں اور اونٹ کے بالوں سے بنی ہوئی لمبی عبائیں پہنے شیخ نہاب کے حرم میں قطن کے ساتھ "نصر بالجمل" کا خطرناک کھیل کھیلنے کے لئے ایک ایک دو دو کر کے تشریف لائے۔

"نصر بالجمل" کا یہ قانون ہے کہ کنواری لڑکی اپنے آپ کو سنوار کر کسی حرم کے پردوں کے پیچھے اپنے منگیتر کو جھانجھوں سے ناچ کر خوش کرتی ہے یا اس کے ہمراہ تنہا صحرا کے وسیع آسمان کے ستاروں کے نیچے دور تک جاتی ہے گروہ ہر ایک قسم کے خدشہ سے مامون ہوتی ہے کیونکہ اگر وہ اسے برائی وغیرہ کی طرف راغب یا مجبور کرتا ہے یا اسے دھوکہ دیتا ہے تو اس مرد کی سزا ایک بدترین موت ہوتی ہے۔ لیکن آپ کو یقین کر لینا چاہئے کہ جو انسان بعد ازاں قطن کی خاطر قتل ہوئے وہ بغیر کسی قسم کی شرمندگی کے ایک پاکیزہ اور شاندار موت مرے۔

ان مغرور نوجوان شیوخ میں جنھوں نے سب سے پہلے قطن کا دم بھرا قطن نے کسی ایسے نوجوان کو جس کا حسن اس کے حسن سے ملتا جلتا تھا یا جو سب سے زیادہ قیمتی تحفے لایا تھا یا جو شاعر تھا اور اس کی تعریف میں نغمے اور غزلیں بنا سکتا تھا اپنی شادی کے لئے منتخب نہ کیا بلکہ اس کا دل بے تابانہ ایک درشت اور پتلے دبلے انسان طریف بن ذبیان کی طرف کھنچا چلا گیا۔ جس کا جسم ایک فاقہ زدہ چیتے کی طرح تھا اور چہرہ عقاب کی طرح، جو شکار کے لئے بیتاب ہو۔

طریف بن ذبیان بنی سحر کے طاقتور قبیلے کا چھوٹا شیخ، خاموش طبع اور جرگوں سے بے نیاز اور بیزار، مگر جنگ میں ایک خونخوار جنگجو تھا۔ اس کے محبت کرنے کا طریق بہت عجیب اور ظالمانہ تھا۔ پہلے روز قطن نے جب اس کے سامنے رقص کیا تو اس نے پہلے پہل اسے نامحرمانہ نگاہوں سے گھور کر دیکھا۔ پھر گردن جھکا کر بے نیازانہ انداز میں ریت پر اپنی انگلی سے بیل بوٹے بنانے لگ گیا۔ اور دوسرے دن جب وہ اس کے ہمراہ دور صحرا میں تنہا تھا اور قطن اس کے سامنے محبت کی شدت اور خوف سے کانپ رہی تھی وہ ایک طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ ٹہلتا ہوا دور چلا گیا۔

اگر وہ واپس نہ آتا تو یہ اس کے لئے بہتر تھا کیونکہ قطن کی نگاہیں اس کے جگر کے پار ہو گئی تھیں اور اس کی رگوں میں قطن کا حسن ایک آگ کی طرح سرایت کر چکا تھا مگر جب اس نے شیخ نہاب سے قطن کی شادی کے متعلق درخواست کی تو نہاب نے تیز اور ترش الفاظ سے اسے مسترد کر دیا اور خدا کی قسم کھا کر کہا کہ اس کی بہن سوائے اس کے اپنے انتخاب کے اور کہیں شادی نہ کرے گی ـــ اور صحرائی قانون کے مطابق وہ اپنی بہن کی

مجبور کرنے کا اختیار بھی رکھتا تھا۔ چونکہ اپنے باپ کی وفات کے بعد وہ تمام اعمال وعمّال اور قبیلے کی ملکیت کا حق رکھتا تھا۔ اگرچہ مہتاب بہرحال طرید بن ذبیان سے نفرت کرتا تھا تاہم اس کے انکار کی بنیاد زیادہ تر کسی دوسرے گہرے اور تاریک چشمے کے زہریلے پانی سے پرورش پا رہی تھی۔

مہتاب ایک راندۂ تقدیر انسان تھا۔ اپنی ہمشیرہ کے حسن کے جہنمی شعلوں سے جھلسا ہوا۔ عربستان میں کسی بھائی نے ان قدیم بادشاہوں کے ایام سے لیکر جو مصر کے بت پرستوں میں سے تھے آج تک اپنی ہمشیرہ کی رفاقت کا ارادہ نہیں کیا۔ اس لئے مہتاب کے زخم کا مرہم ملنا ناممکن تھا کیونکہ خدا اور رسول کے احکام اس کی طاقت سے زیادہ مضبوط تھے۔

اگرچہ وہ اپنے قول یا فعل سے اس حقیقت کے اظہار کی کبھی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ لیکن اس کا دل اندرونی طور پر قطن کو کسی دوسرے کے حوالے کرنے کے خیال میں ایک حاسدانہ غصے سے جل اٹھتا تھا۔ اس لئے اس نے طرید بن ذبیان سے جس کا چہرہ غم آلود اور نگاہیں درد و اندوہ سے تاریک ہوگئی تھیں کہا۔ "تم میرے یہاں سے فوراً چلے جاؤ اور پھر واپس آنے کا نام تک نہ لو" اور جب طرید سوار ہو کر واپس جا رہا تھا مہتاب نے بدوی قانون کے مطابق ہوا میں اپنے پستول سے تین فائر کئے جس کا مطلب یہ تھا کہ اگر وہ کبھی واپس آئیگا تو خون ہو کر رہے گا۔

طرید نہ واپس مڑا اور نہ پیچھے پھر کر دیکھا۔ لیکن جب وہ سوار ہو کر جا رہا تھا وہ ایک گہری سوچ میں مبتلا تھا اور بنی سخر کے خیموں تک پہونچکر وہ اپنے خیمے کے بجائے سیدھا طلحہ کے پاس گیا۔ جو تمام شیوخ کا معزز شیخ تھا۔ وہ کمبلوں وغیرہ پر بیٹھا حقہ پی رہا اور ایک روپہلی ملمع شدہ پالان کا سہارا لئے ہوئے تھا اور دو سیاہ فام غلام اس کی خدمت میں حاضر تھے۔

"سلام علیکم" اس نے کہا اور طلحہ نے جواب دیا "علیکم سلام"۔

طرید نے معزز طلحہ کے پاس بیٹھ کر کافی دیر تک ان معاملات پر سنجیدگی کے ساتھ گفتگو کی اور اس نے کچھ بھی نہ چھپایا۔ کلام کے خاتمے پر اس نے کہا "یہ اگرچہ ایک قسم کی کمزوری ہے اور ایک ندامت بھی ہے مگر جیسا کہ اللہ کو منظور ہے میں اس عورت کو ضرور حاصل کرونگا۔ ورنہ اے چچا! اے معزز شیخ، میری زندگی، میرے لئے، آپ کے لئے، میرے قبیلے کے لئے مزید مفید ثابت نہ ہوگی۔"

طلحہ نے تمام شیوخ اور جنگجوؤں کی ایک میٹنگ طلب کی۔ انھوں نے طلحہ کی باتوں کو سنا اور جواب دیا "ہم سب کچھ کرنے کو تیار ہیں جو ہماری عزت کی بقا کے لئے ضروری ہو اور طرید میدان جنگ میں ہماری عزت و ناموس ہے" اور جب دوسری صبح سورج نمودار ہوا تمام قبیلہ میں سے ایک سو معزز ترین انسان طلحہ کی رہنمائی میں اپنے بہترین نمائشی ساز و سامان کے ساتھ اپنی گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور سرزہ کی خیمہ گاہ کی طرف روانہ ہوئے۔

جب مہتاب نے دیکھا کہ طرید ان میں نہیں ہے تو اس نے نہایت اہتمام کے ساتھ انھیں خوش آمدید کہا اور غلاموں کو سب سے فربہ اونٹ ذبح کرنے کے لئے بھیجا۔ اور ان کو اندر داخل ہونے کی دعوت دی۔ لیکن معزز طلحہ نے کہا — "تمہاری مہمان نوازی میں برکت ہو مہتاب! لیکن اس وقت تک خیمہ کے اندر ہم قدم نہیں رکھ سکتے اور نہ تمہارا کھانا کھا سکتے ہیں جب تک تم ہمارے ساتھ وعدہ نہ کرو"۔

"وعدہ، کیسا وعدہ؟ اے معزز شیوخ؟"

"میں پر امن طریق پر آیا ہوں" طلحہ نے کہا "اور خدا کے فضل و کرم سے پر امن ہمارے قبائل میں قائم رہے اور میں قطن کا بازو ایک پر عظمت شادی میں طرید کے واسطے حاصل کرنا چاہتا ہوں"۔

مہتاب نے اندازہ کیا کہ معاملہ بہت نازک صورت اختیار کر چکا ہے اور مکمل انکار خلاف مصلحت ہوگا اس لئے اس نے جواب دیا "تب بے خوف ہو کر داخل ہوجیئے اور دعوت تناول فرمایئے بعد ازاں ہم شادی کی شرائط پر بحث کریں گے"۔

جب وہ سب کھا پی چکے تو مہتاب نے ایک مکنت آمیز بے حجابی سے کہا "قطن کی شادی کیلئے آپ کو پانچسو سفید اونٹ دینے ہونگے"۔

بنی سخر نے کہا "بہت بہتر — ہم دینگے"۔

یہ ایک بہت بڑی قیمت تھی لیکن اس سے اونچی قیمت ضروری تھی۔ چونکہ قطن کا حسن بے نظیر تھا۔ اور وہ سب ششدر رہ گئے جب مہتاب چلایا "اور تیس ہندی تلواریں بھی دو گے" وہ اگرچہ بہت برا محسوس کر رہے تھے مگر جواباً کہنے لگے "ہم دیں گے"۔

مہتاب ایک شرارت آمیز ہنسی کے ساتھ بے جھجھک مانگتا چلا گیا ساٹھ اونٹ گیہوں سے لدے ہوئے اور اسی قدر زین اور پالان۔ ایک مختصر قبیلے کی نصف دولت کے برابر — مگر طلحہ بھی بہت چالاک تھا اور

بنی سحر کا قبیلہ بہت متمول اور طاقتور تھا۔ اگر بنی سحر درحقیقت قطن کی شادی کی اتنی بے بہا قیمت ادا کر دیتا تو سردیہ کو ارادتاً یا جبراً اس باہمی رشتے سے ان کے ساتھ مل جانا پڑتا اور مہتاب کے آدمی اگرچہ تعداد میں کم تھے مگر مشہور و معروف جنگجو تھے اس لئے طلحہ نے اپنے ہمراہیوں کو آمادہ کر لیا۔ اور سب یکزبان ہو کر بول اٹھے "ہم دیں گے مگر اس سے زیادہ اور کچھ بھی نہیں"

مہتاب دم بخود تھا جب طلحہ اپنے تمام ہمراہیوں سمیت یہ کہتے ہوئے سوار ہوا "ہم اب جاتے ہیں اور کل صبح پانچسو اونٹوں اور ان تمام چیزوں سمیت جن کا ہم نے وعدہ کیا ہے وہاں سے روانہ ہونگے۔ اس لئے دلہن کو تیار رکھنا"۔ لیکن مہتاب اچھلا اور انھیں ٹھیرا کر کہنے لگا "کیا ہم بصرے کے بازاری آدمی ہیں اور اے طلحہ کیا تم ایک بادشاہ ہو کہ ایک شاہانہ جہیز کے بدلے میری بہن خرید و گے۔ اور اس کا اپنے حرم سے ایک تیزی سے اس کے کندھوں کے ارد گرد لپیٹے ہوئے لبادہ کے ساتھ باہر آنے کا مطالبہ کرو گے، کیا تم یہ خیال کرتے ہو کہ قطن کی شادی کا لباس ایک گھنٹہ یا ایک دن میں بنایا جا سکتا ہے۔ آپ اس وقت آئیے گا جب سات دن گذر چکیں۔ اور وہ ارغوانی رنگ کے ریشمی لباسوں سے جن پر سنہری اور روپہلی تاروں سے کشیدہ کاری ہوگی لاد دی جائیگی"۔

طلحہ اور اس کے تمام ہمراہی جو ان باتوں کو سن رہے تھے جانتے تھے کہ یہ سب بے سود اور فریب آمیز الفاظ ہیں کیونکہ کسی بدوی شیخ کی لڑکی کے شادی بیاہ کا سامان اس کے چودھویں برس میں تیار کر دیا جاتا ہے لیکن کسی جھگڑے یا کشمکش میں پڑنے کے بجائے انھوں نے خاموشی کو بہتر سمجھا اور اس طرح سات دن کا فیصلہ ہوا اور وہ سب اپنی اپنی گھوڑیوں پر سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔ جب سات دن گزر گئے اور بنی سحر ایک کاروان کی صورت میں قطن کی شادی کی قیمت کے ہمراہ ایک ہفت رنگ اونٹ کی پیٹھ پر ایک شاندار محمل آراستہ کئے جیسے اس میں قطن کو ایک شہزادی کی طرح عنابیوں کی دیدی بنا کر بٹھانا تھا۔ واپس آئے۔

لیکن وہ سردیہ منزل پر آئے تو ان کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کیونکہ مہتاب اپنے خیموں، غلاموں، چھ اونٹوں اور اپنی بہن قطن کے ہمراہ رات کو فرار ہو چکا تھا اور وہاں سوائے ان کے بکھرے ہوئے پسماندہ نشانات کے اور کچھ نہیں تھا۔ سردہ کا شیخ اپنے قبیلہ کو خیرباد کہہ کر غایب ہو چکا تھا اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں گیا ہے؟"

جب یہ خبریں طریدہ بن ذبیان کو پہونچیں تو اس نے مہتاب کے نام پر لعنت بھیجی اور ایک خونی قسم کھائی کہ وہ اس کے پناہ دینے والوں سے ایک خوفناک انتقام لے گا اور اسی رات شمال اور جنوب میں تیز رفتار شہسوار اس نے کھوج لگانے کے لئے بھیجے۔ تین دن بعد معلوم ہوا کہ مہتاب بنی حسن کی اقامت گاہوں میں جو نجد کے سامنے پہاڑیوں میں قائم تھیں پناہ گزیں ہے آخر کار طریدہ نے "منشأ عیون قطن" (قطن کی آنکھوں کا صدقہ) کا نعرہ لگاتے ہوئے ان پر ایک خونی حملہ کیا۔ لیکن مہتاب ایک رات پیشتر قطن کے ہمراہ بہت دور مغرب کی طرف شام کی پہاڑیوں میں ایک زیادہ قابل اعتماد پناہ کی تلاش میں فرار ہو چکا تھا۔

لیکن شامی ایک مختلف النسل لوگ تھے جو پتھر ملی دیواروں میں رہتے تھے اور سنہری بچھڑے کی پرستش کرتے تھے اس لئے مہتاب ان میں ایک اجنبی کی حیثیت رکھتا تھا۔ وہ اپنے قبیلہ کے بغیر ایک جلا وطن شیخ تھا جس کا دل اپنی "منزل" کے سیاہ خیموں کی یاد سے مجروح ہو رہا تھا لیکن وہ سردہ واپس آنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا مبادا طریدہ کا انتقام ان پر موت مسلط کر دے۔

اس لئے رویلا کے ساتھ مفاہمت کو مصلحت آمیز سمجھا۔ رویلا ایک طاقتور اور نیم وحشی قبیلہ کا نام تھا جو بنی سحر کی شمالی حدود سے لے کر تمام صحرا کا مالک تھا۔ اس نے رویلا کے حاکم سلطان پاشا شالان کے پاس قاصد بھیجے اور اس نے جو کسی کے ظلم یا انتقام سے خوف نہیں کھاتا تھا مہتاب کو قطن اور اس کے عیال کے ہمراہ بلا بھیجا لیکن مہتاب کو وہاں دائمی طور پر رہنے کی اجازت دینے کا اختیار رویلا کونسل کو حاصل تھا۔

آخر کار مہتاب رویلا منزل کی طرف آیا اور اس نے اپنے خیمے شالان کے خیموں کے سامنے گاڑ دیئے اور جب قطن اپنے حرم کے لپیٹے ہوئے پردوں کے ساتھ کھڑی ہوئی تو تمام دیکھنے والے اس کے حسن سے حیرت زدہ ہو گئے اور شالان جواب تک یہ سوچ رہا تھا کہ مہتاب دینے کے انکار یا اقرار سے اسے جنگ یا امن میں کون سا فائدہ حاصل ہوگا اب قطن کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا یہاں تک کہ جو کچھ قسمت میں لکھا تھا ظہور پذیر ہو کر رہا۔

جب مہتاب کونسل میں شالان کے سامنے آیا تو اس نے کہا "میں تمھیں قطن کے بلانے کیلئے کہتا ہوں"۔ قطن آئی اور ان میں بیٹھ گئی۔ اس وقت شالان

نے کہنا شروع کیا۔

"مہتاب! مجھ سے واضح الفاظ میں سنو۔ تم میرے پاس پناہ اور امداد کے طالب بن کر آئے ہو لیکن جب تک تمہاری ہمشیرہ کے متعلق یہ تمام شور و شغب بند نہ ہو جائے کسی قسم کی پناہ اور امداد ملنی ناممکن ہے اور یہ سب قصور تمہارا ہے۔ جب تک تمہاری بہن تمہارے پاس کنواری رہے گی یہ انتقام جاری رہے گا۔ اور تم طرید کے نزدیک واجب القتل اور جلا وطن رہو گے لیکن قطن کے ایک دوسرے آدمی کے ساتھ بیاہے جانے سے سب معاملہ ختم ہو جائے گا وہ اپنے خاوند کی حفاظت میں رہے گی اور کوئی انسان بے سود انتقام کی کوشش نہیں کرے گا اور طرید بھی آخر کار کسی وقت دوسری عورت تلاش کر لیگا میری بات غور سے سنو مہتاب! اور ذرا میری شان اور طاقت کا خیال کر کے میرے سوال کا جواب دو۔ میں سلطان پاشا شالان رویلا کا شیخ قطن کا بازو ایک قابل عزت شادی میں مانگتا ہوں۔"

مہتاب وقت کی نزاکت سے اچھی طرح واقف تھا اس لئے اس نے جواب دیا۔ "میرا فرض فرمانبرداری ہے" اور اپنا سر جھکا دیا۔ تیسرے روز غلاموں نے قطن کو ایک دلھن کی طرح ارغوانی رنگ کے ریشمی لباس اور سنہری کنگنوں سے سجایا۔ اس کے سینے اور پیشانی کو سنہری چمکتے ہوئے سکوں سے مزین کیا۔ اور بہت سے اونٹ، بھیڑیں اور بکریاں شادی کی دعوت کے لئے ذبح کی گئیں۔ جب سارا قبیلہ دعوت سے فارغ ہو گیا۔ شالان ایک سفید گھوڑی پر سوار ہو کر ایک منشی کے ہمراہ مہتاب کے خیمہ کی طرف گیا جس نے تمام رسم نکاح جو اسلامی قانون کے مطابق عمل میں لائی گئی تھی ایک گواہ کی حیثیت سے دیکھا۔ اس کے بعد ایک بہت قدیم صحرائی قانون کے مطابق شالان نے قطن کو اٹھا کر اپنے آگے سفید گھوڑی کی مرصع زین پر بٹھایا اور اس کے ہمراہ اپنے خیمہ کے گرد شمشیر برہنہ داہنے ہاتھ میں لیکر تین چکر لگائے اور تمام لوگوں نے اپنے خیموں کے دروازے پر کھڑے ہو کر اس منظر کا نظارہ کیا اور بلند آواز میں "شالان اور اس کی دلھن زندہ باد" کا نعرہ لگایا۔

شالان کے بیت الشعار کی دیوار کے سامنے دلھن کے لئے ایک خلوت کدہ تیار کیا گیا۔ ایک چھوٹا سا خیمہ جس کے اردگرد رنگین اور منقش پردے لٹکائے گئے تھے۔ سب سے بہترین سفید اونی پردہ جس پر سرخ سرخ نشانات تھے خیمے کی مشرقی دیوار کے ساتھ دلھن کے بستر سے لٹک رہا تھا۔

اگرچہ قطن شالان سے محبت نہیں کرتی تھی تاہم وہ اس کا ایک خاوند اور مالک کی حیثیت سے احترام کرتی تھی۔ لیکن اس کے اندرونی خیالات طرید کی طرف مائل تھے اور اس کا دل کسی تباہی اور مصیبت کی پیشین گوئی کر رہا تھا۔

بہرحال قطن اپنے کنج میں شالان کی زوجہ کی حیثیت سے رہنے لگی اور مہتاب رویلا کے سواروں کا شیخ بنا دیا گیا جب تک کہ وہ خود اپنا قبیلہ تیار نہ کر لے۔ قطن کے دل کی پیشین گوئی صحیح ثابت ہونی شروع ہو گئی۔ جنوبی شاہراہوں سے بری خبریں متواتر موصول ہونے لگیں کہ طرید نے ایک ہزار سواروں کے ساتھ رویلا کے ایک دستے پر حملہ کر کے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا۔ جاسوسوں نے یہ بھی بتلایا کہ طرید نے دوران قتل و غارت میں "قطن کی آنکھوں کا صدقہ" کا نعرہ بھی لگایا تھا۔

اس طرح صحرا میں ایک خوفناک جنگ شروع ہو گئی۔ موسم گرما کا چاند خون کی طرح سرخ ہونا شروع ہوا اور صحرا کی ریت انسانی خون سے رنگین ہونے لگی جب سیکڑوں جانباز اپنی جانیں دینے کیلئے اپنی گھوڑیوں پر سوار ہوئے اور جب رویلا کی عورتیں اپنے مقتول فرزندوں، خاوندوں اور بھائیوں کی تعداد گننے لگیں۔ تو انھوں نے قطن کے ولادت کے دن پر لعنت بھیجی اور اس کو حرمت الدما (خونی عورت) اور حرمت الحمرا" (سرخ عورت) کے ناموں سے پکارنا شروع کیا۔

جب وہ شالان کے حرم سے باہر آتی عورتیں اس کے خلاف غم و غصے کا اعلانیہ طور پر اظہار کرنے کی جرأت نہ کرتے ہوئے دبی زبان سے ایک دوسرے سے کہتیں "میرے بھائی کا خون اس کی نگاہوں میں ہے۔" "تیرے باپ کا خون اس کے چہرے میں ہے۔" "میرا بیٹا جو ابھی تک عورت کے وجود سے بھی بیخبر تھا اسی کی وجہ سے مارا گیا۔" "اوہ! اس پر تین بار لعنت ہو" لیکن قطن ان کے طعنوں اور لعنتوں کو سنتی اور کوئی جواب نہ دیتی۔ نہ تو ان سے نفرت کرتی اور نہ ان سے دور رہنے کی کوشش کرتی۔ وہ شالان کے پاس ان کی کوئی شکایت بھی نہ کرتی تھی بلکہ خاموش و پژمردہ مگر ایک پر رعب انداز میں اپنا سر فخر سے بلند کئے ان کے درمیان سے گذر جاتی۔

حتیٰ کہ اس کے فخر و غرور کی تلخی نے ایک روز ناقابل برداشت صورت اختیار کر لی۔ اس نے سیاہ لبادہ اتار دیا جو صحرائی عورتیں رسماً سوا شادی کے

خوشی کی مجلسوں میں علم طور پر پہنتی ہیں اور اپنے آپ کو ارغوانی رنگ کے ریشمی لباس میں ملبوس کر دیا۔ اسی طرح وہ رویلا کی سحر اور مبہوت عورتوں اور لڑکیوں کے ہجوم میں چلا پھر رہی تھی اور کہہ رہی تھی "تم نے مجھے حرمت الدما" کہا ہے اور دیکھو میں وہی ہوں اور میری پوشاک شاندار طریق سے سیکڑوں سپاہیوں کے خون سے رنگی ہوئی ہے۔ ہاں! یہ تمہارے بیٹوں، خاوندوں اور بھائیوں کے خون سے آلودہ ہے۔ دیکھو کیا یہ کپڑے مجھے بھلے نہیں معلوم ہوتے۔ کیا حرمت الحمرا خوبصورت نہیں ہے۔"

جب وہ اس قسم کے طعنے دے رہی تھی تو رویلا کی عورتیں جو اپنے درد و اندوہ کی شدت سے آہ و زاری کر رہی تھیں سخت جوش میں آگئیں اور انہوں نے اسے قتل کر دینا چاہا مگر شالان کے خوف سے وہ ایسا کرنے کی جرات نہ کر سکیں اور وہ آزادی اور بیباکی سے تمام خیموں میں ایک شعلہ جوالہ کی طرح پھرا کرتی جب شالان جنگ سے واپس ہوا تو اس نے قطن کو ایسا بنا سنورا دیکھ کر حیرت سے پوچھا "یہ کیا ۔۔۔؟"

"میرے مالک!" اس نے جواب دیا "آپ نے میرے لئے بہت اہم اور مہنگی قیمت ادا کی ہے اس لئے اس احسانمندی میں کہ جب آپ کہیں دور جائیں اور میں آپ کے دل میں ہمیشہ ایک دلھن کی طرح رہ سکوں ہر وقت بنی سنوری رہتی ہوں۔"

ان دنوں میں جنگ روز بروز خوفناک صورت اختیار کرتی گئی ایک شب طریدبن ذبیان نے بہت سے شہسواروں کے ہمراہ رویلا کی حدود تک پیشقدمی کی اور رویلا کے آٹھ سو اونٹ جنوب کی طرف ہانک کر لے گیا جب یہ خبر شالان کو پہونچی تو اس نے بہت جلد رویلا کی ایک فوج ان کے تعاقب میں روانہ کی مگر خود اپنے خیمہ میں بہت زیادہ غیر مطمئن اور پریشان رہا کیونکہ لڑائی میں اگرچہ اس نے اپنے حملہ آور کا وار بندوق سے روک لیا تھا مگر تلوار اس کی بندوق کی نالی پر پھسل کر اس کے ہاتھ کو زخمی کر گئی تھی۔

دور صحرا میں طریدا اور اس کے آدمی رویلا کے اونٹوں کے ریوڑ ایک تنگ گذرگاہ سے لے گئے تھے جہاں اس کی کل فوج پوشیدہ تھی۔ اس طرح جب تعاقب کرنے والے رویلا سپاہی ان خشک پہاڑیوں میں پہونچے تو طرید کے آدمیوں نے تمام راستے ان پر مسدود کر دیئے اور ان کے گرد اپنی کمین گاہوں سے جن میں وہ لیٹے ہوئے تھے اور ان کی گھوڑیاں ان کے پیچھے ہوئیں اونٹوں کی دیواروں کے پیچھے چھپی ہوئی تھیں نکل کر اکٹھے ہوگئے۔ اب رویلا پر اپنے بچاؤ اور فرار کے تمام دروازے بند تھے اور وہ بالکل طرید کے رحم و کرم پر تھے۔ یہ صورت حالات دیکھ کر چار محافظ جو اس دستے کے بہت پیچھے صحرا کی جنگی حکمت عملی کے مطابق موجود تھے الٹے پاؤں بھاگے کسی بزدلی سے نہیں بلکہ یہ ان کا فرض تھا اور اپنی گھوڑیوں پر بلا کی تیز رفتاری سے شالان کے پاس یہ منحوس خبر لے کر پہونچے۔ لیکن اس بدقسمت وقت میں شالان ایک موہوم امید کے ساتھ عزدہ میں اپنے جنگجوؤں کی خاطر چند مزید قاصد ارسال کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکا۔

یہ بری خبر تمام خیموں میں بجلی کی طرح پھیل گئی اور عورتیں ایک اور نئی تباہی اور قتل و غارت کا اندازہ کر کے رویلا کے سب سے بڑے خیمے میں جمع ہوئیں اور شالان کے غصے سے بے نیاز ہو کر بیتابانہ قطن پر لعنت ملامت کرنے لگیں۔ شالان قطن کو بچا لیتا اور عورتوں کو واپس بھیجدیتا مگر پیشتر اس کے کہ وہ کچھ کہے قطن خود ایک بھری ہوئی شیرنی کی طرح کھڑی ہوگئی اور حرم کے پردوں کو پھاڑ کر للکارتی ہوئی عورتوں کے سامنے ظاہر ہوئی۔

"تم ناپاک، فاقہ زدہ، مجبور مادہ حیوانو! کیا تم مجھ قطن کو لعنت ملامت کرنے کی جرأت کرتی ہو؟ اپنے اوپر لعنت بھیجو۔ اتنے تنگ اور ٹیڑھی کوکھ والی عورتو جو انسان نہیں بلکہ بھیڑیں پیدا کرتی ہو جو اپنے آپ کو بھیڑوں کی طرح ذبح کرا دیتے ہیں اگر تم مرد پیدا نہیں کر سکتیں تو طریدا اور بنی سخر والوں کے پاس جاؤ، تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ انسان کیسے پیدا ہوتے ہیں۔"

تمام عورتیں خاموش اور خوف سے مبہوت ہو کر ایکدم پیچھے ہٹیں ایک طویل خاموشی طاری ہو گئی جو بعد ازاں دبی ہوئی اور تیز کانا پھوسیوں سے ٹوٹ گئی۔ کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ قطن کے سخت اور گستاخ الفاظ نے شالان اور قبیلے کے مردوں کے ناموس کو ناقابل تلافی طور پر مجروح کیا ہے۔

شالان نے قطن کے الفاظ سنے۔ وہ غصے سے سخت پیچ و تاب کھا رہا تھا۔ وہ فوراً قطن کو اپنی تلوار سے قتل کرنے کے خیال سے اٹھا، مگر قطن نہ تو اپنے بچاؤ کی خاطر بھاگی اور نہ اس نے اس سے رحم کی درخواست کی بلکہ اس کے سامنے گھٹنے ٹیک کر اپنا گلا اس کے سامنے کر دیا۔ شالان

اس کے اس عظیم الشان استقلال سے متاثر ہو کر اسے قتل نہ کر سکا بلکہ بیساختہ اس کی زبان سے نکلا۔ "میں مجبور ہوں"

قطن وہاں سے اٹھی اور پھر اسی طریق سے حرم میں داخل ہو گئی، اور اپنے پیچھے پردوں کو تان دیا۔ لیکن تمام عورتیں کچھ فاصلے پر خاموش اور منتظر کھڑی رہیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ اس کے ان الفاظ نے شالان کو ذلیل کیا ہے اور اس کا قصور ناقابل معافی ہے۔

شالان اس کے پر عظمت حسن اور شدید محبت کی وجہ سے قطن کا قتل یا جدائی برداشت نہیں کر سکتا تھا اگرچہ یہ ایک کمزوری تھی مگر وہ دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ وہ ریت پر بیٹھا ہوا اونٹ ہانکنے کی چھڑی کو آہستہ آہستہ ریت پر ٹپکنے لگا جس کی مدھم آواز کے سوا چاروں طرف خاموشی تھی۔ اب وہ ٹھپک یک دم بند ہو گئی۔ کیونکہ شالان اس چھڑی کو بائیں ہاتھ سے دائیں ہاتھ میں جو تلوار سے زخمی تھا تبدیل کر رہا تھا۔ اس نے چھڑی پر اپنی انگلیاں جمانا چاہیں مگر ہاتھ پر بندھی ہوئی پٹی اس میں حائل ہوئی۔ اس نے پٹی کو نوچ کر پھینک دیا۔ اس کے بعد مضبوطی سے چھڑی کو خون آلود انگلیوں میں پکڑے کسی خیال کے زیر اثر حرم کا پردا اٹھا کر اندر داخل ہو گیا اور اپنے پیچھے پھر پردہ ڈال دیا۔

اندر سے کسی قسم کی کشمکش یا گفتگو کی آواز نہ آئی۔ بلکہ ریشمی لباس کے پھٹنے، پھاڑتے اور فضا میں چیخنے اور سسکیاں بھرنے کی آواز کے ہمراہ ایک موٹے بانس کے ڈنڈے کی ننگے انسانی جسم پر پڑنے کی آواز آتی رہی جو مسلسل کراہنے اور چلانے کے ساتھ دیر تک جاری رہی۔ آخر وہ مار پیٹ بند ہوئی اور شالان ایک نشہ میں مست انسان کی طرح کانپتا اور لڑکھڑاتا اپنے خون آلود ہاتھ میں بانس کی ٹوٹی ہوئی چھڑی کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے نمودار ہوا۔

تھوڑی دیر گذری تھی کہ خیمہ گاہ کے پرلے سرے سے ایک اضطراب انگیز نعرہ بلند ہوا۔ اور ایک قاصد سرپٹ گھوڑا دوڑائے "خوشخبری، میدان جنگ سے خوشخبری" کا نعرہ لگاتے ہوئے شالان کے خیمہ کی طرف آیا جونہی وہ شالان کے سامنے اپنے گھوڑے سے اترا ایک بلند آواز میں چلایا۔ "خوشخبری۔" لیکن وہ ایک ایسا انسان تھا جس پر شالان نے کبھی اعتبار نہیں کیا تھا

شالان کی پیشانی پر ایک شکن نمودار ہوئی۔ کیونکہ اس کے نزدیک یہ شخص کج رو، بدطینت اور کمینہ خصلت تھا اور یہ سب کچھ شالان کو منحوس معلوم ہوا اور اس کا دل ایک عظیم تباہی کی پیشین گوئی کرنے لگا۔

سفید ریش بزرگان قبیلہ مشورے کی خاطر اس عظیم خیمے کی چھت کے نیچے جمع ہوئے۔ شالان دائرہ کونسل میں کمبلوں اور پالانوں کے انبار پر بلند بیٹھا ہوا تھا۔ قاصد نے اس کے سامنے اپنا دایاں گھٹنا جھکایا اور اس کے ہاتھ کو بوسہ دیکر کہنے لگا۔ "اے شیخ الشیوخ! میں ایک خوشخبری لایا ہوں اور التجا کرتا ہوں کہ آپ قطن کو بھی بلائیں کیونکہ یہ خبر اس سے بھی گہرا تعلق رکھتی ہے اور یہ دن اس کے لئے ایک ایسا دن ہے جو تا قیامت یادگار رہے گا۔"

شالان نے جواب دیا۔ "میں اسے نہیں بلاؤں گا۔" کیونکہ اس نے قاصد کے چہرے پر جب وہ قطن کا نام لے رہا تھا نفرت کے آثار دیکھے تھے باہر عورتوں میں چہ میگوئیاں شروع ہو گئی تھیں کہ قطن بھلا کیسے آسکتی ہے کیونکہ وہ ہمارے شیخ الشیوخ کی حسین اور مغرور عورت ہے اور ایک عیسائی عورت یا ایک غلام کی طرح ابھی پیٹی گئی ہے۔ لیکن قطن یہ تمام باتیں خود سن رہی تھی۔ اس نے اپنی شرمندگی چھپانا ایک قابل نفرت فعل سمجھا اس لئے فخر سے اپنے پھٹے ہوئے ارغوانی لباس میں جو جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا اپنے ان زخموں کو چھپاتی ہوئی جو شالان کی لاٹھی سے پیدا ہو گئے تھے۔ اپنے سر کو فخر سے بلند کئے اپنے مالک کے پاس آکر کھڑی ہو گئی۔

قاصد نہایت حسین الفاظ میں اس سے متوجہ ہوا۔ "اے قطن آج کا دن ہمارے لئے خوش قسمت ہے۔ رویلا کی جنگ کے تمام دنوں میں یہ ایک ایسا دن ہے کہ ہم اپنی طاقت اور جنگی حکمت عملیوں کے ممنون نہیں ہو سکتے بلکہ تمہاری ان حسین آنکھوں کے . . ."

تمام لوگوں پر ایک طویل خاموشی طاری تھی حتیٰ کہ شیخ الشیوخ بھی خاموش تھا کیونکہ جب تک تمام کہانی ختم نہ ہو جاتی وہ کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

اس گہری خاموشی میں قاصد نے اپنی چھڑی بلند کی اور اسے زور سے ریت پر مار کر کہنے لگا۔ "ہم پہاڑیوں میں طرید بن ذبیان کے پھندے میں پھنس گئے تھے۔ اس کے آدمی چاروں طرف سے ہم پر چھا گئے تھے

اور جب ہم چٹانوں کے سامنے جن پر صرف بکریاں چڑھ سکتی تھیں اپنے
گھوڑوں پر سوار ہو کر بھیڑیوں کی طرح گولیاں کھانے کے بجائے مردانہ وار حملہ
آوروں کی طرح مرنے پر تیار ہوئے تو طرید اپنے دونوں بازو پھیلائے تاکہ ان پر
کوئی فائر نہ کردے سامنے کی چٹان کے کنارے پر کھڑا ہوا نظر آیا۔ وہ ایک گہری آواز
میں نعرہ لگا رہا تھا "میرے سامنے آؤ۔"

اس کے آدمیوں نے گولیاں چلانی بند کردیں، اور ہم اپنے گھوڑوں سے
اتر کر چٹانوں پر لپک پڑے۔ اس نے ہمارے آدمیوں سے نہیں بلکہ اپنے آدمیوں
سے جو ایک بہت بڑے دائرے میں اس کے گرد اکٹھے ہوگئے تھے۔ کہنا شروع
کیا "تنطفونی" (کیا تم میری بات سنوگے اور اس پر عمل کروگے) اور انھوں
نے ایک نعرے کی صورت میں جواب دیا "ننطق" (ہم سنیں گے اور عمل کریں گے)
ہم تمام لوگ اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے۔ اس نے اپنے آدمیوں سے
کہنا شروع کیا "تمھیں ان سب کی جان بخشی کرنی ہوگی ۔۔۔ قطن کی
نگاہوں کا صدقہ ۔۔۔"

قاصد تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ تمام کونسل میں بیٹھے ہوئے بزرگ اور دور
کھڑی ہوئی عورتیں۔ بہت حیران ہورہی تھیں اور اس پر یقین کرکے بہت خوش
تھیں بلکہ قطن بھی، یہ امید کرنے کی سعی کررہی تھی کہ اس کے الفاظ حقیقت
پر مبنی ہیں کیونکہ وہ جانتی تھی کہ محبت کے دیوانے ہمیشہ دیوانے کام کیا
کرتے ہیں لیکن جب اس نے قاصد کے چہرے پر نظر ڈالی تو اس نے اس میں
ایک تاریک اور خوفناک نفرت دیکھی جس سے اس کی روح کانپ اٹھی۔ قاصد
نے پھر وہ اونٹ چلانے کی چھڑی اٹھائی اور اسے ریت پر پٹکا۔ یہ ایک ایسی چوٹ
تھی جیسے وہ قطن کے ننگے جسم پر پڑ رہی ہے کیونکہ اب اس اس کے الفاظ میں
ایک کھلا فریب اور استہزا موجزن تھا۔

طرید پھر چلایا "تنطقونی! تم انھیں قطن کی آنکھوں کی خاطر ان کے
تمام اونٹ اور لوٹ کا مال جو آج ہم نے حاصل کیا ہے واپس کردوگے؟ تم انھیں
قطن کی آنکھوں کی خاطر ان کے تمام ریوڑ جو تم نے جنگ کے پہلے روز غزوہ میں
لئے تھے واپس کردوگے۔ اور ہم خود قطن کی آنکھوں کا صدقہ اپنے ریوڑ سے
دس ہزار سفید اونٹنیاں دیں گے۔ اور بیشک اللہ تعالیٰ ہماری سخاوت اور
مہربانی کے عوض قطن کی آنکھوں کا صدقہ ان کے شہید بھائیوں اور بیٹوں کو
پھر زندہ کرے گا۔" اے شیخ الشیوخ! آپ نے میرا پیغام سن لیا ہے اور
سمجھ لیا ہے؟"

لیکن شالان جانتا تھا کہ صحرا میں طرید نے رویلا پر ایک نئی تباہی و
بربادی مسلط کردی ہے اور وہ جو مزید قتل و غارت سے جان بچا کر بھاگ
گئے تھے اب پھر کبھی بیدار نہ ہوں گے۔

"ہاں! ایسا ہونا چاہئے تھا" شالان نے کہا "مگر اس کی تکمیل
تمھارے اشتراکانہ جھوٹ اور فریب کے ذریعہ نہیں" اچانک ایک لمبی
خمدار تلوار کی تیز چمک جسے نگاہیں مشکل سے دیکھ سکیں بجلی کی طرح فضا
میں بلند ہوئی۔ شالان کی تلوار قاصد کی کھوپڑی کو چیرتے ہوئے، اس کے
کندھوں کے درمیان سے گزر کر اس کی پسلیوں اور پھیپھڑوں کو کاٹتے
ہوئے اس کے معدے میں جاکر رکی۔ تمام ریت خون آلود ہوگئی۔ اور
اسی رات شالان نے قطن کو طلاق دیدی۔

صحرائی قانون کے مطابق قطن دوسری صبح اپنے قبیلہ اور اعزہ کے
پاس جنی سرد ینہ بھیجی جانے والی تھی۔ مگر اسی رات پوشیدہ طور پر قطن نے
ایک اونٹ کی پیٹھ پر پالان وغیرہ کسا اور تھوڑا سا پانی اور روٹی لے کر
اس پر سوار ہوگئی اور جب رویلا کی تمام خیمہ گاہ پر نیند مسلط تھی وہ اکیلی جنوبی
سمت ستاروں کی رہنمائی میں روانہ ہوگئی۔

جب صبح سویرے آفتاب طلوع ہو رہا تھا وہ اپنا راستہ مشرق
کی سمت پہاڑیوں کے درمیان تبدیل کررہی تھی کیونکہ اس کا دل طرید کی
طرف اس کی رہنمائی کررہا تھا۔ ایک طویل دن اور رات وہ سفر کرتی رہی اس
کے ہونٹ خشک ہو رہے تھے اس کا پیٹ خالی تھا۔ دوسری صبح وہ پہاڑیوں
کے درمیان ایک نخلستان پر آئی جہاں ان آدمیوں کے مردہ اجسام پڑے
ہوئے تھے جنھیں طرید کی فوج نے قتل کیا تھا۔ گدھ اور گیدڑ اس کو خونی رنگ
کے سرخ لباس میں اپنے نزدیک سے گزرتا ہوا دیکھنے کے لئے اپنے لذیذ کھانوں
سے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر گئے۔

اب وہ ان سموں کے نشانات کی رہنمائی میں چل رہی تھی جو طرید
کے ساتھیوں کے گھوڑوں سے ریت پر ثبت تھے اور تیسری رات کے نصف
وقت میں وہ طرید کی خیمہ گاہ کے قریب آئی۔ اسے کسی نے نہ ٹوکا۔ کیونکہ

طرید کے سپاہی تعاقب کرنے والوں کے خوف سے آزاد تھے۔ اس کے قویٰ مضمحل ہو چکے تھے اسے بھوک اور پیاس کی شدت سختی سے ستا رہی تھی وہ اس تاریک خیمہ گاہ کے کنارے پہلے خیمہ پر ٹھٹکی جو ایک معمولی آدمی حلیم کا خیمہ تھا۔

حلیم اس تنہائی اور تاریکی صحرا میں ایک عورت کو اونٹ پر سوار آتا ہوا دیکھ کر بہت حیران ہوا۔ اس نے اسے اونٹ پر سے اتار کر اس کے اونٹ کا گھٹنا باندھ دیا اور جب وہ اس کے خیمے میں داخل ہوئی تو حلیم اس کے مضمحل اور زرد چہرے میں اس کی حسین آنکھیں جو دنیا کی ہر فانی عورت کی آنکھوں سے زیادہ چمک رہی تھیں دیکھ کر مسحور ہوئے بغیر نہ رہا۔ اس نے خیال کیا کہ وہ قطن ہے لیکن یہ خیال سوال بن کر اس کے حلق میں اٹکا رہ گیا۔ کیونکہ عرب میں کسی شخص کا نام دریافت کرنا جو پناہ گزیں یا مہمان کی حیثیت سے آیا ہو ایک بہت قابلِ اعتراض بات سمجھی جاتی ہے۔ لیکن وہ اپنے لئے منافع یا انعام حاصل کرنے کے لئے بہت بیچین تھا اور جب قطن اس کے لکڑی کے پیالے سے پانی پی چکی تو وہ بغیر کوئی نام لئے کیونکہ اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ قطن ہی ہے اس سے مخاطب ہو کر کہنے لگا "اے حسینہ! کیا میں انھیں مطلع کرنے کے لئے جا سکتا ہوں کہ آپ یہاں میرے خیمہ میں ہیں"۔

چونکہ وہ بہت زیادہ تھک چکی تھی اس لئے اس نے صرف اپنا سر جھکا دیا جیسے وہ کہنا چاہتی تھی کہ جو کچھ تمھیں بہتر نظر آئے کرو اور اب وہ مکمل طور پر پہچان گیا کہ وہ قطن ہے۔ وہ بھاگا ہوا گیا اور ایک چھوٹی بکری ذبح کر کے اس کا گوشت ایک برتن میں ڈال کر قطن کو اس کے نام سے مخاطب کر کے کہنے لگا "اے قطن! طرید کا خیمہ اس دوسری پہاڑی کے پیچھے ہے۔ اگر میں گوشت کے پکنے تک واپس نہ آسکوں تو آپ بیشک اپنا حصہ کھا سکتی ہیں۔ کیونکہ جو کچھ میرے پاس ہے سب آپ کا ہے اور انشاء اللہ آپ پر برکات نازل ہونگی کیونکہ میں ایک نیک خبر کا قاصد بن کر جا رہا ہوں۔

یہ کہہ کر حلیم تیزی اور جوش میں اپنی گھوڑی لینے کے لئے بھی نہ ٹھہر سکا بلکہ فوراً ان دو پہاڑیوں کے اوپر بھاگتا چلا گیا۔ اور جب وہ طرید کے خیمے میں پہونچا تو اسے جگا کر خوشی میں چلانے لگا "بشارتی او طرید" (طرید آپ کے لئے ایک نیک خبر ہے)۔ اور طرید نے جیسی کہ رسم ہے اس کے جواب میں کہا "میں دونگا"۔

طرید کا گمان تھا کہ حلیم کسی ریوڑ کے غزے میں پکڑے جانے کی خبر لایا ہے یا کسی اور غیر اہم معاملے کے متعلق کچھ کہنا چاہتا ہے اور اس کے لئے کسی معمولی انعام کی ہوس میں ہے۔ اس لئے وہ اس کی آرزو کو رحم آمیز نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ لیکن حلیم نے کہا۔ "جو خبر میں لایا ہوں آپ مجھے اس کیلئے تیس اونٹ اور ایک گھوڑی دینگے اور خوشی سے دس بکریاں اور بیس بھیڑیں۔

طرید بہت حیران ہوا اور بہت دیر تک سوچا کیا اور جب تک وہ معاملہ کی تہہ کو نہ پہونچ گیا اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ کیونکہ عرب میں یہ ایک رسم ہے کہ جب تک کوئی معاملہ اچھی طرح نہ سوچ لیا جائے اس کے متعلق مزید الفاظ استعمال نہیں کئے جاتے۔ آخر کار اسے معلوم ہو گیا کہ قطن آپہنچی ہے اور اس نے حلیم کو کہا۔ "اگر وہ اپنی مرضی سے شالان کو چھوڑ کر آئی ہے اور آزادانہ طریق پر میرے پاس آئی ہے تو میں تمھیں نوے اونٹ دونگا اور جو کچھ تم نے مانگا ہے اس سے تین گنا زیادہ دونگا لیکن اگر اس نے شالان کے خیمے کو اپنی مرضی سے خیرباد نہیں کہا ہے تو خدا مجھے اندھا کر دے اگر میں اس کے چہرے پر ایک نگاہ بھی کروں"۔

جب قاصد اپنے خیمے پر واپس آیا تو اس نے دیکھا کہ قطن نے برتن میں گوشت پکا کر عمدہ طریق پر ایک طشت میں رکھا ہے جونہی وہ داخل ہوا تو قطن نہایت صبر و اطمینان سے پہلا لقمہ اٹھا کر منہ میں ڈالنے والی تھی۔ وہ چلایا کیونکہ وہ طرید کے تحائف سے اپنے امیر ہو جانے کی امید میں بہت بیتاب تھا۔ "اے قطن! مجھے بتلاؤ کیا تم نے اپنی مرضی سے شالان سے جدائی اختیار کی ہے؟"

اس سوال پر قطن نے ہولناک طریق پر اس تمام گفتگو کا ایسا صاف طور پر اندازہ کر لیا جیسے وہ خود طرید کی زبان سے سن رہی ہے۔ اس نے جواب دیا۔ مگر الفاظ میں نہیں۔ اس نے قانون کے مطابق اس پکے ہوئے گوشت کے ٹکڑے کو بوسہ دیا اور اسے ریت پر ڈال دیا۔ بغیر کچھ کہے وہ اٹھی اور تاریکی میں اپنے بیٹھے ہوئے اونٹ کے پاس گئی جس کی پیٹھ پر نہ پانی کا مشکیزہ تھا اور نہ خوراک کا تھیلا۔ اس نے اس کو ایڑ دی اور اپنا چہرہ وسیع آسمان کے بلند ستاروں کی طرف فخریہ انداز میں اٹھائے بسیط صحرا کی تاریک اور لامحدود فضا میں غائب ہو گئی۔

میں قطن کے اس افسانہ میں آپ کو یقین کی دعوت دیتا ہوں کیونکہ یہ ایک سچا افسانہ ہے اور میں نے ایماندارانہ طریق پر اسے سپرد قلم کیا ہے بالکل اسی طرح جیسے میں نے اس کو بنی سخر کے سیاہ خیموں میں ان انسانوں کے منہ سے سنا ہے جن کے جسموں پر ان ناقابل فراموش لڑائیوں کے نشانات ابھی تک زندہ ہیں۔ (سی بروک)

رنگِ غم!

از:- حضرت شفق رضوی عماد پوری

جسم سے جانیں نکل کر نذرِ جاناں ہو گئیں ــــ منتشر مانندِ اجزائے پریشاں ہو گئیں
بے نشاں کچھ ہو گئیں کچھ نقشِ ریحاں ہو گئیں ــــ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

اک نئے قالب میں آ آ کر گل افشاں ہو گئیں ــــ چشمِ نرگس۔ زلفِ سنبل خطِ ریحاں ہو گئیں
کچھ مٹیں، کچھ سبزۂ گورِ غریباں ہو گئیں ــــ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہونگی جو پنہاں ہو گئیں

وہ تھے کنعاں میں یہاں تک مصر میں تھے جلوہ گر ــــ منزلوں چشمِ پدر سے دور تھا نورِ نظر
چاہ نے فرزند کی آخر یہ دکھلایا اثر ــــ قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

دل میں اپنے سوچکر رکھا تھا گو ان کا جواب ــــ سامنا جب ہو گیا مُنہ سے نہ کچھ نکلا جواب
تھے کہاں الفاظ میرے پاس کیا دیتا جواب ــــ واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب
یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

مرحبا ناوک کے صدقے ناوک افگن کی نثار ــــ ہے جواب سینۂ مجروح پہلوئے فگار
یہ نہیں کھلتا جگر میں کیوں خلش ہے بار بار ــــ وہ نگاہیں کیوں ہوئی جاتی ہیں یارب دل کے پار
جو مری کوتاہیٔ قسمت سے مژگاں ہو گئیں

دیکھئے کبتک رہے مثلِ شفق گریہ کُناں ــــ گل کھلائے دیکھئے کبتک یہ چشمِ خوں فشاں
دیکھئے کبتک رہے اشکوں کا اک دریا رواں ــــ گر یونہیں روتا رہا غالبؔ تو اے اہلِ جہاں
دیکھنا ان بستیوں کو تم کہ ویراں ہو گئیں

بات چیت

از:-

(جناب پروفیسر سراج احمد صاحب علوی لکھنوی - ایم اے)

نطق و گویائی وہ صفت ہے جو انسان کو دوسرے حیوانات سے متمیز کرتی ہے۔ یوں تو حواس خمسہ ظاہری اور باطنی اپنی اپنی جگہ پر بہت ضروری ہیں اور ان میں سے کسی ایک کا نقصان بہت بڑی نعمت سے محرومی ہے مگر "قوت ناطقہ" کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ادنےٰ سے ادنےٰ مخلوقات سے لے کر اعلےٰ سے اعلےٰ مخلوقات کو مختلف درجے عطا فرمائے گئے ہیں۔ لیکن "نطق" سے فطرت نے بجز انسان سب کو محروم رکھا۔ جب ہم اس نکتہ پر غور کرتے ہیں تو ہمیں "خلاق کائنات" کی حسن تدبر کا معترف ہونا پڑتا ہے ؎

اگرچہ بعض حیوانات کو ان کے ماحول کی بنا پر یا ان کے اذوقہ کے طریق حصول کی سہولت کے لئے مختلف حواس کو زیادہ قوت بخشی گئی ہے۔ مثلاً چیونٹیوں کو قوت شامہ چڑیوں کو قوت باصرہ چھوٹے چھوٹے پھولوں کے رس چوسنے والے کیڑوں کو قوت لامسہ اور شامہ دونوں زائد ملے ہیں لیکن اشرف المخلوقات کے لقب سے پکارے جانیوالی مخلوق کو مبدا ء فیاض نے گوارا نہ کیا کہ دوسری جاندار مخلوقات سے کمتر یا مساوی درجہ پر رکھے۔ درانحالیکہ اس کے مراتب قدسیوں سے بالاتر قرار دیئے گئے تھے اور اس کو اپنی وحدانیت کا پیغام دے کر اسے دنیا کو پہنچانا مقصود تھا۔ اس سے یہ نہ دیکھا گیا کہ یہ پیغامبر اپنے قلبی واردات خیالات اور جذبات و ذہنی ارادات کا اعضا کو حرکت دے کر گردن کی جنبش سے لکیریں کھینچ کر تصویریں بنا بنا کر اور نشانات کے تعین سے اظہار کرے ؎

ذرا غور کرو کہ اگر آج نسل انسانی قوت گویائی سے محروم ہوتی اور دوسرے حیوانات کے مانند چند مخصوص آوازوں کے سوا کوئی ذریعہ اس کے پاس ادائے مافی الضمیر کا نہ ہوتا تو پھر کیا تعجب تھا

کہ انسان بھی دوسرے جانوروں کی طرح ارتقائی منزلوں کے پہلے زینے پر ہوتا اور دوسرے سماوی دنیا کے نظارہ کرنے والے ہماری نسبت بھی وہی انکشافات اور وہی ارتقائی نظریئے پیش کرتے جو آج ہم دوسری مخلوقات کے متعلق پیش کر رہے ہیں۔ یہ اسی قوت گویائی کا کرشمہ ہے جس نے انسانی ارتقا کے دلفریب مناظر پیش نظر کر دیئے۔ کہ آج اگر ہم اس سے محروم ہوتے تو ہماری تمام ترقیاں۔ صدیوں بلکہ ہزاروں برس پہلے کی تاریخ مذہب۔ ملت سائنس کی محیر نمائیاں مادی عروج سب قعر نیستی میں ہوتے۔ اور ہم بھی گوریلا ایسے انسان نما مخلوق کے زمرہ میں پائے جاتے۔ اس تمہید سے میرا مقصد یہ نہیں ہے کہ پڑھنے والے اس مضمون کے اس بات کے منتظر ہوں کہ آئندہ سطور میں قوت گویائی کے متعلق کوئی نئی تھیوری پیش کی جائے گی۔ بلکہ اس تحریر سے میرا مقصد یہ ہے کہ اس مضمون کے پڑھنے والوں پر یہ واضح ہو جائے کہ قوت گویائی کتنی بڑی اور اہم نعمت ہے۔ اور اس کے بعد میں یہ دکھلانا چاہتا ہوں کہ اس نعمت کے استعمال میں ہم کہاں تک جائز مصرف کا خیال رکھتے ہیں۔ نیز یہ بھی دکھلانا مقصود ہے کہ مختلف پیشہ و کسب سن و سال اور متضاد فضائے ماحول میں رہنے والے قوت ناطقہ کے مالک اس قوت کو کیسے کیسے کن موضوعات کے لئے وقف رکھتے ہیں۔

(۱) سب سے پہلے بات چیت کا وہ رخ جس کا ذکر ابتدائی سطور میں کیا گیا ہے۔ منشائے فطرت نطق کی بخشش کا یہ تھا کہ اگر ایک طرف اس کے ذریعہ سے فطرت کے صفات لامتناہی کا ورد کیا جائے۔ ایک دوسرے تک انکی ترویج کی جائے اور احکام فطرت کی تشہیر و تبیین ہو تو دوسری طرف اپنی نوع کے درمیان حلم و خلق برتنے کا ذریعہ بنایا جائے

آپس میں رشتہ اتحاد و التفات کو گویائی کی گرہ سے مضبوط کیا جائے ۔ محبت کے سرچشمے جاری ہوں دوسرے کے جذبات کا احترام کیا جائے اپنے اور کیفیات و احساسات دوسرے تک پہنچانے اور موثر طریقے سے پیش کرنے کے لئے یہ آلہ استعمال کیا جائے اور انسان بھونڈے طریقے سے مثلاً ہاتھ ہلا کر ناک سے آواز نکال کر کان موڑ کر۔ آنکھیں دکھلا کر اپنی خوشی اور افسوس درد و تکلیف اور جوش و خروش کا اظہار نہ کرے۔ مگر افسوس ہے کہ اس لطیف قوت کو انسان نے بیجا استعمال کیا۔ ایک بار نہیں دو بار نہیں بلکہ سینکڑوں اور ہزاروں بار کبھی قدرت کے احکام کا انکار کیا کبھی اور بیجا غرور و قوت کے زعم میں دعویٰ "انا ربکم الاعلےٰ" کر بیٹھا۔ کسی برگزیدہ ہستی کو ساحر کہا۔ کسی کو تہمت لگا کر قید کرا دیا۔ کسی کو متہم کیا۔ کسی کو آیت "لم یلد ولم یولد" کے خلاف خدا کا بیٹا بنا دیا کسی رسول پر سب و شتم کے تبر برسائے؟ کبھی اکابران ملت پر تبرا کیا۔ غرضیکہ جو نہ کرنا چاہئے تھا وہ کیا۔ جو نہ کہنا چاہئے وہ کہا۔ اور بجائے اس کے کہ قدرت کاملہ کی حمد و ثنا سے قوت ناطقہ فیضیاب ہوتی۔ جملہ مکروہات سے اسے گندہ اور کثیف کر دیا دروغ فریب جعل کی ہزاروں داستانیں بیان کیں۔ شرک و کفر کے دفتر کے دفتر مرتب کئے اور نمائش کرتے رہیں گے۔

یہ ہے تصویر کا وہ رخ جو اپنی تابناکی اور نور افشانی کو چھوڑ کر ضلالت اور کثافت کا پرتو ڈال رہا ہے۔

اب یہاں تک تو طاقت گویائی کی اجمالی تفسیر تھی۔ اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ ہم اپنی روزانہ زندگی میں اس قوت کو کن کن موضوع پر صرف کرتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یہ کہو کہ بات چیت کا موضوع بیشتر کیا ہوتا ہے۔

سب سے پہلے ان لوگوں کی بات چیت سنو جنکی ہستیاں ذمہ دار ہستیاں ہیں۔ اور وہ اعلےٰ عہدوں پر قائم ہیں یا کاروباری زندگی بسر کرتے ہیں۔ جج ہائی کورٹ سے لے کر ادنےٰ سے ادنےٰ کلرک تک کا موضوع گفتگو یا تو کسی کے تبادلہ و تقرر کے متعلق ہوتا ہے یا اپنی جعل سازیوں اور ستم آرائیوں کا ذکر ہوتا ہے یا مقدموں کے فیصلہ کے متعلق اپنی قابلیت کا اظہار ہوگا۔ اور کچھ نہیں تو افسران اعلےٰ یا ماتحتوں کی شکایت ہوگی۔ کسی کے عزل ونصب کی رکیک تدبیریں ہونگی۔ دو قومی لیڈر مل بیٹھیں گے تو گورنمنٹ پر نکتہ چینی کریں گے۔ کانگرس کی کارگزاریاں بیان کریں گے۔ ہندو مسلمانوں کی سرپھوڑ لڑائیوں کا ذکر ہوگا۔ کبھی "زمیندار" "پرتاپ" کبھی "سائمن" پر دشنام ہوگی۔ کبھی مسلم لیگ کا ماتم کریں گے کبھی مہا سبھائی ذہنیت کا رونا روئیں گے۔ کبھی مسلم ہندو اتحاد کو کامیاب بنانے کی اسکیم بنائی جائے گی۔ کبھی جاپان کے بائیکاٹ کے مسودے تیار ہوں گے اور کبھی بنگال کے وزراء پر بے اعتمادی کے ووٹ پاس کئے جائیں اگر دو تاجر یکجا بات کرنے کے لئے جمع ہو جائیں گے تو بیشتر تجارت کے متعلق بات چیت ہوگی۔ بازار کے بھاؤ کے گھٹنے بڑھنے کا تذکرہ ہوگا یا پھر کلکتہ اور بمبئی کے نرخوں پر گفتگو ہوگی۔ ایک وکیل یا بیرسٹر اپنے موکل کے پھانسنے کے لئے اپنے گزشتہ کارنامے بیان کرتا ہے مقدمے جیتنے کا حال سناتا ہے یا مقدمہ کی خوفناک صورتیں پیش کر کے زبردست فیس وصول کرنے کی تدبیر کرتا ہے۔

دو اسکول یا کالج کے ماسٹر یا لکچرار مل بیٹھیں گے تو ڈپارٹمنٹل بورڈ کی گردان ہوگی۔ تعلیم میں ہونیوالی تبدیلیوں پر اظہار خیال ہوگا یا پھر اپنی وقتی تقریر میں شکسپیر۔ ملٹن۔ اسکاٹ ورڈ اور شیلے کے کلام پر ریویو ہونگے۔ اگر مشرقی پروفیسر ہیں تو سعدی و حافظ رومی۔ غالب۔ میر ذوق و کبیر رحیم سے بات بات میں تماثیل اخذ کریں گے۔ السنۂ شرقیہ کی کس مپرسی کا نوحہ کریں گے۔ ڈپارٹمنٹ کو گالیاں سنائیں گے۔ ہیڈ ماسٹر اور پرنسپل کی پالش شدہ تعصب کی داستانیں بیان کریں گے۔ اور یونہی دل کی بھڑاس نکالیں گے۔ اسکول اور کالج کے لڑکوں کی بات چیت کا ماحصل ٹیچروں کی غیبت اپنی بدتمیزیاں اور بدمعاشیاں ہونگی یا پھر کسی تھیٹر و سنیما۔ ٹورنامنٹ یا کھیل کی برائی بھلائی۔ کھلاڑیوں اور لڑکوں کے کردار سوقیانہ پر تنقید ہوگی۔ اس کے ساتھ چند مغلظات اور فواحش کی بوچھار ہوگی۔

یہ ہے وہ بات چیت جو نئی تہذیب کے علمبرداروں اور نئی روشنی کے دلدادوں کا مسلک ہے۔

اب اس گروہ کے ساتھ چند منٹ بسر کرو۔ ان کی لن ترانیوں کا لطف اٹھاؤ۔ جو چراغ سحری ہو رہے ہیں۔ جن کے قویٰ اضمحل ہو چکے ہیں۔ جو نوجوانوں کی جولانیاں چابکدستیاں اور خوش فعلیاں دیکھ دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتے ہیں۔ پیچ و تاب کھاتے ہیں۔ کبھی کبھی وقتی جذبہ افسوں سے طبیعت میں امنگیں پیدا کرتے ہیں۔ مگر پر شکستہ طائر کی طرح چند لمحے سعی لاحاصل کر کے ساکت و صامت ہو جاتے ہیں۔ ایسے نفوس کی بات چیت کا ملخص کیا ہوگا۔ ایک حد تک ظاہر ہے۔ کبھی زمانہ کی شکایت ہے۔ پرانے زمانہ کی خوبیاں ورد زبان ہیں۔ ہر نئی چیز اور ایجاد میں ایک نقص نکالنا لازم ہے۔ نوجوانوں کا رونا ہر لحظہ اور ہر گھڑی ہے کبھی ان کے لباس سے تعرض ہے۔ کبھی معاشرت پر نکتہ چینی کبھی اخلاق و عادات پر انگشت نمائی۔ کبھی ان کی بے راہ روی کا شکوہ۔ کبھی ان کے اسراف کا گلہ ہے۔ تو کبھی انکی اطاعت پذیری کا رونا ہے۔ بیشتر اپنی زندگی کے ہر ہر قدم پر جو ٹھوکریں کھائیں انکی داستانیں تجربات زندگی کے عنوان سے کبھی مجملاً اور کبھی مفصلاً بیان ہونگی۔ اور ہر شخص سے یہی تمنا ہوگی کہ ہمارے اصول اور تجربوں کو اپنا لائحہ عمل بنائے۔ پھر دیکھئے کس قدر فائدہ حاصل ہوتا ہے گویا زمانہ انکا ان کے ۷۰ سال پہلے والا زمانہ ہے اور حالات ایک انچ بدلے نہیں ہیں۔ ہر عاقل اور فرزانہ ان کے آگے طفل دلستاں ہے۔ انکی معلومات ایک زندہ انسائیکلوپیڈیا ہے۔ اب اگر ان صحبتوں سے گھبرا گئے ہو اور تمہارا دماغ براگندہ ہو گیا ہے۔ تو آؤ صنف نازک کی بات چیت سے کچھ حظ اٹھاؤ اور اس چمن کے پھولوں کو سونگھ اور دماغ کو طراوت دو۔ مگر ان میں بھی تم کو بہن مختلف رنگ و بو کے گل ملیں گے۔ ایک تو وہی جو اپنی عمر کے آخری دور میں پہنچنے کے بعد اور سرد و گرم زمانہ چکھنے کے بعد تلقین و ارشاد اور سجادہ کی نصیحت کی زینت دہ ہونگی۔ بیٹے کی زن مریدی کے کپڑوں سے مملو ہوگی۔ یا پھر داماد کے عیوب۔ سمدھیانے کے جھگڑے۔ نانہ داروں کے مظالم کی داستانیں اور اپنی بے کسی مظلومی اور بے دست و پائی کا پر آشوب قصہ ہوگا۔ یا پھر مٹنے والے رسوم کا ماتم ہوگا۔

انہیں چھوڑ کر کھلے ہوئے پھولوں کی طرف متوجہ ہو یہ وہ ہستیاں ہونگی جو جوانی کی بہاریں دیکھ چکی ہیں۔ اپنے زوال حسن اور دوسروں کی چڑھتی ہوئی جوانی کو دیکھ دیکھ کر کلیجہ مسوس مسوس کر رہ جاتی ہیں۔ ان کی بات چیت کا موضوع کبھی بال بچوں کا قضیہ ہے کبھی میاں کی بے التفاتی کا رنج۔ کبھی ساس نندوں کے برتاؤ کی شکایت ہے۔ دوسروں کے لباس تراش خراش پر حرف گیری ہے۔ کسی کے زیور پر چہ میگوئیاں ہیں۔ کسی کے اٹھنے بیٹھنے پر آوازے کسے جاتے ہیں کسی کے یہاں کے جھگڑوں قصوں پر تنقید ہے۔

غرض یہ کہ یہ صحبت بھی کچھ زیادہ لطف آور ثابت نہ ہوگی۔ لہذا اسے بھی چھوڑ دو۔ اور اس چمن کی سیر کرو جس کی ڈالی ڈالی نہال اور پتی پتی سبز اور ہر ہر برگ سے طوفان بپا۔ برپا ہے۔ جس کا ہر ذرہ آلام و مصائب کے نام سے ناآشنا عشق و محبت کے راگ الاپ رہا ہے۔ جسکی تمنائیں مشکل افسانہ یا خواب ہیں۔ انہیں نہ کسی کا شکوہ ہے نہ شکایت نہ کسی سے بغض ہے نہ کینہ نہ کاوش ہے نہ کاہش۔ انکی ہر بات سحر آمیز امید افزا اک شوق و ذوق کی دنیا لئے ہوئے ہے۔

ان کی بات چیت کبھی ننھے نہیناتی چاہت بھرے لونوں کا اعادہ کبھی یتیم کے محبت بھرے ستموں کی بات۔ نی پیاری پیاری شکایتیں کبھی روٹھنے اور منانے کی ادائیں۔ کبھی چھمتی چھمتی باہیں اور پردہ پردہ میں نوک جھونک۔ کبھی محبت کی نگاہوں سے دیکھنے والے ساتھ بنانے کے طراقہ۔ کبھی پابندئ عہد کی قسمیں اور وعدے ہیں۔ کبھی رازداریاں ہیں۔ کبھی ایک دوسرے کی غمخواریاں ہیں۔ کبھی چہچے کبھی قہقہے ہیں ان کی بات چیت سراپا جذبات ہوتی ہے۔ جھوٹ کم۔ غیبت نادر نادر اور توہمات لایعنی بہت کم۔ یہ بات چیت ایک حد تک دلچسپ اور دلپذیر ہے۔ اور کچھ دیر کے لئے فردوس گوش کا کام کر سکتی ہے۔ مگر سب سے شیریں۔ فرح ناک۔ دلکش۔ سادہ پیاری۔ دل کو موہ لینے والی ہے بات چیت اس بے زبان بچے کی جو اپنے گہوارہ میں لیٹا ہوا آسمان سے ستاروں سے۔ فرشتوں سے۔ پاک روحوں سے باتیں کرتا ہے۔ کبھی مسکراتا ہے۔ کبھی ملکوتی زبان میں اظہار محبت کرتا ہے۔ کبھی (۱)

انداز میں اپنے فدائی سے اپنی بھوک کا اظہار کرتا ہے۔ اس کی بات چیت اگر آگے بڑھی تو ماں سے طلب محبت ہے۔ کبھی ایک سمت ٹکٹکی لگائے ... جاتا ہے۔ اس کی توجہ سمیٹنے کی خواہش ہے اور اس کو نہانے کی کوشش میں ہے۔ ... نہ نفسانیت کا شائبہ ہے۔ نہ شکوہ ہے نہ شکایت۔ نہ ... نہ ناز۔ نہ شر ہے نہ شر۔ نہ زور بر زبان ہے۔ نہ عبارت آرائی ہے۔ نہ زبان پابند قواعد ہے۔ نہ ناشستہ الفاظ ہے اور ... یہ ... سلسلہ کا ... صرف انہیں معصوم ہستیوں تک منتہی ہوتا ہے یا اس سے متجاوز ہے؟ نہیں ہماری بات چیت صرف زندوں تک محدود نہیں بلکہ ہم ان عالی دماغ مدبروں۔ بے مثل فلسفیوں اور بزرگوں سے بھی تعلیم کر سکتے ہیں۔ جو کہ ہم سے صدیوں اور قرنوں پہلے گزر چکے ہیں اور جن کی خاک تک فنا ہو چکی ہے۔ مگر ان سے تکلم کا طریقہ جدا گانہ ہے۔ ان کے خیالات تجربات ... صحائف اور کتب کے ذریعہ حاصل ہوتے ہیں ... جو گھڑیاں ان مشاہیر سے گفتگو میں گزرتی ہیں وہ زندگی کی بہترین گھڑیاں۔ مگر وہ خیالات متعصب کردار اور لا یعنی افعال سے محفوظ رہتے ہیں۔ اس گفتگو کا والہ و شیدائی کبھی اپنے جنون کے لئے بدنام نہیں ہوتا اور خسارے میں رہتا ہے۔ ہاں ذوق سلیم شرط ہے۔

ابھی اگر بات چیت سے پیٹ نہ بھرا ہو تو آؤ چند گھڑیوں کے لئے یکسو ہو کر بیٹھو۔ اپنے دل کی طرف متوجہ ہو۔ دل سے بات چیت کرو۔ غور کرو۔ دنیاوی مصائب اور روحانی اذیتوں کا مداوا اس سے پوچھو۔ اپنے معاصی اور روح نواز حرکتوں کا تجربہ کرو۔ دل سے مشورہ کرو۔ اپنی کنہ اور اصلی ظرف تک پہنچنے کی راہ دریافت کرو مگر اس راہ میں کوشش شرط۔ استقلال ضروری عقل کی مشعل پیش نظر رکھنا۔ لازم ہے۔ پھر دیکھو۔ یہ بات چیت کیسی مزید ار اور جاذب توجہ ثابت ہوئی۔

(سراج احمد علوی)

فیضانِ محوی

از جناب حکیم اورنگ آبادی تلمیذ حضرت علامہ محوی مدظلہ

کیا جانئے کیسی گذرے گی اب ان کے کرم فرمانے تک
بیماری ختم نہو جائے قاصد کے جانے آنے تک

اے حسنِ طور کے دلدادہ کچھ اس سے سوا ہی کام ترا
جب شمع یکشب کی خاطر جل جاتے ہیں پروانے تک

ساقی کا ذکر برائی سے اس مجلسِ وعظ کی حد تک ہے
اے حضرتِ واعظ آپ ذرا تکلیف کریں میخانے تک

وہ شورِ نوشانوش کہاں وہ ساقی وہ مینوش کہاں
وہ بادہ کہاں وہ بزم کہاں سب ٹوٹ چکے پیمانے تک

میں آتشِ غم کے شعلوں میں جلتا ہی رہا پیہم یارب
گل شمع ہوئی شب بھر جل کر جل بجھ کے بجھے پروانے تک

یا سنگِ ستم یا خارِ الم اب جائے کہاں دیوانہ ترا
ہر گام پہ ہیں سامانِ جفا آبادی سے ویرانے تک

برباد رہِ الفت ہو کر اے مستِ انا خود مٹ کے ابھر
ورنہ ہے فلک خود صرفِ عمل اس نقشِ خودی کو مٹانے تک

بیتابیٔ شوق کی جھلک سے اے حسن تری ہاری تمکین
لو شمع کی بڑھ خود لپکی بیتابانہ پروانے تک

سب آپ کا مطلب سمجھا میں ہے قتل سے اس میں لطف سوا
صدمات مسلسل سہہ سہہ کر جیتا رہوں موت کے آنے تک

ہے ایک حقیقت جلوہ نما کثرت ہے فریب ان آنکھوں کا
تھا زعمِ خودی کہ نہ سمجھا میں اس راز کو ایک زمانے تک

تھے آپ ہی یا تھا فریبِ نظر کچھ محوِ حسن سمجھ نہ سکا
لازم تھا ٹھہر جانا دم بھر بیہوش کے ہوش میں آنے تک

ساقی کی نگاہیں بھرتے ہی اک قطرۂ مے بھی مل نہ سکا
گو دستِ طلب ہر بار بڑھا پہنچا نہ مگر پیمانے تک

دل یعنی امیدوں کی بستی تھی کیسی حکیم آباد کبھی
کچھ ایسی اجڑی کہ پھر نہ بسی آباد ہوئے ویرانے تک

بی اے پاس کرنے کا آسان طریقہ

منشی فاضل پاس کرنیکے بعد صرف انگریزی کا امتحان میٹرک ایف اے، اور پھر بی اے کا دیکر بی اے کی پوری ڈگری حاصل کریں۔ اردو کا امتحان ادیب عالم دیکر میٹرک و ایف اے پاس کر سکتے ہیں مکمل قواعد کیلئے علیحدہ فہرست کتب پتہ ذیل پر طلب کریں، جن کتب کی رعایتی قیمت نہیں دی گئی ان پر ۲ر فی روپیہ کمیشن ہوگی (علاوہ مطبوعات یونیورسٹی)۔

نام کتاب	قیمت	رعایتی
منشی فاضل سنہ ۳۸-۳۹ء		
(۱) دبیر عجم	ہے	
جواہر النحو بی اے عربی کورس نثر	عا ۱۲ر	
شعر العجم حصہ ۳	عا ۴ر	عہہ ر
شعر العجم حصہ ۵	عہ ۱۲ر	۱۴ر
(۲) چہار مقالہ	۶ر	۴
ابوالفضل اول و سوم معہ فرہنگ	۱۲ر	۸ر
حاجی بابا اصفہانی	تے	عہ ۸ر
سیاحت نامہ ابراہیم بیگ دوم	عہ ر	۱۲ر
وکلائے مرافعہ	۳ر	۲ر
(۳) انتخاب قصائد قاآنی	۸ر	۵ر
غزلیات نظیری تا ردیف را	۱۰ر	۶ر
دیوان فرخی حصہ شامل نصاب	عہ ر	۱۰ر
منطق الطیر مطبوعہ تاج بکڈپو	۱۲ر	۸ر
رباعیات باباطاہر معہ ترجمہ و شرح	۴ر	۰۲ر
" ابوسعید ابوالخیر	۶ر	۴ر
(۴) تاریخ وصاف	عا ر	
سیر المتاخرین از بابر تا جہانگیر	عہ ر	۱۰ر
(۵) اخلاق جلالی	عہ ۸ر	۱۲ر
رموز حکمت	عا ر	
درۃ الاخبار مطبوعہ یونیورسٹی	عا ۴ر	
کشف المحجوب حصہ شامل نصاب	عا ر	عہ ر
(۶) ترجمہ و جواب مضمون		
اختیاری مضمون		
(۱) روح الاجتماع	عا ر	
افادات مہدی	ہے	

نام کتاب	قیمت	رعایتی
انتخاب مخزن دوم (نثر)	عہ ر	
رویائے صادقہ	عہ ۴ر	
ادبی خطوط غالب	عہ ۱۲ر	
(۲) دیوان حالی معہ مقدمہ	عہ ۱۴ر	عہ ر
دیوان غالب	۶ر	
سنہ ۳۹ء		
(پرچہ ۱) العروض و القوافی از		
پروفیسر اصغر علی روحی	۱۲ر	
کتب امدادی		
حل دبیر عجم	۱۰ر	۶ر
ترجمہ جواہر النحو حصہ نثر مکمل	عہ ۸ر	عہ ر
خلاصہ شعر العجم حصہ ۳	۴ر	۰۲ر
" " حصہ ۵	۳ر	۰۲ر
ترجمہ چہار مقالہ	۸ر	
" ابوالفضل اول	عہ ر	۸ر
" " سوم	عہ ۸ر	۱۲ر
" وکلائے مرافعہ	۳ر	۰۱ر
فرہنگ حاجی بابا	عہ ۸ر	
" سیاحت نامہ	۸ر	۵ر
ترجمہ قصائد قاآنی	عہ ر	۸ر
" سیر المتاخرین	عہ ۴ر	۱۲ر
درتمثیل خلاصہ " سوالاً جواباً	۸ر	۶ر
تاج ٹیسٹ پیپرز سنہ ۱۹۳۸ء	عہ ر	عہ ر
ترجمہ ابوسعید ابوالخیر	۶ر	۳ر
" تاریخ وصاف	عہ ۸ر	۱۲ر
" دیوان فرخی معہ فرہنگ	عہ ۴ر	۱۲ر

نام کتاب	قیمت	رعایتی
خلاصہ تاریخ وصاف	۸ر	۴ر
" " سوالاً جواباً	۳ر	۰۱ر
ترجمہ اخلاق جلالی	عہ ر	
چارٹ " "	۴ر	۲ر
ترجمہ کشف المحجوب	عا ر	عہ ر
خلاصہ اخلاق جلالی سوالاً جواباً	عہ ر	۸ر
معنی مطلوب خلاصہ کشف المحجوب	۸ر	۵ر
اسرار فلسفہ خلاصہ رموز حکمت	۸ر	۵ر
شرح منطق الطیر	عہ ۴ر	۱۲ر
" غزلیات نظیری	عا ر	عہ ر
گنجینۂ اسرار خلاصہ درۃ الاخبار	۸ر	۶ر
مناہ الاخبار ترجمہ " "	عہ ۸ر	عہ ر
ضمیمہ اتالیق عجم قسم اول	۳ر	۲ر
بادۂ شیراز مجموعہ مضامین فارسی	عہ ر	
ٹرشین کمپوزیشن	عہ ر	
درمکنون یعنی مجموعہ مضامین فارسی	عہ ر	
پرچہ جات منشی فاضل سنہ ۲۹ تا سنہ ۳۷	۹ر	۵ر
مخزن فضیلت	۱۰ر	۵ر
حل پرچہ جات ۳۲	۴ر	۲ر
" " ۳۳	۴ر	۰۲ر
" " ۳۴	۴ر	۰۲ر
" " ۳۵	۴ر	۲ر
" " ۳۶	۴ر	۰۲ر
" " ۳۷	۴ر	۰۲ر
ترجمہ سیاحت نامہ دوم	عہ ۴ر	۱۰ر
" حاجی بابا مکمل	عا ر	

نام کتاب	قیمت	رعایتی
ادیب عالم سنہ ۳۸-۳۹ء		
مصباح القواعد نحو	عہ ۱۲ر	
نکات سخن ہر سہ حصہ مکمل	عہ ر	
(۲) آبحیات	ہے ر	
(۳) مجموعہ نظم آزاد	۸ر	
انتخاب مخزن اول (نظم)	عہ ر	
دقائق ذوق	۴ر	۲ر
گلزار نسیم یعنی یادگار نسیم	عہ ۴ر	۱۲ر
(۴) عود ہندی غالب	۸ر	۵ر
یادگار غالب	عہ ۸ر	۱۲ر
(۵) دربار اکبری	ھشر	
زندگی	عہ ۱۴ر	
(۶) جواب مضمون اردو میں		
(کتب امدادی)		
خلاصہ مصباح القواعد نحو	۳ر	۲ر
" آبحیات	۶ر	۴ر
شرح قصائد ذوق	عہ ۴ر	
فرہنگ عود ہندی	۴ر	۲ر
خلاصہ یادگار غالب	۴ر	۲ر
خلاصہ دربار اکبری	عہ ر	۸ر
مجموعہ مضامین اردو	۸ر	
پرچہ جات ادیب عالم		
۲۷ تا [illegible]	۸ر	۵ر
۳۵ تا ۳۷	۳ر	
طبع رواں مجموعہ مضامین اردو	عہ ر	زیر طبع
کلید کامیابی یعنی حل پرچہ جات	عہ ر	زیر طبع

(تاج ٹیسٹ پیپرز سنہ ۳۸ طلبہ منشی فاضل کے لئے مختلف لائق پروفیسروں سے مرتب کرائے گئے ہیں قیمت عہ ر)

پتہ ملنے کا: ملک نذیر احمد تاجر کتب و مالک تاج بکڈپو موہن لال روڈ بیرون موری گیٹ، لاہور

(فرمائش خریداری کے وقت رسالہ کا حوالہ ضرور دیں ورنہ رعایتی قیمت نہ دی جائے گی)

محو خیال

کا خاکہ ہے ہماری اجتماعی زندگی کے نقائص کا موجودہ تہذیب و تمدن ہمارے ضمیر کو کس طرح مردہ کر رہا ہے۔ اس کا ایک ہلکا سا عکس مجنوں کی ڈائری میں دیکھئے اور اندازہ کیجئے کہ اگر ہوا کا رخ یہی رہا۔ تو سو سال کے بعد ہماری کیا حالت ہوگی بیحد دلچسپ کتاب قیمت صرف ایک روپیہ۔ (عہ)

تین پیسے کی چھوکری از قاضی عبدالغفار مصنف "لیلیٰ کے خطوط" یہ افسانے قاضی صاحب کی دماغی کاوش کا نتیجہ ہیں۔ وثوق سے کہا جاتا ہے۔ کہ یہ افسانے اردو لٹریچر میں ایک حسین اضافہ ثابت ہونگے جو حضرت افسانہ نگاری کے شائق ہیں اور افسانوں میں حقیقی روح دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کو جلد از جلد آرڈر بھیجنا چاہیئے قیمت عہ محصول

لمحات رنگین مس زبیدہ سلطانہ کے حسین افسانوں کا مجموعہ ہے جسے مصنفہ نے نہایت کاوش اور محنت سے لکھا ہے قیمت عہ

ناظمہ کی آپ بیتی ایک شریف زادی کی عبرتناک آپ بیتی۔ یہ نہ کوئی افسانہ ہے۔ نہ کہانی۔ بلکہ ایک سچا واقعہ ہے جس کے پڑھنے سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے۔ دوشیزگی۔ ازدواجی زندگی، اور رانڈاپا۔ مصنف کی یہ ادبی کاوش ایک قومی و ملکی خدمت متصور ہو رہی ہے پریس اور پبلک نے نہایت زوردار الفاظ میں اس کا خیر مقدم کیا ہے کتاب بیحد دلچسپ اور واقعات سچے اور ہوشربا ہیں قیمت عہ

کھرپا بہادر مشہور مزاح نگار حضرت مرزا عظیم بیگ چغتائی کے تازہ ترین طرز تحریر کا شاہکار افسانہ نما ناول۔ نہایت ہی پر مذاق اور ظرافت آمیز پلاٹ ہے۔ مصنف نے اپنے شوخ اور مزاحیہ طرز بیان کیساتھ لشکر اعظم کے جگمگاتے کمرے میں عشق و محبت سوز و گداز کے کرشمے اور خوفناک دہشتناک سین دکھائے گئے ہیں قیمت ایک روپیہ محصول ڈاک ۵ر

خطوط کی ستم ظریفی خطوط کی ستم ظریفی مرزا عظیم بیگ چغتائی کا ایک ایسا ہنسنے ہنسانے والا ناول ہے جسکی نظیر اردو لٹریچر میں ملنی مشکل ہے قیمت بارہ آنے ۱۲ر

غزال ترکستان کی بہت دلچسپ کہانی ہے۔ ہمارا دعویٰ ہے کہ ایسی دلچسپ کہانی آپ نے کبھی نہیں پڑھی ہوگی۔ واقعات اتنے ہوشربا ہیں۔ کہ محو حیرت ہو کر رہ جائیں گے قابل مصنف کے نرالے انداز بیان پر بیساختہ تعریف نکلتی ہے۔ قیمت صرف ۱۰ آنے علاوہ محصول ڈاک۔

سلامبو آج سے دو ہزار سال قبل کی قرطاجنہ قدیم کی حسین و جمیل داستان مترجمہ مولینا عنایت اللہ صاحب بی اے دہلوی سلامبو میں مصنف نے آج سے دو ہزار سال پہلے کے واقعات کی تفصیل پیش کی ہے اور اس خوش اسلوبی کے ساتھ کہ تہذیب و معاشرت، حاکم و محکوم، رزم، بزم، امرا و غربا، مذہب اور رسمیں سب کی تصویر دیکھ لیجئے۔ اس تاریخی منظر میں حسین سلامبو اور رشتہ زور ماتو کی داستان عشق مرتب کی ہے۔ حسن و عشق کی آویزش۔ وحشی سپاہ کی بغاوت جنگ کے بھیانک مناظر قتل و غارتگری کی دل ہلا دینے والی روئداد۔ غرضیکہ اس زمانہ کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نہیں ہے جس پر فاضل مصنف نے روشنی نہ ڈالی ہو۔ ترجمہ دو جلدوں میں شائع ہوا ہے ضخامت ... ۵ صفحات ہر دو جلد قیمت تین روپے ۳ر

شاخ نبات مصور مجموعہ کلام حضرت طالب باغپتی حضرت طالب باغپتی ملک کے مشہور اور دقیقہ رس شعراء میں سے ہیں جنکی ذات علمی و ادبی حلقوں میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ آپ کی تازہ ترین تصنیف شائع ہو چکی ہے جو شاخ نبات کے نام سے بالکل اسم با مسمیٰ ثابت ہو رہی ہے شاخ نبات اس سال کی بہترین تصنیف ہے۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات متعدد سہ رنگی تصویریں۔ قیمت عہ

طلسم سامری ملک روس کی ایک نہایت دلچسپ داستان سامری اور انارکسٹوں کے خوفناک حالات اس قدر دلچسپ ہیں کہ شروع کرکے چھوڑنے کو جی نہیں چاہتا۔ تاریخی حقائق کو ایسے رنگین و ہوشربا پیرائے میں بیان کرنا میاں اسلم کی جادو نگاری ہی کا کام ہے۔ قیمت صرف عہ

عجیب مشہور زمانہ ادیب قاضی عبدالغفار مصنف "لیلیٰ کے خطوط" کی نہایت عجیب تصنیف قیمت عہ ایک روپیہ

آرائش جمال باتصویر اردو زبان میں زنانہ سنگھار کے متعلق ایسی کتاب جو ایک معزز خاتون نے لکھی ہے۔ اس سے پہلے اس قسم کی دوسری کتاب موجود نہیں تھی جو بہو بیٹیوں کے ہاتھ میں دی جاسکے۔ کتاب کی خوبیاں پڑھنے سے واضح ہونگی۔ متعدد ہاف ٹون تصاویر حجم ۲۷۰ صفحات مجلد صرف عہ

طلسمات جوانی کی الجھنوں اور رنگینیوں کے پندرہ مرقعے قیمت عہ

ملنے کا پتہ :- عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور

ب، تقدیر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔ قیمت ۱۰/

م۔ تاریخی واقعہ ہے۔ عہد فاروقی میں ایران پر حملہ۔ عہ

ان حیات۔ تعویذ گنڈا کے خلاف۔ قیمت عہ

ت کی مائیں ...... قیمت عہ

ع خاتون فخر نسواں ہند محترمہ خاتون اکرم کی جوانمرگی

پر چند آنسو ......

سیا کی سرگذشت نیٹن اور بدنتی کی دلدادہ ایک انگریز خاتون کی زندگی کے حالات خود اس کی زبانی۔ ۴/

نی عشو اس قدر پر لطف قصہ ہے کہ ہنستے ہنستے پیٹ میں بل پڑ جاتے ہیں۔ قیمت ۱۰/

نہ سعید ایک مصیبت زدہ لڑکی کا دردو غم بھرا افسانہ۔ ۸/

ر کا حکیم و ڈاکٹر

علوم الابدان میں سب سے اشرف فن طب ہی لیکن افسوس کہ جس قدر یہ فن انسان کے لئے مفید ہے اس نسبت سے اسکو عوام الناس کے لئے سہل الحصول بنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ نتیجہ مختصر یہ بڑے شہروں میں لائق ڈاکٹر اور حکیم مل سکتے ہیں۔ مگر غربا اور متوسط درجہ کے لوگ ان کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے ب کی کتب سے امداد حاصل کرنا۔ سو اس فن میں کتب تو بہت مگر عموماً طویل اور اصطلاحات سے پر۔ حکیم ڈاکٹر کریم بخش صاحب ن تمام عقدوں کو حل کیا ہے۔

(۱) کتاب عام فہم اور سلیس اردو ہے ثقیل اصطلاحات سے مبرا ہے اور ع ایسی کہ دریا کو زہ میں بند کر دیا ہے۔

(۲) یہ کہ ہر ایک بیماری کا نام پانچوں زبانوں میں انگریزی، یونانی انگریزی ن عربی فارسی، ہندی یا پنجابی بحروف اردو تحریر کرتے ہیں۔

(۳) یہ کہ ہر ایک بیماری کے اسباب، علامات، تشخیص تا مغالطہ نہ ہو

(۴) جس قدر نسخہ جات درج ہیں دیدہ ہیں شنیدہ نہیں۔

(۵) یہ کہ ڈاکٹر موصوف کے مدت العمر تجربہ اور ساتھ ہی والد مرحوم کے ب نسخوں سے خصوصاً زہر خوردں کے علاج نہایت وضاحت سے درج ہیں

(۶) یہ کہ جو کشتہ نہایت مجرب تھے۔ سب درج کر دیئے گئے ہیں
قیمت باوجود ان سب خوبیوں کے صرف عہ

کشتہ جات کا خزانہ

یعنی

جامع الاکاسیر معروف رسالہ کشتہ جات بے نظیر

طالبان علم کیمیا کو مبارک ہو۔ کہ وہ اسرار کیمیاگری جو کیمیاگروں کے سینہ بسینہ چلے آتے تھے۔ اور خاص کر انہیں کی ملکیت تھی۔ کسی سے نسخہ بیان کرتے وقت طرح طرح کی سرگوشیاں کرتے تھے۔ وہ نکات خاکسار نے اس کتاب میں اظہر من الشمس کر دیئے ہیں کہاں ہیں وہ لوگ جو راستہ بھولے ہوئے تھے ان کا رہبر بلکہ گم گشتگاں کو راہ راست پر لانے والا سورج روشن ہو گیا۔ پارہ سم الفار۔ سونا۔ چاندی۔ آہن۔ تانبہ۔ سکہ۔ ہڑتال جست۔ نوشادر۔ کانسی۔ قلعی۔ گندھک وغیرہ وغیرہ کا صاف کرنا اور تکلیس و تصعید کرنا اور سمیات سم الفار۔ کافور۔ ہڑتال شنگرف۔ نمک۔ مینسل۔ جست وغیرہ وغیرہ کا قائم کرنا اور عمل کرنا اس کے ادنے کرشمے ہیں۔ کاغذ۔ لکھائی، چھپائی بڑی اعلیٰ

قیمت حصہ اول ۴/ حصہ دوم ۱۲/ حصہ سوم ۶/ چہارم ۴/ پنجم ۴/

حاجت روا

اگر آپ کسی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ یا بیروزگاری کے ستائے ہوئے ہیں۔ یا کسی کی تیز نظر کے گھائل ہیں۔ یا کسی مقدمہ میں کامیابی چاہتے ہیں تو ہماری یہ کتاب منگوایئے۔ جس میں سب کے سب تمام مجرب اور آزمودہ عمل جمع کئے گئے ہیں۔ اس سے پہلے اس قسم کی جامع اور مستند کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی ہے۔ آج ہی منگوا لیجئے ورنہ بعد میں پشیمانی ہو گی۔ کیونکہ اس کے دو ایڈیشن پہلے بھی ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئے ہیں۔ اب یہ تیسرا ایڈیشن چھ ماہ کی محنت کے بعد شائع کیا گیا ہے۔ زیادہ تعریف فضول ہے۔ اس شخص کو مبلغ

ایک ہزار روپیہ

انعام دیا جائیگا جو کتاب ہٰذا کے ایک عمل کو بھی غلط ثابت کر دیگا قیمت مجلد عہ

ملنے کا پتہ:- عالمگیر بکڈپو بازار سید مٹھا لاہور۔

عالمگیر بک ڈپو کی اسلامی کتابیں ضرور ملاحظہ فرمائیے

تاریخ اسلام (مکمل) مولفہ اکبر شاہ خاں صاحب نجیب آبادی، اس تاریخ کی ضخامت نہ اس قدر زیادہ ہے۔ کہ آج کل کے لوگ اس کا مطالعہ نہ کر سکیں نہ اسقدر مختصر ہے۔ کہ کوئی چیز رہ گئی ہو پیچیدہ اور دماغ میں رہ سکنے والے واقعات کو اس خوبی کے ساتھ سلجھا کر لکھا گیا ہے۔ کہ پڑھنے کے بعد انسان حیران رہ جاتا ہے۔ کوئی قابل تذکرہ بیان ایسا نہیں جو چھوٹ گیا ہو اور کوئی واقعہ ایسا نہیں جو غلط ہو۔ یہ تاریخ نجیبہ اور سنجیدہ اردو زبان میں لکھی گئی ہے۔ کسی جگہ سنجیدہ اور محققانہ انداز بیان کو ہاتھ سے نہیں دیا حقیقت یہ ہے۔ کہ اس تاریخ کی خوبی صرف مطالعہ کے بعد ہی ہر شخص کو معلوم ہو سکے گی۔ قیمت جلد اول للعہ رعایتی سے جلد دوم للعہ رعایتی جلد سوم رعایتی عہ

پیغمبر صحرا علامہ خالد لطیف گابا کی مشہور عالم کتاب "دی پرافٹ آف دی ڈیزرٹ" کا اردو ترجمہ بہترین کتابت وطباعت قیمت مجلد عہ غیر مجلد عہ

ذکر حبیب قیمت تین روپے سے

سیرۃ الصحابہؓ صحابہؓ کرام جیسی مقدس ہستیوں کے عقائد و عبادات و معاملات حسن معاشرت علوم و فنون اور زندگی کے مفصل حالات اس میں درج ہیں مولفہ جناب سید انصاری ندوی قیمت جلد اول عہ جلد دوم للعہ علاوہ محصول کتابت طباعت اور کاغذ بہترین۔

سیرۃ حضرۃ خدیجۃ الکبریٰ حجم ۱۴۰ صفحہ۔ کتاب میں حضرت ام المومنین کے مزار مبارک کا فوٹو بھی دیا گیا ہے پہلے چار دفعہ چھپ کر فروخت ہو چکی ہے اب پانچویں دفعہ طبع ہوئی ہے قیمت فی جلد ایک روپیہ دو آنے عہ

خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا رضی اللہ عنہا کے حالات زندگی میں ایک جامع و مکمل کتاب باتصویر قیمت صرف دو روپیہ دس آنے علاوہ محصول ڈاک عہ

سوانح سلطان صلاح الدین قیمت صرف عہ

سیرۃ الحسینؓ حضرت امام حسین علیہ السلام کے حالات زندگی شہادت و واقعہ کربلا کی مبسوط تاریخ معہ آپ کے مزار مبارک کے فوٹو کے چار رنگوں میں چھپا ہوا نفیس سرورق بہترین کاغذ و طباعت قیمت صرف عہ دو روپیہ دو آنہ علاوہ محصول ڈاک

سیرۃ حضرت بلالؓ عاشق رسول صلعم اسلام کے پہلے موذن حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے حالات میں یہ کتاب چار دفعہ چھپ چکی ہے اب پانچویں دفعہ طبع ہوئی ہے قیمت عہ

سیرۃ صدیقہ ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ کے حالات زندگی میں جامع و مکمل کتاب باتصویر قیمت صرف عہ

فقرائے اسلام اس کتاب میں ان پیشوایانِ دین کے سبق آموز حالات درج ہیں جنھوں نے فقر و فاقہ کے باوجود اسلام کے اصول و ارکان کو استوار و مستحکم کر لیا۔ مصنفہ مولینا عبدالسلام ندوی قیمت اصلی صرف عہ

صحابیات یہ کتاب اکثر زنانہ اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہے اس میں ۸۰ صحابیات کے حالات درج مولفہ مولانا نیاز فتحپوری۔ قیمت مجلد صرف عہ

ترجمان القرآن مصنفہ مولینا ابوالکلام آزاد دہلوی جلد ۲ سورۂ اعراف سے سورۂ مومنون تک یہ جلد اپنی نوعیت میں پہلی جلد سے بھی مہتم بالشان ہے یعنی حواشی زیادہ مفصل اور دلکش اہم مسائل پر مشتمل ہیں۔ قیمت جلد اول عہ جلد دوم عہ کتاب ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو رہی ہے۔

سترہ رمضان علامہ جرجی زیدان کے بے نظیر اسلامی تاریخی عربی ناولوں کا اردو ترجمہ۔ دلچسپی کے لئے جرجی زیدان کا نام کافی ہے قیمت جلد اول عہ دوم عہ

الفاروق حضرت فاروق اعظمؓ کی مکمل لائف اور ان کے طرز حکومت کا مفصل بیان علامہ شبلیؒ کی زندہ جاوید تصنیف قیمت قسم اعلےٰ عہ دوم عہ

عالمگیر بک ڈپو۔ لاہور

بھاگتے ہی چلے گئے۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلہ پر ایک خوفزدہ ہرنی بھاگی ہوئی جا رہی تھی۔ چیتے نے جھاڑی سے نکل کر اس پر حملہ کرنے کے لئے جست کی ہی تھی کہ ایک ہرن نے آواز دی۔

"یہ تو میری دُلھن ہے۔"

اس آواز کے سنتے ہی شیر الٹے پاؤں واپس ہو گیا اور ہرنی اٹکھیلیاں کرتی ہوئی جھاڑیوں میں گھس گئی۔ شیر کو دیکھ کر میں بہت خوفزدہ ہو گئی۔ میرا بدن کانپنے لگا۔ اور میرے پاؤں اٹھائے نہ اٹھتے تھے۔ مجھ پر کچھ غنودگی سی طاری ہوئی۔ غنودگی کے بعد جو ہوش آیا تو میں نے اپنے کو ایک تالاب کے کنارے کھڑا ہوا پایا۔ جہاں ایک گاؤں کی دُلھن پانی بھر رہی تھی۔ یہ لڑکی شکل صورت میں بارہ برس کی معلوم ہوتی تھی۔ بس ذرا جسم گدرا تھا۔ اس کے ہاتھ پاؤں میں مہندی لگی ہوئی تھی۔ آنکھیں کاجل سے بھری ہوئی تھیں۔ ماتھے پر سیندور کا ٹیکہ لگا ہوا تھا۔ نہایت ہی گہری نیل کا جوڑا پہنے ہوئے تھی۔ پیروں میں چاندی کے موٹے موٹے کڑے تھے اور ہاتھوں میں ہری ہری چوڑیاں۔ اس کا شوہر دھوتی باندھے ہوئے جامن کی شاخ پر بیٹھا ہوا تھا۔ دلھن نے ہاتھ منہ دھو کر اٹھنا چاہا کہ اس کا پیر پھسل گیا اور وہ پانی میں غوطے کھانے لگی۔ اس کا شوہر جامن کی شاخ سے کود کر بولا۔

"یہ تو میری دُلھن ہے۔"

اس کا یہ کہنا تھا کہ موجوں نے دلھن کو کنارے کے سہارے لا کر کھڑا کر دیا۔ میں عورت کے دیکھنے کے لئے تیزی کے ساتھ دوڑی راستہ میں جامن کی جڑ سے میرا دوپٹہ الجھ گیا۔ ادھر میں زمین پر گری اور ادھر میری آنکھ کھل گئی۔ بارش تھم چکی تھی مگر پرنالوں سے پانی ٹپک رہا تھا۔ میں تھوڑی دیر تک پلنگ پر کروٹ بدلتی رہی۔ اس کے بعد دن نکل آیا۔ میں پلنگ سے اٹھتے ہی دلھن کے کمرے میں پہنچی۔ وہاں جا کر دیکھا کہ مسہری کے ایک کونے میں دُلھن سمٹی ہوئی بیٹھی ہے اور بستر پر پھول نے ہوئے بکھرے پڑے ہیں۔ مجھے آج تک حیرت ہے کہ "وہ" جس کا احترام پانی کی موجیں اور شیر کرتے ہیں کس لئے اس قدر مجبور بنی بیٹھی تھی۔ یا تو میرا خواب جھوٹا تھا یا "دلھن" اپنی ہستی سے ناواقف تھی۔

[illegible] سب نے قہقہہ لگایا۔ چنچل لڑکی خواب بیان کرنے والی کے رخسار کو ٹھوکا دیکر بولی۔ "ابھی سے دلھن بننے کی تمنا ہے۔" لڑکی نے شرما کر گردن جھکا لی۔

دوسرا خواب

اس کے بعد دوسری لڑکی بولی۔ "پچھلے جاڑے کا واقعہ ہے کہ ہمارے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ ہماری ملازمہ کو اس دن بخار آ گیا۔ گھر کا تمام کام کاج مجھے ہی کرنا پڑا۔ رات کو پلنگ پر لیٹتے ہی نیند آ گئی۔ غافل ہونے کے بعد میں نے دیکھا کہ ہمارے گھر میں کوئی تقریب ہو رہی ہے۔ سیکڑوں مہمان جمع ہیں۔ مکان کی چھتوں پر رنگ برنگ کی جھنڈیاں لہرا رہی ہیں اور منڈیروں پر فانوس روشن ہیں۔ دالانوں میں دسترخوان بچھے ہوئے ہیں جن پر بیسیوں قسم کے کھانے چنے ہوئے ہیں۔ مردانہ بیٹھک میں قالین کا فرش ہے۔ اور وہاں طوائف کا گانا ہو رہا ہے۔ طوائف ہلکے گلابی رنگ کی ساری پہنے ہوئے ہے۔ ساری کے نیچے مہین جالی کا بلاؤز ہے۔ طوائف کا رنگ کھلتا ہوا ہے ناک نقشہ باریک اور موزوں، پاٹ دار آواز ہے۔ میں جھروکے میں بیٹھی ہوئی یہ منظر دیکھ رہی ہوں کہ سارے کے سارے مرد طوائف کو بُری طرح سے گھور رہے ہیں طوائف ہاتھوں اور آنکھوں کے اشارے سے نہ معلوم کیا جادو کر رہی تھی کہ ساری محفل بت بنی ہوئی ہے۔ اتنے میں بڑے زور کا دھماکہ ہوا اور دھماکے کے ساتھ ہی کمرے کی دیواروں سے پانی ابلنے لگا۔ تھوڑی سی دیر میں ہمارا سارا گھر پانی میں ڈوب گیا۔ سب لوگ پانی میں ڈبکیاں کھانے لگے۔ میں نے اچھی طرح دیکھا کہ کمرے کی سطح پر طبلے ستار اور سارنگی تیرتے پھرتے تھے۔ اتنے میں ایک کشتی آتی ہوئی دکھائی دی۔ سب لوگوں نے کشتی کی طرف بڑھنے کی کوشش کی لیکن موجوں نے ان کو بڑھنے سے روک دیا۔ کشتی میرے پاس آ کر رکی اور پتوار چلانے والے نے مجھے گود میں اٹھا کر کشتی میں بٹھا لیا۔ میں نے پتوار پر جو نظر ڈالی تو اس پر لکھا ہوا تھا۔ "عورت کی محافظ۔"

میں نے کشتی بان سے گھبرا کر کہا کہ دیکھو سامنے طوائف غوطے کھا رہی ہے اسے خدا کیلئے بچاؤ۔ لیکن کشتی بان نے جھنجھلا کر کہا۔ "اس چڑیل کو ڈوب جانے دو۔"

میں اس کی پتوار پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ "آپ تو عورت کے محافظ ہیں" کشتی بان نے پتوار کو گھماتے ہوئے جواب دیا۔ "عورت کا محافظ ہوں۔ طوائف کا نہیں ہوں، عورت عصمت ہے اور عصمت ہی عورت ہے عصمت زائل ہونے کے بعد عورت کی نسوانیت باقی نہیں رہتی اور اس کو ہم عورت نہیں کہہ سکتے۔"

اس پر میں نے گھبرا کر کہا "کیا آپ بیچارے مردوں کی جانیں نہ بچائینگے؟" کشتی بان کڑک کر بولا "میں ان مردوں کی جان بچاؤں گا جو مرد ہیں۔ نامردوں اور بوالہوسوں کو میں فنا کر دونگا، ڈبو دونگا، موت کے گھاٹ اتار دونگا۔ جو مرد عصمت پر بے عصمتی کو ترجیح دیتا ہے اسے کتے اور سور کی طرح مار ڈالنا چاہئیے۔"

طوفان بڑھ رہا تھا ہزاروں آدمی ڈوب رہے تھے اور سیکڑوں لاشیں سطح پر تیر رہی تھیں ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا تھا کشتی بان پتوار کو زور زور سے چلا رہا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کشتی کے ایک تختے پر چند جملے سرخ حروف میں لکھے ہوئے ہیں۔

"عورت محبت ہے اور محبت ہی عورت ہے۔"

"عورت نہ ہو تو کچھ نہ ہو عورت ہے تو سب کچھ ہے۔"

"عورت کی پرستش نہ کر سکو تو کم سے کم اس سے محبت کرو۔"

"عورت کائنات کا دل اور دنیا کی روح ہے۔"

"عورت سکون کی دولت اور مسرت کا خزانہ ہے۔"

تھوڑی دیر کے بعد ایک پہاڑی آگئی جس کے قریب کشتی بان نے کشتی کو روک دیا اور مجھ سے کہنے لگا "جا! اس پہاڑی پر چلی جا، وہاں تجھے عورتیں بھی ملیں گی اور مرد بھی۔" میں گھٹنوں برابر پانی میں ہو کر کنارے پر پہونچی اور چٹانوں پر چڑھتی چلی گئی اوپر جا کر دیکھا تو سیکڑوں مرد اور عورتیں گھوم رہے ہیں مجھے دیکھتے ہی سبھوں نے میرا استقبال کیا اور پرجوش آواز میں کہا۔ "آگئیں! تمھارا ہی انتظار تھا۔"

یہاں شہر میں جب کسی گلی سے گزرتی ہوں تو سیکڑوں نگاہیں مجھ پر حملہ آور ہو جاتی ہیں مگر وہاں میں نے دیکھا کہ جوانوں کی ایک ٹولی میرے سامنے سے گذر گئی۔ لیکن کسی نے میری جانب آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا ایسا معلوم ہوتا تھا کہ میں فرشتوں کی دنیا میں آگئی ہوں سب لوگ ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے، نہ فساد نہ دنگا۔ نہ چھیڑ چھاڑ نہ تاک جھانک۔

میرے ساتھ کتنی ہی نوجوان لڑکیاں ہوگئیں ہم سب ایک باغ میں جا پہنچے، باغ کیا تھا سچ مچ کی جنت تھی فواروں کے جھرمٹ میں ہریالی کا سماں اور پھلواری کی بہار اب تک میری آنکھوں میں پھر رہی ہے۔ ہم سب باغ میں گھومنے لگے، سامنے کچھ فاصلے پر نوجوان لڑکے کھیل رہے تھے شفتالو کے درختوں کی آڑ میں کچھ کچھ نظر آتے تھے۔ میں گلاب کی کیاری میں پھول توڑنے کے لئے گئی۔ میری انگلیاں پھول کو پورے طور پر چھونے بھی نہ پائی تھیں کہ میرے سینہ میں گلاب کا ایک پھول آکر لگا۔ میں نے اپنے ساتھ کی عورتوں کو آواز دیکر بلایا اور کہا "کسی نے گلاب کا پھول اس زور سے میرے سینے پر پھینکا کہ میرے سینہ میں درد ہونے لگا۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ تمام عورتیں مجھے مبارکباد دینے لگیں کئی لڑکیوں نے میرے بالوں میں کلیاں لا کر الجھا دیں اور سب مجھے "دلھن دلھن" کہنے لگیں۔ ایک لڑکی نے زور سے آواز دی۔ "جس لڑکے نے ادھر گلاب کا پھول پھینکا ہے وہ یہاں چلا آئے۔"

لڑکی کی آواز نے مجھے چونکا دیا اور میری آنکھ کھلی ہے تو میرا کلیجہ دھک دھک کر رہا تھا۔ سب لڑکیاں ہنسنے لگیں چنچل لڑکی نے خواب سنانے والی لڑکی کا ہاتھ تھام کر کہا "گلاب خاں تمھارے . . کا نام ہوگا۔ یہ اس خواب کی تعبیر ہے۔" لڑکی نے آنکھیں جھکا لیں۔

تیسرا خواب

اس کے بعد چنچل لڑکی نے رخسار پر بکھری ہوئی زلفوں کو ہٹاتے ہوئے کہا کہ اس مہینہ کی چاندرات کو میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک ایسی ریل گاڑی میں سوار ہوں جسے بغیر سینگ کی گائیں کھینچ رہی ہیں جب اسٹیشن پر ٹرین رکتی ہے تو مسافر گایوں کے تھنوں سے دودھ نکالنے لگتے ہیں۔ کئی سٹیشن کے بعد جنکشن آیا۔ اس جنکشن پر جتنے آدمی نظر آئے ان سب کے سروں پر چھوٹے چھوٹے سینگ اور پشت پر دم تھی۔ دمدار اور سینگوں والے انسانوں کو دیکھ کر مجھے بڑی وحشت ہوئی۔ میں نے ڈبہ کا دروازہ بند کر لیا۔

تاکہ ان حیوان نما انسانوں کو نہ دیکھ سکوں۔ مگر تھوڑی دیر بعد پلیٹ فارم سے ایک آواز آئی۔ "ایک گائے نے بچہ دیا ہے اور ایک گائے کو تکلیف ہے اس لئے ٹرین آگے نہیں جا سکتی۔"

مجھے بھی مجبوراً اترنا پڑا لیکن میں نے آنکھیں نیچی کئے ہوئے چلنا شروع کیا۔ تاکہ سینگوں والے انسانوں کی مکروہ صورتیں نہ دیکھ سکوں۔ زنانے ویٹنگ روم میں پہنچکر کیا دیکھتی ہوں کہ ویٹنگ روم کی خادمائیں لوہے کی سلاخوں سے کمرے میں سوراخ کر رہی ہیں۔ مجھے ان کی یہ حرکت دیکھکر بڑا تعجب ہوا خادماؤں کے پاس جاکر میں نے اس کا سبب پوچھا۔ ایک خادمہ نے تیوری چڑھا کر جواب دیا۔ "اس ویٹنگ روم میں ایک مرد گھس آیا تھا اس لئے ہم اس عمارت کو برباد کرکے چھوڑیں گے۔"

میں نے اس پر کہا۔ "تو عمارت کے ڈھانے سے کیا فائدہ؟"

اس پر تمام ملازماؤں نے ایک زبان ہوکر کہا۔ "اس لڑکی کو بھی موت کے گھاٹ اتار دو یہ مردوں کی ہمدرد معلوم ہوتی ہے۔"

میں نے گھبرا کر جواب دیا۔ "میں مردوں کی ہمدرد و مددرد نہیں ہوں مجھے تو نہیں عمارت کی بربادی کا قلق ہے"۔

تھوڑی دیر تک میں ویٹنگ روم میں بیٹھی رہی اس کے بعد ٹانگہ میں سوار ہوکر شہر کا رخ کیا۔ راستے میں ایک مقام پر بڑی بھیڑ نظر آئی پوچھنے پر معلوم ہوا کہ مردوں نے عورتوں کی مخالفت میں جلسہ کیا ہے۔ یہ سن کر میں ٹانگہ سے کودی اور آن کی آن میں جلسہ گاہ میں جا پہونچی۔ ایک مرد جس کی مونچھوں کے آدھے بال سپید ہو چکے تھے تخت پر کود کود کر تقریر کر رہا تھا۔

"دوستو! اب ہم زیادہ دن تک صبر نہیں کر سکتے۔ ہماری قوت برداشت نے جواب دیدیا ہے۔ عورتوں نے ہماری مخالفت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی جذبہ عناد روز بروز ترقی پذیر ہے پس ہم کو مدافعت کے لئے تیار ہو جانا چاہئے۔ ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ آج سے ہم اینٹ کا جواب پتھر سے دیں گے۔ ہم اب زخم کھا کر نہیں مسکرائیں گے بلکہ زخم پہونچانے والے ہاتھ کو مجروح کرکے دم لینگے۔ یہ اپنوں ہی کا مجمع ہے یہاں کوئی غیر نہیں ہے۔"

آخری جملہ سن کر میری سانس زور زور سے چلنے لگی۔ قریب کے نوجوان نے جو مقرر کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے تھا میری طرف دیکھ کر کہا۔ "دوستو! ایک جاسوس عورت یہاں بھی موجود ہے۔" سب لوگ میری طرف غصہ بھری نظروں سے دیکھنے لگے۔ میں نے ڈھلکے ہوئے دوپٹہ کو سر پر ڈالتے ہوئے کہا "میرے عزیز بھائیو! میں عورت ہوں لیکن جاسوس اور خبر رساں نہیں ہوں میں جس ملک کی رہنے والی ہوں وہاں نہ عورتوں کو مردوں سے شکایت ہے اور نہ مردوں کو عورتوں سے۔ اگر ہے بھی تو وہ اس قدر شدید نہیں ہے کہ دونوں طرف لڑائی کے مورچے قائم ہو جائیں۔ میں تو اس تمہارے ملک میں آکر پریشان ہو گئی۔"

اس پر مقرر نے تالیاں بجا کر کہا۔ "یہ عورت ہندوستان کی رہنے والی معلوم ہوتی ہے۔ مجھے اس کے کہنے کا پورا یقین ہے۔ بھائیو! اس سے کچھ بھی نہ کہو۔ یہ عورت قابل احترام ہے۔" تھوڑی دیر تک تقریر ہوتی رہی اس کے بعد جلسہ برخاست ہو گیا۔

میں اس بستی کے راستوں سے ناواقف تھی۔ اس لئے نیچے سڑک پر چلنا شروع کیا۔ آگے چل کر ایک باغ ملا جہاں عورتوں کا جلسہ ہو رہا تھا۔ مجمع بہت کافی تھا میں نے نظر ڈالی تو اس مجمع میں شاید ہی کوئی عورت ادھیڑ ہوگی تمام کی تمام نوجوان لڑکیاں تھیں۔ ترشے ہوئے بال۔ کھلے ہوئے سینے عریاں پنڈلیاں، ہونٹ اور رخسارے انگارے کی طرح لال بھبوکا۔ میں جب وہاں پہنچی ہوں تو ایک لڑکی نے تقریر ختم کی اور دوسری نے اس کی جگہ اسٹیج پر آکر تقریر شروع کی۔

"پیاری بہنو! تمہاری جرأتیں مستحق تبریک ہیں۔ دنیا کی تاریخ میں تمہارے کارنامے سنہرے حروف میں لکھے جائیں گے، مردوں کے بائیکاٹ کا پروگرام تم نے شروع کیا اور اسے کامیاب کر دکھایا۔ شاباش! عورت کی راہ آزادی میں سب سے بڑی رکاوٹ مرد کا وجود بحیثیت شوہر کے ہے۔ ہم نے اعلان کر دیا ہے کہ اب عورتیں مردوں کی بیویاں نہیں بن سکتیں، ہم آزاد ہیں بالکل آزاد، محبت میں بھی آزاد اور خواہشوں میں بھی آزاد۔ ہم جذبات رکھتی ہیں لیکن ان کی تسکین کا ذریعہ مرد کو کیوں بنایا جائے۔ انسانی خیال بہت کچھ جدت طراز اور متنوع ہے۔ ٹھکرا دو مردوں کو اور ان کی قوامیت کو پارہ پارہ کر دو ان کی عظمت کے ضعیفوں اور ان کے احترام کے کتابچوں کو جو عورتیں ہمارا ساتھ نہ دیں ان کو سنگین سزائیں دو۔"

اس جملہ پر میں بے اختیار ہو کر چیخ اٹھی۔ میرا چیخنا تھا کہ تمام عورتیں مجھ پر ٹوٹ پڑیں۔ میں نے بھاگنا چاہا مگر ایک لڑکی نے میری ٹانگ پکڑ لی اور میری ران میں اس زور سے چٹکی لی کہ میری آنکھ کھل گئی۔ جب میری آنکھ کھلی ہے تو میں اپنی ران سہلا رہی تھی۔

اس کے بعد سب سے بڑی لڑکی نے درخت کی شاخ پکڑ کر اپنا خواب بیان کیا۔

چوتھا خواب

پارسال بڑے دن کی چھٹیوں میں ایک رات میں نے خواب دیکھا کہ میں ایک خوشنما باغ میں گھوم رہی ہوں، باغ کیا تھا فردوس کا بہترین منظر تھا۔ ایک ایک پتی جاذب نگاہ تھی۔ اس باغ میں ایک عجیب بات یہ نظر آئی کہ ہر چیز کا رنگ سرخ تھا چنبیلی کے پھول بھی سرخ اور نرگس بھی سرخ کانٹے بھی سرخ اور پتیاں بھی سرخ۔ انتہا یہ کہ بھونرے بھی بیر بہوٹی بنے ہوئے تھے۔ ہر طرف فوارے جاری تھے جو سرخ موتی برسا رہے تھے۔ اتنے بڑے باغ میں میرے سوا کسی آدم زاد کا نشان بھی نہ تھا۔ مجھے پیاس معلوم ہونے لگی۔ باغ کے وسط میں تالاب تھا۔ پیاس بجھانے کے لئے وہاں پہونچی تالاب کا پانی سرخ تھا۔ میرے کنارے پر پہونچتے ہی پانی ابل کر میرے قریب آگیا۔ پیاس اگرچہ شدید تھی لیکن خون کے رنگ کا پانی مجھ سے نہ پیا گیا بس ذرا لب تر کر کے رہ گئی۔ تالاب کے قریب سرو کے درختوں کا جھنڈ تھا، اس جھنڈ کے آس پاس چمکیلے مرمر کے تخت بچھے ہوئے تھے۔ میں ایک تخت پر جا کر بیٹھ گئی۔ میں منظر سے لطف اندوز ہو رہی تھی کہ ایک کلنگ نے آکر میرے دامن کو جھٹکا دیا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی صورت یہ تھی کہ کلنگ میرا دامن پکڑے ہوئے آگے آگے چل رہا تھا اور میں پیچھے پیچھے چل رہی تھی۔ کلنگ مجھے روشوں پر لئے پھرتا رہا۔ تھوڑی دور جا کر ایک بارہ دری نظر آئی وہاں جا کر کلنگ نے مجھے چھوڑ دیا۔ ایسی خوشنما عمارت میں نے آج تک نہیں دیکھی محرابیں اتنی خوشنما اور متناسب کہ میری نگاہیں طواف کرنے لگیں دیواروں پر خوشنما پھول بنے ہوئے۔ میں بارہ دری کے اندر داخل ہوئی اس کے وسط میں ایک کمرہ بنا ہوا تھا جس کے دروازے پر سرخ مخمل کا پردہ پڑا تھا۔ میں نے پردے کو جو ہاتھ لگایا تو پردے سے سرخ پانی ٹپکنے لگا تھوڑی دیر میں تمام پردہ سرخ پانی میں تحلیل ہو گیا۔ میں کمرے کے اندر داخل ہوئی کمرہ کیا تھا اچھا خاصا محل تھا۔ بہترین ساز و سامان قرینے سے سجا ہوا۔ ہر چیز اپنی جگہ پر مناسب طریقہ پر رکھی ہوئی۔

کمرے کے وسط میں مسہری بچھی ہوئی تھی جس پر سرخ جھالریں پرند کی شکل میں پڑی ہوئی تھیں میں نے مسہری کا پردہ پر زور جھٹکے کے ساتھ اٹھا دیا۔ پردہ کا اٹھنا تھا کہ ایک نوجوان رنگین ہتھیلیوں سے آنکھیں ملتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا اس نے میرے ہاتھوں کو گداز انگلیوں سے دباتے ہوئے کہا "اب عیش جنت مکمل ہو گیا"۔۔ میری پیشانی شرم کے مارے عرق آلود ہو گئی اور میں نے اس کی صبیح انگلیوں سے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لئے اقدام کیا ہی تھا کہ میری آنکھ کھل گئی۔ اس خواب کا اثر نہ پوچھئے میں محسوس کر رہی تھی کہ واقعی کسی نے میرے ہاتھ کو محبت کے ساتھ سہلایا ہے۔

تمام لڑکیاں قہقہہ لگا کر اٹھ بیٹھیں اور خوشنما گلدستے ہاتھوں میں لئے ہوئے اپنے گھروں کو سدھاریں۔

ماہر القادری

افسانہ پارینہ کی یاد

از :-
مولانا عشرت رحمانی

عشقِ فسانہ ساز کی باتیں بنائے جا حُسنِ فسوں طراز کے یہ نغمے گائے جا
کانوں کی راہ بادۂ عشرت پلائے جا ـــــــــ ہاں اے "فسانہ خواں"
وہ فسانہ سُنائے جا

دستاں سرائی نے تری کیا کیا مزا دیا وہ کچھ سُنا دیا کہ دلوں کو ہلا دیا
چرخِ ستم شعار کے فتنے مٹائے جا ـــــــــ ہاں اے "فسانہ خواں"
وہ فسانہ سُنائے جا

سحر بیاں سے تونے اُڑائے حواس و ہوش اُلٹے ترے فسانوں نے یہ بزمِ ناؤ نوش
کیفیتیں زباں کی یونہیں لُٹائے جا ـــــــــ ہاں اے "فسانہ خواں"
وہ فسانہ سُنائے جا

جادو بیانیوں نے تری مست کر دیا رگ رگ میں گویا زہرِ غمِ عشق بھر دیا
اس کیفِ "مضمحل" کو خدا را بڑھائے جا ـــــــــ ہاں اے "فسانہ خواں"
وہ فسانہ سُنائے جا

افسانہ سازیوں سے تری دل مچل گیا دل کیا بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا!
یاد اُس غم نشاط کی لا! اور لائے جا! ـــــــــ ہاں اے "فسانہ خواں"
وہ فسانہ سُنائے جا!

شہنشاہ ہمایوں!

ایک بہترین تاریخی مقالہ

از:- مولانا عبد السبحان صاحب

بعض واقعہ نویسوں کو جب مسلمان بادشاہوں کی عملی کارروائیوں پر براہ راست حملہ کرنے کا موقعہ نہیں ملتا تو وہ کوشش کرکے اُن کے عمدہ خصائل اور نیک عادات کو پبلک کے سامنے اس طرح رنگ آمیزی کرکے پیش کرتے ہیں۔ کہ پڑھنے والوں کو خواہ مخواہ دھوکا ہوتا ہے میں نے ایک امریکن کی کتاب مغل امپررز کا ترجمہ کیا ہے۔ جس میں مصنف ہمایوں کا کیرکٹر بیان کرتے ہوئے یوں گوہر افشانی کرتا ہے۔

"مغل بادشاہوں میں ہمایوں ایک ایسی مثال ہے۔
جس کی تمام عمر یورش اور جلاوطنی میں صرف ہوئی کیونکہ
وہ بہت زیادہ شفقت کرنے والا اور ایسا نرم مزاج تھا
کہ اس کی حکمت عملی کو دکھ دعویداران سلطنت کی قسمت
کا اس طرح فیصلہ کرنا کہ انہیں نظر بند رکھا جائے
یا قتل کردیا جائے۔ تاکہ اُن کی رخنہ اندازیوں اور
فتنہ پردازیوں سے مامون رہ سکیں) انتہائی حد تک
عمل میں نہ لا سکتا تھا۔ اُس کی نرمی اور نیک مزاجی
ہی اُس کی ساری مشکلات کا باعث ہوئیں جیسا
کہ بہت سے ایسے اوصاف جو موٹی آدمی کے لئے
ہر دلعزیزی کا باعث ہوتے ہیں سلطنت کے حق
میں تقریباً بربادی کا سبب ہوتے ہیں۔ چنانچہ جب تک
کہ جنگ کے ذریعے یا کسی اور طرح پر اُس کے بھائی
اُس کی سلطنت سے علیحدہ نہیں ہوئے۔ اُسوقت
تک کسی قسم کا امن پیدا نہیں ہوا۔ ہمایوں گو ہندوستان
کا بادشاہ تھا۔ لیکن وہ فوجی طاقت کے ایسے ذرائع
قائم نہ رکھ سکا جن کی مدد سے تخت سلطنت پر مضبوطی
کے ساتھ قابض رہ سکتا۔ فوج اب تک موجود تھی،
لیکن جنگی طاقت کو ترقی دینے یا قائم رکھنے کا بھی کوئی
پائدار ذریعہ نہ تھا۔"

"بادشاہ کے لئے عہد حکومت کے آغاز ہی میں ممکن تھا۔ کہ وہ اپنے خاص بھائیوں کی سازشوں سے بےخوف ہوکر میدانِ جنگ میں مقابلہ پر آتا۔ غیر ملک کے مورخین اُس کی ابتدائی ناکامیابی کا سبب اُس کی تلون مزاجی اور طبیعت کی کمزوری قرار دیتے تھے۔ جملہ مورخین کے بیانات سے یہ بات میرے نزدیک صاف ہو جاتی ہے۔ کہ اگر وہ اپنے باپ کی اس نصیحت پر کاربند ہوتا۔ کہ اپنے رقیب بھائیوں کے ساتھ شفقت کا برتاؤ کرے اور اگر وہ ایسا ہی کرتا جیسا کہ اُس کے جانشینوں نے کیا یعنی اُنکو فوراً قتل کرادیتا تو وہ شاید ایک کامیاب فرمانروا کہلاتا۔" گو اِس طور پر وہ بھائیوں کے مقابلہ میں بے رحم سمجھا جاتا لیکن اور باقی دنیا کے لئے ضرور رحمدل ثابت ہوتا۔ وہ اکثر نیکی کی حد سے بھی گذر کر عالی نیت اور کشادہ دل ثابت ہوا ہے کہ سیف خاں ہمایوں کے پنجہ میں گرفتار ہوگیا تھا اس کا آقا شیر خاں پہاڑ کی تنگ راہ سے چھپ کر بھاگ رہا تھا سیف خاں کے جسم میں تین جگہ زخم لگے تھے جن سے خون جاری تھا بادشاہ کے سامنے لایا گیا۔ تو ظاہر ہے۔ کہ اُسے موت کی ہیبت ناک شکل نظر آتی ہوگی۔ لیکن بادشاہ نے فرمایا۔

"ایک سپاہی کے لئے یہی شان ہے۔ اُسے اپنے آقا کی
خیرخواہی میں جان تک نثار کردینی چاہیئے میں تم کو آزاد
کرتا ہوں۔ تمہارا جہاں جی چاہے چلے جاؤ۔"

سیف خاں نے عرض کیا۔

"میرا سارا خاندان شیر خاں کے ہمراہ ہے میں اُسی کے پاس جانا چاہتا ہوں۔"

شیر خاں اس وقت مغلوں کے حق میں کانٹا ہو رہا تھا لیکن ہمایوں نے کچھ بھی پس و پیش نہیں کیا۔ اور فرمایا "میں نے تمہاری جان بخشی کی ہے۔ جو چاہو کرو"۔

ہمایوں کے عادات میں ان مشہور افسانوں کا بھی شعبہ پایا جاتا تھا جو حاتم کی جانب منسوب کئے جاتے ہیں۔ حسن کلام اور خوش آوازی کے صلے میں شعرا اور مطربوں پر خزانے کا دروازہ کھول دیتے اور ان سے پوچھتے تھے "مانگو کیا چاہتے ہو"۔ اس کے تکلیف دہ تلون یا غیر مستقل مزاجی کا ظہور خاص طور پر اس کے اوائل زمانہ حکومت میں اور مابعد صرف صلاح و مشورہ کے موقعوں پر ہوا ہے۔ وہ میدان جنگ میں چست و چالاک اور دلیر ثابت ہوا جیسا کہ امیر تیمور کے جانشین کو ہونا چاہیئے تیمور کے جملہ جانشین اپنی ذاتی شجاعت اور دل کی مضبوطی کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ ان میں سے بعض نے اپنے مورث اعلیٰ کی وہ ہمت ترکہ میں پائی تھی جس سے کہ وہ ایک مجوزہ رائے پر ہمیشہ استقلال اور ثابت قدمی کے ساتھ کاربند رہے لیکن ہمایوں نے ان اوصاف کو ترکہ میں نہ پایا تھا۔ وہ بہادر ضرور تھا لیکن اس میں استقلال کی کمی تھی"۔

یہاں تک امریکن مصنف کا مقدمہ تھا۔ اب مسٹر ارسکن کی رائے ملاحظہ ہو۔

"وہ اکثر معاملات میں تند مزاج تھا لیکن متلون طبع و بیفکر اور غیر مستقل بھی تھا۔ وہ قدرتی طور پر فیاض ملنسار اور محبت کرنے والا تھا۔ اس کی عادات شائستہ بے تکلف اور دلکش تھے۔ اس کی فیاضی آخرکار اسراف کے درجہ تک پہنچ گئی۔ اور اس کی شفقت کمزوری کی حد تک بڑھ گئی تھی۔ اور اسی لئے مرتے وقت تک وہ خوشامدیوں اور اپنے منظور نظروں کا شکار بنا رہا۔ اگرچہ وہ دلیر نیک مزاج فیاض اور علم دوست تھا مگر اس کے کل اوصاف اپنے بالمقابل برائیوں کے حد تک پہنچ گئے تھے۔ اور ان سے بہت کم مفید نتیجہ پیدا ہوا"۔

فلسفۂ تاریخ کے ان محققوں سے یہ سوال کرنا عبث ہے۔ کہ اوائل سلطنت میں بھائیوں کو قتل کر کے ہمایوں کس طرح تعریف کا مستحق ہو سکتا تھا۔ اور آج سے چار صدی پیشتر مشرق و مغرب کی تہذیب و تمدن شخصی زندگی کے بار اور مقامی حالات میں کوئی تفاوت بھی تھا یا نہیں؟ بیشک آج ہمایوں کی سی نیک مزاجی، رحمدلی اور فیاضی کی ضرورت باقی نہیں رہی! لیکن اس آزادی کے زمانہ میں کشت و خون، قتل و غارتگری کا فتویٰ دینا اور چار صدی قبل اسے مصلحتاً جائز قرار دینا کہاں تک قرین انصاف ہے؟ اس کا فیصلہ ان ہی منصف مزاجوں پر چھوڑ دینا چاہیے۔

ہمایوں ۵ اپریل ۱۵۰۸ء کو ماہم بیگم کے بطن سے پیدا ہوا۔ اور ۲۶ دسمبر ۱۵۳۰ء کو بابر کے انتقال کے بعد وصیت کے مطابق اس کا جانشین ہوا ابتو تبلیغ دربار کے مناصب اور بھائیوں کو جاگیریں عطا ہوئیں۔ بابر نے مرتے وقت امرا کا جلسہ منعقد کر کے ہمایوں کو ولیعہد قرار دیا تھا اور وصیت کی تھی کہ خدا اور بندگان خدا کے ساتھ اپنا فرض ایمانداری سے ادا کرنا۔ دیانتداری اور محنت و عدل گستری کرنا مجرموں کو سزا دینے میں نرمی کرنا اور رحم سے کام لینا۔ غریب و بیکسوں کی حمایت کرنا۔ بھائیوں کے ساتھ مہربانی اور شفقت سے پیش آنا وغیرہ"۔ ہمایوں کے حالات پڑھو اور دیکھو کہ اس نے مرحوم باپ کی [illegible] کس حد تک بجا آوری کی بھائیوں سے کبھی نہ اُنسے سلوک کی امید ہوئی [illegible] دیا مگر ہمایوں نے موقع پا کر بھی ان کی تقصیرات سے درگذر کیا اور ان کے ساتھ فیاضانہ اور مشفقانہ برتاؤ کرتا رہا۔ بیشک اس نیک مزاجی کا صلہ اُسے ضرور یہ ملا کہ اس کی ساری عمر مصیبت و تکلیف میں بسر ہوئی اور جب تک کہ پتھر کا جگر نہ کر اس نے بھائیوں کے حق میں فیصلہ قطعی نہیں کیا اس وقت تک اُسے چین نہ نصیب ہوا اور نہ سلطنت میں امن و امان پیدا ہوا لیکن اس فطرتی نیکی کا وہ کہاں تک ذمہ وار ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ ہمایوں کی فوجی طاقت گو اعلیٰ درجہ کی نہ تھی۔ مگر وہ خود بڑا شجاع اور بلند حوصلہ تھا۔ تین سو سپاہیوں کی معیت میں کانجر کے مضبوط قلعہ پر شبخون مارنا اور [illegible] کر لینا اسی کا کام تھا قلعہ فتح ہو گیا۔ تو امرا نے مشورہ کیا کہ قیدیوں کے ساتھ [illegible] کیا جاوے تاکہ خزانہ کا پتہ بتا دیں۔ ہمایوں نے محض تالیف قلوب کر کے اپنا کام نکال لیا۔ تیرہ برس کی عمر میں بابر نے حاکم بدخشاں کے انتقال پر وہاں کی حکومت تفویض کی تو اس نے جدوجہد کر کے شہر کو دشمنوں سے پاک کر دیا۔ جنوبی بدخشانی نے اس کی شان میں ۴۸ شعر کا یہ قصیدہ لکھا۔

شہنشاہا رخ تو لالہ و نسرین خط ریحاں ہمی نیم لب تو صحبہ رنگین شدہ خنداں

نمیلامم خطِ تو سبزہ و ریحاں خدِ تو گل — شود ظاہر قدِ تو فتنہ دوراں دمِ جولاں

اس قصیدہ میں معما۔ اظہار مضمر اور تاریخ کی صنعتیں بکثرت ہیں مثلاً ہر مصرعہ کے حرف اوّل سے یہ مطلع پیدا ہوتا ہے ؎

شہنشاہِ دیں بادشاہِ زماں — زبخت ہمایوں شدہ کامراں

پہلے دو اشعار کے درمیانی لفظوں سے یہ مطلع نکلتا ہے

رخِ تو لالہ نسریں خطِ تو سبزہ و ریحاں — لبِ تو غنچہ رنگیں قدِ تو فتنہ دوراں

اور درمیانی فقروں کو دوسری طرف سے لوٹ کر پڑھنے میں یہ مطلع نمودار ہوتا ہے ؎

خطِ تو سبزہ و ریحاں رخِ تو لالہ و نسریں — قدِ تو فتنہ دوراں لبِ تو غنچہ رنگیں

اس قصیدہ سے یہ قطعہ تاریخ برآمد ہوتا ہے ؎

توئی شاہ شاہانِ دوراں کہ شد — ہمیشہ ترا کار فتح و ظفر

گوئی مدِ سال و تاریخ شد — محمد ہمایوں شہ بحر و بر

۱۵۴۰ء سے پہلے میرزا عسکری اور کامران نے بغاوت کا سلسلہ شروع کر دیا تھا۔ کہ اسی سن میں بادشاہ کو شیر شاہ کے ہاتھ سے سخت ہزیمت اٹھانی پڑی اس کی ساری فوج منتشر ہو گئی بیگم کو افغانوں نے گرفتار کر لیا اور ۱۵۴۰ء میں ہمایوں بالکل بے دست و پا ہو گیا۔ دہلی اور آگرہ میں شیر شاہی ہو گئی۔ ہمایوں اور اس کی بیگم کو جسے جوانمرد شیر شاہ نے بعزت و احترام واپس کر دیا تھا۔ بھاگ کر لاہور جانا پڑا۔ سندھ کے ریگستانوں میں ہمایوں نے سخت مصیبتیں اُٹھائیں یہانتک کہ کھانے پینے کی تکلیف بھی برداشت کرنی پڑی جیگیز کے جنگل میں اُس کے رفقا ماہی بے آب کی طرح تڑپنے لگے۔ اتفاقیہ کنواں نظر آیا تو تشنگی کی بیتابی سے کئی ایک اس کے اندر گر پڑے۔ ہمایوں نے خود اس واقعہ کیطرف اشارہ کیا ہے۔

انہی ایام صعوبت میں ۲۵ اکتوبر ۱۵۴۲ء کو حمیدہ بانو کے بطن سے شہزادہ اکبر تولد ہوا۔ تین برس تک سندھ میں رہکر اور زمانہ کی سختیوں کا مقابلہ کر کے ہمایوں نے شاہ طہماسپ بادشاہ ایران کی حمایت چاہی اور شاہ کو یہ قطعہ تحریر کیا ؎

خسروا عمریست تا عنقائے عالی ہمتم — قلۂ قاف قناعت را نشیمن کردہ است

روزگار سفلہ و گندم نماد جو فروش — طوطیِ طبع مرا قانع بہ ارزن کردہ است

دشمنم شیر است و عمرے پشت بر من کردہ بود — حالیا زکیں عداوت روئے با من کردہ است

التماس از شاہ آں دارم کہ با من آں کند — آنچہ با سلماں علی در دشت ارزن کردہ است

شاہ طہماسپ نے یہ مکتوب دیکھا تو حسرت و افسوس کا اظہار کیا اور جواب نامہ میں یہ بیت زیب عنواں کی ؎

ہمائے اوجِ سعادت بدام ما افتد — اگر ترا گذرے بر مقامِ ما افتد

دیار و امصار کے وُلات و حکام اور عاملوں کو ہدایت کی کہ جہاں کہیں بھی ہمایوں کا گذر ہو آنکھوں کو فرش بنائیں۔ حاکمِ خراساں کو ہمایوں کی تشریف آوری کی یوں اطلاع دیتا ہے ؎

شرح دہ اے پیکِ صبا از خبرِ مقدمِ دوست — خبرت راست بود بہمہ جا محرمِ دوست

باشد آں روز کہ در بزم بہ بالائے بکام — بنشینم بمرادِ دل خود ہمدمِ دوست

نہایت خندہ پیشانی اور کشادہ دلی کے ساتھ بادشاہِ ہند کی خیر مقدم کی تاکید کرتا اور سمجھاتا ہے کہ کہیں اعزاز و احترام میں کوئی کمی نہ رہ جائے مراسمِ شاہانہ میں اشیائے تکلفات کی جھلک دیکھنی ہو۔ تو اکبر نامہ میں شاہ طہماسپ کا فرمان پڑھو۔

ہمایوں نے غرہ ذیقعدہ ۹۵۱ھ کو باغِ جہاں آرا واقع ہرات میں نزول اجلال فرمایا۔ محمد خاں نے جشنِ شاہانہ ترتیب دیا۔ اتفاقاً مجلس سماع میں یہ غزل گائی گئی ؎

مبارک منزلے کاں خانہ را ماہے چنیں باشد
ہمایوں کشورے کاں عرصہ را شاہے چنیں باشد

صاحبِ قاق نے جب یہ شعر پڑھا ؎

ز رنج و راحت گیتی مرنجاں دل مشو خرّم
کہ آئینِ جہاں گاہے چناں گاہے چنیں باشد

تو ہمایوں پر رقت طاری ہوئی۔ قوال کو جی کھول کر انعام عطا کیا۔

ہرات میں خواجہ عبداللہ انصاری کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور بزرگانِ دین کے مزارات کی زیارت سے شرف حاصل کیا۔ میرزا قاسم گونابادی نے ایک مثنوی شاہ ایران کے حالات میں نظم کی ہے۔ اس میں ہمایوں اور طہماسپ کی ملاقات کا ذکر یوں کرتا ہے ؎

دو صاحبقراں در یکے بزمگاہ — قراں کردہ باہم چو خورشید و ماہ

دو نورِ نہر چشم اقبال را | دو عیدِ مبارک مہ و سال را
دو کوکب کو ایشاں فلک استیں | بہم در یکے عرصہ چوں فرقدیں
دو چشم جہانی بہم ہم عناں | بہم چوں دو ابرو تو اضع کناں
دو سعد فلک است یک برج جائے | دو والا گہر را یکے دُرج جائے

ہمایوں ایران سے بارہ ہزار سواروں کا دستہ فوج ساتھ لیکر ہندوستان کو واپس ہوا۔ لیکن ابھی اُس کی مصائب کا خاتمہ نہ ہوا تھا بھائی عداوت پر کمربستہ تھے۔ کامران کو ہمایوں برادرانہ محبت کے ساتھ سمجھاتا رہا۔ مگر بے سود۔ میرزا عسکری ۱۵۵۱ء میں مکہ کو روانہ ہوا جہاں ۱۵۵۸ء میں اس کا انتقال ہو گیا۔ تاریخ وفات یہ ہے ع

عسکری بادشاہ دریا دل ٭ ہندال کامراں کا تعاقب کرتے ہوئے جس نے شبخون مارا تھا۔ اُس کے افغان ساتھیوں کے ہاتھ مارا گیا۔ شبخون مادۂ تاریخ ہے۔ کامران کی آنکھوں میں سلائی پھیری گئی۔ مسز بیوریج نے گلبدن بیگم بنت بابر بادشاہ کی ہمایوں نامہ ۱۹۰۲ء میں بمقام لندن شائع کی ہے جو قابل دید ہے۔ یہ کتاب اسی واقعہ پر ختم بھی ہوئی ہے گلبدن بیگم لکھتی ہیں :۔

"عاقبت الامر جمیع خوانان و سلاطین و وضیع و شریف و صغیر و کبیر و سپاہی و رعیت وغیرہ کہ از دست میرزا کامراں داغہا داشتند دراں مجلس متفق شدہ بعرضِ حضرت بادشاہ رسانید۔ کہ در بادشاہی و حکم رسم برادری منظور نمی باشد اگر خاطر برادر میخواہید ترک بادشاہی بکنید و اگر بادشاہی میخواہید ترک برادری بکنید و ایں ہمہ میرزا کامراں است کہ از سبب او در دست قبچاق بسر مبارک ایشاں چہ نوع زخم رسیدہ بود و افغاناں مکر و فریب دادہ یکے شدہ و متفق شدہ میرزا ہندال را کشتند و اکثر چغتائی از سبب میرزا نابود شدہ و اہل و عیال مردم بہ بند رفت و بے ناموس شد۔ دیگر مجال نماندہ کہ عیال و اطفال مردم من بعد تاب بند و عذاب ندارند و دیگر ہا بر جہنم جان و مال و اہل و عیال ما یاں ہم تصدق یکتار ہوئے حضرت ایں برادر نیست۔ ایں دشمن حضرت است۔ سخن مختصر کہ ہمہ جمع شدہ بہ اتفاق یکجہ شدہ بعرض رسانیدند۔ کہ ع رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ حضرت بادشاہ در جواب فرمودند۔ کہ اگرچہ ایں سخنانِ نمایاں خاطر نشان من میکند۔ اما دل من نمی شود۔ ہمہ فریاد برآوردند و گفتند کہ آنچہ بعرض رسانیدہ شدہ است عین مصلحت است۔ آخر الامر حضرت فرمودند کہ اگر مصلحت و رضامندی ہمہ شمایان دریں است پس ہمہ شمایاں جمع شوید و محضری نویسید۔ ہمہ از یمین و یسار امرایان جمع شدہ نوشتہ دادند بہماں مصرعہ را ع رخنہ گر ملک سر افگندہ بہ۔ بحضرت بادشاہ ہم ضرور شد۔ در نواحی رہتاس کہ رسیدند بہ سید محمد حکم کردند کہ ہر دو چشم مرزا کامراں را میل کشند۔ در ساعت رفت و میل کشید۔"

کامراں اندھا ہوا۔ تو ہمایوں اُسے ملنے گیا۔ ابوالفضل لکھتا ہے

"مرزا بعد از لوازم تعظیم و مراسم احترام اولا ایں بیت خواند" ؎

کلاہ گوشۂ درویش بر فلک ساید | کہ سایہ ہمچو تو شاہے فگند بر سرِ او

و بعد ازیں ایں بیت بر زبان مرزا رفت ؎

بر جانم از تو ہر چہ رسد جائے منت است | اگر ناوکِ جفا است و گر خنجر ستم

ہمایوں فطرتی جذبات کو ضبط نہ کر سکا اور کہنے لگا کہ
"عالم الاسرار و الخفیات آگاہ است کہ ازیں کار کہ
نہ باختیارِ من واقع شدہ بغایت شرمندہ ام کاشکے ایں
حالت از شما نسبت بمن پیشتر ازیں شدی"۔

واضح رہے کہ مرزا کامراں فن شاعری میں کمال رکھتا تھا۔ فارسی اور ترکی دونوں زبانوں میں شعر کہتا تھا۔ اس کا بیش قیمت دیوان بانکی پور کے کتب خانہ میں جو خان بہادر مولوی خدا بخش خاں سی آئی ای نے فراہم کیا اب تک محفوظ ہے۔ ہمایوں سے اجازت حاصل کر کے مرزا کامراں حج بیت اللہ کو روانہ ہو گیا۔ جہاں تین حج ادا کر کے بتاریخ ۱۱ ذی الحجہ ۹۶۴ھ ہجری کو راہی ملک بقا ہو گیا۔ اس کا بیٹا ابوالقاسم مرزا بھی شاعر تھا اور شوکتی تخلص کرتا تھا۔

یہ واقعہ ہے کہ کامراں کے معاملہ میں ہمایوں نے فی الحقیقت نرمی کا برتاؤ کیا۔ مرزا ہمیشہ اس کے ساتھ برادرانِ یوسف کی طرح پیش آتا رہا۔ مگر ہمایوں نے کبھی سخت گیری اختیار نہیں کی۔ مؤرخین اس پر تلون طبع اور غیر مستقل مزاجی کا الزام عائد کرتے ہیں۔ بعض اس کا بڑا

قصور یہی قرار دیتے ہیں کہ اُس نے بھائیوں کے حق میں مناسب فیصلہ کرنے میں بہت دیر کی۔ ہم اس اعتراض کو ٹھنڈے دل سے سنتے ہیں۔ اور خیال کرکے ہمایوں کے باپ مرزا بابر کا سلسلہ نسب پانچویں پشت میں تیمور سے ملتا ہے۔ ہمایوں کی خدا ترسی اور انسانی ہمدردی پر ضرور تعجب آتا ہے۔ لیکن جب ہم دیکھتے ہیں کہ اکبر کے حیات میں حصول اختیارات کے لئے جو کشت و خون ہوئے۔ شاہجہان نے تخت کے واسطے جس قدر بغاوتیں کیں۔ خود اس کے بیٹوں نے حکومت کی خاطر جو جد و جہد کی وہ واقعات بھی تو مورخوں کی نکتہ چینی سے نہیں بچ سکے۔ حتیٰ کہ اورنگ زیب جیسا دیندار اور خدا پرست بادشاہ بھی تو غداری۔ مکاری ظلم و سختی کے الزامات کی زد میں آ ہی گیا ہے۔ تو پھر ہمایوں کی طرف سے ان حملوں کی مدافعت کا خیال جاتا رہتا ہے۔

فرض کرو کہ قیام امن اور استحکام سلطنت کی خاطر ہمایوں بھائیوں کے ساتھ ابتداء سلطنت میں وہی سلوک کرتا جو مجبور ہو کر اورنگ زیب کو دارا شکوہ اور مراد کے ساتھ کرنا پڑا تو آج یہ انصاف پسند مورخین ہمایوں کو کس ترازو میں تولتے؟ کیا اُس وقت کی تلون اور غیر مستقل مزاجی ایسی عادات میں خونریزی و سفاکی ظلم و زیادتی کا اضافہ نہ کیا جاتا؟ استحکام سلطنت کا مسئلہ بجائے خود غور طلب ہے۔ ظاہر ہے کہ بابر کی وفات تک نظام سلطنت بخوبی درست نہ ہونے پایا تھا۔ ورنہ ہمایوں شجاعت و مردانگی میں بابر سے کم نہ تھا۔ اُس نے بدخشاں کو باپ کی حیات ہی میں دشمنوں سے پاک کر دیا تھا۔ قلعہ کالنجر کے تسخیر میں وہ اپنی غیر معمولی بہادری کا ثبوت دے چکا تھا مجبوری یہ آن پڑی کہ ہمایوں کو ارث میں جو سلطنت ملی اُسے حاصل کئے ہوئے مشکل ہی سے پانچ چھ برس گذرے تھے۔ وہ تخت پر بیٹھا تو ایک اور اندرونی قوت پٹھانوں کی جو مغلوں سے کم شجاع نہ تھے۔ زور پکڑنے لگی۔ شیر خاں نے قلیل مدت حکومت میں یہ پورے طور پر ثابت کر دیا کہ وہ سیف و قلم دونوں کا مالک کہلائے جانے کا جائز مستحق تھا اس کی فتوحات کا سیلاب ایسا نہ تھا کہ ہمایوں آسانی سے محفوظ رہ سکتا۔ وہ تو عنان حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اپنے پاؤں کھڑا ہونے بھی نہ پایا تھا کہ اُن کو قوتِ بازو سے آنکھ دکھانے لگے بھائیوں نے نرغہ کیا ادھر شیر خاں اپنا ہاں سے غراتا ہوا نکلا۔ یہ ہمایوں ہی کا دم خم تھا۔ کہ وہ اُس دوہری چوٹ کو سنبھال سکا اور پھر ۱۵۵۵ء میں جب مختصر سی فوج لے کر دوبارہ ہندوستان کی طرف ادھر مراجعت کی تو فتوحات کا تانتا باندھ دیا اور بالآخر کھوئی ہوئی سلطنت کو اپنے قبضۂ قدرت میں کر ہی چھوڑا۔

اگر اس کو زمانہ کی نیرنگی سے مہلت ملتی تو وہ اپنی اصلی قابلیت کو پورا کر دکھاتا۔ جوہر ذاتی میں وہ کسی ہمعصر فرمانروا سے کم نہ تھا۔ اس میں ایجاد و اختراع کا مادہ بھی تھا۔ وہ انتظام سلطنت کی اصلاح سے بے خبر نہ تھا۔ ابوالفضل نے اس کے عہد سلطنت کی چند خصوصیات کا ذکر کیا ہے وہ لکھتا ہے۔

"جمیع ملازمان عتبۂ اقبال بلکہ تمام متوطنان ممالک محروسہ را بسہ قسم منقسم ساخت۔ اخوان و اقربا و امرا و وزرا، کافہ سپاہیان را اہل دولت گفتند و حکما و علما، صدور و سادات و مشائخ و قضات و شعرا، سائر فضلا و حوالی اشراف و اہالی را اہل سعادت خواندند۔ و ارباب موتات و اصحاب حسن صوری و اہل نغمہ و ساز را اہل مراد نام نہادند۔ و ہمچنین بقسمت ایام ہفتہ پرداختہ ہر یکے از اہالی دولت و سعادت و مراد منسوب ساختند بریں موجب کہ روز شنبہ و پنجشنبہ باہل سعادت تعلق گرفت و دریں روز توجہ عالی بانتظام مناظم علم و عبادات متفق شد۔ و روز یکشنبہ و سہ شنبہ باہل دولت و سرانجام مہام بادشاہی و انتظام امور جہانبانی اختصاص گرفت و روز دوشنبہ و چہار شنبہ را روز مراد گرفتند۔ روز جمعہ بر طبق نام خویش جامع مراتب مذکورہ گشتہ طبقات انام از فیض عام بادشاہی بہرہ ور گشتند۔ و آنحضرت سریر آرائے فرماندہی گشتہ بزم دیوانی می آراستند بآواز نقارہ طلب مردم را آگاہی می بخشیدند و ہر گاہ از دیوان بر می خاستند۔ توبچیاں بعضے بندوق خلائق را آگاہ میگردانیدند در آں روز کیر اقچیاں بہتمام باس، چند مت خلعت و خزانچیاں چند بدرۂ زر نزدیک بارگاہ می آوردند تا در بخشش و کار روائی خلق تاخیرے نرود۔ و از مخترعات اختراعات آنحضرت پوشیدن باس ہر روز بود۔ موافق رنگے کہ منسوب بکوکب آں روز است کہ مربی است چنانچہ در روز یکشنبہ خلعت زرمی پوشیدند کہ منسوب بنیر اعظم است و در روز دوشنبہ لباس سبز کہ منسوب بقمر است و بریں قیاس و از مخترعات حضرت

طبل عدل بود کہ اگر داد خواہے را با کسے مخاصمت میشد یک نوبت چوب بر طبل بیزد و اگر تعطلہ ادا ز عدم وصول علوفہ بود۔ دو نوبت آں کار میکرد و اگر مال وجہات او را ظالمی غصب کردہ بود زیادہ زدیر دہ سہ نوبت طبل را بغفال آورد و اگر با کسے دعوئی خون داشتے چہار نوبت صدائے طبل را بلند گردانیدے"

ہمایوں ہمیشہ باوضو رہتا تھا۔ اور خدا اور رسول خدا صلعم کا نام بلا وضو نہ لیتا تھا۔ اسمائے الٰہی کی اس حد تک عزت کرتا کہ عبدالغنی کو فقط عبدل کہتا مثل الفاظ زبان سے کبھی نہ نکالتا۔ آداب مجالس کا اس قدر پابند تھا کہ جہاں جاتا پہلے دایاں پاؤں رکھتا۔ اس کی سخاوت مشہور ہے تخت نشینی سے کچھ دنوں بعد دریائے جمن کے سیر کو گیا تو ایک کشتی زر انعام میں بخشدیا مورخین لکھتے ہیں کہ وکلاء ہی اندیشہ سے اُس کے سامنے روپیہ پیش نہ کرتے تھے۔ اُسے علم ہیئت و نجوم سے خاص شغف تھا وہ علامہ الیاس اردبیلی کا شاگرد تھا۔ دور دور سے لوگ اس سے اس فن کو سیکھنے آتے تھے اُس نے کرۂ ارض وکرات عناصر و افلاک مع کواکب مختلف رنگوں سے رنگ کر مجسم صورت میں بنائے تھے اور اصطرلاب کی بھی اصلاح کی تھی ایک روز قلعہ دین پناہ میں کتبخانہ کے چھت پر مریخ کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ اُترتے وقت اذان کی آواز کانوں میں آئی تعظیما بیٹھ گیا اُٹھنے لگا تو پاؤں پھسل گیا اور کئی زینے لڑکتا ہوا زمین تک پہنچا اور ۵۱ برس کی عمر میں ۲۵ برس کم وبیش سلطنت کرکے دارالبقا کو سدھارا تاریخ وفات یہ ہے ؎

چو گشت از رحمت حق ساکن اندر روضہ رضواں
بہشت آمد مقام پاک او تاریخ اراں باشد

مولنا قاسم نے یہ تاریخ لکھی ہے ؎

ہمایوں پادشاہ ملک معنی!	ندارد کس چو او شاہنشہی یاد
زبام قصر خود افتاد ناگہ	وزاں عمر عزیزش رفت برباد
پئے تاریخ او کاہی رقم زد	ہمایوں بادشاہ از بام افتاد

یہ بھی مادہ تاریخ ہے ؎

متوفی از سال نوشتہ این زمین ہمایوں کجا رفت و اقبال او

حمیدہ بانو بیگم اکبر کی ماں مرزا ہندال کے استاد شیخ علی اکبر جامی کی دختر تھی۔ ہندال کے کیمپ میں ہمایوں نے اُسے دیکھا اور شادی کی خواہش کی۔ گلبدن بیگم اس واقعہ کو لکھتی ہیں:۔

"روز دیگر حضرت ہمایوں پیش والدہ ام آمدند وگفتند کہ کس فرستید حمیدہ بانو بیگم را طلبیدہ بیارد حضرت والدہ کہ کس فرستادند۔ حمیدہ بانو بیگم نہ آمدند وگفتند۔ اگر غرض ملازمت است خود آں روز بہ ملازمت مشرف شدہ ایم۔ دیگر برائے چہ بیائم ہم مرتبہ دیگر حضرت سبحان قلی را فرستادند کہ مرزا ہندال کا رفتہ بگو کہ بیگم را بفرستند مرزا گفتند ہر چند من گفتند نمیرود تو خود رفتہ بگو۔ سبحان قلی کہ رفتہ گفت بیگم جواب دادند کہ دیدن بادشاہان یکمرتبہ جائز است۔ دو مرتبہ دیگر نامحرم است من نمی آیم غرض کہ تا چہل روز از جہتہ حمیدہ بانو بیگم مبالغہ ومناقشہ بود و بیگم راضی نشدند۔ آخر حضرت والدہ ام دلدار بیگم نصیحت کردند کہ آخر خود بکسے خواہی رسید۔ بہتر از بادشاہ کے خواہد بود بیگم گفتند کہ آرے بکسے خواہم رسید کہ دست من بگریباں او رسد۔ نہ آنکہ بکسے برسم کہ دست من میدانم بدامن او نرسد"۔ دیکھو کیا بات کہہ گئی ہے۔ ... غرض کہ بعد از چہل روز در جمادی الاول سنہ ۹۴۸ھ نہصد وچہل وہشت در مقام پاتر روز دوشنبہ نیم روز بود کہ اُصطرلاب را حضرت بادشاہ بدست مبارک خود گرفتہ اند وساعت را اختیار کردہ میر ابوالبقا را طلبیدہ حکم فرمودند کہ نکاح ببستند۔ مبلغ دو لک نکاحانہ بہ میر ابوالبقا دادند"۔

یہی حمیدہ بانو بیگم بعد میں حاجی بیگم کے نام سے مشہور ہوئیں اور مریم مکانی لقب پایا۔ ہمایوں نے انتقال کیا تو دہلی میں پندرہ لاکھ روپیہ کی لاگت سے اس کا مقبرہ تعمیر کرایا۔ دارالشکوہ فرخ سیر اور عالمگیر ثانی اس مقبرہ میں مدفون ہیں حج سے واپس آکر عرب سرا نام کی ایک عمارت مقبرہ کے قریب بنوائی جو اب تک موجود ہے مقبرہ کی تعریف میں کسی نے کہا ہے ؎

ہر کہ میخواہد کہ بیند شکل فردوس بریں	گو بیا ایں قصر وایں باغ ہمایوں ہیں

ہمایوں شاعر بھی تھا اور طبیعت مناسب پائی تھی۔ ایک روز ملا حیرتی نے اُسے اپنے یہ اشعار سنائے ؎

گہ دل از عشق بتاں گہ جگرم میسوزد!	عشق ہر لحظہ بداغ دگرم مے سوزد!
ہمچو پروانہ بشمعے سروکار است مرا!	کہ اگر پیش روم بال و پرم مے سوزد!

ہمایوں نے آخر مصرعہ کو یوں درست کر دیا۔ ع

ہیرم پیش اگریبال و پرم می سوزد؛

اُس کا دیوان اکبر کے کتب خانہ میں موجود تھا۔ یہ رباعیات اُسی کی ہیں ؎

اے دل مکن اضطراب پیش رقیب!　　حالِ دلِ خود مگوئے یا ہیچ طبیب
کاریکہ ترا باآں جفا کار او فتاد　　بس قصۂ مشکل است و بس امر عجیب

وَلَہٗ

اے دل ز حضور یار فیروزی کُن!!　　در خدمتِ او بصدق دل سوزی کُن
ہر شب بخیالِ دوست دل خوش بنشیں　　ہر روز بوصل یار نوروزی کُن

وَلَہٗ

اے آنکہ جفائے تو بعالم علم است　　روزیکہ ستم نہ بینم از تو ستم است
ہر غم کہ رسد از ستم چرخ بدل　　مارا چو غم عشق تو باشد چہ غم است

اُس کے ذوق علمی کا یہ کیا کم ثبوت ہے کہ اُس نے ۴۷ برس کی عمر میں بابر کی سرگذشتوں کا اپنے ہاتھ سے ترجمہ لکھا اور اس میں جا بجا اپنے حواشی اضافہ کئے۔

علوم و فنون کی قدر دانی نے اُس کے عہد کو نامی شعرا کی موجودگی سے ممتاز کر دیا تھا جس میں شیخ زین الدین بھی تھے جو بابر کے عہد میں ہندوستان کے صدر تھے۔ اور وفائی تخلص کرتے تھے۔ انہوں نے فتح ہندوستان کے متعلق ایک تاریخ بھی لکھی ہے اور اس میں کمال سخنوری کو ختم کر دیا ہے۔

مولانا نادری سمرقندی سرآمد و فاضل روزگار جامع کمالات تھے۔ فرماتے ہیں ؎

سر کوئیت کہ عمرے بودم آنجا　　بعمرے خود کجا آسودم آنجا
بمقصد سجدہ ہر جا سر نہادم　　تو بودی کعبۂ مقصودم آنجا
جہانے محرم و من ماندہ محروم　　ہمہ مقبول و من مردودم آنجا
چہ پرسی نادری چونی ازاں کوی　　گہے ناخوش گہے خوش بودم آنجا

ہمایوں کی تعریف میں ایک قصیدہ لکھا ہے جسکا مطلع یہ ہے

المنۃ للہ کہ بجمعیت خاطر　　باعیش نشستند حریفان معاصر

سنہ ۹۶۶ ہجری میں وفات پائی۔

شیخ ابوالواحد فارغی درویشانہ وضع رکھتے اور کلام شیریں کہتے تھے فرماتے ہیں

بحمد اللہ کہ وارستم ز عشق مست بدخوئے　　کہ می افتاد چوں چشم خود از مستی بہر کوئے
چو ساغر از برائے جرعہ لب بر لب ہر کس　　صراحی وار بہر سائے مائل بہر سوئے

وَلَہٗ

عمرے کہ دل بوصل توام بہرہ مند بود　　نشمرد آں قدر کہ تواں گفت چند بود
القصہ در فراق بسر شد شمار عمر!　　سرمایہ وصال کہ داند کہ چند بود
اغیار دوش پیش تو بودند فارغی　　از دود ہا بر آتشِ حرماں سپند بود

وَلَہٗ

جو تیر خود کشی از سینہ ام بگذار پیکاں را　　مرا دل دہ کہ تا مردانہ در راہت دہم جاں را

سنہ ۹۶۴ ہجری میں انتقال کیا۔

ملا جامی بخاری کا نمونہ کلام ملاحظہ ہو ؎

خوبرویاں ہمہ بے مہر و وفائید شما!　　با اسیراں ز پئے جور و جفائید شما!
وعدہ کردید وفا طور دروغی گفتید　　راست گوئید کہ ایں طور چرائید شما
ما درایں شہر نہ از بہر شما رسوائیم　　ہمہ جا باعث رسوائی مائید شما
چند پرسید کہ مقصود تو در عالم چیست　　راست گوئیم کہ تنہا ئید شما لُبد شما
جائے از دست شما جان تواند بردن　　کہ بلائے ز بلاہائے خدائید شما

وَلَہٗ

دوش ماہ عید بر شکل مقوس آشکار　　کرد بخار روزہ بود آئینۂ دل را غبار
یا بہ لو بود یا تیمور از ضعف بدن　　استخوان پہلوئے لب تشنگاں روزہ دار
یا تراشید ند بہر ناقۂ لیلیٰ حطب　　با تن خم گشتۂ مجنوں شد از غم زرد و زار
خویش را در سلک خدام تو میخواہد فلک　　زاں کماں حلقہ آوردہ است بہر گذار
بلکہ ہیبت بستہ رنگے یک پرے برسر زدہ　　میبرد از روم تا آرد خبر از زنگبار

رباعی

خط گرد رخت باعث حیرانی ماست　　زلفت سبب بے سر و سامانی ماست
آں کاکل مشکیں پئے ویرانی ماست　　اینہا ہمہ اسباب پریشانی ماست

سنہ ۹۵۶ ہجری میں ایک غلام نے زہر دے کر مار ڈالا۔

خواجہ ایوب ابن خواجہ ابوالبرکات علم و فضل میں یکتائے روزگار تھے ہمایوں اُن کے حال پر خاص توجہ رکھتا تھا یہاں تک کہ اپنے خاندان

... خواجہ یا توب کبھی ایوب اور کبھی غزانی تخلص کرتے تھے۔

غزل

اے شاخ گل کہ ہمچو مہی قد کشیدہ ؛ ! | بر گرد لب خطے ز مرد کشیدہ
قدت بر آمدہ چو الف مد ظلہ | وز ابروان فراز الف مد کشیدہ
بر حرف دیگراں زدہ قرعۂ قبول | بر حرف عاشقاں قلم رد کشیدہ
تشویش میکشی کشش اے نقشبند چیں | ناید چو چشم و زلفش اگر صد کشیدہ
از دوستاں وصال فراقی طمع مبر | جور و جفائے یار چو بیحد کشیدہ

مولانا نظام الدین احمد مصنف کتاب طبقات اکبری ہمایوں کی نسبت اپنی یہ رائے لکھتے ہیں۔

"ایام سلطنت صوری آنحضرت بست و پنج سال و کسری امتداد یافت و سن مبارکش پنجاہ و یک رسید ذات ملکی صفاتش بکمالات انسانی آراستہ بود و در شجاعت و مردانگی از سلاطین آفاق امتیاز داشت و در جنب بخشش از جمیع ہندوستان وفا نکردے و در علم نجوم و ریاضی بے بدل بود و شعر نکو گفتے و در صحبت آں مقتدائے جہاں ہمہ فضلاء و علما اکابرے بودند و ہمیشہ از اول شب تا صبح بصحبت میگذشت و نہایت آداب در مجلس آنحضرت مرعی مے بود۔ ہمہ وقت بحث علمی در عہدش رائق پذیر آمد و مروتش بحدے بود کہ میرزا کامراں و امرائے جغتائی مکرر مخالفت کردہ گرفتار شدند گناہاں ایشاں را بالعفو مقرون گردانید"۔

عفو اور رحم اخلاق اور مروت اگر انسانی جرائم کی فہرست میں شامل ہوں۔ تو ہمایوں کی بریت نہایت مشکل ہے۔ تاہم وہ بابر جیسے شجاع اور خوش مزاج حکمران کا لائق جانشین کہلائے جانے کا مستحق اور کم سے کم اس تعریف کا ضرور حقدار ہے اور اس نے اپنے بعد اس سلطنت کا وارث ایسے شخص کو چھوڑا جو آسمان شہرت کا آفتاب بنکر چمکا۔

لمحات آزادی

از :-
جناب الطاف مشہدی صاحب!

گھٹاؤں کے سایوں کی مستی سے بڑھکر
فرشتوں کی پاکیزہ مستی سے بڑھکر

حسین بربطوں کے ترنم سے پیارے
لبِ دلنشیں کے تبسم سے پیارے

وطن کے عزیزوں کے ناموں سے میٹھے
نگاہوں کے پرکیف جاموں سے میٹھے

محبت کے آوارہ راگوں سے دلکش
حسینوں کی زلفوں کے ناگوں سے دلکش

ستاروں کے پرنور بستر سے پیارے
مہ و مہر کے سیمگوں گھر سے پیارے

بہاروں کی اٹھتی جوانی سے شیریں!
مری عاشقی کی کہانی سے شیریں!

وہ لمحات گذرے جو آزادیوں میں
وہ اوقات گذرے جو آزادیوں میں

بے گناہ کُش

(موپاساں کے ایک شاہکار افسانہ کا ترجمہ)

(از جناب ایس۔ محمد آصف (بی اے)

صاحبزادہ جارج ۔۔۔ میں ۔۔۔ چھوٹی چھوٹی گھروندے بنانے میں محو ہے۔ شفیق باپ پاس ہی بیٹھا بچے کی ان بھولی بھالی حرکات کو نہایت پیار سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے آس پاس اور بچے بھی کھیل کود میں مشغول تھے۔ گویا وہ باغ بازیچۂ اطفال بن رہی تھی۔ انائیں مصروفِ گلگشت تھیں۔ معصوم اور کم عمر لڑکیاں اونچے کوٹ زیبِ تن کئے ننگی پنڈلیاں نکالے چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں نہایت سنجیدگی سے باتیں کر رہی تھیں۔ سورج فلک بوس عمارتوں کے عقب میں چھپتے ہوئے اس مجمعِ عام پر زرد زرد کرنیں گرا رہا تھا۔ درختوں کے پتے سنہری سے ہو رہے تھے۔ گرجے کی بلند پیشگاہ کے سامنے چھوٹتے ہوئے فواروں کی سیمیں دھاریں فضائے بسیط میں گم ہو رہی تھیں۔

موسیو پیرنٹ اپنے خوردسال بچے کو پیار اور محویت کی نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ . . اچانک اس کی نظر گرجے کے گھڑیال پر پڑی چونک پڑا . . . . پانچ منٹ کی تاخیر ہو چکی تھی۔ ایک بے چینی کے ساتھ وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔ جارج کے بازو تھام کر گرد آلود کپڑے جھاڑے اور اپنے پیچھے اور تیزی سے چلنے لگا۔ ۔۔۔ بیوی سے پہلے گھر پہنچ سکے۔ بچے کے ننھے ننھے قدم باپ کی سرعت رفتار کے ساتھ ۔۔۔ موسیو پیرنٹ نے اسے گود میں اٹھا لیا

- -

پیرنٹ کی عمر ۴۰ سال تھی۔ داڑھی کے بال کھچڑی ہو چکے تھے جسم مضبوط تھا۔ اسکی بیوی کا فرجمال تھی۔ جس سے اسے بے حد محبت تھی

ان دونوں کی شادی ہوئے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ وہ ایک جابر عورت تھی۔ ہمیشہ خاوند کے ساتھ ایک مطلق العنان فرمانروا کی طرح بے رحمی اور تحکم سے پیش آتی۔ بات بات پر الجھتی۔ ہر ایک حرکت پر اس کے منہ آتی گویا اسے اس سادہ مزاج انسان کی عادات ایک آنکھ نہ بھاتیں

اس سلوک کے باوجود پیرنٹ کو اس سے محبت تھی وہ اسکی قدر کرتا تھا اسے اس پر حد سے زیادہ اعتماد تھا اور ہمیشہ اس کی درشتی کو اس کی طبعی افتاد پر محمول کرتا۔ اور جارج کو جو اسی بدزبان عورت کے بطن سے تھا ہمیشہ سینہ سے لگائے رکھتا اور ایک لمحہ کے لئے بھی اپنی آنکھوں سے اوجھل نہ ہونے دیتا۔ گویا وہ ننھا سا ہستی اسکے بڑھاپے کی امید اور اسکی راحتوں کا واحد مرکز تھا۔ مالی لحاظ سے پیرنٹ اوسط درجے کا انسان تھا۔ بیس ہزار فرانکس اسکی موروثی جائداد کی سالانہ آمدنی تھی جس پر گذر اوقات تھی لیکن ناشکر گذار بیوی عذر بیکاری رکھ کر ہمیشہ اسے تنگ کرتی۔ . . . . . .

غرض وہ تیز رفتاری سے گھر پہنچا۔ بچے کو گود سے اتارا۔ بالائی منزل پر پہنچ گھنٹی بجائی۔ بوڑھی خادمہ پیرنٹ جس کے ہاتھوں میں پل کر جوان ہوا اور ادھیڑ عمر کو پہنچا۔ نمودار ہوئی۔ یہ ان خادماؤں میں سے تھی جو خاندان کی فرد ہی خیال کی جاتی ہیں اور گھر کے چھوٹے افراد پر ایک جابر حکمران کی طرح مسلط رہتی ہیں۔ پیرنٹ نے دریافت کیا "کیا تمہاری مالکہ آ گئیں"؟ خادمہ نے کندھوں کو جنبش دیتے ہوئے جواب دیا۔ "ہاں آگے روز ساڑھے چھ بجے ہی تو آتی ہیں" ——— "اچھا ہوا جو ابھی نہیں آئیں۔ میں ان کے آنے تک کپڑے بدل لونگا۔ گرمی لگ رہی ہے"

خادمہ نے حقارت آمیز رحم اور قہر آلود نگاہوں سے پیرنٹ کو دیکھا اور بڑبڑائی "موسیو تم سر سے پاؤں تک پسینے میں بھیگ رہے ہو معلوم دیتا ہے بچے کو اٹھا کر تیز چلے ہو تا کہ خاتون سے پہلے گھر پہنچ سکو... ..... میں ان کے آنے پر ایک ہی دسترخوان بچھاؤنگی۔ بار بار گوشت گرم ہونے سے جل کر راکھ نہ ہو جائے گا کیا؟"

پیرنٹ باتوں پر کان نہ دھرتے ہوئے "یونہی سہی تم نیچے جا کر ننھے کے ہاتھ صاف کر دو۔ وہ ریت میں کھیلا کیا ہے۔ اور میں کپڑے بدل لیتا ہوں"

خادمہ چلی گئی۔ پیرنٹ دماغی کوفت دور کرنے کے لئے آرام کرسی پر دراز ہو گیا۔ بوڑھی خادمہ جولی کی غضب آلود نگاہیں اسے تنگ کرنے لگیں جن سے قسم قسم کے خیالات پیدا ہونے لگے۔ "وہ دن بدن خطرناک ہو رہی ہے ۔۔ اسے میری بیوی سے نفرت ہے اور اس سے کہیں زیادہ نفرت میرے دوست پال لیموسی سے"۔

پال لیموسی موسیو پیرنٹ کا ہمدم دیرینہ تھا جو میاں بیوی کے درمیان ایک منصف کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہمیشہ غریب کو بیوی کی ناروا ملامتوں سے بچاتا اور نہایت ہمدردی سے خانہ تلخیوں میں اس کی مدد کرتا۔

قریباً چھ ماہ سے جولی اپنی مالکہ کے سخت خلاف تھی دن میں قریباً بیس دفعہ یہ کلمہ دہرانی۔ "میں تمہاری جگہ ہوتی موسیو تو یوں مٹی کا بھوہا نہ بنتی لیکن تم اپنی فطرت سے مجبور ہو۔ یہ تمہارے بس کی بات نہیں"۔

ایکدن تو وہ پیرنٹ یعنی موسیو پیرنٹ کی بیوی پر برس پڑی جسنے اس گستاخی کا ذکر اپنے خاوند سے کیا اور کہا۔ "اگر آئندہ اس بوڑھی چوہیا نے ایسا کیا تو گلا گھونٹ ڈالوں گی"۔ لیکن یہ الفاظ پیرنٹ نے دبی زبان سے کہے۔ یوں معلوم دیرہا تھا کہ وہ خادمہ سے خم کھاتی ہے لیکن پیرنٹ سمجھا یہ نرمی خادمہ کے بڑھاپے کی وجہ سے ہے۔ لیکن اب بیگم کا پیمانہ صبر لبریز ہو چکا تھا اور پیرنٹ اس کے ناگزیر نتائج سے خائف تھا۔ "مجھے کیا کرنا چاہئے؟" بار بار اس سوال سے ذہنی تکلیف ہوتی۔ ہر وقت یہ [illegible] فیصلہ سے عاجز تھا۔ [illegible]

کبھی بیوی کے خلاف خادمہ کا ساتھ دینا معیوب بات تھی۔ گویا اسکا حباب زندگی موج مضطر پہ رقص کر رہا تھا۔ دیر تک اسی سوچ میں کھویا ہاتھ چھوڑے بیٹھا رہا۔ متضاد خیالات دماغ میں سوئیوں کی سی چبھن پیدا کرتے رہے۔ لیکن ہنوز کسی صحیح نتیجہ پر نہ پہنچ سکا۔ اور اپنے آپ سے کہنے لگا۔ "یہ خوش قسمتی ہے کہ ننھے جارج کا وجود میرے لئے باعث راحت ہے ورنہ یہ ایک روح سوز دکھ تھا" فوراً دل میں خیال پیدا ہوا لیموسی سے مشورہ لینا چاہئے لیکن یہ خیال جلد مٹ گیا مبادا لیموسی خادمہ کے اخراج کا مشورہ دے . . . . . .

. . . گھڑی نے سات بجائے وہ چونک اٹھا۔ "سات بج چکے اور میں نے کپڑے تبدیل نہیں کئے" اعصابی بے چینی سے جلد جلد کپڑے اتارے نیا جوڑا پہن کر نشستگاہ میں چلا گیا۔ بیوی کو وہاں نہ پا کر دم میں دم آیا اخبار پر اچٹتی ہوئی نگاہ ڈالی۔ کھڑکی سے باہر جھانکا اور صوفے پر بیٹھ گیا۔ دروازہ کھلا۔ بچہ دوڑتا ہوا آیا اور ٹانگوں سے چمٹ گیا۔ اسے آغوش شفقت میں لے کر فرط محبت سے بار بار چوما۔ بازوؤں میں تھام کر ہوا میں اچھالا۔ گھٹنوں پہ بٹھا کر کہا۔

"گھوڑا دوڑاؤ بیٹا" بچہ کھل کھلا کے ہنسا۔ تالی بجاتے ہوئے چلانے لگا۔ بچے کو یوں خوش دیکھ کر باپ کی رگ رگ میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ پیرنٹ ایک قانع کمزور اور مظلوم انسان کی طرح اس بچے سے محبت کرتا تھا۔ اس کی محبت میں ایک پوشیدہ سی ہچکچاہٹ اور خفیف سا انفعال تھا وہ محبت جو بیوی کی مہربانی سے ماہ عسل میں بھی شرمندۂ معنی ہی رہی۔ دبے پاؤں جولی پھر اندر آئی۔ اب اسکا چہرہ زرد تھا۔ آنکھوں میں بھیانک روشنی تھی۔ آواز قلبی ہیجان سے کانپ رہی تھی۔

"ساڑھے سات ہو گئے موسیو"۔

"ہاں پورے ساڑھے سات ہیں"۔ پیرنٹ نے گھڑی کی طرف دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"کھانا تیار ہے"۔

[illegible]

طوفان کو روکنے کی بے سود کوشش کرتے ہوئے۔

"آٹھ بجے! تم کیا خیال کرتے ہو؟ کیا غریب بچے کو آٹھ بجے کھانا کھلانا چاہتے ہو؟ یہ بیمار نہ ہو گا لیں؟ بچے کی دیکھ بھال کرنے والی صرف ماں ہی تو ہے وہ تو بچے پر جان دیتی ہے جان واہ ری ماں.. ."

"پیرنٹ نے سوچا اس خشمگیں منظر کا یہیں خاتمہ کر دو ورنہ بات طول پکڑ جائے گی۔"

"جولی! میں نہیں چاہتا کہ تم اپنی مالکہ کے متعلق یوں گفتگو کرو آئندہ کبھی ایسی حرکت نہ کرنا سمجھ گئی ہو نا"

بوڑھی خادمہ جواب سنکر ساکت ہو گئی۔ مڑی اور کمرے سے باہر نکلتے ہوئے اس زور سے دروازہ بند کیا کہ جھاڑ کے قمقموں میں ارتعاش پیدا ہو گیا۔ اور نشستگاہ میں بہت سی چھوٹی چھوٹی گھنٹیاں بجتی ہوئی سنائی دینے لگیں۔ منھا جو پہلے گھبرا گیا تھا جوش میں آکر زور سے تالیاں بجانے لگا۔ ننھے گالوں کو پھلا کر بلند آواز سے چلایا تاکہ وہ اس شور کی نقل اتار سکے باپ بچے کو محظوظ کرنے کے لئے چڑیا کی کہانی سنانے لگا۔ مگر خیالات دماغ میں اودھم مچا رہے تھے۔ وہ بار بار رک کر کسی گہرے سوچ میں کھو جاتا۔ بچہ جوان کیفیات کے سمجھنے سے قاصر تھا۔ حیران ہو کر باپ کا منہ تکنے لگتا۔

پیرنٹ کی مایوس نگاہیں گھڑی پر لگ رہی تھیں۔ کاش وہ اپنی بیوی کی تاخیر سے رنجیدہ نہیں تھا۔ بلکہ اس کی تندی سے خائف تھا۔ جولی سے خائف تھا۔ آئندہ واقعات کے خوف سے لرزہ براندام تھا۔ آنے والے دس بیس منٹ معلوم نہیں اُس پر کون سا ستم توڑنے والے تھے۔ کرخت اور تند الفاظ کے تصور سے اس کی روح کانپ رہی تھی۔ لڑائی کا تصور بلند دلخراش آوازیں گولیوں کی طرح نشانے پر بیٹھتے ہوئے توہین آمیز فقرات ایک دوسرے کے مقابل پرتی ہوئیں دو برانگیختہ عورتیں اور انکی ایک دوسرے میں گڑی ہوئی مہیب نگاہیں اس کے سینے میں دھڑکن پیدا کر رہی تھیں زبان سوکھ کر کانٹا ہو رہی تھی۔ جیسے وہ چلچلاتی دھوپ میں سفر کر رہا ہو۔ چہرے کا رنگ [illegible] نہ تھا۔ ذہنی قواء مفلوج ہو چکے تھے۔ اتنی طاقت نہ تھی کہ بچے کو اٹھا کر گود میں بٹھا سکے۔

گھڑی نے آٹھ بجائے۔ دروازہ کھلا جولی پھر اندر داخل ہوئی اس کی نظروں میں برہمی تھی۔ چہرے پر ایک خطرناک ارادے کے آثار عیاں تھے۔ یہ حالت پہلی حالت سے زیادہ زہرہ گداز تھی۔

"موسیو! میں نے تمہاری والدہ مرحومہ کی مرتے دم تک خدمت کی ہے۔ اس گھر کو ہمیشہ اپنا گھر سمجھا ہے۔ تمہارے دسترخوان پر ٹکڑے توڑے ہیں۔ حق نمک ادا کرنے کی اپنی طرف سے سر توڑ کوشش کی ہے....."

وہ جواب لینے کے لئے ایک لمحہ ٹھہری۔ پیرنٹ نے منفعل سی آواز کے ساتھ جواب دیا۔ "ہاں! یقیناً محسن جولی"

"میں نے چند ٹکوں کے لئے یہ غلامی مول نہیں لی۔ تمہیں سکھ دینا اپنا فرض سمجھتی ہوں۔ تمہیں معلوم ہے میں نے کبھی جھوٹ نہیں بولا کبھی دھوکا نہیں دیا۔ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی کبھی"

"یہ درست ہے جولی" پیرنٹ نے گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

"تو سنو موسیو میرا کلیجہ پھٹ رہا ہے۔ میں دیر سے دم سادھے پڑی ہوں لیکن اب خاموش نہیں رہا جاتا۔ پانی سر سے گذر چکا۔ اب مجھ سے لوگوں کی ہنسی گوارہ نہیں ہوتی۔ انکی کنکھیوں سے دل جل اٹھتا ہے۔ میں یہ لہو کے گھونٹ پی نہیں سکتی.... تمہیں شاید علم نہ ہو کہ بی بی کیوں رات گئے تک غائب رہتی ہے؟ کیوں من مانی باتیں کرتی ہے۔ کیونکہ اب وہ پاکدامن بی بی نہیں رہی"۔

پیرنٹ ٹھٹھر گیا تمام بدن پر چیونٹیاں دوڑتی ہوئی معلوم دینے لگیں۔ بدحواس سا ہو کر چلا اٹھا۔ "زبان کو تھامو کیا کہہ رہی ہو جولی"۔ لیکن خادمہ کو نہ رکنا تھا نہ رکی کہتی چلی گئی جو کچھ اُسے کہنا تھا۔ "نہیں موسیو اب میں کچھ چھپا نہیں سکتی یہ میری برداشت سے باہر ہے۔ خاتون مدت سے لیموسی کے ساتھ.... .. ... میں نے بارہا نہیں ــــ دیکھا ہے۔ لیموسی امیر ہوتا تو وہ تمہارے ساتھ شادی نہ کرتی"۔

پیرنٹ کھڑا ہو گیا۔ رنگ زرد تھا۔ اعصاب روحانی صدمہ سے پھڑک رہے تھے۔ "خدا کے لئے زبان کو تھامو زبان بند کرو"

اسنے رقت آمیز لہجے میں کہا۔ لیکن وہ نہ رکی اور کہتی چلی گئی

"میں یہ بھانڈا پھوڑنا چاہتی ہوں۔ اس نے محض روپئے کی خاطر شادی کی ہے۔ وہ تمہیں جل دے رہی ہے۔ یہ سب کچھ ان کے منصوبے سے ہوا ہے۔ خدارا چند لمحات کے لئے آنکھیں کھولو۔ وہ تمہاری زندگی اجیرن کر رہی ہے۔ اُف میرا دل پھٹ رہا ہے۔ میں نے ان آنکھوں سے سب کچھ دیکھا ہے۔"

وہ کمرے میں ٹہلتے ہوئے ان الفاظ کو دُہرانے لگا۔ "جولی مجھ پہ رحم کرو۔۔۔ ۔۔مجھ پر رحم کرو۔ میں ان الفاظ کو برداشت نہیں کر سکتا۔" لیکن جولی پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا وہ سب کچھ کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ ننھا خادمہ کی درشت کلامی سے سہم کر چلانے لگا۔ بچے کی چیخوں نے پیرنٹ کو غضب آلود کر دیا وہ جولی پر جھپٹا اور کڑک کر بولا۔ "بدبخت کیا بچے کو ہلاک کردے گی۔" لیکن وہ کہتی گئی اور نہ رُکی۔

"موسیو تم اپنی بوڑھی خادمہ کو پیٹ سکتے ہو۔ لیکن خوب یاد رکھو یوں تمہاری بیوی کی عصمت نہیں لوٹ سکتی اور نہ ہی یہ حقیقت تبدیل ہوسکتی ہے کہ یہ بچہ تمہارا نہیں۔" پیرنٹ پر اس فقرہ کا برقی اثر ہوا۔ اعصاب میں ارتعاش سا پیدا ہو گیا۔ اٹھے ہوئے بازو خود بخود گر گئے۔ آنکھوں میں ایک خطرناک تحیر کی چمک پیدا ہوگئی۔۔۔۔۔۔ "اگر تمہیں معلوم کرنا ہو والد کون ہے تو بچے کو نگاہ تنقید سے دیکھو۔۔۔۔ ۔۔اس کی پیشانی اور آنکھوں کو دیکھ کر ایک بیوقوف بتا سکتا ہے یہ بچہ لیموسی کا ہے"

آن واحد میں جولی کے شانے پیرنٹ کی گرفت میں تھے وہ ایک بپھرے ہوئے چیتے کی طرح اُسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ خشمگیں آواز کمرے میں گونج رہی تھی۔ "ناگن! افعی! نکل جا اس کمرے سے دور ہو جا۔ ورنہ میں تمہیں ہلاک کردونگا۔ میں کہتا ہوں میری نظروں سے اوجھل ہو جا" پیرنٹ کی وحشیانہ گرفت نے اسے دور پھینک دیا۔ وہ قلابازی کھا کر کھانے کی میز پر گری۔ شیشے کا سامان چور چور ہو گیا اٹھی اور بجلی کی سی تیزی کے ساتھ تن کر کھڑی ہوگئی۔ پہاڑی ندی کی تند و تیز روانی کی مانند اس کے منہ سے خوفناک الفاظ نکلنے لگے۔ "میرے کہنے کا یقین نہ ہو تو آج کھانے سے فارغ ہو کر ذرا باہر نکل جانا اور جلد دبے پاؤں لوٹ کر دیکھنا۔ کہ ہیں اسی کمرے میں کیا گل کھل رہے ہیں" وہ یہ کہہ کے تیر کی سی تیزی سے کمرے کے باہر چلی گئی۔ پیرنٹ نے تعاقب کیا۔ لیکن وہ اپنے کمرے کو اندر سے مقفل کر چکی تھی۔ اس نے دروازہ کھٹکھٹا کر پُررعب لہجہ میں کہا "میرے گھر سے اسی وقت چلی جاؤ" جواب ملا "گھبراؤ نہیں موسیو میں ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں سے رخصت ہو رہی ہوں"۔

وہ نشستگاہ میں چلا آیا جہاں ننھا فرش پر لیٹا سسک رہا تھا۔ کرسی پر گرتے ہی پیرنٹ نے غمگین دھندلی نگاہوں سے بچے کو دیکھا۔ وہ کچھ نہ سمجھ سکا۔ سر چکرا رہا تھا۔ عقل جواب دے چکی تھی۔ اوسان خطا ہو رہے تھے جیسے وہ ابھی بلندی سے سر کے بل گرا ہو۔ خادمہ کی زہر میں بجھی ہوئی باتیں اس کے دل کو متورم کر رہی تھیں۔ بتدریج عقل کام کرنے لگی۔ جیسے گدلا پانی آہستہ آہستہ نتھرنے لگتا ہے۔ بھیانک انکشاف دل کو افعی کی طرح کاٹنے لگا۔

جولی نے وثوق خلوص اور زور کے ساتھ سب کچھ اُگل دیا تھا۔ پیرنٹ اپنے خیال میں صادق اور نمک حلال جولی کو جھٹلانے کی کوشش کر رہا تھا۔ شاید اسے دھوکا لگا ہو یا میری محبت نے اندھا کر دیا ہو۔ یا ہنریٹ سے بغض اس کے تخیل کو فریب دے رہا ہو۔ گویا سیکڑوں دلائل سے دل کو بیوی کی بیگناہی کا قائل کر رہا تھا۔ چند منٹوں میں گزرے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ بیوی کا حسن سلوک۔ لیموسی کی سیاست یکے بعد دیگرے دونوں کی غیر حاضری۔ رات گئے باہر جانا پہلے ان باتوں کی کوئی وقعت نہ تھی لیکن اب ان میں معنی پیدا ہو چکے تھے۔ آج تک جو کچھ ہوا۔ بچھو کی طرح اس کے دل پر ڈنک مارنے لگا۔ روح شدت درد سے تلملا اٹھی۔

ننھا جو خاموش ہو چکا تھا۔ جب اس نے دیکھا باپ کو التفات نہیں پھر چلانے لگا۔ پیرنٹ نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ بیخود ہو کر اُسے پیار کرنے لگا۔ جس سے کسی حد تک دل میں ٹھنڈک کا

ماس پیدا ہوا۔ "جارج! میرے بچے۔ میری روح" "لیکن جولی کی
ں کی یاد تازہ ہوگئی۔" ہاں اس نے کہا تھا۔ یہ لیموسی کا بیٹا ہے
ہیں یہ نہیں ہوسکتا۔ میں باور نہیں کرسکتا۔ مجھے یقین نہیں آسکتا
افترا ہے۔ جھوٹ ہے۔ الزام ہے۔ جولی کے فریب خوردہ تخیل کی
ہارت ہے۔ آہ! میرے بچے! میرے بچے!! دنیا تمہیں مجھ سے
چھیننا چاہتی ہے" بچہ باپ کے سینے سے لپٹ کر خاموش ہوگیا۔
پرنٹ نے ننھی سی دھڑکن کو اپنے سینے کے ساتھ محسوس کیا جس سے
ل جرأت ہمت اور راحت سے لبریز ہوگیا۔ معصوم بے لوث
دھڑکن نے اسے چین اور سکھ دے کر سوزِ دروں سے کسی حد تک
نجات دی۔ وہ ننھے گھنگریالے سر کو شفقت آمیز نظروں سے گھورنے
لگا۔ "اگر یہ لیموسی کا بچہ ہو تو؟" پیرنٹ کے جسم میں آگ کی لہر دوڑ گئی
ایک خوفناک جذبہ نہایت تندی کے ساتھ اس کے جسم میں چکر
اٹھنے لگا........ تھوڑے وقفہ بعد اسے اپنا جسم ٹھنڈا ہوتا
ہوا معلوم دیا۔ وہ رگیں جنہیں ابھی ابھی گرم خون کھول رہا تھا یخ بستہ
ہوکر رہ گئیں۔

"اگر اس کی لیموسی سے مشابہت ہوئی تو؟" یہ فقرہ قلب کی
گہرائیوں میں گونج رہا تھا۔ یہ زہر کا گھونٹ بار بار حلق سے نیچے
اتر رہا تھا۔ نظریں بچے کے چہرہ پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ بچے کے
خدوخال کا لیموسی سے موازنہ کر رہا تھا۔ خیالات سخت پراگندہ
تھے۔ دماغ میں دیوانگی کا خیال فزوں تر ہوتا چلا جا رہا تھا۔ بچے نے
ایک گھڑی میں متعدد شکلیں تبدیل کیں۔ بچے کی شکل اس کی ہر
داخلی کیفیت کی آئینہ دار بن رہی تھی۔ "اس کی پیشانی اور آنکھوں کو
دیکھ کر ایک بیوقوف بتا سکتا ہے یہ بچہ لیموسی کا ہے۔" جولی کے یہ
الفاظ پگھلے ہوئے سیسے کی طرح دماغ پر گر رہے تھے۔ "نہیں یہ کیسے
ہوسکتا ہے۔ اس کی پیشانی فراخ۔ لیموسی کی پیشانی تنگ اس کے
منہ اور ٹھوڑی کی بناوٹ کا مقابلہ ہی نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ لیموسی کے
منہ اور ٹھوڑی کو ڈاڑھی اور مونچھوں نے ڈھانپ رکھا ہے۔
ان دونوں میں کوئی مشابہت نہیں ہے۔"

پھر کچھ سوچ کر کہنے لگا۔ "میں اس وقت کچھ اندازہ نہیں
کرسکتا مجھے تحمل سے کام لینا چاہئے۔ کل صبح ٹھنڈے دل سے غور
کرونگا۔" معاً ایک اور ترکیب سوجھنے سے خیالات کی رو تبدیل
ہوگئی۔ "اگر یہ میرے مشابہ ہوا تو میں اس آتشیں ادھیڑبن سے نجات
پاجاؤنگا۔" قدِ آدم آئینہ کے قریب جا کر اپنے نقوش کا بچے سے مقابلہ
کرنے لگا۔ "ہماری ناک ایک جیسی ہیں ہاں قریباً ایک ہی جیسی ہیں
یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ ان میں کہاں تک مشابہت ہے۔
مگر اف اس کی آنکھیں نیلگوں ہیں او خدا! میں ضرور دیوانہ ہوجاؤنگا
اب برداشت کی تاب نہیں۔ میں دیوانہ ہو رہا ہوں"

وہ آئینے سے ہٹ کر کمرے کے دوسرے حصے میں چلا گیا
بچے کو آرام کرسی پر بٹھا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ بلند ہچکیوں سے
سہم کر بچہ چلانے لگا۔ اتنے میں ہال کی گھنٹی بجی۔ پیرنٹ اچھل کر
کھڑا ہوگیا۔ جیسے پستول کی گولی سینہ سے پار ہوگئی ہو۔ "یہ وہی ہے"
اس نے چونک کر اپنے آپ سے کہا۔ "میں کیا کروں؟" سر پر پاؤں
رکھ کر بھاگا۔ کمرے میں جاتے ہی دروازہ مقفل کرلیا وہ اپنے آنسوؤں کو
خشک کرنا چاہتا تھا۔ پھر گھنٹی سنائی دی۔ وہ دوبارہ اچھل پڑا۔ اسے
خیال آیا جولی بغیر ہیڈ کو اطلاع کئے رخصت ہوچکی ہے۔ اس لئے دروازہ
کوئی نہیں کھولے گا۔ کیونکہ دروازہ عموماً جولی ہی کھولا کرتی تھی۔ وہ
کیا کرے؟.... خود دروازہ کھولنے کو چلا اس نے محسوس کیا
کہ وہ بدل چکا ہے۔ وہ ہر مصیبت کا بہادری سے مقابلہ کرنے کو
تیار ہے۔ جانکاہ صدمے نے چند لمحات کے اندر اس میں حیرت انگیز
تبدیلی پیدا کردی تھی۔ بزدلی کی جگہ ایک مشتعل قسم کی بہادری مسلسل
برداشت کی جگہ برہمی نے لے لی تھی۔ اب وہ صرف صداقت کا متلاشی
تھا۔ اسے صرف اصل حقیقت کی جستجو تھی خواہ اسے موت کا ہی
مقابلہ کیوں نہ کرنا پڑے لیکن اس کے باوجود وہ کانپ رہا تھا
کیا اس کی وجہ خوف تھی۔ ہاں وہ اب بھی اس سے خائف تھا۔
عموماً شجاعت مشتعل بزدلی کے عنصر سے یکسر معرا نہیں ہوتی۔ وہ
دبے پاؤں دروازے تک پہنچا گرش برآواز ہوا۔

دل دھڑک رہا تھا۔ کانوں میں صرف دھک دھک کی آواز آرہی تھی۔ سر پر لگی ہوئی گھنٹی پھر ایک دفعہ زور سے بجی وہ چونک پڑا۔ اس نے جلدی سے چابی گھمائی۔ دروازہ کھلا —— ہنریٹ اور لیمونسی سیڑھیوں پہ کھڑے تھے۔ بیوی نے اشتعال آمیز حیرانی سے کہا "شکر ہے جو تم دروازے تک پہنچے۔ جولی کہاں ہے؟" پیرنٹ کی آواز گلوگیر ہوگئی۔ سانس رک رک کے چلنے لگی۔ جواب دینے کی بے سود کوشش کی۔ لیکن نوائے سوختہ در گلو ہی رہی۔ اس نے پھر ڈپٹ کے دریافت کیا۔ "بہرے ہو میں پوچھتی ہوں جولی کہاں ہے؟" پیرنٹ نے رک رک کر جواب دیا۔ "....وہ —— وہ چلی گئی" یہ سن کر بیوی کے تیور بگڑنے لگے۔ "اس سے مطلب وہ کہاں گئی؟ کیوں گئی؟"

پیرنٹ نے خلافِ معمول محسوس کیا کہ اس کے پہلو میں اس گستاخ عورت کے خلاف انتہائی نفرت کا جذبہ موجزن ہے نہایت تحمل سے جواب دیا۔ "ہاں وہ ہمیشہ کے لئے چلی گئی اور اسے میں نے بھیجا ہے۔"

"تم نے بھیجا ہے جولی کو دیوانے ہوگیا؟"

"ہاں میں نے بھیجا ہے۔ وہ گستاخ تھی"

"جولی؟"

"ہاں جولی"

"کس سے گستاخی کی اس نے؟"

"تم سے"

"مجھ سے!"

"اس لئے کہ تم وقت پر نہ پہنچیں اور کھانا جل گیا۔"

"کیا کہتی رہی ہے وہ بوڑھی قطامہ مجھے؟"

"چند ایسی باتیں جنکی میں تاب نہ لا سکا۔"

"کہا کیا آخر؟"

"میں دہرانا نہیں چاہتا"

"میں سننا چاہتی ہوں"

"اس نے میری بدقسمتی پر افسوس کیا اور کہا کہ میری بیوی ایک بدخو عورت ہے جو نہ ہی اچھی ماں ہے اور نہ ہی اچھی بیوی"

اتنے میں وہ ساتھ والے کمرے میں پہنچ گئے۔ ہنریٹ نے دروازہ بند کیا اور پیرنٹ کے قریب آکر اسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"کیا کہا۔ میں بدخو ہوں۔ اچھی ماں نہیں ہوں۔ نہ ہی اچھی بیوی ہوں۔"

"یہ جولی کے الفاظ ہیں میرے نہیں"

ہنریٹ نے محسوس کیا کہ آج پیرنٹ کی آواز میں خلافِ معمول تحکم ہے لیکن الفاظ بدستور سابق نرم ہیں وہ دل ہی دل میں لال پیلی ہو رہی تھی اور اس کے ہاتھ خاوند کی داڑھی نوچنے کے لئے بیقرار تھے۔ وہ ہر بات پر لڑائی کا عذر ڈھونڈھ رہی تھی ——

"غالباً تم کھانا کھا چکے ہو گے؟"

"نہیں تو مجھے تمہارا انتظار تھا۔"

ہنریٹ نے شانوں کو جنبش دی اور بیقرار ہو کر بولی۔

"اتنی دیر تک انتظار کرنا بیوقوفی ہے مجھے سیکڑوں کام تھے۔ میں انہیں ختم کرکے ہی لوٹ سکتی تھی"

"یونہی کرنا چاہئے تھا۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں"

لیمونسی جو اب تک خاموش تھا آگے بڑھا اور ہاتھ ملایا اور دریافت کیا "کیا حال ہے؟" جواب ملا "اچھا ہوں"

مگر ہنریٹ خاوند کے آخری فقرے میں ملامت محسوس کر رہی تھی جھک کر بولی "اعتراض۔ کیسا اعتراض؟ کوئی جانے میں قصوروار ہوں" پیرنٹ نے جواب دیا "میری یہ مراد نہیں کہ تمہاری تاخیر میرے لئے باعثِ تشویش تھی"

اس سے وہ اور سیخ پا ہوگئی "تاخیر! تشویش! کوئی جانے میں ہر روز رات کے ایک بجے ہی آیا کروں"

"نہیں میں نے تاخیر کا لفظ اس لئے استعمال کیا ہے کیونکہ اس سے بہتر لفظ میرے پاس نہیں تھا۔ تم نے وعدہ کیا کہ میں ساڑھے چھ

آؤنگی اور اسوقت ہیں ساڑھے آٹھ سو۔ اس لحاظ سے یہ تاخیر ہی ہوئی نہ"

"لیکن تمہارا لہجہ ظاہر کر رہا ہے کہ میں گویا ساری رات باہر رہی ہوں"

"میری اس سے یہ مراد نہیں"

جب اس نے دیکھا کہ لڑائی کا کوئی عذر ہاتھ نہیں آتا تو اٹھکر لباس تبدیل کرنے چلی راستے میں ننھے کو سسکتے پایا۔ گرج کر بولی۔ "کیا ہوا بچے کو؟"

"میں نے کہا تو ہے کہ بچہ جولی کی وجہ سے سہم گیا ہے"

"کیا کہتی رہی ہے کم بخت جولی اسے؟"

"یونہی اس کا ہاتھ اسے لگا اور یہ بگڑ گیا"

کھانے کے کمرے میں پہنچی تو نقشہ ہی اور تھا۔ میز اوندھی پڑی تھی۔ خور و نوش کے برتن ٹوٹ کر بکھرے ہوئے تھے۔

"یہ کیا شرارت ہے؟"

"یہ جولی نے . . . . "

اس نے معترض سخن ہوتے ہوئے کہا۔ "حد ہو چکی جولی جو چاہے کرے بچے کو مارے۔ برتن توڑے گھر کو سر پہ اٹھائے لیکن تمہارے کان پہ جوں تک نہ رینگے۔ جولی نہ ہوئی ایک آفت ہوئی"۔

"یقیناً ایسا نہیں ہے۔ ورنہ وہ یوں نکالی نہ جاتی"

"اسے تو پولیس کے حوالے کرنا چاہئے تھا نہیں"

"معقول وجہ نہ ہونے کی وجہ سے یہ مشکل تھا"

ہنریٹ نے حقارت کے ساتھ شانوں کو جنبش دی" تمہارے جیسے کمزور انسان میں یہ جرأت کہاں وہ تو تمہاری جولی نے کوئی خاص ہی چلے پھپھولے پھوڑے ہوں گے جو تم نے اسے نکالا۔ افسوس کہ میں یہاں نہ ہوئی"۔ یہ گل پاشی کر کے اس نے ننھے کو فرش سے اٹھا لیا۔ "میرا بچہ۔ میرا لال کیا ہوا میری جان؟" ننھا روتے ہوئے۔ "جولی نے ابا کو مارا تھا۔"

ہنریٹ خاوند کی طرف مڑی ناقابلِ ضبط ہنسی کی خواہش اس کی آنکھوں میں نمایاں ہوئی۔ رخسار سرخ ہو گئے۔ اوپر کا ہونٹ بل کھا گیا۔ نتھنوں میں پھبتیاں کھیلنے لگیں۔ شرارت آمیز مسکراہٹ نے سفید موتیوں کی لڑی عریاں کر دی ایک گانے والے پرندے سے زیادہ سریلی آواز میں چند فقرات اس کے حسین لبوں سے پھوٹ نکلے۔ جو ہیرنٹ کے دل کو سانپ اور بچھو کی طرح کاٹنے لگے۔

"ہاہاہا۔ مارا میرے خاوند کو مارا ہا ہا ہا کتنی مضحکہ خیز بات ہے سنتے ہو لیموتسی جولی نے میرے خاوند کو مارا ہا ہا ہا"

ہیرنٹ نے انکار کرتے ہوئے کہا: "یہ درست نہیں یہ غلط ہے بات اس کے الٹ ہے بچے کو غلطی لگی ہے"

"کیوں ننھے" ہنریٹ نے بچے کو مخاطب کیا۔ "جولی نے ابا کو مارا تھا نہ؟"

"ہاں مارا تھا"

اچانک ہنریٹ کا خیال دوسری طرف چلا گیا "لیکن ننھا ابھی تک بھوکا ہے۔ کیوں ننھے تم نے کچھ کھایا تھا؟"

"اوہوں" بچے نے جواب دیا۔

غصے سے بیوی کا چہرہ تمتما اٹھا۔ "تو ہونے کو آئے بچے کے حلق میں دانہ تک اڑ کر نہیں گیا۔ تم پاگل ہو بالکل پاگل"

ہیرنٹ نے عذر خواہی کرتے ہوئے کہا۔ "ہم تمہارے منتظر تھے تمہارے بغیر کھانا کھالینا معیوب سی حرکت تھی۔ تم روز قریباً دیر سے ہی آتی ہو۔ اس لئے مجھے ساڑھے چھ کے بعد ہر لحہ تمہارا انتظار تھا"

"یہ فقرہ سمندِ غضب پر تازیانہ تھا"۔ تم خود خرد ماغ ہو تمہارے ساتھ رہنا تو ایک عذاب ہے۔ وہ بھی کوئی انسان ہے جس میں رتی بھر عقل نہ ہو۔ بات کہنے کا سلیقہ نہ ہو اور صبح سے لیکر شام تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہے۔ فرض کرو مجھے دیر ہو جائے اور میں رات کے بارہ بجے آؤں تو بچہ بھوکا ہی رہے نہ"

ہیرنٹ بیوی کے اس بگڑتے ہوئے تیور کو دیکھ کر کانپ اٹھا اس نظارہ سے لیموتسی کا دل پسیج گیا۔ میاں بیوی کے جھگڑے میں دخل دیتے ہوئے کہا۔ تمہاری غیر معمولی دیر کا اسے کیسے اندازہ ہوتا

جبکہ تم ہر روز اس سے پہلے آتی ہو اور آج تو خصوصاً بغیر جونی کے ننھے کو کھانا کھلانا ایک مشکل امر تھا۔"

لیموسی کے ان الفاظ سے ہنریٹ کا غصہ فرو نہ ہوا۔ بولی "ان مشکلات کو اسے برداشت کرنا ہی پڑے گا۔ گھر کے انتظام کی میں اکیلی ذمہ دار نہیں"۔ یہ کہکر بچے کو روتا چھوڑ کے وہ منہ ہی منہ میں غصہ کا اظہار کرتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ لیموسی کام میں دوست کا ہاتھ بٹانے لگا۔ دونوں نے برتنوں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اٹھا کر خاک انداز میں پھینکے پیرنٹ دوڑا ہوا گیا اور ننھے کے کمرے سے میڈ کو بلا لایا۔ جو اس تمام لڑائی جھگڑے سے بے خبر اپنے کام میں مشغول تھی۔ اسے میز پر کھانا وغیرہ لگانے کے لئے کہا۔ وہ باورچی خانے میں گئی اور جو کچھ موجود تھا لے آئی۔ پیرنٹ نے پہلے بچے کو کھلایا۔ اس کے بعد آپ بھی چند لقمے زہر مار کئے...... تھوڑے سے وقفے کے بعد اسے لیموسی کو غور سے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی جو اس کے سامنے کرسی پر بیٹھا ہوا تھا پہلے تو وہ ہچکچایا لیکن آخر اُسنے اُس پر ایک معنی خیز نگاہ ڈالی آج وہ اپنے دوست کے چہرہ میں ایک غیر معمولی بات مشاہدہ کر رہا تھا۔ اس کا مقابلہ اپنے بچے کے خدوخال سے کرنا چاہتا تھا۔ پیرنٹ کی نگاہوں نے دونوں چہروں کا جائزہ لیا—— وہ کسی گہرے سوچ میں کھو گیا"۔ جارج کا باپ لیموسی۔ لیموسی۔ لیموسی" یہ الفاظ دلکی دھڑکن سے ہم آہنگ ہو کر کنپٹیوں میں گونجنے لگے۔ کیا اس کے سامنے بیٹھا ہوا انسان اس کے بچے کا باپ تھا؟ پیرنٹ نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ اب وہ کچھ نہیں کھا سکتا تھا۔ اس کے پہلو میں شدید درد تھا۔ ایسا درد جس سے انسان چلانے لگتا ہے۔ خاک میں لوٹتا ہے سر کو پیٹتا ہے۔ گریبان چاک کر دیتا ہے۔ چاہتا ہے تیز برچھی پیٹ میں بھونک کر زندگی کی داستان ختم کر دے۔

اب وہ کیسے زندہ رہے گا؟ کیا اسی خیال میں ڈوبے ہوئے صبح سے شام اور شام سے پھر صبح ہو گی؟ سیر کو جاتے ہوئے گھر کو لوٹتے ہوئے کھانا کھاتے ہوئے یہی خیال اس کے دماغ پر حاوی رہے گا۔ نہیں یہ ناقابلِ برداشت ہے۔ اِس آشوب کو برداشت کرنے کی اُس میں تاب نہیں ہے۔ ہر ہفتہ ہر دن ہر لحہ اس خوفناک راز کو بے نقاب کرنے کی کوشش میں گذرے گا؟ کیا وہ مجبور کیا جائیگا کہ ہمیشہ مشکوک نگاہوں سے اپنے لختِ جگر کو گھورا کرے؟ ایک ہی وقت میں اپنے بچے سے نفرت اور محبت کرے کاش اس کے سامنے حقیقت واشگاف ہو سکتی! اور وہ ہمیشہ کے لئے اس دکھ سے نجات پا جاتا۔

لاعلمی۔ جستجو مسلسل درد بچے کو چومنا۔ پیار کرنا۔ محبت کرنا اس خیال کو دل میں لئے ہوئے "شاید یہ میرا بچہ نہ ہو" اس سے تو بہتر ہے۔ وہ روپوش ہو جائے۔ بھاگ جائے۔ ہمیشہ کے لئے چلا جائے کہیں دور بہت دور جہاں ہمنوا کوئی نہ ہو اور رازداں کوئی نہ ہو۔

اتنے میں دروازہ کھلا ہنریٹ داخل ہوئی "مجھے بھوک لگ رہی ہے کیا تمہیں بھی بھوک ہے لیموسی؟" وہ ہچکچایا لیکن پھر کچھ سوچ کر جواب دیا "ہاں مجھے بھوک ہے"۔ انہوں نے خوب سیر ہو کے کھانا کھایا۔ ہنریٹ خوش تھی۔ کھلکھلا کے ہنس رہی تھی۔ پیرنٹ اُسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ وہ گلابی گون پہنے تھی۔ جس کے حاشئے پر سفید لیس ٹکی تھی وہ سارا دن اس غیر محرم کے ساتھ کس شغل میں مشغول رہی ہے؟" پیرنٹ کے دل میں خیال پیدا ہوا۔ کاش وہ صداقت معلوم کر سکتا یہ کیا ستم ظریفی ہو گی اگر وہ پہلے ہی دن سے یہ کھیل کھیل رہی ہو۔ کیا یہ ممکن ہے ایک شریف اور بھولے بھالے انسان کو صرف اس لئے بیوقوف بنا یا جائے کیونکہ وہ ایک چھوٹی سی جائداد کا مالک ہے؟ کیوں شریف کو بدمعاش کے منصوبوں کا پتہ نہیں چلتا؟ کیوں قلبِ انسانی کے حقیقی جذبات عریاں نہیں ہو جاتے؟ کیوں جھوٹ اور سچ بولنے میں ایک ہی زبان کام دیتی ہے؟ کیوں ایک پُر فریب اور ایک پُر خلوص نگاہ میں فرق نہیں ہو سکتا؟ وہ انہیں غور سے دیکھتا رہا۔ لیکن کوئی قابلِ گرفت بات نظر نہ آئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ باہر جا کر اچانک کمرے میں آنا چاہئے۔ اس سے شاید حقیقت پر کچھ روشنی پڑے۔ وہ اٹھا اور بیوی سے مخاطب ہوا "میں کسی خادمہ کی تلاش میں جا رہا ہوں تاکہ صبح ہمیں تکلیف نہ ہو۔ شاید میں جلدی گھر نہ آسکوں"

"ہاں جاؤ میں اور لیموسی نشستگاہ میں تمہارا انتظار کرینگے" پھر اس نے میڈ کی طرف مڑتے ہوئے کہا۔ "تم دسترخوان بڑھا کر جا سکتی ہو" پیرنٹ اٹھا اور کمرے سے نکل گیا اس کا سر چکرا رہا تھا۔ زمین پاؤں تلے سے نکلی جا رہی تھی۔ ....

ہنریٹ اور لیموسی نشستگاہ میں چلے گئے۔ دروازہ بند کرتے ہی لیموسی یوں گویا ہوا "تم دیوانی ہو۔ یونہی اسے دق کر رہی ہو"۔ وہ برقی تیزی کے ساتھ اس کی طرف مڑی۔ "یہ حمایتیں مجھے زہر معلوم دیتی ہیں"۔

"حمایت کی بات نہیں۔ یوں اسے تنگ کئے جانا نادانی ہے" لیموسی نے جواب دیا۔

ہنریٹ نے سگرٹ سلگاتے ہوئے کہا "میں دق نہیں کرتی بلکہ اسکی بھونڈی حرکات سے مشتعل سی ہو جاتی ہوں"

"یوں مشتعل ہو جانا ہی تو بیوقوفی ہے۔ تم عورتوں کی عقل جوتی میں ہوتی ہے۔ پیرنٹ حسنِ ظن کا پتلا ہے وہ کبھی ہمارے تعلقات میں خلل انداز نہیں ہوا۔ لیکن تم اسے غصہ دلا کے بنا بنایا کھیل بگاڑ دو گی"۔ اس نے سگرٹ کا کش لگاتے ہوئے کہا۔

"تم بزدل ہو جبھی تو پیرنٹ سے ڈرتے ہو"۔ اس بات پر لیموسی اچھلا اور سختی سے جواب دیا۔ "مجھے معلوم تو ہو کہ وہ بیچارہ کرتا کیا ہے جو تم اس کی مخالفت پر یوں ادھار کھائے بیٹھی ہو۔ کیا وہ تمہیں گالی دیتا ہے۔ مارتا ہے۔ تمہیں دھوکا دیتا ہے تم یونہی اسے پھاڑ کھانے دوڑتی ہو"۔

"کم از کم تمہیں یہ بات نہیں کہنا چاہئے جو منہ سے دوستی کا دم بھرتے ہو۔ لیکن دل سے بیوی پر مرتے ہو"

اس جواب سے وہ منفعل سا ہو گیا۔ خفیف سا ہو کر کہنے لگا۔ "میں تمہیں ملامت نہیں کر رہا پیاری یوں کہنے سے مقصد یہ ہے کہ تم ذرا نرمی سے پیش آیا کرو۔ ورنہ ہم اسکا اعتماد کھو بیٹھیں گے"

"لیکن کیا تم سمجھتے نہیں مجھے اس سے سخت نفرت ہے۔ وہ دن میں متعدد دفعہ اپنی حماقت سے مجھے برانگیختہ کر دیتا ہے۔ وہ ایک احمق سا انسان ہے۔ وہ تو ایک مٹی کا ڈھیر ہے جس میں حیات نام کو نہیں اور نہیں تو کم از کم وہ ہمارے تعلقات پر رشک ہی کھایا کرے۔" لیموسی کھلکھلا کے ہنس دیا اور ہنستے ہوئے کہنے لگا۔ "پھر بھی بہتر ہو اگر تم خاموش رہو۔ اور سوتے فتنوں کو جگانے کی کوشش نہ کرو"

"تم یونہی اس سے خائف ہو یا اسے پسند کرتے ہو جو یوں گرمجوشی سے ہاتھ ملاتے ہو۔ خندہ جبینی سے پیش آتے ہو تم مرد بعض دفعہ حیرت انگیز باتیں کر گزرتے ہو"۔

"عقلمند احتیاط سے کام لیتے ہیں" لیموسی نے کہا۔

"لیکن یہاں تو جذبات کا سوال ہے۔ تم مرد جب کسی کو دھوکا دیتے ہو تو تمہاری التفات پہلے سے فزوں تر ہو جاتی ہے لیکن ہم عورتیں اگر کسی کو چل دیں تو اسی گھڑی سے نفرت کرنے لگتی ہیں"

"لیکن میں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں اس شخص سے کیوں نفرت کروں جس کی بیوی سے مجھے محبت ہو"

"تم مرد اسے نہیں سمجھ سکتے تم میں ان نازک احساسات کا فقدان ہے۔ ان باتوں کا تعلق محسوسات سے ہے بیان سے نہیں۔ میں سمجھا نہیں سکتی کہ ہم عورتوں کی ایسے وقت میں کیا حالت ہوتی ہے"۔

یہ کہتے ہوئے مسکرا کر اس نے اپنے بازو لیموسی کی گردن میں ڈال دیئے اور شاہد بازاری کی طرح اپنا منہ اس کے قریب کر دیا وہ جھکا ——— دونوں کے ہونٹ ——— وہ ایک قدِ آدم شیشہ کے سامنے تھے۔ ایک ایسا ہی جوڑا آئینہ میں بھی ایسی قبیح حرکت کا مرتکب ہو رہا تھا۔ وہ اس وقت دنیا سے بے خبر تھے۔ اتنے میں ہنریٹ لیموسی کے پہلو سے بیساختہ اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ ... .

پیرنٹ دروازہ میں کھڑا غصہ سے کانپ رہا تھا۔ سر اور پاؤں عریاں تھے سر کو جنبش دیئے بغیر اسے ایک سے دوسرے پر شعلہ بار نگاہیں ڈالیں۔ اچانک خونخوار چیتے کی طرح لیموسی پر جھپٹا جھنجوڑا اور اس تندی سے ریلا کہ وہ دوسرے کونے میں جا رہا۔ لیموسی کا سر دیوار سے ٹکرایا اور اسے تارے نظر آنے لگے۔ جب ہنریٹ نے دیکھا پیرنٹ اسے مارے ڈالتا ہے وہ بھوکی شیرنی کی طرح اپنے خاوند پر جھپٹی نازک

نازک ہاتھ ہیرنٹ کا گلا گھونٹنے لگے اور اس زور سے اس کے شانے پر کاٹا کہ اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی وہ اٹھا اور بیوی کو جھٹک دیا جو دور منہ کے بل جا گری۔

ہیرنٹ کا غصہ بہت جلد ٹھنڈا پڑ گیا۔ جیسا کہ تمام نیکدل انسانوں کا غصہ جلد ہی فرو ہو جایا کرتا ہے۔ وہ ان دونوں کے درمیان کھڑا کانپ رہا تھا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اب کیا کرے جوش ختم ہو چکا تھا۔ وہ صرف تھکاوٹ اور بوجھ محسوس کر رہا تھا۔ جونہی اس کے دم میں دم آیا وہ سنجیدگی سے مخاطب ہوا۔ "چلے جاؤ تم دونوں میرے گھر سے نکل جاؤ۔"

لیموسی دیوار سے سہارا لگائے بے حس و حرکت کھڑا تھا۔ عقل جواب دے چکی تھی۔ خوف سے اس میں جنبش کی بھی طاقت نہ تھی۔ مجرم کتنا بزدل ہوتا ہے۔ ہنریٹ گول میز پر کہنیاں ٹیکے کھڑی تھی۔ ندامت اور غصے سے سرنگوں تھا۔ بال جبین نازبر پریشان تھے۔ گریبان چاک ہو کر گٹھی ہوئی سفید چھاتیاں عریاں ہو چکی تھیں۔ تند خو مادہ چیتے کی طرح جست کے لئے بیقرار نظر آ رہی تھی۔ اتنے میں دوبارہ ہیرنٹ کی آواز کمرے کے طول و عرض میں گونجی۔ "نکل جاؤ فوراً نکل جاؤ اس گھر سے"

ہیرنٹ کے غصے کو فرو ہوتے ہوئے دیکھ کر بیوی دلیر ہو گئی۔ قریب آ کر گستاخی سے بولی۔ "عقل کے ناخن لو۔ کیا ہوا تمہیں؟ کیا ہوش ٹھکانے نہیں" وہ گھونسا اٹھا کے اس کی طرف بڑھا۔ "نکل جاؤ۔ میں کہتا ہوں۔ تمہاری بے حیائی کی داستان ان کانوں سے سن چکا ہوں۔ تم دونوں بدمعاش ہو نکل جاؤ! دونوں نکل جاؤ۔ اسی وقت نکل جاؤ۔ میں تمہیں ہلاک کر دوں گا نکل جاؤ"

ہنریٹ نے جب دیکھا راز طشت از بام ہو گیا۔ وہ سارے سیاہ سفید سے واقف ہے وہ اپنی بے گناہی ثابت نہیں کر سکتی۔ اب عفت و عصمت کا ڈھونگ نہیں جم سکتا اس نے پینترہ بدلا۔ تمام نسوانی شوخیاں سمٹ کر نوکِ زبان پر آ رہیں۔ نفرت کے سبھی گھٹے ہوئے جذبات ایک ہی وقت میں نکلنے کے لئے بیقرار ہو گئے۔

"آؤ لیموسی چلیں۔ میں اب سے تمہارے ساتھ رہوں گی"

لیموسی مبہوت کھڑا تھا۔ جواب نہ دے سکا لیکن ہیرنٹ ان الفاظ کی سوزش سے جل اٹھا۔ چیخ کر بولا۔ "جاؤ دور ہو جاؤ۔ میری آنکھوں سے اوجھل ہو جاؤ۔ ورنہ میں تمہیں ہلاک کر دونگا"

ایک کرسی اٹھا کے غصہ سے گھمانے لگا۔ ہنریٹ لیموسی کا بازو تھام کر دروازے کی طرف بڑھی وہ اب بھی دہکتے ہوئے کوئلے اگل رہی تھی۔ "آؤ لیموسی پیارے چلیں۔ تم دیکھتے نہیں یہ دیوانہ ہے جلدی چلے جاؤ" جاتے وقت ہنریٹ کے دماغ میں ایک خطرناک خیال پیدا ہوا۔ وہ خیال جس سے عورت کی تمام بے وفائیاں اپنے آپ کو بے نقاب کر دیتی ہیں۔ وہ ہیرنٹ کے دل کو مجروح کرنا چاہتی تھی اور ایسا زخم لگانا چاہتی تھی جو کبھی مندمل نہ ہو۔ اور اس سے تا زندگی خون رستا رہے۔ وہ وثوق سے بولی۔ "میں ننھے کو ساتھ لئے جا رہی ہوں"۔ اس سوال سے اس کے سارے بدن میں آگ لگ گئی ——— "تمہارا۔ تمہارا بچہ۔ بچے کا نام لیتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ چلو بھر پانی میں ڈوب مرو بے شرم اس کے بعد بچے کا نام لینے کی جرأت کرو۔ بدبخت عورت چلی جا یہاں سے اپنے ناپاک وجود سے اس گھر کو ہمیشہ کے لئے پاک کر دے۔"

وہ اپنے لبوں پر مسکراہٹ لئے ہوئے اس کی طرف بڑھی وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بولی۔ "ہاں میں بچہ لینا چاہتی ہوں۔ اسے رکھنے کا تمہیں حق نہیں کیونکہ وہ تمہارا نہیں لیموسی کا بچہ ہے۔ سمجھ گئے ہو؟"

ہیرنٹ حیران ہو کر تڑپ اٹھا۔ "تم جھوٹ بولتی ہو بدبخت تم بک رہی ہو"۔ ہنریٹ کے لبوں پر ایک شیطانی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ "بیوقوف انسان تمہارے علاوہ سب جانتے ہیں کہ حقیقی باپ کون ہے اس کا باپ وہ کھڑا ہے ذرا غور سے اس کے خدوخال کا جائزہ لو۔"

غریب ہیرنٹ لرزہ براندام ہو گیا۔ مڑا شمع اٹھائی۔ بھاگ کے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ بچے کو اٹھائے ہوئے واپس آیا۔ بچہ

ناپاک ماں کے بازوؤں میں دے کر دھکا دے کر باہر نکال دیا دروازہ
مقفل کر کے مڑا۔ ڈگمگایا اور دھڑام سے زمین پہ آ رہا۔

(۲)

ہیرنٹ تنہا رہنے لگا۔ تنہا بالکل تنہا۔ علیحدگی کے بعد چند ہفتے تک
نئی زندگی کے عجیب احساس نے اُسے غور و فکر سے باز رکھا۔ بیوی کو
بدستور سابق خرچ دیتا رہا۔ تاکہ بدنامی نہ ہو۔ رفتہ رفتہ بچے کا خیال
اسے تنگ کرنے لگا۔ اکثر رات کو کچھ دیر پہلے بلند سے اچانک کسی
خیالی آواز سے چونک پڑتا۔ آواز آتی "ابا۔ ابا" دل دھڑکنے
لگتا۔ ایک رات تو اس نے دروازہ کھول دیا۔ شاید ننھا باہر
کھڑا ہو۔ وہ لوٹ آیا ہو جیسے پالتو کتے اور کبوتر واپس لوٹ
آتے ہیں۔ کیا بچوں میں اپنے مسکن کو لوٹنے کی تحریک طبعی کم ہوتی ہے؟
یہ معلوم کر کے کہ آواز اس کا وہم تھا اندر آ کر لیٹ گیا۔ جارج کی موہنی
صورت آنکھوں کے سامنے پھرنے لگی ------ گھنٹوں اسی
سوچ میں ڈوبا رہتا۔ دن اسی ایک خیال میں گذر جاتے یہ محض ایک
ذہنی تکلیف نہ تھی بلکہ اس میں ایک جسمانی اذیت کا بھی عنصر تھا۔
دل میں بچے کو چھاتی سے بھینچ کر پیار کرنے کی خواہش بار بار پیدا ہوتی
اور یہ خواہش دوران خون کے ساتھ چکر کاٹتی ہوئی دھڑکن میں
تبدیل ہو جاتی۔ وہ بار ہا ننھے ننھے ہاتھوں کو اپنی داڑھی سے کھیلتے
ہوئے محسوس کرتا۔ اس کے گھنگریالے بال اکثر پیشانی سے چھوتے
ہوئے معلوم دیتے۔ دن میں سینکڑوں دفعہ اپنے آپ سے پوچھتا "کیا
وہ جارج کا باپ ہے؟" تمام رات کروٹیں لیتے گذر جاتی۔ پسلیاں
دکھنے لگتیں۔ دل میں ناسور سے زیادہ درد دماغ میں دوزخ سے
بڑھ کر سوزش محسوس ہوتی۔ گویا ہر رات یہی سوزشیں ہوتیں اور وہ
یہی کاوشیں ہوتیں اور وہ۔

پہلے چند دنوں تک تو اسے کامل یقین رہا کہ جارج واقعی لیموسی کا
بیٹا ہے۔ لیکن یہ حالت زیادہ دیر تک قائم نہ رہ سکی۔

ہنریٹ کے الفاظ کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہئے۔ یہ
تریا چرتر ہے۔ مجھے دکھ دینے کے لئے اس نے جھوٹ بولا ہے.......
لیموسی حقیقت سے ضرور آگاہ ہوگا۔ لیکن وہ اسے کیوں بتانے لگی۔
اُسے کون سچ بولنے پر مجبور کر سکتا ہے۔"

ہیرنٹ آدھی رات کو اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگتا۔ بار بار اسکے
دل میں خیال پیدا ہوتا۔ میں نے جلدی کی۔ مجھے دو تین ماہ تک اور
ٹھہرنا چاہئے تھا۔ دھیرج کے ساتھ حالات کا مطالعہ کرنے سے حقیقت
ضرور وا انکشاف ہو جاتی۔ لیموسی کی حرکات ضرور غمازی کرتیں۔
غیر شخص بچے سے باپ کی مانند محبت نہیں کر سکتا۔ وائے حسرت اُسے
یہ بات پہلے کیوں نہ سوجھی! آہ میں نے جلد بازی سے ابدی روگ
خرید لیا! اب اس سے رہائی ناممکن ہے ---- قسمت! قسمت!!"

یہ شکوک اور مصائب کا سلسلہ جاری رہا خصوصاً شام کے
جھٹپٹے کو دیکھ کر اس کی جان ہوا ہو جاتی۔ شفق کی سرخی میں اسے
خون ہی خون نظر آتا۔ رات کی تنہائیاں اسے لرزہ براندام کر دیتیں
وہ اپنی ذہنی کشمکش سے یوں ڈرنے لگتا۔ جیسے لوگ مجرموں سے ڈرتے
ہیں۔ وہ ان سے جان چھڑا کر ایسے بھاگتا جیسے کوئی خوفناک درندہ کے
آگے بھاگ رہا ہو۔ سنسان اور ویران گھر کو دیکھ کر اس کا کلیجہ منہ کو
آنے لگتا۔ ان گلی کوچوں سے اسے ہیبت سی معلوم دیتی۔ جہاں
تھوڑے تھوڑے فاصلے پر بجلی کے مدھم سے قمقمے ٹمٹما رہے ہوں اور
کسی شب رو کے پاؤں کی آواز دور کہیں اس خاموشی میں ڈوبتی
ہوئی معلوم دے رہی ہو۔

ہیرنٹ مغموم سناٹے سے بھاگ کر پر رونق بازاروں کی چہل پہل
میں پناہ لیتا۔ روشنی اور بھیڑ میں پہنچ کر اس خونین احساس میں کسی قدر
کمی ہو جاتی۔ بغیر کسی مقصد کے شہری ہنگاموں میں گھومنے لگتا۔ بھیڑ
کم ہونے لگتی بجلی کے منور قمقمے آہستہ آہستہ گل ہونے شروع ہو جاتے
پھر یہاں سے بھاگ کر کسی مے نوشوں سے بھرے ہوئے قہوہ خانے
میں جا بیٹھتا۔ شراب منگوا کے گھونٹ گھونٹ کر کے پینے لگتا تاکہ جلد
سیر نہ ہو جائے۔ ہر گاہک کے رخصت ہونے پر اُسے تکلیف سی محسوس
ہوتی۔ ایک ایک کر کے سب چلے جاتے۔ جب قہوہ خانہ خالی ہو جاتا۔
دوکان بڑھا دی جاتی۔ وہاں سے نکل کر تاریک گلیوں میں قدم رکھتے

ہی بچے کا خیال دماغ میں آموجود ہوتا۔ دل پر نشتر سے چلنے کا گمان ہوتا پہلو میں ان زخموں کو دبائے ہوئے گرتا سنبھلتا گھر کا رخ کرتا وہ گھر جس کی فضا خوفناک یادوں سے معمور تھی۔ گھر کیا تھا ایک یاس و حسرت کا مسکن جس کے کونے کونے میں اس کی آرزوؤں کے پھول کملائے ہوئے پڑے تھے۔ .... گھر کی ویرانی سے تنگ آکر وہ ایک ہوٹل میں رہنے لگا۔ تاکہ ہر وقت اس کے کانوں تک انسان کی آواز پہنچتی رہے۔ یہاں وہ کسی حد تک مسرور تھا۔

پانچ سال گذر گئے کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا۔ ایک دن وہ ہوٹل کے گرد و پیش میں گھوم رہا تھا۔ اس کی نظر ایک متمول خاتون پر پڑی جس کے ہمراہ ایک بلند قامت مرد اور خورد سال بچہ بھی تھا۔ وہ اس سے چند قدم کے فاصلے پر آگے جا رہے تھے۔ ان کی حرکات و سکنات دیکھی ہوئی سی معلوم دیں۔ یہ تینوں کون تھے؟ انہیں دیکھ کر پیرنٹ کے خون میں تموج سا پیدا ہو گیا۔ وہ تینوں ایک دوکان کے سامنے رک گئے۔ لیموسی کے بال سفید ہو چکے تھے۔ جسم کچھ پہلے سے دبلا تھا۔ ہنرییٹ خوب فربہ ہو رہی تھی۔ جارج کی صورت میں اتنا تغیر آچکا تھا کہ اسے پہچان لینا ایک مشکل امر تھا۔ کیا یہ وہی ننھا سا بچہ تھا جسے وہ ہر وقت گود میں لئے رہتا تھا؟ پیرنٹ ان کے قریب سے ہو کر گذرا۔ دل میں بچے کو اٹھانے کی ناقابل ضبط خواہش پیدا ہوئی پیرنٹ قصداً جارج سے کھسٹ کر گذرا۔ اجنبی لڑکے نے قہر آلود نگاہوں سے پیرنٹ کو دیکھا۔ پیرنٹ ان نگاہوں کی تاب نہ لا سکا اور سرعت سے گذر کر آگے چلا گیا۔ کمرے میں پہنچ کر آرام کرسی پر گر پڑا

... قریباً چار ماہ تک وہ ان نگاہوں کی [illegible] محسوس کرتا رہا۔ کیا یہ غضب آلود لڑکا وہی ننھا سا جارج تھا؟ کیا وہی تھا جس نے وجود میں آتے ہی زندگی کی پہلی تین منزلوں کو پیرنٹ کی گود میں طے کیا؟ کیا خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا جو سنا افسانہ تھا! کیا اس دنیا میں پدرانہ شفقت کا معاوضہ دہکتے ہوئے انگارے ہیں؟

رفتہ رفتہ یہ زخم بھی بھرنے لگے۔ خشمگیں نگاہوں کا احساس کم ہونے لگا۔ ایک دفعہ پھر کاہل انسانوں کی سی زندگی بسر کرنے لگا شغل مے نوشی نے کافی حد تک قصۂ ماضی کو فراموش کرنے میں مدد دی۔ اب اسے وہ حزنیہ کبھی کبھی یاد آتا۔ جس نے اسکی کشتی حیات کو بحر حوادث میں غرق کر دیا۔ سر کے بال سفید ہو کر جھڑ گئے۔ بھرے ہوئے چہرے پر جھریاں نمودار ہو گئیں۔ داڑھی کے بالوں پر صبح پیری ضیا پاشیاں کرنے لگی۔ زندگی کا آفتاب موت کی خونین شفق میں آہستہ آہستہ غوطہ زن ہونے لگا۔

. دریا چڑھے اور اتر گئے۔ آندھیاں آئیں اور گذر گئیں۔ بگولے آئے اور نکل گئے لیکن اس غریب مظلوم بیکس انسان کی زندگی میں کوئی خاص تغیر واقعہ نہ ہوا. ..... زندگی کے بیس سال ہوٹل کی تنگ و تاریک کوٹھری میں گذر گئے!

ہوٹل کے مالک نے ایک دن پیرنٹ سے یوں کہا۔ "موسیو آپ کی صحت گر چکی ہے کیا ہی اچھا ہو اگر آپ چند یوم کیلئے دیہات کیطرف نکل جائیں"۔ ہوٹل کا مالک پیرنٹ کی عدم موجودگی میں ہمیشہ اپنی خادمہ سے کہتا۔ "پیرنٹ اب چند دن کا مہمان ہے تمہارا اسیر اثر ہے۔ اسے کہو کچھ عرصہ کے لئے کہیں سیر و تفریح کیلئے نکل جائے۔ اس سے اس کے چہرہ پر کچھ رونق آجائے گی"۔ خادمہ کو اس مغموم بوڑھے کی حالت پر بہت رحم آتا وہ اکثر اسے کہتی۔ "موسیو کچھ اپنی حالت پر رحم کھاؤ۔ تمہاری صحت دن بدن خراب ہو رہی ہے۔ چند دنوں کے لئے دیہات کی طرف چلے جاؤ۔ ٹھنڈی اور تازہ ہوا سے تمہاری طبیعت کو طاقت ملے گی۔ میرے بس میں ہوتا تو میں ہمیشہ دیہات میں رہتی"۔ وہ اسے گاہے گاہے شعریت سے لبریز خوابیں سناتی۔ خادمہ ایک بھولی بھالی دیہاتی لڑکی تھی جسے فکر معاش نے کچھ عرصہ سے گرد آلود تمدن اور ہنگامہ خیز شہریت میں رہنے پر مجبور کر دیا تھا اسے اپنے دیہاتی وطن سے بہت محبت تھی۔ وہ موسیو پیرنٹ سے بار بار ذکر کرتی۔ "موسیو دیہاتی زندگی مزے کی زندگی ہے۔ وہاں درختوں کے خوابیدہ سائے موسم سرما کی سہانی دھوپ چراگاہوں میں دور تک چرتے ہوئے مویشی رنگا رنگ کے کھلے ہوئے جنگلی پھول ندیوں کے سفید بہتے ہوئے پانی ہمیشہ انسان کو مسرور رکھتے ہیں"۔ ابتدا میں پیرنٹ ان باتوں کو چنداں

خیال میں نہ لاتا لیکن رفتہ رفتہ اس کے تجسس میں اضافہ ہونے لگا۔ کیا دنیا کی زندگی واقعی دلفریب ہے؟" بعض دفعہ دل میں سیر و تفریح کے لئے خواہش بھی پیدا ہوتی۔ ایکدن اس نے نوجوان خادمہ سے دریافت کیا" تمہیں علم ہے پیرس کے مضافات میں کہاں بود و باش کا خاطر خواہ بندوبست ہو سکے گا؟"

جواب ملا" سینٹ جرمین میں موسیو"

ایک اتوار کو وہ سینٹ جرمین جانے کو روانہ ہوا وہ گاڑی میں بیٹھا ہوا دوڑتے ہوئے درختوں کھیتوں اور جھونپڑوں کو دیکھ رہا تھا۔ خلاف معمول زندگی میں تغیر سا دیکھ کر اُسے ذہنی کوفت محسوس ہو رہی تھی۔ مناظر سے کچھ اجنبیت سی ٹپک رہی تھی۔ جسم و دماغ کے اندر ایک عجیب قسم کی کشمکش سی ہو رہی تھی۔ جس سے اسے بار بار پیاس معلوم دیتی۔ وہ ہر سٹیشن پر اتر کر بیر کا گلاس چڑھا جاتا .... "ہر چیز میں حرکت ہے ہر چیز تغیر پذیر ہے۔ درخت اور جھونپڑے اُڑتے چلے جا رہے ہیں۔ گاڑی فراٹے بھرتی ہوئی اپنی جگہ کو تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ لیکن میں برسوں سے ایک ہی جگہ کھڑا ہوں میری زندگی میں کوئی تغیر پیدا نہیں ہوتا۔ میرے اوقات کی یکسانیت نہیں ٹوٹتی۔ ہر چیز کو بدلتے ہوئے دیکھنا۔ ہر شے کو ایک حالت سے دوسری حالت میں جاتے ہوئے مشاہدہ کرنا۔ لیکن خود کو سکوت و جمود کی آہنی زنجیروں میں جکڑے ہوئے پانا ظلم ہے! ——— ظلم ہے! اسے کون برداشت کر سکتا ہے"

گاڑی سینٹ جرمین کے قریب پہنچی۔ حدِ نگاہ تک گھاس کے میدان پھیلے ہوئے تھے۔ جس میں خوشنما دیہات شطرنج کے مہروں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ سفید سڑکیں ایک دوسری کو کاٹتی ہوئیں دور جا کر درختوں کے جھنڈوں میں غایب ہوتی چلی گئی تھیں۔ شفاف پانی کے جوہڑوں پہ نکلتے ہوئے سورج کی تنک تابی رقص کر رہی تھی۔ سینٹ جرمین کا سٹیشن آپہنچا۔ گاڑی رکی۔ لوگ اترنے شروع ہوئے پیرنٹ بھی اترا .... ہوٹل میں پہنچا کمرہ کرایہ پر لیا... کھانا کھا کر سگرٹ کے بڑے بڑے کش اڑانے لگا گذرے ہوئے واقعات آنکھوں کے سامنے پھر گئے۔ ذہنی تلخیاں ایک دفعہ پھر انگڑائی لے کر بیدار ہو گئیں۔ میں نے کیوں زندگی کے بیس سال ہوٹل کی تنگ تاریک کوٹھری کی نذر کر دیئے؟ مجھے کسی لمبے سفر کو نکل جانا چاہیئے تھا علوم و فنون کی گہرائیوں میں غوطہ زن ہونا بھی بڑے مزے کی چیز ہے لوگ ان اعلےٰ مشاغل میں خوش خوش زندگیاں بسر کر دیتے ہیں۔ میں بھی ضرور لطف اندوز ہوتا ——— لیکن وقت گذر چکا اب اجڑے ہوئے کھیت میں دانہ تک باقی نہیں"۔ ان خون آلود احساسات کو فراموش کرنے کے لئے شراب میں مخمور رہنے لگا۔ مرور زمانہ سے بھرے ہوئے ناسور تلخ یاد کی نمی سے ہرے ہو گئے ....

ایکدن وہ ہوٹل میں بیٹھا ہوا اپنے خیالات میں محو تھا کچھ لوگ اندر داخل ہوئے اور اس کے قریب بیٹھ گئے ان کے سامنے کھانا چنا گیا وہ کھانے میں مصروف ہو گئے۔ یکایک پیرنٹ کو ایک عورت کی آواز نے چونکا دیا" جارج کیا مرغ کھاؤ گے"؟ جواب ملا "ہاں کھاؤنگا امّی" پیرنٹ کی نگاہیں معنی خیز ہو گئیں۔ بھانپ گیا یہ کون لوگ ہیں۔ جارج۔ ہنریٹ اور لیموسی قریب ہی میز پر بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ہنریٹ پہلے سے بھی فربہ تھی۔ جارج شباب کو پہنچ چکا تھا۔ وہ ایک شوقین مزاج جوان معلوم دے رہا تھا۔ پیرنٹ نے حیرانی سے دیکھا" کیا یہ وہی جارج ہے؟" لیموسی کا چہرہ دوسری طرف تھا اس کے کندھوں میں معمولی سا خم پیدا ہو چکا تھا۔ وہ تینوں خوش باش معلوم دے رہے تھے۔ انکی زندگی راحت اور سکون سے لبریز تھی وہ ان سب نعمتوں سے مستفید تھے جو انسانی زندگی کو خوشگوار بنا دیتی ہیں۔ لیکن انہوں نے اس قصرِ تعیش کی بنیاد پیرنٹ کی خانہ بربادی پر رکھی۔ انکی رگ رگ میں پیرنٹ کا نمک تھا۔ اِن تین اشخاص نے بھولے بھالے پیرنٹ کو ایسی دوزخ میں بند کر دیا۔ جہاں بیس سال تک اس کی روح بھٹکتی رہی۔ اور اب پیرنٹ کے دلِ بے مدعا میں کوئی آرزو نہ تھی۔ آخر امید اور آرزو کیوں پیدا ہوتی جبکہ دنیا میں اس کا کوئی نہ تھا۔ اس کے لئے دنیا سنسان اور ویران جگہ تھی ——— وہ دل جو کبھی راحت سکون اور

انبساط کا گہوارہ تھا۔ اب وہاں یاس و قنوط کی حکومت تھی۔ یہ سب کیا دھرا ان تین انسانوں کا تھا جو اس کے قریب بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اب بیرنٹ کو بچے سے بھی محبت نہ تھی ———— "یہ لیموسی کا بیٹا ہے۔ کیا کوئی غیر کے بچے کو اتنی شفقت سے پالا کرتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ جارج یقیناً اس پاپی کا بیٹا ہے۔ کاش اس حقیقت کا انکشاف پہلے ہو سکتا! وہ انہیں ناکوں چنے چبواتا۔ کیا محض اس بچے کے لئے میں متواتر بیس سال تک لہو کے گھونٹ نہیں پیتا رہا؟ میری تمام تلخیاں صرف اس حرامی پلے کی وجہ سے وجود میں آئیں"

بیرنٹ خوفناک چیتے کی طرح انہیں دیکھ رہا تھا۔ وہ چاہتا تھا انہیں پھاڑ کھائے۔ تکا بوٹی نوچ ڈالے سر کھوڑ کر بھیجا نکال دے نہیں اب وہ بغیر انتقام لئے انہیں نہیں چھوڑے گا۔ انتقام کی آخری گھڑیاں آپہنچیں ———— اسے اپنی درد انگیز زندگی کا انتقام لینا ہے دماغ میں مختلف تجاویز پیدا ہوئیں۔ تاتاری یلغاروں کے انہدام آنکھوں کے سامنے پھرنے لگے۔ وہ جام پر جام اڑا رہا تھا تاکہ وقت پر اس کا دل نرم نہ ہو جائے۔ اچانک ایک تدبیر دماغ میں سما کر قوت عمل میں تبدیل ہو گئی۔ ہونٹوں پر زہر آلود مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ شراب کا پیالہ ہاتھ سے رکھ دیا۔ "بچ کر وہ میرے انتقام کی زد سے بچ کر نکل نہیں سکتے"۔ ان تینوں نے کھانا ختم کیا اور دستر خوان بڑھا دیا گیا۔ وہ خراماں خراماں سیر و تفریح کے لئے گاؤں سے باہر جا رہے تھے بیرنٹ نہایت احتیاط سے تعاقب کر رہا تھا۔ ہنریٹ لیموسی کے بازو سے لٹکی ہوئی تھی۔ جارج چھڑی سے درختوں کی ٹہنیوں سے کھیلتا اور سگار کے کش اڑاتا چلا رہا تھا۔ بیرنٹ ان کے قریب پہنچ چکا تھا قلبی ہیجان سے سر چکرا رہا تھا جسم کانپ رہا تھا اسے اس حالت میں انکے سامنے جاتے ہوئے خوف معلوم دے رہا تھا وہ دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ان کے قریب سے گذرا اور آگے چلا گیا تاکہ ان کے مقابل ہو سکے۔

بیرنٹ کچھ دور جا کر مڑا اتنے میں وہ تینوں ایک تناور درخت کے سائے میں بیٹھ چکے تھے۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا ان کے سامنے آ کر رک گیا۔ "میں آپہنچا ہوں۔ تمہیں غالباً میرے دوبارہ آنے کی توقع نہ ہوگی"۔ وہ اسے پہچاننے سے قاصر رہے۔ اور اسکی بات پر چنداں توجہ نہ کی اور خیال کیا کوئی دیوانہ ہے جو یوں بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے بیرنٹ دوبارہ ذرا معنی خیز انداز سے گویا ہوا۔ "شاید تم مجھے بھول چکے ہو۔ میں ہنری بیرنٹ ہوں۔ بیرنٹ جانتے ہو وہ کون تھا۔ تمہیں اس کے یوں اچانک آنے کی امید نہ ہوگی۔ لیکن نہیں دنیا میں بعض دفعہ خلاف امید باتیں بھی وجود میں آجایا کرتی ہیں . . . . . مجھے آج تم سے کچھ کہنا ہے"۔

ہنریٹ نے خائف ہو کر چہرہ سے ہاتھوں کو چھپا لیا۔ جارج والدہ کو یوں ہراساں دیکھ کر اچھل پڑا۔ لیموسی بھی اپنی جگہ تصویر حیرت بن کر رہ گیا۔ بیرنٹ کی خوفناک آواز فضا میں گونجنے لگی۔ "تم نے دھوکا دے کر میری زندگی کو تباہ کر دیا اور اتنے عرصہ کے بعد مکافات سے بچنے کی کوشش کرتے رہے لیکن یہ دستور نہیں۔ تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ پاداش عمل کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ پاداش سے بچ نکلنا ایک محال سا امر ہے" نوجوان جارج غصے میں اٹھا اور اسے کندھوں سے پکڑ کر جھنجوڑا۔ "کیا دیوانے ہو؟ کیا چاہتے ہو؟ اپنی راہ لو ورنہ میں تمہیں سزا دونگا"۔ بیرنٹ نے زہر خند کر کے جواب دیا۔ "میں کیا چاہتا ہوں۔ میں تمہیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں کون ہوں اور یہ کون ہیں" قریب تھا کہ جارج اس کے رخسار پر ایک گھونسا رسید کرے کہ بیرنٹ نے پھر سلسلہ کلام جاری کر دیا۔ "نوجوان ٹھیرو ذرا ہوش سے کام لو مجھے کچھ نہ کہو۔ میں تمہارا باپ ہوں ذرا غور سے دیکھو وہ دونوں کمبخت مجھے پہچان رہے ہیں"۔ جارج کا اٹھا ہوا ہاتھ شل ہو کر گر پڑا۔ بیرنٹ اس سے ہٹ کر ہنریٹ کے قریب گیا اور یوں مخاطب ہوا۔ "جارج پوچھتا ہے میں کون ہوں اسے بتاؤ میں کون ہوں اس غریب سے کہو میرا نام ہنری بیرنٹ ہے اور اس کا نام جارج بیرنٹ ہے اور اس بات پر بھی روشنی ڈالو کہ میں نے تمہیں گھر سے کیوں نکالا۔ اپنے بیٹے پر ترس کھاؤ۔ تاکہ اسے علم ہو کہ یہ قلاش اور رذیل انسان کون ہے (لیموسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) خاموش کیوں ہو۔ میں تم سے مخاطب ہوں۔ بیسوا میری باتوں کا جواب دو؟"

دو دم لینے کے لئے رکا۔ ہنرییٹ درد انگیز لہجہ میں چلائی۔" اے روکو۔ اسے کہو خدا کے لئے خاموش رہے میرے بیٹے کے سامنے مجھے یوں مخاطب نہ کرے" لیموسی تحکمانہ انداز میں یوں کہنے لگا۔" خاموش رہو۔ زبان کو لگام دو۔ سوچو تم کیا کہہ رہے ہو" پیرنٹ غرا کر بولا۔" مجھے خوب علم ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔ مجھے صرف ایک بات کا تجسس ہے۔ میں صرف ایک حیا سوز راز کو طشت از بام کرنا چاہتا ہوں" پھر اس نے جارج کی طرف رخ کیا جو درخت سے ٹیک لگائے کھڑا تھا اسے مخاطب کیا۔" اس عیارہ کو مجھ سے علیحدہ ہوئے بیس سال کا عرصہ ہو گیا ہے میرے گھر سے رخصت کیوں ہوئی یہ اس سے دریافت کرو ——— جاتی دفعہ یہ زہریلی ناگن ایسا ڈنک لگا گئی جس کی سوزش سے میری روح متواتر بیس سال تک خاک و خون میں لوٹتی رہی۔ بیٹا! ——— مجھے تم سے بیحد محبت تھی۔ تم میری دنیا تھے لیکن اس پتھر دل والی عورت نے تمہیں میری آغوش شفقت سے چھین کر علیحدہ کر لیا۔ اس نے جاتی دفعہ ایک ایسا چرکہ دیا کہ جس سے اب بھی خون رستا ہے۔ ——— اس نے کہا کہ تم میرے بیٹے نہیں بلکہ اس گداگر کے بچے ہو۔ (لیموسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) کیا اس نے جھوٹ بولا؟ مجھے علم نہیں۔ کیا سچ کہا؟ میں اس کا صحیح طور پر اندازہ نہیں کر سکتا۔ میں نے پورے بیس سال تک اس شرمناک معمہ پر غور کیا ہے۔ لیکن بے سود۔ میں کوئی صحیح رائے نہیں قائم کر سکا" وہ ایک خوفناک جست لگا کے ہنرییٹ کے قریب گیا اور اس کے ہاتھوں کو جھٹک کر چہرہ سے علیحدہ کرتے ہوئے جن سے وہ ابھی تک منہ چھپائے تھی۔ ڈپٹ کر کہنے لگا۔" میں تم سے پوچھتا ہوں۔ ہم دونوں میں سے کون اس کا باپ ہے۔ میں تمہارا حقیقی خاوند یا یہ رذیل کتا۔ جلدی بتاؤ دیر نہ کرو" اس بات پر لیموسی آگ بگولہ ہو کر اس پر جھپٹا۔ لیکن پیرنٹ اسے خاطر میں نہ لاتے ہوئے کہنے لگا۔" خوب اب تم بہت دلیر ہو۔ اب اس وقت سے بہادر ہو جب میں نے ٹھڈے مار کر اپنے گھر سے نکالا تھا تم ایڑی سے لے کر چوٹی تک گوشت سے لے کر پوست تک میرے نمک سے بنے ہو اور اس وقت بھی تمہاری انتڑیوں میں میرا نمک ہے۔ میں صرف اس بچہ کی وجہ سے آج تک اس بدفطرت عورت کو خرچ دیتا رہا ہوں۔ ہاں ہاں حق نمک ادا کرو تمہیں بتا دو اس بچے کا باپ کون ہے؟" وہ دوبارہ بیوی سے مخاطب ہوا۔" اے باعصمت خاتون اگر تمہیں مجھ سے ذکر کرتے ہوئے شرم معلوم دیتی ہے تو اپنے بیٹے کو بتا دو۔ وہ جوان ہے باپ کے متعلق استفسار کرنا اس کا حق ہے۔ جارج اگر مجھے علم ہوتا تو میں تمہیں کبھی اندھیرے میں نہ رکھتا لیکن تمہاری ماں سنگدل ہے۔ اسے تم پر رحم نہیں آتا۔" اب اس کی آواز کچھ لڑکھڑا رہی تھی جسم کانپ رہا تھا اعصاب بھڑک رہے تھے۔" جواب دو بیگم عفت رہتی دنیا تک تمہارے نام پر ناز کرنگی۔ جواب دو میں تم سے پوچھتا ہوں نہیں اس بیچاری کو خود علم نہیں۔ واللہ علم نہیں اس کا ایک ہی وقت میں ہم دونوں کے ساتھ .... اسے کیونکر علم ہو سکتا ہے جارج تم ہمیشہ اپنی ولدیت کے صحیح علم سے محروم رہو گے۔ اگر تمہیں یقین نہ ہو تو اس سے دریافت کرو یہ بتانے سے قاصر رہے گی ——— تمہیں اختیار ہے ہم دونوں سے جسے چاہو انتخاب کر لو۔ میں پیرس کے فلاں ہوٹل میں مقیم ہوں۔ میں تم سے مل کر خوش ہونگا۔ اور تم بھی اپنے باپ کی خدمت میں رہ کر مسرور ہوگے۔ میری شفقت کے بادل میں ابھی اتنا پانی ہے کہ وہ تمہاری زندگی کی کھیتیوں کو شاداب کر سکے۔ اچھا رخصت" یہ بات کہہ کر وہ ہانپتا کانپتا قلق و جوش سے لرزتا ہوا وہاں سے چلا آیا۔

پیرس جانے والی گاڑی کھڑی تھی۔ ٹکٹ لے کر اس میں بیٹھا اور معین وقت پر پیرس پہنچ گیا ؛

....

گلزارِ خلیل

حضرت خلیل بیگوسرائی

ہماری فغاں سے اثر ہل گیا — زمیں تھرتھرائی فلک ہل گیا
مرا غنچۂ آرزو کھل گیا — نظر جب ملی دل سے دل مل گیا
تھی بادِ صبا تیغ بھی یار کی، — چلی تو گلِ زخمِ تن کھل گیا
مجازی میں دیکھا حقیقت کا نور — بتوں سے ملے تو خدا مل گیا
تو حیراں بہت ہوگا او آئینے! — رخ یار کے گر مقابل گیا
یہ دستِ جنوں کی ہیں گلکاریاں — کھلا گل جو زخمِ جگر چھل گیا
وہ ٹھکرا کے کہتے ہیں "ہم کیا کریں" — "زمیں سے جو مرقد کوئی مل گیا!"
صدا میری سن کر کہا غیر سے — گلی سے مری کون سائل گیا
رہا پھر نہ گلچیں کو کچھ امتیاز — گلوں میں جو وہ گلبدن مل گیا
پھڑکتا ہے رہ رہ کے ہر عضوِ تن — ادھر ہی سے کیا ہو کے قاتل گیا
حسد سے وہیں جل گئی شمعِ بزم — جو محفل میں وہ شمعِ محفل گیا
مرہ آہ سے، یار کی چال سے — زمیں ہل گئی، آسماں ہل گیا
یہ پھولوں کا گجرا وہ نازک بدن — گلے میں جو ڈالا گلا چھل گیا

لگا لائیں گے راہ پر پھر خلیل
کہیں چلتے پھرتے جو وہ مل گیا

مسیح الملک حکیم محمد اجمل خان صاحب رئیس اعظم دہلی
سرپرست ہندوستانی دواخانہ

رہی ہیں۔ اور جس طرح آپ کی علمی فیوض و برکات سے وہ مستفیض رہے اسی طرح آپ کے دست فیاض نے مالی امداد سے بھی دریغ نہیں کیا ہے۔

ہندوستان میں موجودہ طبی درسگاہوں کا وجود اور صوبہ جات میں میڈیسن بورڈوں کا قیام، ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپل بورڈوں میں یونانی اور ویدک شعبوں کا اجراء آپ کی خاموش خدمات اور ملک کے طول و عرض میں سعی کے بیش بہا نتائج ہیں۔ ملک کے اتنے دور دراز حصوں میں جہاں طب یونانی کو جاننے والا ایک متنفس بھی نہ ہو۔ جیسا کہ مدراس و جنوبی ہند کے دوسرے مقامات وہاں آپ کی مخلصانہ سعی اور طب یونانی کے عشق سے دواخانہ جاری کرا دیئے اور آج بنگلور، مدراس، میسور وغیرہ [illegible] طرف ملک سے [illegible] آپ کی سعی بلیغ مخلصانہ [illegible] امراء ملک تک محدود تھیں۔ ہندوستان کا غریب سے غریب کاشتکار اور مزدور ملک [illegible] انھوں نے بعض [illegible] اور محال انھوں سے اپنی خاموش علمی زندگی کو مخصوص رستے [illegible] راستہ پسند کیا کہ وہ استغنٰی دے [illegible] دواؤں کے کاروبار [illegible] اصول پر منظم کرنیکے طریقوں پر غور و فکر اور بحث [illegible] کرنا شروع کیا۔ انھوں نے ہندوستان میں لمبے لمبے سفر کیے اور بہت سا اپنی روپیہ صرف کرنیکے بعد عجیب و غریب عملی تجربے اپنے خاندانی اور ذاتی مجربات کے سلسلہ میں کیے ہر جگہ بڑے بڑے معرکتہ الآراء علاج کئے۔ اور طب قدیم کی شہرت کو پھیلایا وہ ہندوستان میں اس وقت چوٹی کے حکیم ہیں۔ ذہن و دماغ کی بہترین خوبیاں جنھوں نے انکے والد کو شہرت کے آسمان پر آفتاب بنا دیا تھا۔ انکی ذات میں ودیعت کی گئی ہیں۔ وہ بچپن اور تعلیمی زمانہ میں ہی اپنے خاندان بھر کو ایک ممتاز اور غیر معمولی نمایاں ہستی تھے۔ انکے والد نے مختلف علوم خصوصاً فن طب میں انکی تعلیم [illegible] تھا۔ اور خود اپنی قیمتی زندگی کا بہت زیادہ وقت انکی علمی ادبی تعلیم و تربیت کو درجۂ کمال پر پہنچانے کے لیئے صرف کیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب حکیم اجمل خاں دنیا سے رخصت ہوئے اور ایسے بڑے شخص کی جگہ حکیم محمد جمیل خاں کو کام کرنا پڑا۔ تو ہر ایک نے یہی محسوس کیا۔ کہ گویا حکیم اجمل خانصاحب ہی زندہ ہیں فن طب میں انکی شہرت اپنے والد کی زندگی ہی میں شروع ہوگئی تھی۔ اور وہ ایسے مریضوں کے علاج میں کامیاب ہوئے جن کو ڈاکٹروں اور طبیبوں نے جواب دے دیا تھا۔ ان کی ایک خاص عادت یہ ہے۔ کہ کوئی کام چھوٹا ہو یا بڑا سرسری طور پر اور بے پرواہی کے ساتھ نہیں کرتے ہیں بلکہ پورے انہماک و کامل غور کے ساتھ ہی ہر کام کو انجام دیتے ہیں مطب میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ [illegible] باپ کی طرح ہیں۔ انتظامی معاملات میں ان کا کام ایسا ہی چچا تلا اور ان کی ہر ایک رائے ایسی ہی صائب اور سلجھی ہوئی ہوتی ہے جیسی کہ انکے والد مرحوم کے مشہور صفات تھیں عجیب و غریب بات یہ ہے۔ کہ لڑکپن سے لے کر اب تک انکی عمر پچاس برس کو قریب ہونے کو ہے۔ وہ زندگی کے کسی زمانہ میں بھی وقت کو بے فائدہ ضائع کرنے والے نہ تھے مطالعہ غور و فکر تحقیقات اور تجربہ ان کے محبوب مشاغل ہمیشہ سے چلے آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ الجھے ہوئے امراض کے علاج کو ایسی آسانی اور کامیابی کے ساتھ سر انجام دیتے ہیں جو کسی واحد طبیب کا نہیں۔ بلکہ کسی طبی بورڈ کا ہی کام ہو سکتا ہے۔ ع

"وہ اپنی ذات سے ایک انجمن ہیں"

مسیح الملک ثانی۔ مسیح الملک حکیم اجمل خانصاحب مرحوم کی تمام خوبیوں اور قابلیتوں کو انکی ذات میں دیکھ کر ہی کئی سال ہوئے [illegible] کے ایک آل انڈیا اجتماع نے ان کے لئے یہ تجویز کیا تھا [illegible] ہیں تو انکو مسیح الملک ثانی کے الفاظ سے مخاطب کرتے ہیں چھ برس کے تلخ تجربوں کے بعد لوگوں کی نگاہیں طبیہ کالج اور ہندوستانی دواخانہ دہلی پر انھیں کی جانب متوجہ ہوئیں اور جب سے ان کے والد کے یہ فرائض بار ثانی ان کے ہاتھوں [illegible] طبیہ کالج اور دواخانہ میں جمود و تعطل کی جگہ [illegible] رہی ہے مسیح الملک ثانی حکیم محمد جمیل خاں صاحب نہ صرف ہندوستان کے بہت بڑے لیڈر رہی ہیں

بلکہ وہ ایک موجد بھی ہیں اور دق اور ذیابیطس کے معالجہ کے لئے نہ صرف طب قدیم بلکہ دنیا کے فنِ طب کے معلومات میں جن سب سے کامیاب دواؤں کا اضافہ گزشتہ دس برس کے عرصہ میں ہوا ہے ان کی ایجاد کا فخر انہیں کا حصہ ہے۔ وہ جتنا وقت بھی ملتا ہے ان امراض مایوسہ کے کامیاب معالجات دریافت کرنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں تاکہ ان بیماریوں کا کامیاب علاج طبی دنیا کے عمل میں آجائے جن کے علاج سے اہل مغرب بھی ابھی تک قاصر ہیں اور اہل مشرق بھی۔ یہ شوق انکے اپنے والد مرحوم سے متوارث ملا ہے جن کی زندگی نے وفا نہیں کی اور ان کے بہت تجربے ناکام رہ گئے جن کو پورا کرنے کو حکیم جمیل خاں صاحب اپنا ذاتی فرض خیال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ طبیہ کالج کو ایک عظیم الشان طبی یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچا دینے کا کام بھی اپنا فرض خیال کرتے ہیں اور برابر اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ جس طرح ان کے والد کے ہاتھوں سے مدرسہ طبیہ ایک معمولی اسکول کے درجہ سے ترقی کرتا ہوا ایک عظیم الشان طبی کالج کے درجہ پر پہنچا تھا اسی طرح وہ آیورویدک یونانی طبیہ کالج دہلی کو ایک مکمل طبی یونیورسٹی کے درجہ پر پہنچا دیں تاکہ ترقی یافتہ ہندوستان کی ایک اہم تعمیری خدمت انجام پائے اور ہندوستان بہ فخر اور یہ دعویٰ کرسکے کہ وہ ذاتی سائنٹفک طب رکھتا ہے۔ اور پھر ویدک اور طب یونانی کو اپنے ملک میں ایک سرکاری طب ہونے کا جار سرل جائے حکیم محمد جمیل خاں مسیح الملک ثانی ایک غیر معمولی قوتِ عمل کے مالک ہیں۔ وہ بہت اچھا سوچنے والے اور بہت زیر عمل کام کرنیوالے شخص ہیں وقت آگیا ہے کہ اس فخر خاندان کے وہ کمالات بے نقاب ہوجائیں جو دَورِ جدید میں اس تاریخی خاندان کو زندہ رکھنے والے ہیں ہندوستان میں لاکھوں لوگ ہیں جو انکی عزت اور ان کا احترام کرتے ہیں اور یہ نہ صرف وہی لوگ ہیں جو انکے والد کے دوستوں سے ہیں بلکہ وہ لوگ بھی ہیں جنھوں نے انکے ذاتی کمالات اور انکی ذاتی خوبیوں کو دیکھا ہے یقیناً مسیح الملک محمد جمیل خاں اس وقت ایک ایسی ہستی ہیں جو فخر خاندان ہی نہیں بلکہ اپنے ملک و ملت کا فخر ہیں اور خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ آئندہ ترقی یافتہ ہندوستان کی اصلی اور اہم تعمیری خدمات میں ان کا کتنا بڑا حصہ ہوگا۔

اے کہ و بدی مراتب جزا است ۔۔۔ کار کلی ہنوز در سر است

یہ مشاہدہ ہے کہ انکا نام سن کر کابل اور بخارا اور بغداد اور فلسطین اور مصر اور ایران اور ٹرکی ہر جگہ سے چلے آتے ہیں اور انکی شہرت نہ محض یہی ہے کہ ہندوستان میں پھیل چکی ہے اور پھیلتی جاتی ہے بلکہ آدھی دنیا میں پھیل رہی ہے اور اسلئے کہ مسیح الملک ثانی حکیم محمد جمیل خاں خدمت انسان کا طبی جذبہ رکھنے والے اور سچی خدمات انسانی ادا کرنیوالے تمام طبی دنیا میں اس وقت ایک منفرد ہستی ہیں

افکار پریشاں

از:-
حضرت راز چاندپوری

اب وہ شوقِ بزم آرائی کہاں — اب وہ ذوقِ بادہ پیمائی کہاں
مضطرب ہے قلبِ محزوں مضطرب — اب فضائے حسن و رعنائی کہاں
سرد ہے اب سرد جوشِ انبساط — اب خیالِ رنجِ تنہائی کہاں
مطلعِ امید ہے ظلمت فروز — اب وہ فکرِ عالم آرائی کہاں
محفلِ شعر و سخن برہم ہوئی — اب وہ لطفِ نغمہ پیرائی کہاں
میکدہ ویراں ہوا مسجد خراب — اب خیالِ ناصیہ سائی کہاں
چل رہی ہے اک ہوائے انقلاب — اب کسی کو نازِ یکتائی کہاں
اب ہے دل کو صرف فکرِ احتساب — اب وہ کیفِ دورِ صہبائی کہاں

دم بخود ہوں رنگِ عالم دیکھ کر
راز اب یارائے گویائی کہاں

رہروانِ جادۂ عشق!

اطالوی افسانہ نگار ماسیو سیلبرٹانو کا شاہکار

ترجمہ جناب راجہ مہدی علی خاں صاحب اسسٹنٹ ایڈیٹر [illegible]

یہ افسانہ سانا کے ایک باشندے نے خوبصورت عورتوں کی ایک جماعت کو سنایا۔ سنانے والا کوئی معمولی آدمی نہ تھا بلکہ اس کا شمار شہر کے معتقدین میں ہوتا تھا۔

نوجوان میری اوڈو سانا کے ایک نیک نام خاندان کا رکن تھا۔ اس کے اخلاق و آداب نہایت اچھے تھے۔ وہ شہر کے ایک بہت ہی معزز رئیس کی خوبصورت لڑکی پر ہزار جان سے عاشق ہو گیا۔ بڑی مدت تک اپنی محبوبہ کی طرف دیوانہ وار توجہ رہ کر اس نے نوجوان عورت کے دل میں بہت سے جذبات پیدا کر دیئے ایسے جذبات جن کی شدت کچھ ان محبت آمیز جذبات سے کم نہ تھی جو خود میری اوڈو کے دل میں اضطراب پیدا کر رہے تھے۔ لیکن صرف ان دونوں کی آنکھیں ہی ایک دوسرے کو ان جذبات کی شدت کا احساس کرا سکتی تھیں جو ان کے دلوں پر مسلط ہو رہے تھے۔ وہ بڑے اضطراب سے کسی ایسے موقع کا امید وار انتظار کر رہے تھے جب وہ ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے اس طرح وابستہ ہو جائیں کہ کوئی طاقت انھیں جدا نہ کر سکے۔

نوجوان کی محبوبہ جتنی حسین تھی اتنی ہی عقلمند بھی تھی۔ جب اس کے اعزہ و اقربا نے اسے میری اوڈو سے شادی کرنے کی اجازت نہ دی تو اس نے فیصلہ کر لیا کہ میں خفیہ طور پر اپنے محبوب سے شادی کر لونگی۔ کیونکہ فراق و ہجر کی دہشت آفرینیوں سے بچنے اور وصل کی نشاط انگیزیوں سے ہمکنار ہونے کا یہی ایک طریقہ باقی تھا۔ ایک پادری کو نوجوان نے خوب رشوت دینے کے بعد اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ چوری چوری ان دونوں کی شادی کر دے چنانچہ ایسا ہی ہوا ایک دن وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں منسلک کر دیئے گئے لیکن ان کی محبت کا زمانہ، پھولوں میں بسی ہوا کے لطیف جھونکے کی شیرینی کی طرح بہت جلد گذر گیا۔ ان کی قسمت کی دیوی کو ان کی مسرت کی دیوی سے بیر ہو گیا۔ میری اوڈو کی ایک اور شہری سے تکرار ہو گئی۔ تو تو میں میں کے بعد ہاتھا پائی تک نوبت پہونچی۔ لیکن بدقسمتی سے میری اوڈو نے اپنے حریف کو ایسے مہلک زخم پہونچا دیئے کہ اسے قانون کے پنجے سے بچنے اور اپنی جان بچانے کے لئے اس ملک سے بھاگ جانا پڑا۔

سانا کی عدالت نے ملک کا قانون توڑنے اور قتل کا ارتکاب کرنے کے بعد مجرم کیلئے جلاوطنی کی سزا کا حکم سنایا۔ [illegible] حکم سن کر ان نوجوان اور ناتجربہ کار دلوں کو کس قدر غم ہوا ہوگا اور انھوں نے کتنے آنسو بہائے ہونگے الفاظ اس کے اظہار سے قاصر ہیں۔ البتہ اس کا اندازہ ان لوگوں کو ہو سکتا ہے جن کے دل محبت سے لبریز ہوں اور جو زندگی کی خواب آسا اور شیریں ترین مسرتوں سے کبھی یکایک چونکا دیئے گئے ہوں اور بالآخر ایک دوسرے کو عمر بھر کے لئے الوداع کہنے والے ہوں۔

ان کی جدائی کی مدت کس قدر روح فرسا اور طویل تھی فرط غم سے وہ سسکیاں لیتے ہوئے ایک دوسرے سے ہم آغوش ہو گئے۔ انھوں نے جدا ہونا چاہا لیکن ایک دوسرے کی دکھ بھری نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے دوڑ کر پھر ایک دوسرے کے گلے مل گئے۔ جب خوبصورت دلھن کا سر اپنے محبوب کے سینے پر جھکا تھا وہ اپنا غم بھول گئی۔ تھوڑی دیر بعد ان دونوں کے دل سے غم بتدریج زائل ہوتا گیا میری اوڈو اسے وطن میں واپس آجانے کے متعلق تسلیاں دیتا رہا کہ اگرچہ میں اٹلی سے جا رہا ہوں لیکن اسکندریہ میں مجھے اپنے ماموں کے یہاں پناہ مل جائیگی جو وہاں کا ایک مشہور تاجر ہے۔ میں تمہیں وہاں سے خط لکھتا رہوں گا اور ایسی تدابیر اختیار کرونگا کہ ہم تھوڑا ہی عرصہ جدا رہنے کے بعد ایک دوسرے سے آملیں۔

اسی طرح باتیں کرتے اور روتے ہوئے انھوں نے اپنے آپ کو

ایک دوسرے کی گرفت سے اس انداز کے ساتھ چھڑایا جس طرح گوشت ہڈیوں سے جدا کیا جاتا ہے

اپنے وطن کے ساحل پر آخری قدم رکھنے سے پہلے میری اوڈو نے اپنے بھائی کو پاس بلایا اور تمام حالات سے اسے باخبر کرتے ہوئے عاجزانہ درخواست کی کہ "دیکھو بھائی! میرے بعد اپنی فرقت زدہ بھابی کا خیال رکھنا اور اس کی ایک ایک بات اور اس کے ساتھ پیش آئے ہوئے چھوٹے سے چھوٹے واقعہ سے مجھے ہر آن آگاہ کرتے رہنا۔" اس کے بعد میری اوڈو اپنے وطن کے ساحل پر پہونچا اور جہاز پر سوار ہو کر روانہ ہو گیا۔

نوجوان کے ماموں نے اپنے بھانجے کا نہایت خوشی اور تپاک سے خیر مقدم کیا۔ جلاوطن مسافر نے جلد ہی اسے پیش آئے ہوئے حادثات کی تفصیل کہہ سنائی۔ تاجر نے نوجوان کا افسانۂ غم بڑی ہمدردی سے سنا اور اس کی گذشتہ غلطیوں پر اسے بے فائدہ سرزنش کرنے کی بجائے اسے نہایت نرمی اور دانائی سے دلاسا دیا کہ تم نے جن جن خاندانوں کو اپنے آپ سے ناراض کر لیا ہے وہ پھر تم سے خوش ہو جائیں گے اس نے صورت حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے اپنے خطرات کو چھپانے کی بھی کوئی خاص کوشش نہ کی بلکہ میری اوڈو کو تاکید کر دی کہ وہ سخت محتاط رہے۔ اس کے بعد اس نے اپنی بحری تجارت کا کچھ کاروبار اس کے حوالے کر دیا اور مستقل طور پر اسے اپنے ہی گھر میں رکھ لیا۔ لیکن نوجوان کے دل میں چین کہاں۔ اندر ہی اندر محبت کا غم اسے کھا رہا تھا تنہائی میں نہ جانے وہ کتنی کتنی دیر تک روتا رہتا تھا اگرچہ وقتاً فوقتاً اسے اپنی تباہ حال دلہن یا بھائی کے خط موصول ہوتے رہتے تھے جو اس کی زندگی کی واحد مسرت تھے۔

گیانوزا کے باپ کو کیا خبر تھی کہ میری بیٹی کی شادی ہو چکی ہے اس کے پاس جگہ جگہ سے بیٹی کے رشتے کے پیغام آنے لگے۔ کئی نوجوانوں کو تو روکھے جوابوں سے ٹال دیا گیا لیکن کہاں تک، اب غریب لڑکی کو کچھ ایسے سبز باغ دکھائے گئے کہ اسے ہاں کرتے ہی بنی۔ لیکن اس دکھ اور اذیت بھری زندگی کا تصور اسے موت سے زیادہ بھیانک نظر آتا تھا۔ اور یہ دیکھتے ہوئے کہ اس کے پیارے شوہر کی واپسی کی اب کوئی امید نہیں رہی اور انکشاف حقیقت دونوں کی تباہی اور رسوائی کا موجب ہوگا اس کے دل میں ایک ایک خیال آیا اس نے فیصلہ کر لیا کہ خواہ اسے اپنی جان اور ناموس ہی سے کیوں نہ ہاتھ دھونا پڑے وہ بہر حال اپنے آپ کو اس تاریک مستقبل سے بچائے گی۔ اس "شریفانہ عہد" سے اچھی طرح دل کو متاثر کر کے بظاہر اس نے باپ کی خوشی کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔

اس کے بعد اس نے اس پادری کو بلایا جو پہلے پہل ان دونوں کو رشتۂ ازدواج میں منسلک کر کے ان کے غم کا باعث ہوا تھا۔ اس نے نہایت رازداری سے اسے اپنے ارادے سے خبردار کیا اور اپنے قطعی فیصلہ کو جامۂ عمل پہنانے میں اس سے مدد مانگی۔ پادری بڑی حیرت سے اس کی باتیں سنتا رہا کچھ تذبذب اور کچھ بزدلی کا اظہار کرنے کے بعد جب اس نے اپنی اس گرانقدر رشوت کا تصور باندھا جو لڑکی اسے اپنا ہم خیال بنانے کے سلسلے میں دینے والی تھی تو اس کی کمزور روح میں طاقت کی لہر دوڑ گئی۔ جب اس نے لڑکی کے جذبات انتہا پر پہونچے ہوئے دیکھے تو وقت کم ہونے کے خیال سے فوراً اس نے اس کے حکم پر سر تسلیم خم کرتے ہوئے ایک ایسی دوا تیار کرنے کی حامی بھر لی جو اگر پانی میں ملا کر کسی کو پلا دی جائے تو اس پر متواتر تین دن تک اس طرح کی غفلت طاری رہتی کہ دیکھنے والے اسے مردہ سمجھ لیں۔ چنانچہ اس نے فوراً یہ دوا تیار کر کے شوہر کی باوفا اور دلیر بیوی کو بھیج دی۔ جب اسے دوا کا پارسل ملا تو وہ ایک جگہ بیٹھ کر میری اوڈو کو اپنے ارادوں کا مفصل حال خط میں لکھ رہی تھی کہ کس طرح مستقبل سے ڈر کر اور اپنے محبوب سے ملنے کی خاطر وہ پادری کے ساتھ ساز باز کر کے عنقریب اس سے ملنے والی ہے۔

خط لکھنے کے بعد اس نے فرط مسرت سے دوا کا پیالہ اٹھا کر پی لیا۔ اس پر ایک گہری بیہوشی طاری ہونے لگی اور وہ نیم بیہوشی کی حالت میں اپنے پلنگ پر اس انداز سے گر گئی جیسے اس کی روح پرواز کر گئی ہے۔

جب اس کی سہیلیاں اس کے کمرے میں آئیں تو اپنی خوبصورت ہمجولی کو اس طرح بیہوش دیکھ کر ان کی چیخیں نکل گئیں انھوں نے جلد ہی اس خوفناک حادثے کی اطلاع گھر کے دوسرے افراد تک پہونچائی دلہن کا باپ چند مہمانوں کے آگے آگے بھاگتا ہوا اس کے کمرے میں داخل ہوا اس نے دیکھا کہ اس کی نوجوان اکلوتی بچی اس کی آنکھوں کے سامنے بیجان پڑی ہوئی ہے ڈاکٹروں کی خدمات حاصل کی گئیں لیکن بیفائدہ۔ اسے ہوش میں لانے

کی ناکام کوششوں کے بعد تمام لوگوں نے بہ متفقہ فیصلہ کر لیا کہ یکایک
اس پر تشنج کا دورہ پڑا ہے اور یہی اس کے انتقال کا باعث ہوا ہے۔

تمام دن اور رات وہ اسی حالت میں پڑی رہی اس کے جسم کو
جنبش تک نہ ہوئی۔ اس کے والدین اور اعزہ واحباب کا مارے غم کے برا
حال تھا۔ اُس کے ماتم کرنے والے دوستوں اور عزیزوں کی تعداد بہت
بڑی تھی۔ اس کی تجہیز وتکفین کی رسوم نہایت شاندار طریقے سے ادا کی گئیں
اور اسے سینٹ آگسٹائن کے ایک بہت بڑے گنبد میں دفن کر دیا گیا لیکن
نصف شب کے قریب واجب التعظیم پادری اسے قبر سے نکال کر اپنے
کمرے میں لے گیا۔ جب اس دوا کے زبردست اثر کے زائل ہونے کا وقت
آیا تو پادری نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اسے ایک دوسری دوا پلائی۔ وہ
اس طرح اٹھ کھڑی ہوئی جیسے کوئی خواب سے بیدار ہوتا ہے۔ بمشکل تین
دن کے بعد وہ اپنے مجوزہ سفر پر روانہ ہو سکی۔ اس سے ملنے کے لئے جس کی
خاطر اس نے اس قدر تکلیفیں برداشت کیں تھیں۔ ایک... راہب کا بھیس
بدل کر وہ بندرگاہ پیسا تک پہونچی۔ جہاں سے کچھ جہاز اسکندریہ روانہ
ہونے والے تھے۔ وہ ایک جہاز پر سوار ہو گئی لیکن مخالف ہواؤں اور
دوسرے مصائب کے باعث جہاز بہت پیچھے چلے گئے۔ انھیں بندرگاہ کے
از سر نو تلاش کرنے اور جہاز کی ضروری مرمت کرنے میں کئی ماہ سمندر ہی
میں لگ گئے۔ لیکن پیری اور لو کے بھائی گارگانو نے اس عرصے میں اپنے وعدے
کے مطابق بھائی کی دلھن کے متعلق ایک ایک بات لکھدی۔ اس طریقے سے
غریب پیری اور لو کو اپنی دلھن کی وحشتناک اور فوری موت کی خبر موصول ہوگئی
اس وقت کی چھوٹی سے چھوٹی بات کی تفصیل گارگانو نے اپنے خط میں دہرائی
اور بتایا کہ کس طرح تھوڑے ہی دن بعد اس کے بوڑھے باپ کا بھی لڑکی
کے غم میں انتقال ہوگیا۔

بدقسمتی سے یہ خط گیانوزا کے ان خطوں سے پہلے موصول ہوگئے
جن میں اس نے اپنے محبوب کو اپنے خفیہ ارادوں سے آگاہ کیا تھا۔ قسمت
کی دیوی کبھی جنھیں دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھی اب اس نے ان سے نگاہ التفات
ہٹالی۔ چنانچہ دلھن کی آمد کی خوشخبری کے متعلق تمام خطوط بحری ڈاکوؤں
کی نذر ہوگئے اور گارگانو کے خطوط منزل مقصود تک پہونچ گئے جنھیں پڑھ
کر نوجوان عاشق کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ اس کا ماموں اسے تسلی دینے
کی ناکام کوشش کرتا رہا۔ خود اس نے بھی اس غم کو دل سے بھلا دینے کی
پوری کوشش کی۔ آخر اس نے اپنی محبوبہ کی قبر تک جاکر اپنی دلھن کی یاد
میں اس وقت تک آنسو بہاتے رہنے کا فیصلہ کر لیا جب تک ناامیدی یا
وہ قوانین جن کی اس نے خلاف ورزی کی تھی اس کے برے دنوں کا خاتمہ
نہ کردیں۔ صرف اسی طریقے سے اپنی دلھن کی ملاقات پر وہ اپنے آپ پر فخر
کر سکتا تھا۔ دنیا میں اگر کسی سے اس نے عشق کیا تھا تو صرف اس لڑکی سے
جس نے اسے اپنا کہنے کے لئے اپنی تمام "شریفانہ امیدوں" پر پانی پھیر دیا تھا۔

یہ فیصلہ کرکے وہ وینس کے ان جہازوں کی آمد کا انتظار کرنے لگا جو
مغرب کی سمت روانہ ہونے والے تھے۔ اپنے رشتہ داروں کو کوئی اطلاع دیئے
بغیر اس نے جہاز کا ٹکٹ خرید لیا۔ نیپلز کی طرف مختصر سفر کرنے کے بعد وہ بلا
خوف یا یوں کہئے کہ موت کی امیدیں دل میں لئے ہوئے ٹسکانی پہونچا۔ وہاں
سے ایک حاجی کا بھیس بدل کر سیانا میں آوارد ہوا۔ یہاں اس نے اپنے
کسی دوست کو اپنی آمد کی اطلاع نہ دی۔ تھوڑی سی تلاش سے اسے وہ
جگہ مل گئی جہاں اس کے خیال سے اس کی محبوبہ ابدی نیند سو رہی تھی قبر
پر دیر تک زار وقطار روتے رہنے کے بعد وہ اس کے پہلو میں ابدی نیند سونا
چاہتا تھا جس کے نزدیک سونے کی زندگی بھر میں اسے جسارت نہ ہوئی تھی۔ اگرچہ
وہ اس کی باوفا محبوبہ تھی۔

اس کی روح پکار پکار کر اسے اسی بات پر آمادہ کر رہی تھی آخر ایک
شام کے قریب وہ گرجے میں چھپ گیا جہاں اس نے اس مقصد کے لئے کہیں
سے چند اوزار کھدائی کرنے کے لئے چھپا رکھے تھے اور رات کو اس نے اپنی
محبوبہ کی قبر کھودنی شروع کردی۔

جب قبر کھد چکی اور وہ اس میں بیٹھنے کیلئے تیار ہو رہا تھا محافظ نے
جو صبح کی پھیری لگانے یہاں آرہا تھا۔ اس گڑبڑ کی آواز سن لی۔ وہ فوراً
اس کی جگہ آپہونچا۔ جب اس نے دیکھا کہ ایک آدمی قبر کھود کر اس میں داخل
ہو رہا ہے تو اس نے ڈر کر شور مچا دیا۔ فوراً کئی پادری اور چند دوسرے
آدمی نیم برہنہ لباس میں دوڑتے ہوئے وہاں آپہونچے۔ جب انھوں نے
دروازہ کھولا تو تباہ حال نوجوان کو گنبد کے نیچے پایا۔ جلد ہی لوگوں نے

پہچان لیا کہ وہ میری اڈو میگنا نیلی ہے - اس کی آمد کی خبر آناً فاناً آگ کی طرح شہر میں پھیل گئی - جب قانون کے ارباب اقتدار کے کانوں تک یہ خبر پہنچی تو فوراً احکام نافذ کر دیئے گئے کہ مجرم کو اس کے جرم کی سزا دی جائے - چنانچہ اس غریب کو قید کر کے پوڈیسٹا کے سامنے پیش کیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اقبال جرم کرانے کے لئے مجرم پر زیادہ سے زیادہ سختی کی جائے -

بدنصیب نوجوان نے اپنی غم انگیز مہم کے متعلق سب کچھ صاف صاف بتا دیا - اس کا بیان سن کر کہ اس نے آخری دم تک کس وفاداری اور محبت کا ثبوت دیا ہے حاضرین عدالت کے دل پسیج گئے - عورتیں تو خاص طور پر اس کی محبت کے غمناک افسانہ سن کر متاثر ہوئیں - کئی آدمیوں کو اس سے یہاں تک ہمدردی ہو گئی کہ انھوں نے عدالت میں اپنے آپ کو پیش کر دیا کہ مجرم کے بجائے عدالت ہمیں سزا دے سکتی ہے لیکن قانون نے کسی کی ایک نہ سنی اور اسے سزائے موت کا حکم سنا دیا گیا - اس کے اعزہ و اقربا کی تمام سفارشیں بیکار ثابت ہوئیں اور قانون کے دیوتاؤں نے نوجوان کو پابجولاں قتل گاہ کی طرف بھیج دیا ——

اس عرصہ میں اس کی غمزدہ دلھن بڑی دوڑ دھوپ اور تکلیفیں جھیلنے کے بعد اسکندریہ پہونچی اور خود اس نے اپنے پیارے شوہر کے ماموں کے گھر کی راہ لی - جسے اس نے اپنی مصیبت کے تمام واقعات سنا دیئے - وہ اس سے نہایت دردمندی اور خلوص سے پیش آیا - لیکن اپنے محبوب سے ہم آغوش ہونے کی بجائے جس کے لئے اس نے اس قدر مصائب جھیلے تھے جب اس نے یہ خبر سنی کہ وہ اس کی موت کی جھوٹی خبر سن کر جیکیے سے یہاں سے روانہ ہو چکا ہے اور اس کے متعلق اس وقت سے لیکر اب تک کوئی خبر نہیں آئی - تو زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل گئی - اس نے کس قدر محنت و مشقت اور غم سہا تھا لیکن یہ خبر تو بہت ہی زیادہ غم افزا تھی!

بہرحال ایک دفعہ اس نے پھر کر ہمت استوار کی اور سوچ بچار میں وقت ضائع کرنے کے بجائے فوراً اس نے میری اڈو کے ماموں کے ہمراہ سائنا پہونچنے کی ٹھان لی - اب صرف ایک ہی امید اس کے دل کا سہارا تھی اپنے محبوب شوہر سے دوبارہ ملنے کا خیال ——

جوگنوں کا لباس پہنے ہوئے ایک مرتبہ پھر اپنے ہمراہیوں سمیت یہ باوفا بیوہ دلھن طوفان زدہ سمندروں کے سفر پر روانہ ہو گئی - موافق ہواؤں نے اسے بہت جلد ٹسکان کے ساحلوں تک پہونچا دیا - پیامبینو کے مقام پر یہ لوگ جہاز سے اترے اور انھوں نے سرنکولو تاجر کے مکان کی راہ لی - یہ جگہ سائنا سے کچھ دور نہیں تھی - ان لوگوں کے عاجلانہ استفسارات کا پہلا جواب یہ دیا گیا کہ ان کی آمد سے تین دن پہلے میری اڈو قتل کیا جا چکا ہے -

اگرچہ انھیں میری اڈو کے متعلق بیحد تشویش ہو رہی تھی تاہم انھیں امید نہ تھی کہ اس کے انجام کے متعلق ایسی افسوسناک تصدیق بھی ہو سکتی ہے - اب ان دونوں کو اس بات کی بھی تاب نہ رہی کہ ایک دوسرے کو تسلی دیں - دلشکستہ دلھن کی گہری اور مسلسل ہچکیاں پتھر کا دل موم کر دینے کو کافی تھیں اس کے مستقبل کے متعلق کچھ سوچنا اب ضروری ہو گیا —— ہر امکانی تسلی دینے کے بعد رحمدل تاجر نے اپنے دوستوں کے مشورے اور خود اس آفت رسیدہ بیوہ کے ایما سے اسے ایک راہبہ خانہ میں پہونچا دیا -

وہاں اس کے عالی مرتبہ کے مطابق اس سے انتہائی مہربانی کا سلوک کیا گیا - لیکن وہ غم کے سمندر میں کچھ اس طرح غرق ہو گئی تھی کہ اس نے اپنا جھکا ہوا سر کبھی اوپر نہ اٹھایا اپنے نقصان اور بدقسمتی پر پیہم آنسو بہاتی رہی - وہاں کی معمر ترین راہبہ جو اس کی زندگی کا افسوسناک افسانہ سن چکی تھی اسے بڑی محبت سے تسلیاں دیتی رہی لیکن اس نے ایک المناک چپ سادھ لی تھی - آہستہ آہستہ اسے غم کھا رہا تھا کبھی کبھی وہ بڑے رحم سے اپنے پیارے خاوند کو نام لے لیکر پکارنے لگتی - کچھ زیادہ عرصہ گذرنے نہ پایا تھا کہ اس کی روح اس کے جسم کو چھوڑ کر میری اڈو کی تلاش میں آسمان کی سمت پرواز کر گئی -

غزل

از:- حضرت دُعا ڈبائیوی

سُنئے تو کبھی آکر حالِ دلِ دیوانہ
عبرت کی یہ عبرت ہے افسانے کا افسانہ

دُنیائے محبت کا عالم ہے جداگانہ
دیوانہ ہے فرزانہ، فرزانہ ہے دیوانہ

سوزِ غمِ اُلفت سے سب لوگ ہیں بیگانہ
دیوانۂ اُلفت کو کہنے لگے دیوانہ

جلوہ وہی دونوں میں تفریق ہے نامونکی
بیکار ہیں سب جھگڑے جو کعبہ وہ بتخانہ

کعبے میں نہیں کچھ بھی بس کعبہ ہی کعبہ ہے
بتخانے کا کیا کہنا بتخانہ ہے بتخانہ

ان مدبھری آنکھوں کی تعریف ہو کیا زاہد
دیکھو تو ہیں دو ساغر سمجھو تو ہیں میخانہ

دیوانگیٔ اُلفت تقدیر سے ملتی ہے
وہ آپ ہیں دیوانے جو کہتے ہیں دیوانہ

ربط اتنا ہے دونوں میں کوئی نہیں کہہ سکتا
یہ قیس کا قصہ ہے یا ہے مرا افسانہ

ایثارِ محبت کی یہ زندہ نشانی ہے
آنکھوں سے لگا زاہد خاکسترِ پروانہ

وحشت پہ مری ناحق اتنی تمہیں حیرت ہے
جب کر دیا دیوانہ تو ہو گیا دیوانہ

مشتاقِ شہادت ہم شمشیر بکف قاتل
یہ وقت مدد کا ہے اے ہمتِ مردانہ

ساقی تری محفل کا یہ رنگ نیا دیکھا
سرشار ہے سب محفل شیشہ ہے نہ پیمانہ

یکساں ہوئی دونوں پر تاثیر محبت کی
سر ہوگیا سودائی دل ہوگیا دیوانہ

جب دل سا یگانہ بھی اُلفت میں نہیں ساتھی
بیگانے کا کیا رونا بیگانہ ہے بیگانہ

وہ حال دُعا سُن کر کس ناز سے کہتے ہیں
کم بخت ہے سودائی، کمبخت ہے دیوانہ

آرائس جمال

بابل اور اسیریا

از:-
جناب سجاد صاحب ہاشمی چنیوٹی،

ملک مصر کی داستان کی طرح بابل اور اسیریائی داستان بھی زمانہ قدیم کی داستان ہے۔ یہ دو قدیم سلطنتیں اس عظیم علاقہ کا حصہ تھیں جسکو اب ہم میسوپوٹیمیا (Meso Potamia) کے نام سے یاد کرتے ہیں جس کا مطلب دریائے دجلہ و فرات کا درمیانی میدان ہے دنیا کے اس حصہ سے تہذیب نمودار ہوئی۔ بایں وجہ ہم اس علاقے کو بنی نوع انسان کا جنم داتا Cradel of Human کہتے ہیں۔

آج سے ہزاروں سال قبل اس میدان میں ایک نامور قوم کے نہایت عظیم الشان شہر آباد تھے۔ جن میں نہایت دلربا اور دلکش مندر محلات اور باغات تھے۔ علاقہ نہایت زرخیز تھا۔ یہاں گندم انسان سے بھی اونچے قد کی پیدا ہوتی تھی - اہالیٔ شہر کی گذران کاشت پر ہی تھی۔ اس زمانے میں یہ علاقہ دنیا کا سب سے گنجان آباد حصہ تھا۔

اس زمانۂ قدیم میں اس قدر زرخیزی کا راز ذریعۂ آبپاشی میں مضمر تھا۔ شاہان وقت نہروں اور تالابوں کی تعمیر و مرمت اپنا اہم ترین فرض خیال کرتے تھے۔ پانی کا بندوبست بعینہ مصر کی طرح تھا یعنی طوفان کے پانی کو تالابوں میں بھر لیا جاتا اور تمام علاقہ میں حسب ضرورت تقسیم کر دیا جاتا لیکن اس کے بعد جب مذکورہ سلطنتیں نیست و نابود ہو گئیں اور فاتح پہ فاتح آنے لگے تو ان تالابوں اور نہروں کی مرمت نہ کی جا سکی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ طغیانی نے ملک کو ویران و سنسان کر ڈالا اور باغات اور عظیم الشان محلات دنیا سے بالکل معدوم ہو گئے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے مینار، یادگاریں اور محلات اینٹوں کے بنائے کیونکہ اینٹوں کے لئے مٹی تو بکثرت تھی لیکن پتھر بالکل کمیاب تھے۔ چنانچہ یہ عمارتیں پائدار نہ تھیں اور یہ شہر رفتہ رفتہ فاتحوں کے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہو گئے۔ اور ان کا نام تک باقی نہ رہا۔ لہذا ان عظیم الشان شہروں کی بابت کچھ معلوم نہ تھا مگر جب انیسویں صدی میں آثار قدیمہ کی کھدائی شروع ہوئی تو وقتاً فوقتاً مٹی کی تختیاں جن پر کسی نامعلوم زبان میں حروف کندہ تھے دستیاب ہونے لگے۔ آخر کار بوٹا Botta نامی ایک فرانسیسی نے کھدائی کا کام شروع کیا اور بڑے بڑے ٹیلوں کے نیچے جو کہ اس میدان میں واقع تھے عظیم الشان شہروں کے کھنڈر دریافت کئے۔ اس کے بعد اور بھی کئی آدمیوں نے تحقیقات جاری رکھی۔ جن کی بدولت ہمیں بابل اور اسیریا کی قدیمی تہذیب اور ناد رعجائبات کے حالات معلوم ہو گئے ہیں۔

جب محلات کی کھدائی شروع ہوئی تو کھنڈروں میں مٹی کی بنی ہوئی کئی کندہ تختیاں پائی گئیں۔ اہل مصر کی طرح ان کا طرز تحریر بھی تصاویر کی مدد سے تھا۔ جہاں تک ہمارا خیال ہے یہ طریقہ انہوں نے ہی ایجاد کیا تھا۔ اور اسی طریقہ تختیوں پر لکھا کرتے۔ بعد ازاں ان تختیوں کو آگ یا دھوپ میں پکا لیتے چنانچہ کئی دستیاب شدہ تختیوں کی عبارت اسی طرح صاف ہے جیسا کہ وہ لکھنے کے وقت تھی۔

۱۸۴۰ء کا واقعہ ہے کہ ایک دن سر ہنری راولسن... Henry Rawlinson صاحب گھوڑے پر سوار ہو کر جا رہا تھا تو اس نے Behistun کے قریب ایک اونچی چٹان پر کندہ عبارت دیکھی چونکہ چٹان بہت اونچی تھی۔ اور اس پر چڑھنا نہایت مشکل کام تھا لہذا وہ رسّوں کی مدد سے چڑھا اور اُترا۔ اور اس خطرناک حالت میں نمدار کاغذات پر اس عبارت کے آثار لے لئے۔ جو کہ اس نے دنیا کے مشہور عالموں فاضلوں کے پاس ارسال کئے۔ تو ان کو معلوم ہوا کہ یہ عبارتیں مسلسل بادشاہوں کے نام ہیں جو تین مختلف زبانوں میں دہرائے گئے ہیں۔ دو زبانیں تو ان کو پہلے سے ہی معلوم تھیں لہذا اس کا مطلب تیسری زبان میں معلوم کرنا نسبتاً آسان تھا۔ چنانچہ یہ تیسری زبان اہل بابل

اور اسیریا کی زبان ثابت ہوئی۔

اس طرح سے تختیوں کی عبارت کو پڑھنا آسان ہو گیا۔ چنانچہ اس سے ہمیں اہل بابل کی طرز معاشرت کا بابت کچھ پتہ لگ گیا۔ کئی تختیوں سے تو صرف بادشاہوں کے نام ملے اور کئی تختیوں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ علاقہ نہایت زرخیز تھا لوگ فارغ البال تھے کئی خطوط بھی ملے۔ جو کہ مٹی کے لفافوں میں بند تھے۔

اس زمانے میں ہر ایک آدمی اپنے پاس ایک مہر رکھتا تھا۔ جو کہ ضروری دستاویزات کے لئے استعمال کی جاتی تھی۔ یہ عموماً پتھر کی بنی ہوئی ہوتی تھی چنانچہ شہنشاہ ہیمربی (Hammurabi) کے قوانین پتھروں کے ستونوں پر اسی طرح سے کندہ ملے ہیں۔ یہ قوانین حضرت عیسیٰ مسیح ؑ کی پیدائش سے دو ہزار برس پہلے کے تھے لیکن عبارت اس عمدگی سے کندہ تھی۔ کہ آج تک صاف پڑھی جا سکتی ہے۔ ایک ستون کے سرے پر بادشاہ کی تصویر بنی ہوئی تھی جس میں کہ وہ سورج دیوتا سے قانون حاصل کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے ان قوانین کی نقلیں مختلف ممالک میں بھیجی گئیں جن میں نہروں و تالابوں کے متعلق ہدایات تھیں۔ ان قوانین سے ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ زمانۂ مذکورہ میں سزائیں نہایت سخت تھیں۔ کئی جرائم کی سزا موت تھی۔ اور دھوکا بازی کی سزا ہاتھ کاٹ دینا تھا۔ اگر ہم ان سزاؤں کا غور سے مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ قوانین انصاف پسند تھے اور صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں تہذیب نے کتنی ترقی کر لی تھی۔ اس دوران میں اہالئ بابل شمال کی طرف بھی آباد ہوتے گئے۔ انجام کار اتنے طاقتور ہو گئے۔ کہ شہنشاہ بابل کی زیر حکومت خود مختار بن بیٹھے۔ اور اس نئے ملک کا نام اسیریا رکھا۔ جس کا مطلب اور طاقت کے دیوتے اسر کی حکومت تھی۔ آہستہ آہستہ شاہ ہیمربی کی وفات کے بعد اہل اسیریا نے بابل کو فتح کر لیا اور ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ نئے بادشاہوں نے بابل میں نہایت خوبصورت اور عظیم الشان مندر تعمیر کرائے۔ اور وہ کھنڈر جو کہ بوٹا (Botta) اور لیرڈ (Layard) نے ٹیلوں کے نیچے دبے ہوئے دریافت کئے انہیں مندروں اور محلات کے تھے۔ اگرچہ عمارات کا زیریں حصہ ہی رہ گیا تھا۔ تاہم تمام نقش و نگار اور تصاویر جو کہ ان عمارتوں پر بنی ہوئی تھیں صاف ظاہر ہوتی ہیں۔ دیواروں پر جنگوں کے عجیب و غریب مناظر کندہ کئے گئے تھے۔

لیرڈ (Layard) نے ٹیلہ نمرود کے نیچے ایک بہت پرانے شہر کالا (Calah) کے کھنڈر دریافت کئے ہیں۔ جہاں کہ اسے سات محل ملے۔ جن میں کہ نہایت دلفریب اور عجیب و غریب تصاویر منقش تھیں کئی بت بھی ملے ان میں سے سب سے عجیب بت ایک جانور کا تھا۔ جس کا جسم تو شیر کی مانند لیکن سر انسان کی مانند تھا اس قسم کے بت عموماً دروازوں پر سنتریوں کے طور پر رکھے جاتے تھے۔ اور ان کا عقیدہ تھا کہ یہ بت شاہانِ وقت کو آفات زمانہ سے بچاتے ہیں۔ جب پہلا بت دریافت ہوا۔ تو ہزاروں آدمی گرد و نواح سے دیکھنے کے لئے آئے۔ لیکن اس وقت ان کی حیرانی کی کوئی انتہا نہ رہی جب تیس چالیس اور بت اسی شکل کے برآمد ہوئے۔ یہ بلندی میں عموماً ۱۲ فٹ کے تھے۔ اور ان کا وزن کئی ٹن تھا۔

اس طرح شاہ سارگن (King Sargon) کا محل بھی کھود لیا گیا۔ جو کہ پچاس ساٹھ فٹ اونچے پلیٹ فارم پر بنا ہوا تھا۔ اس میں سات سو کمرے تھے یہاں بھی انسان کے سر والے شیروں کے بت ملے جن پر شاہ سارگن کی فتوحات کے حالات کندہ تھے۔ چنانچہ ایک جگہ اس بادشاہ کی ایک عجیب داستان کندہ ملی ہے۔ وہ یوں ہے کہ:۔

" جب شاہ سارگن جو کہ شاہی خاندان سے تھا ابھی بچہ ہی تھا تو کسی مصیبت کا اندیشہ ہوا۔ اس سے بچاؤ کے لئے اس کی والدہ نے اس کو دریائے فرات کے ساحل پر لٹا کر چھوڑ دیا۔ ایک سقے نے اسے دیکھ لیا۔ جو اسے اٹھا کر اپنے گھر لے گیا اور اس کی تربیت میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ مگر انجام کار اس کی شناخت ہو گئی اور بادشاہ بنایا گیا لیکن اس کو جنگوں کے بعد بھی چین نصیب نہ ہوا کیونکہ سازشیوں نے اسے محل کے اندر قتل کر دیا۔

لیرڈ (Layard) نے ایک اور ٹیلے کے نیچے شاہ سارگن کے مشہور بیٹے سیناکریب (Sennacherib) کے محلات بھی دریافت کئے جن سے کئی ہزار تختیاں دستیاب ہوئی ہیں یہی شاہی لائبریری تھی لیکن سیناکریب کی لائبریری دنیا کی تاریخ میں عظیم الشان لائبریری

تھی۔اس نے دور و نزدیک کئی آدمی بھیجے تاکہ وہ محلات اور مندروں سے بھی کتابیں تلاش کر کے لے آئیں چنانچہ ان کو ترتیب دیا گیا اور ایک فہرست تیار کی گئی

اس لائبریری میں اہل بابل اور اسیریا کی تصنیفات جمع تھیں جن سے ہمیں ان دو عظیم الشان سلطنتوں کی تاریخ کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان میں بادشاہوں کی تاریخیں تھیں اور ان کی فتوحات کے حالات درج تھے۔ کئی کتابیں علم نجوم، رمل پر مشتمل تھیں۔ زیادہ دلچسپ کتابیں اہل بابل کی تختیوں سے نقل کی گئی تھیں جن میں دنیا کی پیدائش اور آغاز کا حال لکھا گیا تھا۔

دنیا کی پیدائش کا واقعہ اس طرح لکھا گیا تھا کہ ایک راکشس دیودں کے مقابلہ پر کھڑا ہو گیا۔ اس نے دیوتاؤں پر بڑائی اژدہاؤں اور خونخوار جانوروں کی ایک فوج تیار کی۔ جب ایک دیوتا جنگ کے لئے نکلا تو راکشس نے اُسے بھگا دیا۔ اس پر دیوتا بیل نے راکشس کا مقابلہ کیا۔ اور رعد و باراں کی مدد سے اس کو مغلوب کر لیا اور انجام کار اس کو قتل کر دیا۔ سردار کے مارے جانے پر فوج بھاگ نکلی۔ مگر دیوتا بیل نے تعاقب کیا۔ اور تمام فوج کو مغلوب کر کے مار ڈالا۔ بایں وجہ دیوتا بیل سب دیوتاؤں سے افضل مانا جانے لگا۔

علاوہ ازیں کئی اور کندہ کتبے ایسے ملے ہیں جن پر سورماؤں کے واقعات درج ہیں۔

ایک کہانی دنیا کی سب سے پرانی کہانی شمار کی جاتی ہے۔ اور گلگامش (Gilgamesh) کے واقعات کو بیان کرتی ہے اس سورما نے کئی فتوحات حاصل [illegible] بعد ازاں دیوتاؤں کی سلطنت سے کئی غیر ممالک کا سفر کیا۔ وہاں اس نے [illegible] عجیب و غریب درخت دیکھے جن پر پھلوں کی بجائے ہیرے جواہرات لگے ہوئے تھے۔ اور جب وہ عمر خضر حاصل کرنے کے لئے چشمۂ حیات پر پہنچا۔ تو اسے حضرت نوح علیہ السلام ملے جنہوں نے اس کے آگے طوفان کی تمام حقیقت بیان کی۔

اس بادشاہ کی باقی داستان فقط فتوحات اور قتل و غارت پر مشتمل ہے۔ یہ بادشاہ تمام شاہانِ زمانہ سے زبردست تھا۔ کندہ عبارات جو کہ کھنڈرات سے دستیاب ہوئی ہیں بہ ظاہر کرتی ہیں۔ کہ اس شہنشاہ نے مصر کا ایک حصہ بھی فتح کیا تھا اور وہاں مفتوح لوگوں کو بڑی تکلیفیں دیں

اس کے مرنے سے پہلے ہی اسیریا کی طاقت کو زوال آنا شروع ہو گیا۔ اور جلد ہی اسیریا کے ایک باغی جرنیل میڈیز (Medes) نے ایک جرنیل نیبوپلاسر (Nabopolassar) کی مدد سے اسیریا کے دارالخلافہ نینوا (Nineveh) کو فتح کر لیا۔ شہر تو جل کر راکھ ہو گیا۔ اور محلات کے کھنڈر ریت کے نیچے دب گئے۔ شہر بابل نیبوپلاسر کے حصے میں آیا۔ اُس نے سلطنتِ بابل نے پھر بنیاد ڈالی۔ اس کے لڑکے نے شہر کو نئے سرے سے تعمیر کیا۔ اور یہ شہر زمانہ قدیم کے عظیم ترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔

تیرے بغیر

از:-
جناب عزیز احمد صاحب عزیزؔ

کس قدر بے کیف ہے سارا جہاں تیرے بغیر
گلشنِ ہستی میں آئی ہے خزاں تیرے بغیر

مل رہے ہیں خاک میں یہ بے بہا گوہر تمام
لُٹ رہا ہے اشکِ غم کا کارواں تیرے بغیر

کون ہے بیمارِ غم کا پوچھنے والا یہاں
بیکسی ہے چارہ سازِ بیکساں تیرے بغیر

ٹوٹتے ہیں رات بھر تارے فضائے دہر پر
خوں فشاں میری طرح ہے آسماں تیرے بغیر

ہر تکلم وجہِ غم، ہر سوزِ دل وجہِ الم
ہر نفس میں سیکڑوں بیتابیاں تیرے بغیر

بے ضیا ہیں سارے انجم اشک آنکھوں میں بھرے
کتنی بے رونق ہے بزمِ کہکشاں تیرے بغیر

ساغرِ چشمِ تمنا میں ہیں اشکِ گرم گرم
ہر نگاہِ یاس میں مایوسیاں تیرے بغیر

اب کہاں وہ جوشِ ارماں اب کہاں وہ حسرتیں
ہو گئیں ویران دل کی بستیاں تیرے بغیر

جی رہا ہے اب تو یادِ عمرِ رفتہ میں عزیزؔ
کیا کریگا لیکے عمرِ جاوداں تیرے بغیر

پُراسرار کمرہ

ایک حیرت انگیز افسانہ

از:۔

جناب محمد ظہور صاحب بی اے۔ ایل ایل۔ بی

قصبہ فتح آباد سے ۵ میل کے فاصلہ پر شمال کی جانب آبادی سے دور دریائے گھاگرا کے کنارے گھنی بانسیوں سے گھری ہوئی ایک عظیم الشان عمارت واقع ہے۔ جو قلعہ کے نام سے مشہور ہے۔ واقعتاً اس عمارت کو اونچی فصیلیں اور چوڑے پشتے، پھاٹک کے بلند و وسیع برج اس کا ثبوت دیتے ہیں۔ کہ ایام گذشتہ میں یہ عمارت کسی بڑے جاگیردار یا فوجی افسر کی جائے رہائش کے ساتھ ساتھ بروقت ضرورت ایک فوجی مستقر کا بھی کام دیتی ہوگی۔ اس قلعہ کے ہر چہار جانب دس میل تک پھیلی ہوئی زرخیز آبادی اس قلعہ کے مالکان کے قبضہ میں ہے۔ اس قلعہ اور اس وسیع اراضی کے دو حصہ دار پندرہ سال کے عرصہ میں پراسرار طریقہ پر لاپتہ ہوگئے۔ اور باوجود انتہائی کوشش کے انکا سراغ آج تک نہ ملا بقیہ دو مالکوں میں سے ایک پچپن ۵۵ سالہ ترش رو، درشت مزاج شخص کبیر الدین نامی ہے جو اپنی پیدائش ہی سے اس قلعہ میں مقیم ہے ـــــ دوسرا ایک ۱۹ سالہ نوجوان کلیم جلیمی ہے۔ جو اپنی والد کی وفات کے بعد ہی جسکو عرصہ ۱۵ سال کا ہوا کہ اپنے ننھیال چلا گیا۔ اور پھر کبھی یہاں مستقل رہائش کے لئے نہیں آیا۔ کبیر الدین کا خاندان اپنی وجاہت، دولت اور اثر کی وجہ سے ضلع میں بہت مشہور ہے۔ اور اس کے رکن ایک خاص عزت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ لیکن خود کبیر الدین طماع، سنگدل اور انتہائی خود غرض ہونے کی وجہ سے اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ کبیر الدین کے بھتیجہ کلیم سے جو اس علاقہ کے نصف کا مالک ہے بہت سی امیدیں غریب رعایا کی وابستہ ہیں۔ اسکی شریف النفسی اور انسانی ہمدردی کے افسانے اُن کے کانوں تک پہنچ گئے ہیں۔

۱۹۲۷ء کی موسم سرما کی ایک رات کو کبیر الدین اپنی خوابگاہ میں ایک گدے دار کرسی پر بیٹھا ہوا ہے۔ سامنے آتشدان میں آگ روشن ہے۔ اس کے قریب ہی ایک کرسی پر ایک نوجوان جس کا کہ ابھی عنفوان شباب ہے۔ اور جس کے حسین چہرہ پر طفلانہ شوخیاں ابھی تک کھیل رہی ہیں بیٹھا ہوا ہے۔ کبیر الدین نے جسے شاذ ہی کسی نے متبسم دیکھا ہوا اپنے خشک چہرہ پر مسکراہٹ کے آثار پیدا کر کے کہا۔

"بیٹا کلیم! تمکو اس عجلت کیساتھ بلوانے کی ایک خاص وجہ یہ تھی۔ کہ اب ہم لوگوں میں کسی معاہدے کے بغیر جائداد کا انتظام غیر ممکن ہے"

کلیم "لیکن چچا جان! آخر آپ نے میرے یہاں کی خبر کو اس قدر پوشیدہ رکھنے کی کیوں تاکید کی؟"

کبیر الدین "بیٹے کلیم! تم ابھی بچے ہو، زمانہ کے عیار و مکار لوگوں اور خود غرض عزیزوں کی شاطرانہ چالوں سے قطعاً ناآشنا۔ اگر کسی مفسد کو اس کا علم ہو جاتا کہ میں نے تمکو کسی اہم معاملے کیلئے بلایا ہے۔ تو یاد رکھو کہ سینکڑوں روڑے اٹکائے جاتے اور کبھی معاملات طے ہونے پاتے۔ جان عم! ان باتوں کا مخفی رہنا ہی بہتر ہے"۔

کلیم مطمئن ہو کر سعادتمندانہ لہجہ میں "چچا جان میں آپکا ایک خادم ہوں اور مجھے ہمیشہ ایسا ہی تصور کریں۔ ظاہر ہے کہ جائداد کا انتظام بھلا آپ سے بہتر کون کر سکتا ہے؟ خدا آپکا سایہ میرے سر پر قیامت تک قائم رکھے آپکی وجہ سے میں جائداد کے جھگڑے بکھیڑوں سے علیحدہ رہکر پرسکون زندگی بسر کر رہا ہوں"

کبیر الدین (خوش ہو کر) مجھے تمہاری سعادتمندی سے یہی توقع تھی۔ اچھا

ان دستاویزات کو پڑھ لو اور دستخط کر دو"۔

کلیم علمی نے بغیر پڑھے ہوئے دستاویزوں پر دستخط کر دیئے جب وہ اُن پر دستخط کر چکا تو ایک عارضی شیطانی مسکراہٹ کبیرالدین کے چہرہ پر نمودار ہوئی لیکن آن واحد میں غائب ہو گئی۔ اس کے بعد کلیم اور اس کا چچا تھوڑی دیر تک ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے کبیرالدین نے اس کے بعد اپنی طلائی جیبی گھڑی دیکھی اور کلیم سے کہا

"کلیم! تم دور دراز سفر طے کر کے تھکے ہوئے ہو کسل مند ہو گے۔ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو۔ انشاءاللہ صبح کو ہم لوگ کچھ ضروری باتوں پر تبادلہ خیالات کریں گے۔ میں نے مشرقی حصہ ایک کمرہ کو تمہارے لئے درست کرا دیا ہے۔ چلو تم کو پہونچا آؤں"۔

کلیم "چچا جان! میں خود چلا جاؤنگا۔ یا کسی نوکر کو ہمراہ لے لونگا آپ تکلف نہ کیجئے"۔

کبیرالدین "بیٹے کلیم! شائد تمکو معلوم نہیں کہ ہمارے خاندان کے قیمتی نوادر و بیش بہا ذخائر اسی طرف رکھے ہوئے ہیں۔ اسلئے کسی اجنبی کو اس طرف جانے دینا دوراندیشی کے خلاف ہے چلو میں خود تمہیں پہونچا آؤں"۔

کلیم نے اپنی چچا کا شکریہ ادا کیا اور اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا دونوں ایک گیلری اور ایک چھوٹا سا صحن جس میں متعدد گملے جا بجا رکھے تھے اور سرو و تاڑ کے چھوٹے چھوٹے درخت خوش سلیقگی سے لگائے گئے تھے عبور کر کے ایک لانبے برآمدے میں داخل ہوئے کچھ دور چلکر کبیرالدین ایک خوشنما کمرے کے سامنے رک گیا۔ اور قفل کھولکر کلیم سے اندر داخل ہونے کیلئے کہا۔ جیسے ہی کلیم کمرے کے اندر داخل ہوا کبیرالدین نے دروازہ کے ایک حصہ پر زور سے ہاتھ مارا تڑ لنے کی ایک ہیبتناک آواز کے ساتھ زمین کمرے کی پھٹ گئی ــــ کلیم نے ایک دردناک چیخ ماری، ساتھ ہی ــــ اس کے جسم کے بہت نیچے پانی میں گرنے کی آواز سنائی دی ــــ شیطانی مسرت کی ایک لہر کبیرالدین کے چہرے پر دوڑ گئی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ ملتے ہوئے کہا "کس قدر بیوقوف ہیں وہ لوگ جو اپنے راستوں سے کانٹوں کو نہیں ہٹاتے؟ دولت اور طاقت قدرت کی وہ بیش بہا نعمتیں ہیں جنہیں ہر ممکن قیمت پر خریدنا چاہیئے۔ اور اس کے حاصل کرنیکے لئے ہر قربانی کرنا چاہیئے آہ! وہ مغرور و سرکش سر جو میرے سامنے نہ جھکتے تھے اب میری آستاں پر جبیں سائی کریں گے۔ وہ بھی کس قیمت پر ــــ ایک لونڈے کی بیکار جان کے عوض میں جو یقیناً ہوش سنبھال کر اپنے باپ دادا کی گاڑھے پسینہ کی کمائی ہوئی دولت کو فیشن پرستی یا دیگر خرافات پر ضائع کر دیتا خوب ہوا کہ اس کا خاتمہ ہو گیا ــــ اس پر اسرار کمرے کی گہرائیوں کے راز کبھی طشت از بام نہیں ہو سکتے اور اس کے خاموش مکیں قیامت تک زبان نہیں ہلا سکتے"۔

کبیرالدین انسانی کردار کے اس مذموم ترین فعل اور اس سیاہ ترین جرم کے ارتکاب پر نازاں تھا لیکن ایک پوشیدہ قوت انسانی اولوالعزمی کی کمزوری اور اس کارخانۂ عالم میں اس کی بے بضاعتی و بے بسی پر خندہ زن تھی۔ انسانی دماغ کی اختراعی قوت برسہا برس کی کاوش جانفشانی سے اپنے کسی تاریک ارادہ کو عملی جامہ پہنانے اور اسکو کامیاب بنانے کی لاکھ کوشش کرے لیکن قدرت کی ایک ہلکی جنبش اسکو ناکام و بے اثر بنا دینے کے لئے کافی ہے۔

گذشتہ واقعہ کو رونما ہوئے دو سال کا عرصہ گذرا۔ ایک شام کو ایک کشیدہ قامت، سیاہ آنکھوں، کشادہ پیشانی والا خوبصورت نوجوان بمبئی کے مشہور ہوٹل "تاج محل" میں ایک ٹیکسی سے اُترا۔ اور منیجر ہوٹل سے ایک کمرہ بالائی منزل پر کرایہ پر لے لیا۔ نوجوان گو کہ کم عمر تھا لیکن اس کے چہرہ پر آثار افسردگی پورے طور پر نمایاں تھے۔ اندرونی جذبات نے اس کے حسین چہرہ پر کرختگی و درشتی کے ایسے نقوش مرتسم کر دیئے تھے جو عمر ہی انسانوں کے لئے زیادہ موزوں ہیں پیشانی کی شکنیں غور و فکر کا پتہ دے رہی تھیں۔ بالائی ہونٹ کی کمان نما خمی سے خودداری و وقار مترشح تھی۔ چال ڈھال اور طرز تکلم سے یہ کوئی امیرزادہ معلوم ہوتا تھا۔ نوجوان نے تاج محل ہوٹل کے پر کیف ماحول سے متاثر ہوئے بغیر ایک برآمدہ طے کر کے سنگ مرمر کے زینہ پر چڑھنا شروع کیا۔ جب وہ سر کے پر

پہونچا۔ تو اس نے ایک نہایت حسین وجمیل لڑکی کو دیکھا۔ جو ایک چھوٹے سنگ مرمر کے مجسمہ کو شاید اس انتظار میں کھڑی تھی۔ کہ نوجوان اوپر آ جائے تب وہ نیچے اُترے۔ نوجوان نے پہلی ہی نظر میں تاڑ لیا کہ یہ لڑکی اودھ کی رہنے والی ہے کیونکہ یہ حسن، شرمیلاپن، نزاکت اور دلربائی صرف اودھ کی لڑکیوں کا طرۂ امتیاز ہے۔ نوجوان آگے بڑھ گیا۔ اور اپنے کمرے میں سامان درست کرانے کے بعد ایک صوفے پر نیم دراز ہو کر کسی گہری فکر میں مستغرق ہو گیا۔ اس کے بعد اُس نے غسل کیا اور کپڑے تبدیل کر کے ساحل کی طرف ہوا خوری کے لئے روانہ ہو گیا۔ جب وہ واپس آ رہا تھا۔ تو اُس نے ہوٹل کے چمن میں اُسی لڑکی کو بنچ پر بیٹھے ہوئے دیکھا۔ اس اثنا میں ہوا کے ایک تیز جھونکے نے اس حسینہ کا ریشمی رومال اُڑا کر نوجوان کے قریب گھاس پر ڈال دیا۔ اُس نے رومال اٹھا لیا۔ اور حسینہ کو جو چند گز کے فاصلہ پر بیٹھی تھی جا کر دیدیا۔ اُس نے رومال پا کر نوجوان کا شکریہ ادا کیا۔ وہ واپس ہونے والا تھا کہ لیکن کسی وقتی خیال کے تحت میں اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا اور حسینہ سے کہا۔

"کیا میں یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتا ہوں۔ کہ آپ کس صوبہ کی رہنے والی ہیں"؟

حسینہ۔ "میرا مکان صوبہ اودھ اطراف لکھنؤ میں ہے"۔

نوجوان۔ "کیا آپ کو آئے ہوئے دو ایک ہی روز ہوئے ہیں"؟

حسینہ۔ "جی نہیں! میں یہاں ایک ہفتہ سے ہوں"۔

نوجوان۔ "کیا ابھی آپ کا قیام کچھ روز اور رہیگا"؟

حسینہ۔ "میں "اسکو نیری" جہاز سے نو دن بعد ساحل بمبئی سے یورپ روانہ ہو جاؤں گی"۔

اس کے بعد نوجوان حسینہ کو سلام کر کے رخصت ہوا۔

دوسرے دن نوجوان اور حسینہ کی پھر ملاقات ہوئی۔ اور یہ سلسلہ ایک ہفتہ تک جاری رہا۔ اس عرصہ میں دونوں ایکدوسرے سے اچھی طرح واقف ہو گئے۔ نوجوان کو معلوم ہو گیا کہ حسینہ نہایت باحیا شریف اور سیدھی سادی لڑکی ہے۔ اور حسینہ کو بھی نوجوان کی شریف النفسی، نیکدلی اور اعلیٰ دماغی کا یقین ہو گیا۔ انکے اتفاقی تعارف نے روزانہ ملنے جلنے کی وجہ سے مؤانست اور معصومانہ بے تکلفی کی صورت اختیار کر لی۔ پھر بتدریج مؤانست دوستی میں بدل گئی علاوہ بریں خیالات کی یگانگت طبیعت کی موافقت نے دوستی پر محبت کا رنگ چڑھانا شروع کر دیا۔ کم از کم دونوں ایک دوسرے کو سچا ہمدرد اور دوست سمجھنے لگے ـــــ ایکدن جبکہ نوجوان اور حسینہ دونوں ہوٹل کے باغ میں بیٹھے ہوئے تھے نوجوان نے کہا:۔

"اب تو صرف دو دن آپکا قیام ہوٹل میں اور ہے اسکے بعد جدائی۔ دیکھیں پھر ملاقات ہوتی ہے یا نہیں"۔

حسینہ افسردہ لہجہ میں "ہاں یہ صحیح ہے کہ مجھے پرسوں جہاز سے روانہ ہونا ہے لیکن جب میرے والد کی طبیعت سنبھل جائے گی۔ تو ہم لوگ پھر وطن واپس آ جائینگے اور آپ ہمارے مکان پر آ سکتے ہیں"۔

نوجوان یہ سنکر کسی گہری فکر میں پڑ گیا اور کچھ دیر کے بعد گویا ہوا "آہ! جب ہم لوگ ایکدوسرے سے اسقدر جلد جدا ہونیوالے ہیں تو آپ مجھے اسکی اجازت دیں کہ میں کچھ باتیں آپ سے کہدوں"۔

حسینہ (اشتیاق سے) "ہاں ہاں! ضرور کہیئے اجازت مانگنے کی کیا ضرورت ہے"

اس جواب سے نوجوان کے چہرے پر ہلکی سرخی دوڑ گئی اور اُس نے کہا "دیکھئے آپ مجھے اجازت دیتی ہیں لیکن (خدا را جو میں کہتا ہوں) آپ اُس سے ناخوش نہ ہوں کیونکہ ہمارے ہندوستان کی قدامت خواتین اگرچہ نئی روشنی سے متاثر ہیں لیکن اُن روایات و ممنوعات کا جو انہیں ورثہ میں ملے ہیں تذکرہ کرنا خالی از خدشہ نہیں ہے بہرحال جذبۂ دل سے مجبور ہو کر یہ کہنا چاہتا ہوں کہ مجھے اس عرصہ میں آپ سے از حد محبت ہو گئی ہے ـــ بے پایاں محبت ـــ جسکو عشق کہنا کچھ مبالغہ نہ ہوگا ـــ آہ! ـــ خدا کیلئے دیکھئے مجھ سے برگشتہ نہ ہو جائیگا۔ مجھے آپ سے محبت ضرور ہے لیکن آپکی خفگی برداشت نہیں کر سکتا۔ آپکی پیشانی کی ایک ہلکی شکن میرے آئینہ دل کو چور چور کر دیگی"۔

حسینہ جس کے چہرہ پر اب ایک رنگ آتا اور جاتا تھا۔ حیا کی سُرخی چہرہ پر جھلک رہی تھی اور جبیں پر پسینے کے قطرے نمودار ہو گئے تھے اپنی آواز کو قابو میں رکھتے ہوئے کہا "میں آپکے اس اعتراف پر آپکو موردِ الزام نہیں قرار دے سکتی اور نہ آپ کی محبت پر کوئی اعتراض ہی کرتی ہوں لیکن موجودہ حالت میں اس موضوع پر کچھ اور سننا بھی نہیں چاہتی آپکو معلوم ہے کہ میں خود

تھا نہیں میرے والد بقید حیات ہیں اور ایک مہلک مرض میں مبتلا ایسی حالت میں آپکی ان باتوں کا سننا نا درست ہی نہیں بلکہ بے نتیجہ ہے"۔

نوجوان (بیقراری سے) "اچھا اب صرف ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں ۔۔ کیا آپکے دل میں کبھی میری طرف سے محبت پیدا ہو سکتی ہے؟ اگر آپ اس کا جواب اثبات میں دیدیں۔ تو میں تمام عمر صرف اسی امید پر زندہ رہ سکتا ہوں"

حسینہ کچھ تامل کے بعد "مجھے آپ سے نفرت نہیں ہے اور میں آپ کو ناپسند نہیں کرتی بس اتنا کہدینا کافی ہے"۔

نوجوان نے اتنا سُن کر حسینہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیلیا اور اُس کے حسین چہرہ کی طرف دیکھا۔ حسینہ نے اپنا ہاتھ چھڑانے کی فوری کوشش بلکہ ایک لمحہ کے بعد اسکو کھینچ لیا۔

نوجوان نے پھر کہا "اچھا! آپ مجھے اس کی اجازت دیں کہ میں آپکے ساتھ ساتھ یورپ کا سفر کروں۔ بفضلہ میرے پاس اتنے ذرائع ہیں کہ میں سفرخرچ باسانی برداشت کر سکتا ہوں۔ علاوہ بریں میری موجودگی سے آپکو بہت مدد ملیگی کیونکہ میں دو سال تک تمام یورپ گھوم چکا ہوں"۔

حسینہ "لیکن میں یہ نہیں چاہتی کہ دنیا آپکو ہر جگہ میرے ساتھ دیکھے اور ہم لوگوں کی بے لوث دوستی پر جھوٹ حاشیہ چڑھائے۔ واپس آنے تک ہم لوگ خط و کتابت کرکے ایکدوسرے کا حال معلوم کر لیا کریں تو بہتر ہے"

نوجوان "تو آپ میرا پتہ لکھ لیں اور اپنا نام و پتہ بھی دیدیں"۔

حسینہ "میں اپنا یورپ کا پتہ آپکو بعد میں بھیجوں گی میرے مکان کا پتہ فتح آباد اودھ ہے اور میرا پورا نام شیبہ کبیرالدین ہے"

حسینہ کا نام سنتے ہی نوجوان پر ایک غشی کی سی کیفیت طاری ہو گئی سر چکرایا آنکھوں کے نیچے اندھیرا چھا گیا دماغی و جسمانی توازن کی باگ ڈور ہاتھ سے جاتی رہی۔ وہ گر جانے والا تھا کہ اُسنے غیر معمولی قوت سے اپنے کو سنبھالا

حسینہ نوجوان کی یہ حالت دیکھ کر متعجب ہوئی اور اُس نے پوچھا "کہیئے مزاج کیسا ہے"؟

نوجوان (آہستہ سے) "اچھا ہوں"

حسینہ "آئیے چلیں آپ نام پتہ دیجد یجئے"

نوجوان غمگین لہجہ میں "آہ! تم میرا نام و پتہ کیا پوچھتی ہو۔ میں وہ ہوں ۔۔ جو ۔۔ دو سال تک یورپ کی نشاط آگیں دلفریب فضا میں بھی عبرتناک انتقام کے منصوبے سوچا کیا ۔۔ جسنے اپنے تمام اعزا کی حسرتناک اموات کا عوض لینے کی قسم کھائی تھی ۔۔ جسنے تمہارے والد کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا عہد کیا تھا ۔۔ لیکن اب ۔۔ تمہارے معصوم چہرے کی خاموش التجا میرے ارادوں پر پانی پھیرے دیتی ہے ۔۔ آہ! میں تمہارا بدنصیب بھائی کلیم ہوں۔ تمہارے والد نے میری جان لے لینے میں کوئی دقیقہ باقی نہ رکھا تھا اور انتہائی بیرحمی اور قساوت قلبی سے مجھکو موت کے تاریک کنوئیں گرا دیا تھا میرا زندہ رہنا ایک معجزہ اور قدرت کی لامحدود طاقت کا ایک بین ثبوت ہے"۔

حسینہ یہ سن کر زرد پڑ گئی اور اُس نے ایسی آواز میں جو خوف و دہشت سے بیحد متاثر تھی۔ کہا:۔

"آپ میرے چچازاد بھائی ہیں!! اور میرے والد نے آپکی جان لینے کی کوشش کی یہ کیسے؟"

~~~~~~~~

نوجوان نے اس افسانہ کا حصہ جسکا تذکرہ پہلے باب میں کیا جا چکا ہے۔ بوضاحت بیان کیا اور بعد میں بتا دیا کہ "اس خوفناک کمرہ کے نیچے کا وہ حصہ جس میں میں گرا دیا گیا پانی سے لبریز ہے اور دریائے گھاگرا سے دو فرلانگ کے فاصلہ پر مل گیا ہے جب کوئی شخص اس میں گرایا جاتا ہے تو ایک مشین کے ذریعہ سے پانی بہا کر دریائے گھاگرا سے ملا دیا جاتا ہے۔ اور اس خوفناک دریا کی خوفناک موجیں اسکو بہا لیجاتی ہیں۔ پھر گھڑیال جو اس دریا میں بکثرت پائے جاتے ہیں اس شخص کو کھا لیتے ہیں دراصل اس پانی کے کمرہ میں گرنے کے بعد کوئی شخص زندہ نہیں نکل سکتا جس وقت میں کمرہ کے نیچے گرایا گیا تو پانی کے ایک تیز دھارا مجھے دریائے گھاگرا تک بہالے گیا لیکن خوش قسمتی سے اسوقت چند انگریز شکار کھیلتے ہوئے واپس آ رہے تھے۔ میرا جسم اُن کی شکاری کشتی سے ٹکرایا اور انہوں نے مجھے پانی سے نکال کر کشتی میں بٹھا لیا۔ بعد ازاں وہ مجھے ڈاک بنگلہ میں جہاں وہ مقیم تھے لیگئے۔ انمیں سے ایک کروڑپتی شریف انگریز جن کا نام سر ایڈورڈ کلفٹن تھا اور جنہیں اردو سیکھنے کا بہت شوق تھا۔ مجھے
~~~~~~~~

اپنے ساتھ انگلستان لیتے گئے میں دو سال تک اُنکے ساتھ یورپ کے مختلف مقامات پر تفریح کرتا رہا۔ اُن کے برتاؤ میرے ساتھ مثل عزیزوں کے تھا اب صرف چند ہفتے ہوئے کہ میں اُن سے بمشکل اجازت لے کر وطن آیا تھا تاکہ اپنے چچا کبیرالدین سے اُس سلوک کا جو انہوں نے میرے دیگر اعزاء اور نیز میرے ساتھ کیا ہے انتقام لوں ــــ لیکن اب میں کیا کرسکتا ہوں"۔

شعیبہ (غمگین لہجہ میں)" اے میرے شریف شہزادے بھائی خدا کیلئے میرے باپ کو معاف کردیجئے ہاں میری خاطر انکے سیاہ جرائم کی پردہ پوشی کیجئے!"

نوجوان "شعیبہ! میں تمہاری خاطر سب کچھ کرنیکو تیار ہوں تم انہیں جاکر یقین دلادو کہ کلیم گو ابھی زندہ ہے لیکن اسنے انہیں معاف کردیا ہے اور اب اس کے دل میں کوئی جذبۂ انتقام باقی نہیں ہے"۔

شعیبہ (مسرت انگیز لہجہ میں)" بھائی کلیم! تم خود اپنی ہی زبان سے انہیں معافی کا یقین دلادو"۔

کلیم شعیبہ کی ترغیب سے راضی ہوگیا۔ اور یہ ساتھ ساتھ کبیرالدین کے کمرہ میں داخل ہوئے۔ جسے ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے کی ممانعت کردی تھی۔ ملاقاتی کمرے میں صوفے پر لیٹا تھا۔ جیسے ہی اس کی نظر کلیم پر پڑی وہ نصف اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس کی نیم وا آنکھیں انتہائی خوف ہراس سے پھیل گئیں۔ ہونٹ خشک ہوگئے۔ اس نے اپنے ہاتھ کلیم کی طرف پھیلا دیئے۔ اور ایسی آواز میں جس کا مفہوم بمشکل سمجھ میں آتا تھا۔ کہا۔

"کیا تم دوسری دنیا سے مجھ سے انتقام لینے آئے ہو۔ اُف اپنی خوفناک نظریں میرے سے ہٹاؤ۔ آہ! آہ! ــــــــ"

قبل اس کے کہ کلیم کوئی جواب دے۔ وہ صوفے پر گر گیا ــــ جب شعیبہ اور کلیم اُس کے پاس گئے۔ تو وہ مرچکا تھا ــــ

ہر قسم کی کتابیں عالمگیر بکڈپو سے طلب فرمائیں

صنعت و حرفت

ناخدائے سخن تاج الشعرا فصیح العصر حضرت نوح ناروی جانشین داغ

اے مرے پیارے عزیزانِ وطن بیدار ہو | خوابِ غفلت سے اٹھو چونکو بس اب ہشیار ہو
کاہلی کا بوجھ سر پر اپنے اپنے دھر چکے | ہے یہی آرام اگر کرنا تو سب کچھ کر چکے
انقلابِ دہر نے صورت بدل دی ہر کی | ہوگئی تاثیر امرت میں بھی پیدا زہر کی
جادۂ بے رہنما میں ساتھ سب کا چھٹ گیا | قافلہ منزل کے پاس آتے ہی آتے لٹ گیا
وہ شرف وہ شان وہ جاہ و حشم باقی نہیں | وہ سماں وہ بزم وہ میخوار وہ ساقی نہیں
ورطۂ بحرِ مصائب سے ابھرنا چاہیے | تم کو پچھلا کارنامہ یاد کرنا چاہیے
چارۂ رد و بدل ہی جب نہیں تو کچھ نہیں | قوتِ حسنِ عمل ہی جب نہیں تو کچھ نہیں
ہر طرف ادبار کی کالی گھٹائیں چھا گئیں | آسماں سے آفتیں چل کر سروں پر آ گئیں
اپنے ہی اعمال ہیں قہرِ الٰہی کا سبب | اپنے ہی افعال ہیں اپنی تباہی کا سبب
دفتروں میں بھی کلی امید کی کھلتی نہیں | ہوگئے بی۔ اے کلرکی تک مگر ملتی نہیں
شیوۂ حاجت روائی آپ حاجتمند ہے | کس طرف جائے کوئی ایک ایک رستہ بند ہے
جھیل کر آزار و غم جی سے گزر جانا پڑا | زندگی کے واسطے بےموت مر جانا پڑا
خادمین ہی نہیں خدمتگزاری کیلیے | اک زمانہ چاہیے امیدواری کیلیے
اور جانب تھا پلٹنا اور جانب پھر گئے | دل سے اترے ساری دنیا کی نظر سے گر گئے
خرمی مفقود عشرت گم مسرت دور ہے | جیسی کرنی ویسی بھرنی یہ مثل مشہور ہے

ناؤ بھی ٹوٹی ہوئی دم بھی نہیں پتوار میں | ناخدا کی ناخدائی کیا کرے منجدھار میں
پیشتر آغاز سے ہو بند و بستِ انجام کا | جو نہ اپنے کام آئے کام ہو وہ کس کام کا
پست ہمت کر سکے کوئی ترقی کس طرح | ویسے ہی گذریگی اب تک اسکی گذری جس طرح
ناز تھا جس پر بہت کچھ وہ جسارت مٹ گئی | مدح خواں تھا جسکا عالم وہ حمیت مٹ گئی
لوگ کہتے ہیں زراعت سب سے اچھی چیز ہے | میں اسے تسلیم کرتا ہوں کہ گھر کی چیز ہے
رات کو پالا پڑے تو دن کی تیزی بھی فضول | وقت پر بارش نہ ہو تو تخم ریزی بھی فضول
رشتۂ الفت تن آسانی سے جوڑا کیا کیا | صنعت و حرفت سے اپنے منہ کو موڑا کیا کیا
اس کے پردے میں مفادِ ملکی و مالی بھی ہے | اس میں آزادی بھی ہے اور اس میں خوشحالی بھی ہے
کوشش و محنت کا ہر دم دھیان رکھنا چاہیے | ذائقہ تدبیرِ امکانی کا چکھنا چاہیے
صنعت و حرفت کی جانب سے تغافل کس لیے | چشم پوشی حرفت و صنعت سے بالکل کس لیے
جن ممالک میں نہیں ہے یہ وہاں تو کچھ نہیں | یہ اگر ہے تو ہے سب یہ نہیں تو کچھ نہیں
دستکاری پر فقط موقوف عزت رہ گئی | دستکاری دستگیرِ اہلِ حاجت رہ گئی
اس سے بڑھ کر مشغلہ ہے اور کیا دن رات کا | نام اپنے ملک کا ہے کام اپنے ہاتھ کا
کی تجارت جس نے اس کے پاس دولت آ گئی | اس کو سب کچھ آ گیا جس کو تجارت آ گئی
بحرِ طوفاں خیز میں ہر موج گو تلوار ہے | نوح کا کہنا اگر مانا تو بیڑا پار ہے

"مانی اور اُس کی تعلیم"

از سید نصیر الحسن رضوی کندرکوی بی۔ اے از جی ایچ۔ پی
ہائی اسکول نگینہ

مذہب مانویہ کا بانی جس کو مانیز یا مانی کے نام سے پکارا جاتا ہے بادشاہ اردوان کے عہد میں پیدا ہوا تھا حقیقت یہ ہے۔ کہ مانی کی وہ ہستی تھی جس نے دنیا کے مذہب میں ایک انقلاب عظیم پیدا کر کے اپنی تعلیم کے ذریعہ سے ہزاروں اشخاص کے قلوب کو مسخر کر لیا تھا۔ اس بانی مذہب کے حالات زندگی عربی کی کتب میں ملتے ہیں۔ البیرونی۔ ابن واضح۔ الیعقوبی۔ اور شہرستانی کی تصنیفات میں مانی کی زندگی اور تعلیم پر روشنی ڈالی گئی ہے، یورپ کے ارباب قلم نے بھی اس پر تحقیق سے حالات لکھنے میں بہت انہماک سے کام لیا ہے۔ چنانچہ سینٹ آگسٹائن کی تصنیفات میں مانی کے حسب ذیل حالات ملتے ہیں۔ حال کے مورخ مسٹر براؤن نے بھی اپنی لٹریری ہسٹری آف پرشیا کی پہلی جلد میں مانی کے زندگی کے حالات اور تعلیم کا ایک خاکہ لکھتا ہوں۔ شاید اپنے مقصد میں کسی حد تک کامیاب ہو سکوں۔

حالاتِ زندگی

مانی جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے۔ بادشاہ اردوان کے زمانہ میں بابل کی سرزمین میں پیدا ہوا اس کا سن ولادت ۲۱۵ - ۲۱۶ عیسوی خیال کیا جاتا ہے۔ اس کے باپ کا نام فتق بتایا جاتا ہے۔ اس کی ماں کا نام مریم تھا اور قرائن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ وہ اشکانیوں یا پارتھیوں کے شاہی خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ مانی کی ایک ٹانگ تھا۔ مانی کے پیروؤں کا بیان ہے کہ اسکی پیدائش سے پہلے ایک غیبی فرشتہ نے اس کی ماں کو خواب میں آگاہ کر دیا تھا کہ اس کے بطن سے ایک بچہ پیدا ہونے والا ہے جو ایک نئے مذہب کی بنیاد ڈالے گا مانوی فرقہ کے اعتقاد کے موافق مانی جب بارہ سال کا ہوا تو اس پر خدائی [illegible] شروع ہو گئے۔ اور تیرہویں سال یعنی ۲۲۷ء و ۲۲۸ء میں اس پر باقاعدہ وحی الٰہی کا نزول ہونا شروع ہوا۔ تبلیغ و اشاعت مذہب کا حکم اس کو چوبیس[۲۴] برس کی عمر میں

مانی نے جب اپنے خیالات کی نشر و اشاعت شروع کی۔ تو اپنی جادو بیانی کے زور سے بہت سے لوگوں کے قلوب کو مسخر کر لیا۔ اور رفتہ رفتہ اس کی تعلیم شاہی خاندان کے افراد پر بھی اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہی یہاں تک کہ بادشاہ شاپور کا بھائی فیروز بھی اس کے حلقۂ معتقدین میں داخل ہو گیا اس وقت مانی کی زندگی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور اس کی اولوالعزمی و عالی ہمتی اس کو دربار شاپور میں لے گئی۔ وہاں جا کر اس نے علانیہ طور پر اپنی نبوت کا باقاعدہ اعلان کر دیا۔ قرائن اور واقعات اس بات کو بتاتے ہیں۔ کہ بادشاہ کا بھائی فیروز مانی کو بادشاہ کے حضور تک پہنچانے میں معاون و مددگار ہوا۔

مانی کی تعلیم کا لُبِ لباب

مانی نے اس وقت کے مروجہ مذہب زرتشتی کو اصل قرار دیا۔ اس کا خیال تھا کہ کائنات میں ازلی و ابدی عناصر کہلانے کے مستحق صرف دو ہی عنصر ہیں جن کو وہ "نور و ظلمت" کے نام سے منسوب کرتا تھا وہ کہتا تھا۔ کہ خالق بھی دو ہی ہیں یعنی خالق خیر و خالق شر۔ اور نور و ظلمت میں سے ہر ایک پانچ صفات سے متصف ہے یعنی رنگ۔ ذائقہ۔ بو۔ لمس اور صوت انہیں صفات کے ذریعہ سے وہ سب، سنتے اور دیکھتے ہیں۔ اور علم حاصل کرتے ہیں کائنات میں جو چیز اچھی اور مفید کہلانے کی مستحق ہے اس کا منبع نور ہے۔ اور جو چیز بُری اور مضر کہلانے کے لائق ہے اس کا منبع ظلمت ہے۔

ابتدا میں نور و ظلمت الگ الگ تھے۔ بعد میں ان دونوں کے درمیان اتصال پیدا ہو گیا اور اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ پہلے یہ نہ تھا۔ لیکن بعد میں حوادث کا وجود ظہور میں آنے لگا۔ اس آمیزش کی ابتدا ظلمت کی جانب سے ہوئی اس کا سبب یہ ہے کہ ظلمت و نور کی آمیزش

آخرالذکر کے لئے۔ حضرت رسالت یہ بات ناممکن اور عقل کے خلاف نظر آتی ہے کہ نور کی جانب سے اس آمیزش کی ابتداء ہوئی ہو کیونکہ نور فطرتاً خیر ہے۔ اور ظلمت فطرتاً شر۔ خیر و شر دونوں ازلی ہیں۔ اور اس کا ثبوت یہ ہے کہ اگر ایک شئے کا وجود تسلیم کر لیا جائے۔ تو اس سے دو متضاد چیزیں ظہور میں نہیں آسکتیں۔ مثلاً آگ گرم اور جلتی ہوئی چیز ہے۔ اس لئے وہ چیزوں کو ٹھنڈا کرنے کی اہلیت نہیں رکھتی۔ اسی طرح جو چیز ٹھنڈا کر سکتی ہے وہ گرم کرنے سے قاصر نظر آتی ہے۔ بعد معلوم ہوا کہ جو سے باعث خیر ہے وہ شر پیدا نہیں کر سکتی ورجو فاعل شر ہے۔ اس سے خیر ظہور میں نہیں آسکتا

اگر ایک طرف مانی نے انبیاء عبرانی کو اپنے نظام سے خارج کیا تو دوسری طرف ان کے عوض زرتشت اور بدھ کو بھی نبی مرسل تسلیم کر لیا بلکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی نبی برحق مان لیا۔ بلکہ وہ عیسائیوں کے اعتقاد کے خلاف مثل مسلمانوں کے مسیح صادق کو مسیح مصلوب سے علیحدہ بنانا چاہتا تھا کا ذکر اور ہم شبیہ ابن آدم تھا۔ مانی بدرم عصبیت تسلیم و رضا اور نفس کشی کی تلقین کرتا ہے۔

مانویہ کے مختلف طبقے اور فرائض

(۱) معلموں:۔ وہ لوگ جو ابنیاء العلم کہلاتے تھے

(۲) منتمسوں:۔ وہ لوگ جن کو کس نے منور کیا تھا۔ اور جو ابنیاء الحلم کہلاتے تھے۔

(۳) قسیسوں:۔ (مذہبی پیشوا) یہ ابناء العقل کے نام سے پکارے جاتے تھے۔

(۴) صدیقوں:۔ (یا اصحاب ایمان) جو ابناء الغیب کہلاتے تھے

(۵) سماعون:۔ (سننے والے) جو ابناء الفطنۃ کے نام سے مشہور تھے

ان کے لئے فرض تھا کہ وہ روز سات مرتبہ یا چار مرتبہ نماز ادا کریں۔ جھوٹ بخل قتل۔ زنا چوری جس دسحر۔ ریاکاری۔ بت پرستی اور فرائض میں سستی کرنے کی سخت ممانعت تھی۔ ان احکام عشرہ کے علاوہ دیگر معتقدات یہ تھے:۔

چار حقائق اعلیٰ کا دل سے یقین رکھنا یعنی خدا کا جو جنان نور کا بادشاہ ہے خدا کے نور کا۔ اس کی قدرت اور حکمت کا۔ ہر ماہ میں سات (۷) روزے رکھنا۔ مواہیر ثلاثہ یا ابلن لاناسینٹ اگسٹائن اور دیگر عیسائی مصنفوں نے ان مواہیر ثلاثہ سے مراد منہ، ہاتھ اور قلب کی مہروں سے لی ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ انسان کو برے الفاظ برے کام اور برے خیال سے بچنا چاہیئے۔ یہ اصول پارسیوں میں بھی ہخت (الفاظ نیک) ہورشت (اعمال نیک) اور ہمت (خیالات نیک) کے نام سے رائج ہیں۔

مانی کی وفات کے بعد روحانی افضلیت کی بناء پر مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ لیکن ان میں سے دو خاص فرقے تھے۔ ایک مہریہ اور دوسرا مقلاصیہ

مانی کی تصانیف

مانی نے چھ کتابیں سریانی اور ایک پہلوی زبان میں لکھیں لیکن ان کتابوں کا رسم الخط جو مصنف نے خود ایجاد کیا تھا عجیب و غریب تھا۔ مانی نے اپنے رسم الخط اور عموماً فن کتابت پر کافی توجہ اور خاص کاوش سے کام لیا۔ اسی رسم الخط اور فن کتابت کی وجہ سے ایران اور ہندوستان میں یہ خیال پیدا ہو گیا کہ مانی ایک اعلیٰ درجہ کا مصور تھا۔ آج بھی اہل ہند و ایران کا یہ عقیدہ ہے کہ مانی نے ارژنگ یا ارتنگ نام کی ایک کتاب التصاویر تیار کی تھی اور اس کو وہ اپنی فوق البشر طاقت اور ربانی سفارت کے ثبوت میں پیش کرتا تھا۔ اسکی تصانیف میں سے ایک کا نام کنزۃ الاحیاء ہے جو اٹھارہ ابواب پر مشتمل ہے۔ اس میں مصنف نے روح اور نور کے تعلق اور ظلمت کے اثر شنیعہ کا ذکر ہے۔ اور وہ معیوب اعمال کو ظلمت سے منسوب کرتا ہے۔ اس کی ایک دوسری کتاب کا نام شابرقان ہے جس میں اقسام ارواح کا بیان ہے وہ آسمان کو ایک سطح بیان کرتا ہے۔ اور لکھتا ہے کہ زمین ایک ڈھلوان پہاڑ پر قائم ہے جس پر چرخ گردش کرتا ہے۔ اس کی ایک تصنیف کتاب الہدیٰ والتدبیر کے نام سے مشہور ہے۔ اور دوسری صحف دوازدہ کے نام سے۔ ان کتابوں میں نماز اور نجات کے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ ایک کتاب کا نام سفر الاسرار ہے جس میں مصنف نے اپنی تمام تر طاقت نبیوں کے معجزے باطل کرنے میں صرف کی ہے۔ ان کے علاوہ کئی اور کتابیں اور ملفوظات ہیں۔

مانی کے ساتھ حکومت کا رویہ

مانی نے ایک کتاب شابرقان نامی لکھی جس کا اوپر ذکر آچکا ہے۔ یہ

کتاب خاص طور سے بادشاہ شاپور کے واسطے لکھی گئی تھی۔ مانی اس کتاب کے ذریعے سے بادشاہ کو اپنا مطیع و منقاد کرنے میں ایک بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ بادشاہ کو مانی کا پیرو بنانے میں بادشاہ کے برادر حقیقی فیروز نے بہت زیادہ جدوجہد کی۔ بہرحال مانی کی تعلیم کے آگے شاہپور نے متعدد اثرات کی بناء پر سر تسلیم خم کر دیا۔ اور اپنی رعایا کو بھی اس نے اس تعلیم جدید کی طرف راغب کیا لیکن رعایا کو بادشاہ کے مانی کا پیرو ہونے سے سخت صدمہ ہوا۔ اور سلطنت کی تمام بااثر شخصیتوں نے متفقہ طور پر بادشاہ کو اس اعتقاد سے ہٹا دینے کی انتہائی کی لیکن چونکہ بادشاہ مانی کا کچھ ایسا معتقد ہو چکا تھا۔ کہ ان کی تمام کوششیں نقش بر آب ثابت ہوئیں۔ اور بادشاہ کو اپنے اعتقاد سے نہ ہٹنا تھا نہ ہٹا۔ شاپور اس مذہب کا دس برس تک برابر پیرو بنا رہا۔ اسی اثناء میں شاپور کے پاس ایک موبد آتش پرست آیا۔ اور اس نے اپنی جادو بیانی کے زور سے بادشاہ کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ اور اس نے بادشاہ سے کہا کہ وہ ہر طریقہ سے مانی سے گفتگو کرنے کے لئے تیار ہے اور اس کی تعلیم اور معتقدات کو باطل کر سکتا ہے۔ بادشاہ نے مانی کو طلب کیا۔ اور نتیجہ یہ ہوا۔ کہ دونوں کا مناظرہ ہوا۔ اس موبد نے ایسے دلائل پیش کئے۔ کہ مانی ان کے مقابلہ میں لاجواب ہو گیا۔ ان کی تردید نہ کر سکا اس مناظرہ کا نتیجہ یہ ہوا۔ کہ شاپور کو مانی کی تعلیم سے نفرت پیدا ہو گئی اور اس نے مانی کی تعلیم کو خیرباد کہہ کر مجوسیت اختیار کر لی۔ اب شاپور نے ارادہ کیا کہ وہ مانی کی زندگی کا خاتمہ کر دے لیکن مانی کو اس کے دوستوں نے شاہپور کے ارادے سے باخبر کر دیا۔ اور وہ روپوش ہو کر ہندوستان آیا جہاں وہ شاپور کی وفات تک سکونت پذیر رہا۔ شاپور کی وفات کے بعد اس کا بیٹا ہرمز سریر آرائے سلطنت ہوا۔ وہ بڑا بہادر اور عالی ہمت بادشاہ تھا۔ اس نے شہر رام ہرمز بسایا لیکن اس کی زندگی نے وفا نہ کی اور اس نے صرف ایک سال حکومت کرنے کے بعد داعیٔ اجل کو لبیک کہا ہرمز کی بے وقت موت نے عنانِ حکومت اس کے بیٹے بہرام کے ہاتھ میں دے دی جو عیش و عشرت کا دلدادہ تھا۔ وہ اپنا زیادہ تر وقت مے نوشی رقص و سرود اور عورتوں کی صحبت میں صرف کرتا تھا۔ بہرام کی حالت کا مشاہدہ کر کے مانی کے شاگردوں نے اس کو ہندوستان لکھ بھیجا۔ کہ نیا بادشاہ نوعمر اور عیش و عشرت کا بندہ ہے مذہب سے اس کو کوئی سروکار

نہیں۔ اس لئے اگر وہ ایسی حالت میں ایران واپس آ جائے گا۔ اور تبلیغ و تلقین کرے گا۔ تو مذہب مانوی کا پھر عروج ہو جائے گا۔ مانی کے چیلوں کی ترغیب کارگر ثابت ہوئی۔ اور وہ فوراً ایران واپس آ گیا۔ اور مثل سابق کے دوبارہ اپنے مذہب کی نشر و اشاعت میں منہمک ہو گیا۔ اسکی مذہبی تبلیغ کی سرگرمیوں کا شہرہ تمام ملک میں پھیل گیا بہرام نے اسکو اپنے دربار میں طلب کر کے اس کی تعلیم کا حال پوچھا۔ اور مانی نے اپنی تمام رام کہانی کہہ سنائی۔ اس کے بعد بہرام نے ایک موبد کو بلایا۔ اور مانی سے کہا۔ کہ وہ اس موبد کے ساتھ مباہلہ یا مناظرہ کرے موبد نے مانی سے بعد بحث و مباحثہ کے کہا۔ کہ ہم میں سے ہر ایک پگلا ہوا شیشہ اپنے اپنے پیٹ پر ڈالے۔ جو ضرر سے محفوظ رہے گا۔ وہی حقانیت کے لئے ہو گا۔ اور اس کا مسلک منجانب اللہ قرار دیا جائے گا لیکن مانی اس مباہلہ پر کسی طرح راضی نہ ہوا۔ اور اس نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ یہ فعل ظلمت کا ہے مباہلہ سے انکار کرنا مانی کے حق میں موت کا پیغام بن گیا۔ اور بہرام نے غصہ میں آ کر اس کو قید میں ڈال دیا اور کہا کہ جب صبح ہو گی تو تجھ کو ایسے دردناک طریقہ سے قتل کر دوں گا۔ کہ اس سے پیشتر کوئی شخص اس طریقہ سے مقتول نہ ہوا ہو گا لیکن وہ اس رات میں جو اس کو قید میں گزری۔ شدید سے شدید سزاؤں میں گرفتار رہا حتیٰ کہ اس کی کھال تک جسم سے کھینچی گئی۔ وہ اس تکلیف کو برداشت تک نہ کر سکا۔ اور صبح ہوتے ہوتے اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی جب صبح ہوئی تو بہرام نے قید خانہ سے طلب کیا اس کے مردہ جسم کو دیکھ کر حکم دیا کہ اس کا سر کاٹ کر جسم میں بھس بھر دیا جائے مانی کو قتل کرنے کے بعد بہرام نے اس کے معتقدین پر سختیاں کرنا شروع کیں اور ان کی ایک کثیر تعداد کو تہ تیغ کیا

مقالاتِ نجم

(از جناب نجم ندوی فاضل شمسی - بی - اے)

دل سے کیا پرسش احوال جگر سے پوچھو
حال اس گھر کا ذرا دوسرے گھر سے پوچھو

خلشِ نوکِ مژہ زخمِ جگر سے پوچھو
حسرتِ ذوقِ نظر دیدۂ تر سے پوچھو

دور کیوں جاؤ کسی شعبدہ گر سے پوچھو
رازِ تسخیر قلوب ان کی نظر سے پوچھو

یادِ ایامِ کہن دیدۂ تر سے پوچھو
قصۂ صحبتِ شب شمعِ سحر سے پوچھو

علم داں اور بھی اللہ کے بندے ہیں کلیم
"لن ترانی" میں ہے کیا راز خضر سے پوچھو

خلوتی دشت نوردی کا مزہ کیا جانے
جا کے مجنوں سے ملو خاک بسر سے پوچھو

ناوکِ ناز کے ممنونِ کرم کتنے ہیں
دل سے سینے سے کلیجے سے جگر سے پوچھو

بس مرے نقشِ قدم پر رہِ الفت میں چلو
راستہ شمعِ سرِ راہ گذر سے پوچھو

کیا تماشا ہے کہ آج اس کی لحد پر رو دو
عمر بھر جسکو نہ خط سے نہ خبر سے پوچھو

چاند کا حال ستاروں ہی پہ کچھ روشن ہے
قدر اربابِ ہنر اہلِ ہنر سے پوچھو

سیکھو مکتبِ غالب میں خیال آرائی
اور اندازِ بیان داغ کے گھر سے پوچھو

نجم نقاد تہی مغز بھلا کیا جانے
میرے اشعار کو تم اہلِ نظر سے پوچھو

کرکٹ میچ

(منشی پریم چند مرحوم کا ایک افسانہ)

یکم جنوری ۱۹۳۵ء

آج کرکٹ میچ میں مجھے جتنی مایوسی ہوئی اُس کا اظہار نہیں کر سکتا۔ ہماری ٹیم حریفوں سے کہیں زیادہ مستحکم تھی۔ مگر ہمیں ہار ہوئی اور وہ لوگ فتح و نصرت کا ڈنکا بجاتے ہوئے ٹرافی اُڑا لے گئے۔ کیوں محض اس لئے کہ ہمارے یہاں قیادت کے لئے لیاقت شرط نہیں ہم قیادت کے لئے ثروت اور دولت لازمی سمجھتے ہیں۔ ہز ہائنس کپتان منتخب ہوئے۔ کرکٹ بورڈ کا فیصلہ سب کو ماننا پڑا۔ مگر کتنے دلوں میں آگ لگی۔ کتنے لوگوں نے حکم حاکم سمجھ کر اس فیصلہ کو منظور کیا۔ وہ کھیلنے والوں سے پوچھئے۔ اور جہاں محض منہ دیکھی ہے وہاں اُمنگ کہاں۔ ولولہ کہاں۔ عزم کہاں۔ آخری قطرۂ خون گرا دینے کا جوش کہاں۔ ہم کھیلے اور بظاہر دل سے کھیلے۔ مگر یہ حق کے لئے جان دینے والے سرفروشوں کی فوج نہ تھی۔ پیٹ اور لوٹ کے لئے لڑنے والی فوج نہ تھی۔ کھیل میں کسی کا دل نہ تھا۔

میں اسٹیشن پر کھڑا اپنا تیسرے درجہ کا ٹکٹ لینے کی فکر میں تھا کہ ایک نازنین نے جو ابھی کار سے اتری تھی۔ آگے بڑھ کر مجھ سے مصافحہ کیا اور بولی۔" آپ بھی تو اسی گاڑی سے چل رہے ہیں مسٹر ظفر؟"

مجھے حیرت ہوئی یہ کون نازنین ہے اور اسے میرا نام کیونکر معلوم ہو گیا۔ مجھے یک لحہ کے لئے سکتہ سا ہو گیا۔ گویا سارے آداب اور اخلاق کی رسمیں دماغ سے محو ہو گئی ہوں۔ حسن میں ایک سطوت ہے۔ جو بڑوں بڑوں کے سر جھکا دیتی ہے۔ مجھے اپنے عجز کا ایسا احساس کبھی نہ ہوا تھا۔ میں نے نظام حیدر آباد سے۔ ہز ایکسلنسی وائسرائے سے۔ مہاراجہ میسور سے ہاتھ ملایا ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر کھایا ہے۔ مگر یہ افتادگی اور یہ فروتنی مجھ پر کبھی طاری نہ ہوئی تھی بس یہی جی چاہتا تھا کہ اپنی پلکوں سے اس کے قدموں کا بوسہ لے لوں وہ ملاحت نہ تھی جس پر ہم جان دیتے ہیں۔ نہ وہ نزاکت جس کی شعرا قسمیں کھاتے ہیں۔ اس کی جگہ ذہانت تھی۔ متانت تھی۔ وقار تھا۔ زندہ دلی تھی۔ اور شوق اظہار تھا۔ بے نقاب میں نے پُرسوال انداز سے کہا۔"جی ہاں،"

یہ کیسے پوچھوں کہ مجھے آپ سے کب نیاز حاصل ہوا۔ اُس کی بے تکلفی کہہ رہی تھی۔ کہ وہ مجھ سے متعارف ہے۔ میں بیگانہ کیسے بنوں۔ اسی سلسلہ میں میں نے اپنی مروّت کا فرض بھی ادا کر دیا۔ " میرے لئے کوئی خدمت ؟"

اُس نے مسکرا کر کہا۔ جی ہاں آپ سے بہت سے کام لونگی چلئے اندر ویٹنگ روم میں بیٹھیں۔ لکھنؤ کا قصد ہو گا۔ میں بھی وہیں چل رہی ہوں"۔

ویٹنگ روم میں آکر اس نے مجھے آرام کرسی پر بٹھایا اور خود ایک معمولی کرسی پر بیٹھ کر سگرٹ کیس میری طرف بڑھاتی ہوئی بولی۔" آج تو آپ کی بولنگ بڑی مہلک تھی۔ ورنہ ہم لوگ پوری اننگ سے ہارتے"۔

میری حیرت اور زیادہ ہوئی۔ اس حسینہ کو کیا کرکٹ سے بھی شوق ہے۔ مجھے اُس کے سامنے آرام کرسی پر بیٹھتے ہوئے تکلف ہو رہا تھا۔ ایسی ادب شکن حرکت مجھ سے کبھی سرزد نہ ہوئی تھی۔ توجہ اُسی طرف تھی۔ طبیعت میں کچھ انقباض سا ہو رہا تھا

رگوں میں وہ سرعت اور طبیعت میں وہ گلابی بشاشت نہ تھی جو ایسے موقع پر فطرتاً مجھ میں ہونی چاہیئے تھی۔

میں نے پوچھا "کیا آپ وہیں تشریف رکھتی تھیں؟"

اس نے اپنا سگرٹ جلاتے ہوئے کہا۔ جی ہاں اول سے آخر تک۔ مجھے تو صرف آپ کا کھیل جنچا اور لوگ تو کچھ بیدل سے ہو رہے تھے۔ اور میں اس کا راز سمجھ رہی ہوں۔ ہمارے یہاں لوگوں میں صحیح مقام پر رکھنے کا مادہ ہی نہیں۔ جیسے اس سیاسی پستی نے ہمارے سبھی اوصاف کو کچل ڈالا ہو۔ جس کے پاس ثروت ہے۔ وہ قادر مطلق ہے۔ وہ کسی علمی۔ ادبی۔ معاشری جلسے کا صدر ہو سکتا ہے۔ اہل ہو یا نہ ہو۔ نئی عمارتوں کا افتتاح اس کے ہاتھوں کرایا جاتا ہے۔ بنیادیں اس کے ہاتھوں رکھوائی جاتی ہیں۔ تہذیبی تحریکوں کی قیادت اسے دی جاتی ہے۔ وہ کانووکیشن کے خطبے پڑھے گا لڑکوں کو انعام تقسیم کرے گا۔ یہ سب ہماری غلامانہ ذہنیت کی برکت ہے۔ کوئی تعجب نہیں ہم اس قدر ذلیل اور پست ہیں۔ جہاں حکم اور اختیار کا معاملہ وہاں تو خیر مجبوری ہے۔ ہمیں پابوسی کرنی ہی پڑتی ہے۔ مگر جہاں ہم اپنی آزاد خیالی اور آزاد علمی سے کام لے سکتے ہیں وہاں بھی ہماری رسوم طلبی اور منعم پرستی ہمارا گلا نہیں چھوڑتی۔ اس ٹیم کا کپتان آپ کو ہونا چاہیئے تھا۔ تب دیکھتی حریف کیونکر بازی لے جاتا۔ مہاراجہ صاحب میں اس ٹیم کے کپتان بننے کی اتنی ہی صلاحیت ہے جتنی آپ میں اسمبلی کی صدارت کی۔ یا مجھ میں سنیما ایکٹنگ کی۔

بالکل وہی جذبات جو میرے دل میں تھے۔ مگر اس کی زبان سے نکل کر کتنے پر اثر اور کتنے بصیرت افروز ہو گئے تھے۔ میں نے کہا آپ بجا فرماتی ہیں۔ واقعی یہ ہماری کمزوری ہے۔

"آپ کو اس ٹیم میں شریک نہ ہونا چاہیئے تھا۔"

"میں مجبور تھا"

اس حسینہ کا نام مس ہیلن مکرجی ہے۔ ابھی انگلینڈ سے آ رہی ہے۔ یہی کرکٹ میچ دیکھنے کے لئے بمبئی ٹھہر گئی تھی۔ انگلینڈ میں اس نے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کی ہے۔ اور خدمت خلق اس کی زندگی کا مقصد ہے وہاں اُس نے ایک اخبار میں میری تصویر دیکھی تھی۔ اور میرا ذکر بھی پڑھا تھا۔ تب سے اُسے میری جانب سے حسن ظن ہو گیا ہے۔ یہاں مجھے کھیلتے دیکھ کر وہ اور بھی زیادہ متاثر ہوئی۔ اُس کا ارادہ ہے کہ ہندوستان کی ایک نئی ٹیم مرتب کی جائے اور اُس میں وہی لوگ لئے جائیں جو قوم کی نیابت کرنے کے مستحق ہیں۔ اُس کی تجویز ہے کہ میں اس ٹیم کا کپتان بنایا جاؤں۔ اسی ارادہ سے وہ سارے ہندوستان کا دورہ کرنا چاہتی ہے اس کے والد مرحوم ڈاکٹر آین مکرجی نے بہت کافی دولت چھوڑی ہے۔ اور وہ اس کی بلا شرکت غیرے وارث ہے۔ اس کی تجویزیں سُنکر میرا دماغ آسمان میں اُڑنے لگا۔ میری زندگی کا سنہرا خواب اس غیر متوقعہ انداز سے حقیقت بن سکے گا۔ اس کا کسے گمان تھا۔ مشیت غیب میں میرا اعتقاد نہیں۔ مگر آج میرے وجود کا ایک ایک ذرہ تشکر اور عقیدت کے جذبات سے لبریز تھا۔ میں نے مناسب اور منکسر الفاظ میں مس ہیلن کا شکریہ ادا کیا۔

گاڑی کی گھنٹی ہوئی۔ مس مکرجی نے فرسٹ کلاس کے دو ٹکٹ منگوائے۔ میں احتجاج نہ کر سکا۔ اس نے میرا سامان اٹھوایا۔ میرا ہیٹ خود اُٹھا لیا اور بیباکانہ انداز سے ایک کمرہ میں جا بیٹھی اور مجھے بھی اندر بلا لیا۔ اس کا خیال تھا میں تیسرے درجے میں بیٹھا۔ میری قوت عمل جیسے سلب ہو گئی تھی۔ بس خدا جانے ان سب معاملات میں کیوں اُسے پیش قدمی کرنے دیتا تھا جو مرد کی حیثیت سے میرے فرائض میں شامل تھے۔ شاید اس کے حسن۔ اس کے ذہنی وقار اور اس کی علو ہمتی نے مجھے مرعوب کر دیا تھا۔ گویا اس نے کام دیو کے جادو طرازوں کی طرح مجھے بھیڑ ا بنا لیا ہو۔ اور مجھ میں قوت ارادہ غائب ہو گئی ہو۔ اتنی ہی دیر میں میری ہستی اُس کی رضا میں جذب ہو گئی تھی۔ میری خودداری کا یہ تقاضا تھا کہ میں اسے اپنے لئے فرسٹ کلاس کا ٹکٹ نہ منگوانے دیتا اور تیسرے ہی درجہ میں آرام سے بیٹھتا۔ اور اگر اول درجہ میں بیٹھنا تھا تو اپنی ہی فیاضی سے دونوں کے لئے خود اول درجہ کے ٹکٹ لاتا لیکن فی الواقع میری قوت عمل سلب ہو گئی تھی۔

۴ر جنوری - میں حیران ہوں ہیلن کو مجھ سے اتنی ہمدردی کیوں ہے - اور یہ محض دوستانہ ہمدردی نہیں ہے - اس میں محبت کا خلوص ہے، رحم تو اتنا مہمان نواز نہیں ہوا کرتا - اور میرے کمال کا اعتراف ! میں اتنا عقل سے عاری نہیں ہوں کہ اس مغالطے میں پڑوں - کمال کا اعتراف زیادہ سے زیادہ ایک سگرٹ اور ایک پیالہ چائے پاسکتا ہے۔ یہ خاطر و مدارات تو وہیں پاتا ہوں جہاں کسی میچ میں کھیلنے کے لئے مدعو ہوتا ہوں - تاہم وہاں یہ دلنوازی نہیں ہوتی محض رسمی خاطر داری برتی جاتی ہے - اس نے تو جیسے میری آسائش کے لئے اپنے کو وقف کر دیا ہو - میں تو شاید اپنی معشوقہ کے سوا اور کسی کے ساتھ اس خلوص کا برتاؤ نہ کرسکتا - یاد رہے میں نے معشوقہ کہا ہے - بیوی نہیں کہا - بیوی کی ہم خاطر داری نہیں کرتے - اس سے تو خاطر داری کروانا ہی ہمارا وطیرہ ہو گیا ہے - اور شاید حق بھی یہی ہے - مگر فی الحال تو میں ان دونوں نعمتوں میں ایک سے بھی بہرہ ور نہیں - اُس کے ناشتے ڈنر - لنچ میں تو میں شریک تھا ہی - ہر اسٹیشن پر (وہ ڈاک تھی اور خاص خاص اسٹیشنوں پر ہی رُکتی تھی) میوے اور پھل منگواتی اور مجھے بہ اصرار کھلاتی - کہاں کی کیا چیز مشہور ہے - اس کا اسے خوب علم ہے - میرے عزیزوں کے لئے طرح طرح کے تحائف خریدے مگر حیرت یہ ہے کہ میں نے ایک بار بھی اسے منع نہ کیا - منع کیا تکرار کرتا - مجھ سے پوچھکر تو لاتی نہیں - جب وہ ایک چیز لا کر نہ جانے کس ... میری نذر کرتی ہے تو میں کیسے انکار کروں - خدا جانے کیوں میں مرد ہو کر بھی اس کے روبرو عورت کی طرح شرمیلا - کم گو - ... ہو جاتا ہوں ◆

دن کی تکان کی وجہ سے رات بھر مجھے بے چینی رہی - سر میں خفیف سا درد تھا - مگر میں نے اس درد میں مبالغہ کیا - تنہا ہوتا تو اس درد کی شاید مطلق پروا نہ کرتا - مگر آج اس کی موجودگی میں مجھے اس کے اظہار میں مزہ آرہا تھا - وہ میرے سر میں تیل کی مالش کرنے لگی - اور میں خواہ مخواہ نڈھال ہوا جاتا تھا - میرے اضطراب کے ساتھ اس کی وحشت بڑھتی جاتی تھی - مجھ سے بار بار پوچھتی اب درد کیسا ہے؟

اور میں تو کلانہ انداز سے کہتا اچھا ہوں - اس کی نازک ہتھیلیوں کے احساس سے میری روح میں گدگدی ہوتی تھی - اس کا وہ دلکش چہرہ میرے سر پر جھکا ہوا ہے - اس کی گرم سانسیں میری پیشانی کے بوسے لے رہی ہیں - اور میں گویا جنت کے مزے لے رہا ہوں - میرے دل میں اب اُس پر فتح پانے کی خواہش چٹکیاں لے رہی ہے - میں چاہتا ہوں وہ میری ناز برداری کرے - میری طرف سے کوئی ایسی پیشقدمی نہ ہونی چاہئے جس سے اُس پر فریفتگی کا اظہار ہو - چوبیس گھنٹے کے اندر میری ذہنیت میں کیونکر یہ انقلاب ہو جاتا ہے - میں کیونکر طالب سے مطلوب بن جاتا ہوں - یہ میں نہیں سمجھ سکتا - مجھے نہ جانے کب نیند آجاتی ہے - مگر جب آنکھ کھلتی ہے تو دیکھتا ہوں وہ بدستور اسی محویت کے ساتھ میرے سر پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہوئی ہے - تب مجھے اس پر رحم آجاتا ہے - اور میں کہتا ہوں آپ اب تکلیف نہ کریں - میں بالکل اچھا ہوں - عاشقی کا تھوڑا سا تجربہ کسے نہیں ہوتا - میں بھی مستثنےٰ نہیں ہوں - مگر اس معشوقی میں آج جو لطف آیا اس پر عاشقی صدقے - عاشقی غلامی ہے - معشوقی بادشاہت

میں نے ترحم کے انداز سے کہا - آپ کو میری وجہ سے بڑی تکلیف ہوئی -

اُس نے دلسوزی کی - "مجھے کیا تکلیف ہوئی - آپ درد سے بے چین تھے اور میں بیٹھی رہتی - کاش یہ درد میرے ہوتا"

میں عرش معلےٰ پر اُڑا جا رہا تھا ◆

۵ر جنوری - کل شام کو ہم لکھنؤ پہونچ گئے - راستے میں ہیلن سے تمدنی - سیاسی اور ادبی مسائل پر خوب باتیں ہوئیں - گریجویٹ تو خدا کے فضل سے میں بھی ہوں - اور تب سے فرصت کے اوقات میں کتب بینی بھی کرتا رہا ہوں - علما کی صحبت میں بھی بیٹھا ہوں - لیکن اُس کی وسعتِ معلومات کے سامنے قدم قدم پر مجھے اپنی بے بضاعتی کا علم ہوتا ہے - ہر ایک مسئلہ پر اُس کی اپنی رائے ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُس نے خوب تحقیق کے بعد وہ رائے قائم کی ہے - اس کے برعکس

میں ان لوگوں میں ہوں جو ہوا کے ساتھ اڑتے ہیں۔ جنہیں ذہنی تحریکیں زیر وزبر کر دیتی ہیں۔ میں کوشش کرتا تھا کہ کسی طرح اُس پر اپنا ذہنی وقار قائم کر دوں۔ مگر اس کے نظریات مجھے بے زبان کر دیتے تھے جب میں نے دیکھا کہ علمی مسائل میں اس سے پیش نہ پاسکوں گا تو میں نے ابی سینیا اور اٹلی کے معرکے کا ذکر چھیڑ دیا۔ جس پر میں نے اپنی دانست میں بہت کچھ پڑھا تھا۔ انگلینڈ اور فرانس نے اٹلی پر جو دباؤ ڈالا ہے اس کی تعریف میں اپنا سارا زور بیان صرف کر ڈالا۔ اُس نے ایک تبسم کے ساتھ کہا۔ اگر آپ کا یہ خیال ہے کہ انگلینڈ اور فرانس محض انسانیت یا زیردست پروری کے جذبات سے متحرک ہوئے ہیں تو آپ کی غلطی ہے۔ ان کی ملوکیت پرستی یہ نہیں برداشت کر سکتی کہ دنیا کی کوئی دوسری طاقت پھیلے اور سرسبز ہو۔ مسولینی وہی کر رہا ہے۔ جو انگلینڈ نے بارہا کیا ہے۔ اور آج بھی کر رہا ہے۔ یہ سارا بہروپیا پن محض ابی سینیا سے سیاسی اور تجارتی مراعات حاصل کرنے کے لئے ہے۔ اگر انگلینڈ کو اپنی تجارت کے لئے بازاروں کی ضرورت ہے۔ اپنی زائد آبادی کے لئے قطعات زمین کی ضرورت ہے۔ اپنے تعلیم یافتوں کے لئے۔ موٹے منصوبوں کی ضرورت ہے تو اٹلی کو کیوں نہ ہو۔ اٹلی جو کچھ کر رہا ہے ایمانداری کے ساتھ علانیہ کر رہا ہے۔ اس نے کبھی عالمگیر اخوت کا ڈنکا نہیں پیٹا۔ کبھی امن کا راگ نہیں الاپا۔ وہ تو صاف کہتا ہے۔ جنگ و جدل ہی زندگی کی علامت ہے۔ انسانیت کا ارتقا جنگ ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔ انسان کے ملکوتی اوصاف میدان جنگ میں ہی نشو ونما پاتے ہیں۔ مساوات کے نظریئے کو وہ جنون کہتا ہے۔ وہ اپنا شمار بھی انہیں برگزیدہ اقوام میں کرتا ہے۔ جنہیں رنگین آبادیوں پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ اس لئے ہم اس کے طرز عمل کو سمجھ سکتے ہیں۔ انگلینڈ نے ہمیشہ روباہ بازی سے کام لیا ہے۔ ہمیشہ ایک قوم کے مختلف عناصر میں تفرقے ڈال کر یا ان کے اختلافات کو سیاسیات کا مدار بنا کر انہیں اپنا حلقہ بگوش بنایا ہے۔ میں تو چاہتی ہوں کہ دنیا میں اٹلی۔ جاپان اور جرمنی خوب فروغ حاصل کریں۔ اور انگلینڈ کا تسلط ٹوٹے۔ تب ہی دنیا میں اصلی جمہوریت اصلی امن پیدا ہوگا۔ موجودہ تہذیب جب تک مٹ نہ جائے گی دنیا میں امن کا راج نہ ہوگا۔ کمزور قوموں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔ اسی طرح جس طرح کمزور پودوں کو۔ صرف اس لئے نہیں کہ ان کا وجود انہیں کے لئے عذاب کا باعث ہے۔ بلکہ اس لئے کہ وہی دنیا کی اس کشمکش اور خونریزیوں کی ذمہ دار ہیں۔

مجھے بھلا اس رائے سے کیوں اتفاق ہونے لگا۔ میں نے جواب تو دیا اور ان خیالات کی اتنی ہی زوردار الفاظ میں تردید بھی کی مگر میں نے دیکھا اس معاملہ میں وہ عقل سلیم سے کام نہیں لینا چاہتی یا نہیں لے سکتی۔

اسٹیشن پر اترتے ہی مجھے یہ فکر دامنگیر ہوئی کہ ہیلن کو اپنا مہمان کیسے بناؤں۔ اگر ہوٹل میں ٹھہراؤں تو خدا جانے اپنے دل میں کیا کہے۔ اگر اپنے گھر لے جاؤں تو شرم دامنگیر ہوتی ہے۔ وہاں ایسی خوش مذاق اور امیرانہ مزاج نازنین کے لئے آسائش کے کیا سامان ہیں۔ یہ اتفاق ہے کہ میں کرکٹ اچھا کھیلنے لگا۔ اور پڑھنا لکھنا چھوڑ چھاڑ کر اسی کا ہو رہا۔ اور ایک اسکول میں ماسٹر ہوں مگر گھر کی حالت بدستور ہے۔ وہی پرانا اندھیرا بوسیدہ مکان۔ تنگ گلی میں۔ وہی پرانی روش۔ وہی پرانا ڈھچر۔ اماں تو شاید ہیلن کو گھر میں قدم ہی نہ رکھنے دیں اور یہاں تک نوبت ہی کیوں آنے لگی۔ ہیلن خود دروازے ہی سے بھاگے گی۔ کاش آج اپنا مکان ہوتا۔ آراستہ پیراستہ۔ میں اس قابل ہوتا کہ ہیلن کی مہمانداری کر سکتا۔ اس سے زیادہ خوش نصیبی اور کیا ہو سکتی تھی لیکن بے سروسامانی کا برا ہو۔

میں یہی سوچ رہا تھا کہ ہیلن نے قلی سے اسباب اٹھوایا اور باہر آ کر ایک ٹیکسی بلالی۔ میرے لئے اس ٹیکسی میں بیٹھ جانے کے سوا دوسرا چارہ کیا باقی رہ گیا تھا۔ مجھے یقین ہے اگر میں اُسے اپنے گھر لے جاتا تو اس بے سروسامانی کے باوجود خوش ہوتی۔ ہیلن خوش مذاق ہے مگر نازک دماغ نہیں ہے۔ وہ ہر ایک قسم کی آزمائش

اور تجربہ کے لئے تیار رہتی ہے ہیلن شاید آزمائشوں اور ناگوار تجربوں کو بلاتی ہے۔ مگر مجھ میں نہ یہ تخیل ہے نہ وہ جرأت۔

اس نے اگر ذرا غور سے میرا چہرہ دیکھا ہوتا تو اُسے معلوم ہوتا اُس پر کتنی ندامت اور کتنی بیکسی جھلک رہی تھی۔ مگر ظاہرداری نباہ تو ضروری تھا۔ میں نے احتجاج کیا۔ میں تو آپ کو بھی اپنا مہمان بنانا چاہتا تھا۔ آپ اُلٹا مجھے ہوٹل لئے جا رہی ہیں۔

اُس نے شرارت کے انداز سے کہا۔ "اس لئے کہ آپ میرے قابو سے باہر نہ ہو جائیں۔ میرے لئے اس سے زیادہ مسرت کی بات کیا ہوتی کہ آپ کی مہمان نوازی کا لطف اٹھاؤں۔ لیکن محبت حاسد ہوتی ہے یہ آپ کو معلوم ہے۔ وہاں آپ کے احباب آپ کے وقت کا بڑا حصہ لے لیں گے۔ آپ کو مجھ سے بات کرنے کا وقت ہی نہ ملے گا۔ اور مرد بالعموم کتنے بے مروت اور زود فراموش ہوتے ہیں اس کا مجھے تجربہ ہو چکا ہے۔ میں آپکو ایک لمحہ کے لئے بھی الگ نہیں چھوڑ سکتی۔ مجھے اپنے سامنے دیکھ کر تم مجھے بھولنا بھی چاہو تو نہیں بھول سکتے۔

مجھے اپنی اس خوش نصیبی پر حیرت ہی نہیں خواب کا گمان ہونے لگا۔ جس حسینہ کی ایک نظر پر میں اپنے کو قربان کر دیتا وہ یوں مجھ سے اظہارِ محبت کرے۔ میرا تو جی چاہتا تھا کہ اسی بات پر اس کے قدموں کو پکڑ کر سینے سے لگا لوں اور آنسوؤں سے تر کر دوں۔

ہوٹل میں پہنچے۔ میرا کمرہ الگ تھا۔ کھانا ہم نے ساتھ کھایا۔ اور تھوڑی دیر تک وہیں ہری ہری گھاس پر ٹہلتے رہے۔ کھلاڑیوں کا کیسے انتخاب کیا جائے یہی مرحلہ تھا۔ میرا جی تو یہی چاہتا تھا۔ کہ ساری رات اس کے ساتھ ٹہلتا رہوں لیکن اس نے کہا آپ اب آرام کریں۔ صبح بہت کام کرنا ہے۔ میں اپنے کمرے میں جا کر لیٹ رہا۔ مگر ساری رات نیند نہیں آئی۔ ہیلن کا باطن ابھی تک میری نظر سے چھپا ہوا ہے۔ ہر لمحہ وہ میرے لئے معمہ ہوتی جا رہی ہے۔

۱۲؍ جنوری۔ آج دن بھر لکھنؤ کے کرکٹروں کا مجمع رہا۔ ہیلن شمع تھی اور پروانے اُس کے گرد منڈلا رہے تھے۔ یہاں سے میرے علاوہ دو صاحبوں کا کھیل ہیلن کو بہت پسند آیا۔ برجندر اور صادق۔ ہیلن انہیں آل انڈیا ٹیم میں رکھنا چاہتی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں اس فن کے اُستاد ہیں۔ لیکن انہوں نے جسطرح آغاز کیا ہے اس سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ کرکٹ کھیلنے نہیں اپنی قسمت کی بازی کھیلنے آئے ہیں۔ ہیلن کس مزاج کی عورت ہے۔ یہ سمجھنا دشوار ہے۔ برجندر مجھ سے زیادہ قبول صورت ہے۔ یہ مجھے تسلیم ہے۔ وضع قطع سے پورا صاحب ہے۔ لیکن پکا شہدا۔ لوفر۔ میں نہیں چاہتا کہ ہیلن اس سے کسی قسم کا تعلق رکھے۔ آداب تو اسے چھو نہیں گیا۔ بدزبان پرلے سرے کا۔ بیہودہ فحش مذاق۔ گفتگو کا سلیقہ نہیں۔ محل وقوع کی تمیز نہیں۔ بعض اوقات ہیلن سے ایسے پُرمعنی کنائے کر جاتا ہے۔ کہ میں شرم سے سر جھکا لیتا ہوں۔ لیکن ہیلن کو شاید اس کا بازاری پن۔ اس کا ابتذال محسوس نہیں ہوتا۔ نہیں وہ شاید اس کے فحش کنایوں کا مزہ لیتی ہے۔ میں نے اُسے کبھی چیں بجبیں نہیں دیکھا۔ یہ میں نہیں کہتا کہ شگفتہ طبعی کوئی بری چیز ہے نہ زندہ دلی کا میں دشمن ہوں۔ لیکن ایک لیڈی کے ساتھ تو ادب قاعدے کا لحاظ رکھنا ہی چاہئے۔

صادق ایک معزز خاندان کا چراغ ہے۔ بہت ہی ثقہ بلکہ سرد مزاج۔ نہایت مغرور۔ بظاہر ترش رو لیکن اب وہ بھی شہدوں میں داخل ہو گیا ہے۔ کل آپ ہیلن کو اپنے اشعار سناتے رہے۔ اور وہ خوش ہوتی رہی۔ مجھے تو ان اشعار میں کوئی مزہ نہ آیا۔ اس کے پہلے میں نے ان حضرت کو کبھی شاعری کرتے نہیں دیکھا۔ یہ کیفیت کہاں سے پھٹ پڑی ہے؟ حسن میں اعجاز کی قوت ہے۔ اور کیا کہوں۔ اتنا بھی نہ سوجھا کہ اسے اشعار ہی سنانا ہے تو حسرت یا جگر یا جوش کے کلام سے دو چار شعر یاد کر لیتا۔ ہیلن سب کا کلام پڑھے تھوڑا ہی بیٹھی ہے۔ آپ کو شعر گفتن

چھڑ دور۔ مگر یہی بات اُن سے کہدوں تو بگڑ جائیں گے۔ سمجھیں گے مجھے رشک آرہا ہے۔ مجھے کیوں رشک آنے لگا۔ ہیلن کے پرستاروں میں ایک میں بھی ہوں۔ ہاں اتنا ضرور چاہتا ہوں کہ وہ اچھے بُرے کی تمیز کر سکے۔ ہر شخص سے بے تکلفی مجھے پسند نہیں۔ مگر ہیلن کی نظروں میں سب برابر ہیں۔ وہ باری باری سے سب سے محترز رہے۔ اور سب سے ملتفت۔ کس کی جانب زیادہ مائل ہے یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے۔ صادق کی دولت و ثروت سے وہ مطلق متاثر نہیں معلوم ہوتی۔ کل شام کو ہم لوگ سنیما دیکھنے گئے تھے۔ صادق نے آج غیر معمولی فیاضی دکھائی۔ جیب سے روپئے نکال کر سب کے لئے ٹکٹ لینے چلے۔ میاں صادق جو اِس قول کے باوجود بھی تنگدل واقع ہوئے ہیں۔ میں تو خسیس کہوں گا۔ ہیلن نے انکی فیاضی کو بیدار کر دیا ہے۔ مگر ہیلن نے اُنکو روک لیا۔ اور خود اندر جا کر سب کے لئے ٹکٹ لائی۔ اور یوں بھی وہ اتنے بے دردی سے روپئے خرچ کرتی ہے۔ کہ میاں صادق کے چھکے چھوٹ جاتے ہیں۔ جب ان کا ہاتھ جیب میں جاتا ہے۔ ہیلن کے روپیے کا ذکر بیچ جا پہونچتے ہیں۔ کچھ بھی ہوئیں تو ہیلن کی مزاج شناسی پر فدا ہوں ایسا معلوم ہوتا ہے۔ وہ ہماری فرمائشوں کی منتظر رہتی ہے اور اُن کی تعمیل میں اُسے خاص لطف آتا ہے۔ صادق صاحب کو اُس نے اپنا البم نذر کر دیا۔ جو یورپ کی نایاب تصاویر کی نقلوں کا مجموعہ ہے۔ اور جو اس نے یورپ کے سارے نگارخانوں میں جا کر خود مرتب کیا ہے۔ اس کی نظریں کتنی حُسن پسند ہیں۔ برجندر جب شام کو اپنا نیا سوٹ پہن کر آیا جو اُس نے ابھی سلا یا ہے تو ہیلن نے مسکرا کر کہا۔ چشم بد دور۔ آج تو تم یوسفِ ثانی بنے ہوئے ہو۔ برجندر باغ باغ ہو گیا۔ مَیں نے جب ذرا لحن کے ساتھ اپنی تازہ غزل سنائی تو وہ ایک ایک شعر پر اُچھل اُچھل پڑی۔ بلا کی سخن فہم ہے۔ مجھے اپنے ذوقِ سخن پر اتنی مسرت کبھی نہ ہوئی تھی۔ مگر تحسین جب صلائے عام ہو جاتی ہے تو اُس کی کیا وقعت۔ میاں صادق کو کبھی اپنی وجاہت کا دعویٰ نہیں ہوا۔ معنوی حسن سے آپ جتنے ہی بہرہ ور ہیں۔ حسنِ ظاہر سے اتنے ہی بے فیض۔ مگر آج ساغر کے دَور میں جونہی اُن کی آنکھوں میں سرخی آئی۔ ہیلن نے والہانہ انداز سے کہا یعنی تمہاری یہ آنکھیں تو جگر کے پار ہوئی جاتی ہیں۔ اور صادق صاحب اس وقت اُس کے قدموں پر جبہہ سائی کرتے کرتے رُک گئے۔ شرم مانع ہوئی۔ ان کی آنکھوں کی اتنی قدر افزائی شاید ہی کسی نے کی ہو۔ مجھے کبھی اپنی وضع قطع کی تعریف سُننے کی تمنا نہیں ہوئی میں جو کچھ ہوں جانتا ہوں۔ مجھے یہ مغالطہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ میں خوشرو ہوں۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ ہیلن کی یہ نوازشیں کوئی معنی نہیں رکھتیں۔ لیکن اب مجھے بھی یہ اضطراب ہونے لگا کہ دیکھوں مجھ پر کیا عنایت ہوتی ہے۔ کوئی بات نہ تھی مگر میں بے چین رہا۔ جب میں شام کو یونیورسٹی گراؤنڈ سے مشق کر کے آرہا تھا تو میرے پریشان بال کچھ اور زیادہ پریشان ہو گئے تھے۔ اُس نے گرویدہ نظروں سے دیکھ کر فوراً کہا۔ "تمہاری اس زلفِ پریشان پر نثار ہو جانے کو جی چاہتا ہے"۔ میں نہال ہو گیا۔ دل میں کیا کیا طوفان اُٹھے کہہ نہیں سکتا۔

مگر خدا جانے کیوں ہم تینوں میں سے ایک بھی اس کی کسی ادا یا انداز یا حسن کی الفاظ میں داد نہیں دیتے۔ ہمیں احساس ہوتا ہے کہ ہمیں موزوں الفاظ نہیں ملتے۔ جو کچھ ہم کہہ سکتے ہیں اس سے کہیں زیادہ متاثر ہیں۔ کچھ کہنے کی ہمت ہی نہیں ہوتی۔

یکم فروری۔ ہم دہلی آ گئے۔ اس اثنا میں مراد آباد۔ نینی تال ڈیرہ دون وغیرہ مقامات کے دَورے کئے۔ مگر کہیں کوئی کھلاڑی نہ ملا۔ علی گڈھ اور دہلی سے کئی اچھے کھلاڑیوں کے ملنے کی اُمید ہے اِس لئے ہمارا قیام یہاں کئی دن رہے گا۔ الیون پوری ہوتے ہی سب لوگ بمبئی آ جائیں گے اور وہاں ایک مہینہ مشق کریں گے۔ مارچ میں آسٹریلین ٹیم یہاں سے رخصت ہو گی۔ تب تک وہ ہندوستان میں سارے موعودہ میچ کھیل چکی ہو گی۔ ہم اس سے آخری میچ کھیلیں گے اور خدا نے چاہا تو ہندوستان کی ساری شکستوں کی تلافی کر دیں گے۔ صادق اور برجندر بھی ہمارے ساتھ گھومتے رہے

میں تو نہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ آئیں۔ مگر ہیلن کو شاید عشاق کے مجمع میں لطف آتا ہے۔ ہم سب کے سب ایک ہی ہوٹل میں مقیم ہیں اور سب ہیلن کے مہمان ہیں۔ اسٹیشن پر پہونچے تو صدہا آدمی ہمارا استقبال کرنے کے لئے موجود تھے۔ کئی عورتیں بھی تھیں لیکن ہیلن کو نہ معلوم کیوں عورتوں سے احتراز ہے۔ اُن کی صحبت سے بھاگتی ہے۔ خاصکر حسین عورتوں کے سائے سے بھی گریز کرتی ہے حالانکہ اُسے کسی حسینہ سے بدظن ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ یہ مانتے ہوئے بھی کہ حسن اُس پر ختم نہیں ہوگیا ہے۔ اُس میں جاذبیت کے ایسے عناصر موجود ہیں کہ کوئی حور بھی اس کے مقابلہ میں نہیں کھڑی ہوسکتی۔ نک سک ہی تو سب کچھ نہیں ہے۔ حُسنِ مذاق۔ حُسنِ گفتار۔ حُسنِ ادا بھی تو کوئی چیز ہے۔ محبت اس کے دل میں ہے یا نہیں خدا جانے۔ لیکن محبت کے اظہار میں اُسے ید طولےٰ ہے۔ دلجوئی اور ناز برداری کے فن میں ہم جیسے دلدادوں کو بھی اس سے شرمندہ ہونا پڑتا ہے۔ شام کو ہم لوگ نئی دہلی کی سیر کو گئے۔ پرفضا مقام ہے۔ کشادہ سڑکیں۔ خوبصورت مربعے دلفریب روشیں۔ اس کی تعمیر میں سرکار نے بے دریغ روپیہ صرف کیا ہے۔ اور بے ضرورت یہ رقم رعایا کی فلاحی تجاویز میں صرف کی جاسکتی تھی۔ مگر اس کو کیا کیجئے کہ عوام اس کی تعمیر سے جتنے متاثر ہیں اتنی کسی فلاحی تجویز سے نہ ہوتے۔ آپ دس پانچ مدرسے زیادہ کھول دیتے یا سڑکوں کی مرمت میں یا زراعتی تحقیقاتوں میں اس روپیہ کو صرف کردیتے۔ مگر عوام کو تزک و احتشام اور شان و شکوہ سے آج بھی جتنی رغبت ہے اتنی آپکے تعمیری کاموں سے نہیں ہے۔ فرمانروا کا جو تخیل اس کے وجود کے ذرے ذرے میں سرایت کرگیا ہے۔ وہ ابھی صدیوں تک نہ مٹے گا۔ فرمانروا کے لئے شان و شکوہ ضروری ہے بے دریغ روپیہ خرچ کرنا ضروری ہے۔ کفایت شعار۔ یا بخیل فرمانروا چاہے وہ ایک ایک پیسہ رعایا کے فلاح کے لئے خرچ کرے اتنا مقبول اور ہر دلعزیز نہیں ہوسکتا۔ انگریز نفسیات کے ماہر ہیں۔ انگریز ہی کیوں۔ ہر ایک فرمانروا جس نے اپنے زورِ بازو اور قوتِ فکر سے یہ درجہ حاصل کیا ہے۔ فطرتاً نفسیات کا ماہر ہوتا ہے۔ اس کے بغیر عوام پر اُسے اقتدار کیونکر حاصل ہوتا۔ خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا۔ مجھے ایسا اندیشہ ہورہا ہے کہ شاید ہماری ٹیم خوار ہی بن جائے۔ ابھی سے ہم لوگوں میں جشمک رہنے لگی ہے۔ برجندر قدم قدم پر میری مخالفت کرتا ہے۔ میں آم کہوں تو وہ یقیناً املی کہے گا۔ اور ہیلن اس کی جانب ملتفت ہے۔ زندگی کے کیسے کیسے میٹھے خواب دیکھنے لگا تھا۔ مگر برجندر احسان فراموش۔ خودغرض برجندر میری زندگی تباہ کئے ڈالتا ہے۔ ہم دونوں ہیلن کے منظورِ نظر نہیں رہ سکتے۔ یہ طے شدہ بات ہے۔ ایک کو میدان سے ہٹنا پڑے گا۔

۷ر فروری۔ شکر ہے دہلی میں ہماری کوشش بارآور ہوئی ہماری ٹیم میں تین نئے کھلاڑیوں کا اضافہ ہوا۔ جعفر۔ مہرا اور ارجن سنگھ۔ آج ان کے کمال دیکھ کر آسٹریلین کرکٹروں کی دھاک میرے دل سے جاتی رہی۔ تینوں گیند پھینکتے ہیں۔ جعفر قادر انداز ہے۔ مہرا صبر آزما۔ اور ارجن شاطر۔ تینوں مستقل مزاج۔ نگاہ کے سچے اور انتھک۔ اگر کوئی انصاف سے پوچھے تو میں کہونگا کہ ارجن مجھ سے بہتر کھیلتا ہے۔ وہ دو بار انگلینڈ ہو آیا ہے۔ انگریزی معاشرت سے واقف ہے۔ اور مزاج شناس بھی اول درجہ کا تہذیب اور اخلاق کا پتلا۔ برجندر کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اب ارجن پر خاص نظرِ عنایت ہے۔ اور ارجن پر فتح پانا میرے لئے آسان نہیں ہے۔ مجھے تو خوف ہے کہیں وہ میرا رقیب نہ بنجائے

۲۵ر فروری۔ ہماری ٹیم پوری ہوگئی۔ دو ملیبر ہمیں علیگڈھ سے ملے۔ تین لاہور سے اور ایک اجمیر سے اور کل ہم بمبئی آگئے۔ ہم نے اجمیر لاہور اور دہلی میں وہاں کی ٹیموں سے میچ کھیلے اور ان پر بڑی شاندار فتح پائی۔ آج بمبئی کی ہندو ٹیم سے ہمارا مقابلہ ہے۔

اور مجھے یقین ہے کہ میدان ہمارے ہاتھ رہے گا۔ ارجن ہماری ٹیم کا
سب سے اچھا کھلاڑی ہے۔ اور ہیلن اس کی اتنی خاطرداری
کرتی ہے کہ مجھے رشک نہیں آتا۔ اتنی خاطرداری تو مہمان کی ہی کی جا سکتی
ہے۔ مہمان سے کیا خوف۔ لطف یہ ہے کہ ہر ایک شخص اپنے کو
ہیلن کا منظورِ نظر سمجھتا ہے اور اس سے ناز برداریاں کرواتا ہے
اگر کسی کے سر میں درد ہے تو ہیلن کا فرض ہے کہ اُس کی مزاج پُرسی
کرے۔ اُس کے سر میں صندل تک گھس کر لگائے۔ مگر اس کے ساتھ
ہی اُس کا رعب ہر ایک کے دل پر اتنا چھایا ہوا ہے کہ کوئی اُس کے
کسی فعل کی تنقید کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ سب کے سب
اُس کی مرضی کے غلام ہیں۔ وہ اگر سب کی ناز برداری کرتی ہے تو
حکومت بھی ہر ایک پر کرتی ہے۔ شامیانہ میں ایک سے ایک
حسین عورتوں کا جمگھٹ ہوتا ہے۔ مگر ہیلن کے قیدیوں کی مجال نہیں
کہ کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا بھی سکیں۔ ہر ایک کے دل پر ایسا خوف
طاری رہتا ہے۔ گویا وہ ہر جگہ حاضر و ناظر ہے۔ ارجن نے ایک مس پر
یونہی کچھ نظر ڈالی تھی۔ ہیلن نے ایسی قہر کی آنکھ سے اُسے دیکھا
کہ سردار صاحب کا رنگ اُڑ گیا۔ ہر ایک سمجھتا ہے کہ وہ اس کی تقدیر کی
مالک ہے۔ اور اُسے اپنی جانب سے بدظن کر کے وہ شاید زندہ نہ
رہ سکے گا۔ اوروں کی تو میں کیا کہوں۔ میں نے بھی گویا اپنے کو
اس کے ہاتھوں فروخت کر دیا ہے۔ مجھے تو اب یہ احساس ہوتا ہے
کہ مجھ میں کوئی ایسی چیز فنا ہو گئی ہے جو پہلے میرے دل میں حسد کی
آگ سی جلا دیا کرتی تھی۔ ہیلن اب کسی سے بولے۔ کسی سے راز و
نیاز کی باتیں کرے۔ مجھے اشتعال نہیں آتا۔ دل پر چوٹ لگتی
ضرور ہے۔ مگر اس کا اظہار تخلیہ میں آنسو بہا کر کرنے کو جی چاہتا ہے
خودداری کہاں غائب ہو گئی۔ نہیں کہہ سکتا۔ ابھی اس کی
خفگی سے دل کے ٹکڑے ہو گئے تھے کہ یکایک اُس کی ایک نگاہ غلط
انداز نے یا ایک تبسم نے گدگدی پیدا کر دی۔ معلوم نہیں اس میں
وہ کون سی طاقت ہے جو اتنے حوصلہ مند۔ نوجوان دلوں پر حکومت
کر رہی ہے۔ اسے جسارت کہوں۔ مہارت کہوں۔ یا کیا کہوں۔ ہم
سب جیسے اُس کے ہاتھوں کی کٹھ پتلیاں ہیں۔ ہم میں اپنی کوئی
شخصیت۔ کوئی انفرادیت۔ کوئی ہستی نہیں ہے۔ اُس نے اپنے
حسن سے اپنی فراست سے۔ اپنی دولت سے اور سب سے زیادہ
اپنی ہمہ گیری سے ہمارے دلوں پر تسلط قائم کر لیا ہے +

یکم مارچ۔ کل آسٹریلین ٹیم سے ہمارا میچ ختم ہو گیا۔ پچاس
ہزار سے کم تماشائیوں کا ہجوم نہ تھا۔ ہم نے پورے اننگس سے شکست
دی اور دیوتاؤں کی طرح پُجے۔ ہم میں سے ہر ایک نے دل و جان سے
کام کیا اور سبھی یکساں طور پر پھولے ہوئے تھے۔ میچ ختم ہوتے ہی اہلِ
شہر کی جانب سے ہمیں ایک شاندار پارٹی دی گئی۔ ایسی پارٹی
تو شاید وائسرائے کے اعزاز میں نہ دی جاتی ہوگی۔ میں تو تعریفوں
اور مبارکبادوں کے بوجھ سے دب گیا۔ میں نے چوالیس رنوں میں
پانچ کھلاڑیوں کا صفایا کر دیا تھا۔ مجھے خود اپنی ہلاکت آفرینی پر
حیرت ہو رہی تھی۔ ضرور کوئی غیبی طاقت ہماری پشت پر تھی
اس مجمع میں ہیلن کا حسن اپنی پوری شان اور رنگینی کے ساتھ جلوہ
افروز تھا۔ اور مجھے دعوے ہے کہ حسن کے اعتبار سے یہ شہر جتنا خوش
نصیب واقع ہوا ہے۔ دنیا کا کوئی دوسرا شہر شاید ہی ہو مگر ہیلن اس
مجمع میں بھی مرکزِ نگاہ بنی ہوئی تھی۔ ہیلن بظاہر محض حسین نہیں ہے۔
شیریں بیان بھی ہے۔ شیریں ادا بھی۔ سارے نوجوان پروانوں کی
طرح اُس پر منڈلا رہے تھے۔ ایک سے ایک قبول صورت۔ منچلے۔
اور ہیلن ان کے جذبات سے کھیل رہی تھی۔ اُسی طرح جیسے وہ ہم
لوگوں کے جذبات سے کھیلا کرتی تھی۔ مہاراجکمار جیسا شکیل جوان
میں نے آج تک نہیں دیکھا۔ صورت سے رعب ٹپکتا ہے۔ اُن کے
عشق نے کتنے حسینوں کو دلفگار کیا ہے۔ کون جانے مردانہ دلکشی کا
جادو سا بکھیرتا چلتا ہے۔ ہیلن اُن سے بھی اُسی آزادانہ بے تکلفی سے
ملی جیسے دوسرے ہزاروں نوجوانوں سے۔ اُن کے حسن کا۔ اُن کی
دولت کا۔ اس پر مطلق کوئی اثر نہ تھا۔ نہ جانے اتنا غرور۔ اتنی خودداری
اس میں کہاں سے آ گئی ہے۔ کبھی نہیں ڈگمگاتی کبھی مرعوب نہیں ہوتی

بھی مائل نہیں ہوتی۔ وہی بذلہ سنجی ہے۔ وہی اظہارِ محبت۔ کسی کے ساتھ خصوصیت نہیں۔ دلجوئی سب کی مگر اسی استغنا کی شان کے ساتھ۔

ہم لوگ سیر کرکے کوئی دس بجے رات کو ہوٹل پہونچے تو سبھی زندگی کے نئے خواب دیکھ رہے تھے۔ سبھی کے دلوں میں ایک دھکدھکی سی ہو رہی تھی کہ دیکھیں اب کیا ہوتا ہے۔ اُمید و بیم نے سبھی کے دلوں میں طوفان برپا کر رکھا تھا۔ گویا آج ہر ایک کی زندگی کا ایک یادگار واقعہ ہونے والا ہے۔ اب کیا پروگرام ہے۔ اس کی کسی کو خبر نہ تھی۔ ہر ایک نے اپنے دل میں سودائے خام پکار رکھا تھا۔ ہر ایک کو یقین تھا کہ ہیلن کی خصوصی نگاہ اس پر ہے۔ مگر یہ اندیشہ بھی ہر ایک کے دل میں تھا کہ خدانخواستہ کہیں ہیلن نے بیوفائی کی تو یہ جان اس کے قدموں پر رکھدے گا۔ یہاں سے زندہ گھر جانا قیامت تھا۔

اُسی وقت ہیلن نے مجھے اپنے کمرہ میں بلا بھیجا۔ جاکر دیکھتا ہوں تو سبھی کھلاڑی جمع ہیں۔ ہیلن اس وقت اپنی شربتی بیلدار ساڑی میں آنکھوں میں چکاچوند پیدا کر رہی تھی۔ مجھے اس پر جھنجلاہٹ ہوئی۔ اس مجمع عام میں مجھے بلاکر قواعد کرانے کی کیا ضرورت تھی۔ میں تو خاص برتاؤ کا مستحق تھا۔ میں بھول رہا تھا کہ شاید اسی طرح ان میں سے ہر ایک اپنے کو خاص برتاؤ کا مستحق سمجھتا ہو۔

ہیلن نے کرسی پر بیٹھے ہوئے کہا۔ "دوستو میں کہہ نہیں سکتی کہ میں آپ لوگوں کی کتنی مشکور ہوں۔ اور آپ نے میری زندگی کی کتنی بڑی آرزو پوری کر دی۔ آپ میں سے کسی کو مسٹر رتن لال کی یاد آتی ہے؟

رتن لال! اُسے بھی کوئی بھول سکتا ہے۔ وہ جس نے پہلی بار ہندوستان کی کرکیٹ ٹیم کو انگلینڈ کی سرزمین پر اپنے کارہائے نمایاں دکھانے کا موقع عطا کیا۔ جس نے اپنے لاکھوں روپئے اس مہم کی نذر کئے۔ اور آخر متواتر شکستوں سے مایوس ہوکر وہیں انگلینڈ میں خودکشی کرلی۔ اس کی وہ صورت اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے پھر رہی ہے"۔

سب نے کہا۔ "خوب اچھی طرح۔ ابھی بات ہی کے دن کی ہے"

آج اس شاندار کامیابی پر میں آپ کو مبارکباد دیتی ہوں انشاءاللہ آئندہ سال ہم انگلینڈ کا دورہ کریں گے۔ آپ لوگ ابھی سے اس مہم کے لئے تیاریاں کیجئے۔ لطف تو جب ہے کہ ہم وہاں ایک میچ بھی نہ ہاریں۔ متواتر ہمارے ہاتھ میدان رہے۔ دوستو! یہی میری زندگی کا مقصد ہے۔ کسی مقصد کی تکمیل کا عمل ہی زندگی ہے ہمیں کامیابی وہیں ہوتی ہے۔ جہاں ہم اپنے پورے حوصلے سے سرگرمِ عمل ہوں۔ وہی مقصد ہمارا خواب ہو۔ ہمارا عشق ہو۔ ہمارا مرکزِ حیات ہو۔ ہم میں اور اس مقصد کے بیچ میں اور کوئی خواہش کوئی آرزو حائل نہ ہو۔ معاف کیجئے گا۔ آپ نے اپنے مقصد کیلئے جینا نہیں سیکھا۔ آپ کے لئے کرکیٹ محض ایک مشغلۂ تفریح ہے۔ آپ کو اس سے عشق نہیں۔ اسی طرح ہمارے صدہا دوست ہیں۔ جن کا دل کہیں اور ہوتا ہے۔ دماغ کہیں اور۔ اور وہ ساری زندگی ناکام رہتے ہیں۔ آپ کے لئے میں زیادہ دلچسپی کی چیز تھی کرکیٹ تو محض مجھے خوش کرنے کا ذریعہ تھا۔ پھر بھی آپ کامیاب ہوئے۔ ملک میں آپ جیسے ہزارہا نوجوان ہیں جو اگر کسی مقصد کی تکمیل کے لئے جینا اور مرنا سیکھ جائیں تو معجزے کر دکھائیں۔

جائیے اور وہ کمال حاصل کیجئے۔ میرا حسن اور میری باتیں بازیچۂ نفس بننے کے لئے نہیں ہیں۔ نوجوانوں کی آنکھوں کو خوش کرنے اور ان کے دلوں میں سرور پیدا کرنے کے لئے جینا میں شرمناک سمجھتی ہوں۔ حیات کا مقصد اس سے کہیں اونچا ہے۔ سچی زندگی وہی ہے۔ جہاں ہم اپنے لئے نہیں سب کے لئے جیتے ہیں"۔

ہم سب سر جھکائے سنتے رہے۔ اور جھنجلاتے رہے۔ اور ہیلن کمرہ سے نکل کر کار پر جا بیٹھی۔ اُس نے اپنی روانگی کا انتظام پہلے ہی کرلیا تھا۔ قبل اس کے کہ ہمارے ہوش و حواس صحیح ہوں اور ہم صورتِ حال سمجھیں وہ رخصت ہو چکی تھی۔

ہم سب ہفتے بھر تک بمبئی کی گلیوں۔ ہوٹلوں بنگلوں کی خاک چھانتے رہے ہیلن کہیں نہ تھی۔ اور زیادہ افسوس یہ ہے کہ اُس نے ہماری زندگی کا جو آئیڈیل رکھا وہ ہماری پہونچ سے اونچا ہے ہیلن کے ساتھ ہماری

رازِ حُسن

از:-

(جناب چودھری غلام جیلانی - عاصی - بی اے)

کس قدر جوشِ بہارِ دہر عبرت خیز ہے
خندۂ گل کی صدا پیغامِ غم انگیز ہے

حق نما زرّیں صحیفہ ہے ہر اک گلبرگِ تر
ہیں امانت دار فطرت ذرہ ہائے رہگذر

جانفزا ہیں نغمہ ہائے صُلصُل و دُرّاج و سار
شورشِ طاؤس و صوتِ کبک و گلبانگِ ہزار

دولتِ اسرار ہے شیرازۂ اوراقِ گُل
مخزنِ الہام ہے دیباچۂ اسباقِ گُل

نغمہ تقدیس سے بادِ صبا معمور ہے
پتے پتے میں ربابِ سرمدی مستور ہے

ضَو فگن اس فکرِ رنگیں سے تھی قندیلِ دماغ
محفلِ تفہیم میں جلتا تھا دھندلا سا چراغ

اکتسابِ کیف کے جذبے نے اکسایا مجھے
رنگ و بُو کی محفلِ عشرت میں لے آیا مجھے

مکتبِ رنگیں سے درسِ حسن دل پانے لگا
ہر رگ و پے میں مئے اسرار چھلکانے لگا

حُسن کے ہر چند لاینحل ہیں اسرار و رموز
جذبۂ صادق نے پیدا کر دیا شوقِ شہود

جگمگا اٹھی طلوعِ صبح سے بزمِ خیال
مہر کی پہلی کرن تھی مظہرِ شانِ جلال

ہر گلِ تر بن گیا آئینۂ صدق و صفا
اشکِ شبنم دے رہے تھے درسِ احساسِ فنا

جذبۂ رقت ہویدا کر رہا تھا آبشار
سرو پیدا کر رہے تھے قلب میں شانِ وقار

نرم و نازک جھومتی شاخوں کو وجد آنے لگا
پرچمِ رنگیں گل ہر سمت لہرانے لگا

بن رہا تھا گوشہ گوشہ باغ کا جنت نشاں
لے رہا تھا ہر طرف حسنِ ازل انگڑائیاں

فرحت افزا تھی تبسم پاش پھولوں کی مہک
حُسن کی غماز تھی معصوم غنچوں کی چٹک

راز پھر بھی عظمتِ حسنِ ازل کا راز تھا
عالمِ ادراک گویا فرش پا انداز تھا

(ایک انگریزی شاہکار)

حسین ساحرہ

(جان کیٹس کی مشہور آفاق نظم کا ترجمہ)

(از خامہ۔ صدیقہ بیگم سیوہاروی)

بیلڈ (——) جیسا کہ ہماری اردو زبان میں نظموں کی بہت سی قسمیں ہوتی ہیں۔ اسی طرح انگریزی زبان میں بھی نظموں کی بہت سی قسمیں ہیں۔ بیلڈ —— نظم کی ایک خاص قسم ہے جس میں شاعر زندگی کے کسی خاص پہلو کو ایک مختصر افسانہ کی صورت میں پیش کرتا ہے۔ (صدیقہ بیگم)

کون ہے ؟ .... اے تختۂ زمین پر بسنے والے ..... بہادر سپاہی .... آخر اس سنسان پہاڑی پر اس ساکت اور مغموم جھیل کے کنارہ .... تو کس کو تلاش کر رہا ہے .... دیکھ! جھیل میں کنول کے وہ خوبصورت پھول جو کچھ دن قبل اپنی سحر آفرینی سے دلکو تسخیر کر رہے تھے .... ہاں وہ حسین پھول اب دنیا کی بے ثباتی سے متاثر ہو کر سرنگوں ہو گئے ہیں ..... چمن کے خوش رنگ پرند اپنے سحر آفریں نغمہ سنا کر خاموش ہو گئے ہیں ..... ساری فضا پر ایک مہیب خاموشی چھا گئی ہے ..... خوبصورت گلہری نے اپنے آشیانے کو دانوں سے بھر لیا ہے .... وہ اب باہر نکلنا نہیں چاہتی ..... کیوں ؟ اس لئے کہ خزاں کا دور شروع ہو چکا ہے ...... سرسبز پہاڑی نے اپنا خلعت سبز اتار کر .... ماتمی لباس زیب تن کر لیا ہے ..... پھولوں سے لدی ہوئی حسین ڈالیاں باد سموم کے گرم تھپیڑوں سے بے چین ہو کر جھیل کے ساحل پر لوٹ رہی ہیں .... ایسے سنسان وقت میں .... اے کرۂ زمین کے درخشندہ ستارہ تو یہاں کیوں سرگرداں ہے ...... تیری کشادہ پیشانی پر پسینہ کے قطرے گہر آبدار کی طرح چمک رہے ہیں ...... تیرے گلابی رخسار اس نازک پھول کے مانند نظر آ رہے ہیں جو ابھی شہسوار مشرق کے تیروں کی بارش سے پژمردہ ہو گیا ہو ؟

(۲)

ہائیں .... یہ آواز کس کی ہے . ... کون میری زندگی کے گذشتہ واقعات یاد دلا کر میرے خرمن دل پر بجلیاں گرا رہا ہے .... ہاں ! میں کون ہوں ؟ "تصویر حسن" کا متلاشی ...... وہ مجھے یہاں مرغزاروں میں ملی .... آہ کتنی حسین تھی .. .. کتنی خوبصورت اس کے لانبے لانبے سیاہ دراز گیسو .... گلابی رخسار ... . نرگسی آنکھیں .... اُف .... جنکے ایک ہی جلوہ سے میری آنکھوں میں بجلیاں کوند گئیں .... میں نے چنبیلی کی پنکھڑیوں کو محبت کے سنہرے تاروں میں گوندھ کر اس کی نقرئی گردن میں آویزاں کر دیا ... . اس نے مجھے بغور دیکھا .... اس کی آنکھوں کا پیمانہ شراب محبت سے لبریز تھا ... میں بے اختیار ہو گیا .... میری نظروں میں ہر چیز حسن و عشق کا مجسمہ تھی .... میں اسکو اپنے تیز گھوڑے پر بٹھا کر ایک طرف کو روانہ ہو گیا ...... آہ .... کس قدر سرور آفریں تھے وہ لمحے جبکہ وہ پیچھے مڑ مڑ کر اپنی

غزالی آنکھوں سے بہ ... ... سلیاں گرا رہی تھی ....
.... اس کی زبان وہ دلکش نغمے سنا رہی تھی جس سے میرے
جذبات محبت کے عمیق سمندر میں ملاطم برپا تھا .....

تمام دن کی مسافت طے کر لے ... میں اس ... میں پہنچ گیا
جہاں کا ذرہ ذرہ خوش ... کی صدا ... کر رہا تھا ......

باد صبا اپنے لطافت ... جھونکوں سے دنیا کو مسرور کر رہی
تھی ... کلیاں مسکرا رہی تھیں اور جب ضبط نہ ہوتا تو اپنے
انسیا ر کھل کھلا کر ہنس پڑتیں ... لیکن ... اس
پری پیکر کی نشیلی آنکھیں ... مانند ایک چھوٹی کشتی کے
...... آنسوؤں کے عمیق سمندر ... رہی تھیں .....

دفعتاً اس کے نازک لبوں نے جنبش کی جس سے یہ پُرسرور نعرہ فضا
میں بلند ہوا ... "میں تم سے محبت کرتی ہوں" ......
میں نے اس کے نازک لبوں پر مہر محبت ثبت کر دی ....
بعد اس کے ... زندگی کے خوشگوار جھونکوں سے
لطف اندوز ہونے کے لئے ... آنکھیں بند کر لیں ......
میری آنکھ لگ گئی ... آہ ... میں ایک
خواب دیکھ رہا تھا ... کتنا بھیانک ...

کتنا ڈراؤنا .... جس نے دم کے دم میں میرا شیرازۂ محبت
بکھیر دیا ......

کیا دیکھتا ہوں .... بادشاہ ...... ملکہ
.. شہزادیاں میرے سامنے کھڑی ہیں ..... ان کے
چہرے پژمردہ پھول کی مانند زرد ہیں ..... سب پیاس کی
شدت سے خشک ہو گئے ہیں ...... وہ چلّا ... چلّا کر
کہہ رہے ہیں .....

"اے ہتھیار بند بہادر سپاہی اٹھ اور اس "ساحرہ" سے اپنا
دامن چھڑا ......"

میں گھبرا کر اٹھ بیٹھا .... میرا دل زور
زور سے دھڑک رہا تھا .... میرا تمام جسم بید
لرزاں کی طرح کانپ رہا تھا ...... اب میں بجائے اس
حسین آغوش کے اس سنسان جھیل کے کنارے پڑا تھا .....

آہ ...... اس لئے میں اس ویران پہاڑی پر
سرگرداں ہوں ..... جبکہ خوبصورت چڑیاں اپنے سحر
آفریں نغمے سنا کر خاموش ہو چکی ہیں ..... پھول مرجھا چکے
ہیں اور گلہری نے اپنے آشیانے کو دانوں سے بھر لیا ہے ......

پھر رقص میں لا پیمانے کو

(از جناب عبدالشکور شاکر سیمابی متعلم اسلامیہ کالج پشاور)

کیا جانئے طوق و سلاسل نے بتلا دیا کیا دیوانے کو
تا چاکِ گریباں ہاتھ بڑھے اور پاؤں اٹھے ویرانے کو

سن لینا زبانِ شمع سے ہنگام سحر وہ افسانہ
کل جس کے بیاں کی محفل میں فرصت نہ ملی پروانے کو

گھر گھر کے گھٹائیں چھائی ہیں مستانہ بہاریں آئی ہیں
رندوں کی دعائیں لے ساقی پھر رقص میں لا پیمانے کو

اے زاہد ظاہر بیں کیا ... سنگ ... میخانے پہ اگر
آ بیٹھتے ہیں کچھ تشنہ دہن دو چار گھڑی سستانے کو

کس طرح وہ مجھ کو یاد کریں ناداں نہیں وہ جانتے ہیں
سو بار زبانِ شمع کٹی جب یاد کیا پروانے کو

آ ... ... اسے ... ... دل کا کیا ہوگا
گر مجھ کو پلانی ہے بھر دے پیمانے میں میخانے کو

پروانہ سرِ محفل جل کر ... ... کہہ نہ سکا
جل جل کے چراغِ محفل نے بتلا دیا ایک زمانے کو

پھر پاؤں کے چھالوں ... خارِ مغیلاں نے دعوت
پھر وحشتِ دل اکساتی ہے چل نکلیں کسی ویرانے کو

غزل

از :- جناب شاطر صاحب کلیمی

یاد ہیں اُن کی ستم آرائیاں — وہ مری مجبوریاں پسپائیاں

حُسن کی بڑھنے لگیں رعنائیاں — عشق کی ہونے لگیں رسوائیاں

لالہ و گُل میں کہاں رعنائیاں — ہیں یہ سب اُن کی کرم فرمائیاں

خواب سے جاگا ہے وہ مستِ شباب — آسماں لینے لگا انگڑائیاں

تہمتِ نظارۂ گل کون اٹھائے — مانعِ دیدار ہیں رُسوائیاں

عشق کی غارتگری کا کیا علاج — ہاں مجھے منظور ہیں پسپائیاں

حُسن کیوں دینے لگا دادِ وفا — بولتی بھی ہیں کہیں پرچھائیاں

لیچلے ہم داغہائے کارِ شوق — تو ہوا ور تیری چمن آرائیاں

عشق کے جذبات مُردہ ہو گئے — حُسن سے مفقود ہیں رعنائیاں

سوچ لے اے باغباں انجامِ گُل — خود رُلائیں گی چمن آرائیاں

یہ اُنھیں کی دَین ہے اے ضبطِ غم — ورنہ مجھ میں تھیں کہاں پہنائیاں

پھر وہی وہ ہیں، وہی اُنکا خیال — پھر وہی میں ہوں وہی تنہائیاں

کیا ہوئے شاطر وہ اربابِ وفا
کیا ہوئیں وہ انجمن آرائیاں

ایک عرب منجم کی کہانی اور ایک عجیب طلسم کا افسانہ!

ابراہیم ابن ابوایوب

عربی سے براہ راست صرف عالمگیر خاص نمبر کے لئے ترجمہ کیا گیا!

کہتے ہیں کہ ایک عرب بادشاہ کئی صدیوں قبل غرناطہ میں سلطنت کرتا تھا اس نے ہمیشہ اپنی جوانی میں اپنا وقت لڑائیوں میں گزارا تھا اور اب جو اس میں پیری کے آثار نمودار ہوئے تو ضعف پیری کے سبب سے آرام و آسائش کا طالب تھا اور اپنے ہمسایوں کے ساتھ صلح و آشتی کے ساتھ رہنا چاہتا تھا تاکہ اپنے فتوحات کے ثمرات سے فائدہ اٹھائے اور جو ملک اس نے دوسروں سے چھینے تھے ان سے لطف حاصل کرے اتفاقات زمانہ سے اس بوڑھے ہوشیار اور صلح پسند کے مقابل دوسرے نوجوان حریف بھی تھے جن سے اس کو کام پڑتا تھا بعض نوجوان شہزادے نام آوری اور جنگ جوئی کے شوق میں اس سے اپنے باپوں کا بدلا لینے کے ارادے پر تلے ہوئے تھے۔ خود اس کے ملک کے بعض دور دست حصے اور اضلاع جن کی رعایا کے ساتھ اس نے اپنے اقتدار اور استیلا کے زمانہ میں اچھا سلوک نہیں کیا تھا اس کی تن آسانی کی خواہش دیکھ کر اس وقت بلوہ اور شورش کرنے اور اس کے پایہ تخت پر حملہ کرنے کے لئے مستعد ہو رہے تھے۔ دشمن اس کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے تھے اور چونکہ غرناطہ کے اطراف پہاڑ اور جنگل واقع ہیں جن میں اکثر دشمن چھپ کر رہتے تو ان کا حال ظاہر نہیں ہو سکتا تھا ایسی صورت میں لازم تھا کہ بادشاہ ہمیشہ خبردار اور گوش برآواز رہے کیونکہ کیا خبر تھی کہ دشمن اس پر کس گوشہ سے چڑھائی یا حملہ کرے۔ اس نے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دیدبان مقرر کئے تھے اور برج بنوائے تھے اور ہر درہ اور گھاٹی کے دہانے پر فوج مقرر کی تھی کہ دشمن کی آمد دیکھ کر رات ہو تو آگ جلا کر اور دن ہو تو دھواں کر کے اس کو اور شہر کے لوگوں کو آنے والی آفت سے خبردار کر دیں۔ مگر یہ سب تدابیر بیکار ہوتی تھیں۔ اس کے ہوشیار و چالاک دشمن باوجود ان انتظامات کے کسی ایسی دشوار گذار گھاٹی سے داخل ہو جاتے کہ کسی کو اس کی خبر نہ ہوتی اور اس کی آنکھوں کے سامنے اس کے ملک کو لوٹ کر مال و اسباب لئے ہوئے اور لوگوں کو قید کئے ہوئے پھر ان گھاٹیوں میں غایب ہو جاتے۔

ایسے وقت میں جب بادشاہ ان اقسام کی تکالیف و پریشانیوں میں مبتلا تھا ایک عمر رسیدہ عرب منجم حکیم اس کے دربار میں وارد ہوا جس کی داڑھی اس کی کمر تک پہونچی تھی۔ اگرچہ کمال پیری کے تمام آثار اس کے چہرے سے عیاں تھے مگر وہ پا پیادہ مصر سے یہاں تک پہونچا تھا۔ اس کے پاس بغیر ایک عصا کے اور کوئی حربہ نہیں تھا جس پر بعض نقوش و اشکال کندہ تھے۔ اس کا شہرہ تو اس سے پہلے ہی یہاں پہونچ گیا تھا۔ اس حکیم کا نام ابراہیم ابن ابوایوب تھا اور مشہور یہ تھا کہ وہ حضرت رسالتمآبؐ کا زمانہ دیکھا ہوا تھا اور اس کا باپ ابوایوب حضرت کے اخیر صحابیوں میں سے تھا۔ یہ حکیم بچپن میں عمرو عاص کی فاتح فوج کے ساتھ مصر میں آیا اور سالہا سال وہاں قیام کر کے مصری جیسوں کے ساتھ رہ کر ان کے علوم اور خصوصاً ان کے سحر حاصل کئے۔ یہ بھی مشہور ہے کہ اس نے عمر بڑھانے کے راز کو بھی دریافت کیا تھا جس کی وجہ سے اس کی عمر اس وقت دو سو برس سے زیادہ تھی۔ لیکن چونکہ یہ علم اس کو اس کی طبعی پیرانہ سالی میں حاصل ہوا تھا اس لئے اگرچہ اس کی عمر بڑھی مگر اس کے چہرہ کی جھریوں اور سفید بالوں کا علاج نہ ہو سکا۔ بادشاہ نے اس عجیب بوڑھے کو بہت عزت سے ہاتھوں ہاتھ لیا اور جیسا کہ بوڑھے سلاطین کی عادت ہوتی ہے حکماء اور طبیبوں کو اس نے اپنی خاص مہربانی

ونوازش کا ممنون کیا۔ اس کو تو بادشاہ اپنے خاص محل میں جگہ دیتا تھا مگر اس منجم نے ایک غار میں رہنے کو پسند کیا۔ جو شہر غرناطہ کے قریب ایک غار میں بنا ہوا تھا اور یہ وہی پہاڑ ہے جس پر اس کے مابعد کے زمانہ میں قصر الحمرا بنایا گیا۔ اس نے اس غار کو کسی قدر وسیع کرایا اور اس میں ایک بلند و وسیع ایوان بنواکر اس کی چھت میں ایک سوراخ مثل کنوئیں کے اوپر تک کھدوایا تا اس میں سے آسمان اور تاروں کو دن کے وقت بھی دیکھ سکے۔ اس ایوان کی دیواروں پر اس نے مصری علامات اور نقوش کندہ کرائے اور ستاروں کی اشکال اور ان کے برجوں کی علامات بھی کھدوائیں۔ اس ایوان کو اس نے بہت سارے آلات سے آراستہ کیا اور سجایا جو اس کی ہدایتوں کے مطابق غرناطہ کے چابکدست استادوں اور کاریگروں نے بنائے تھے مگر جن کے مخفی راز اور اسرار سے بغیر اس منجم کے اور کوئی واقف نہ تھا۔

تھوڑے عرصہ میں منجم بادشاہ کا رازدار بن گیا اور ہر امر میں بادشاہ اس سے رائے لیتا تھا۔ ایک بار بادشاہ اپنے ہمسایوں کی شکایت اس سے کر رہا تھا اور ان کی یورشوں کی مدافعت کے لئے اپنی بیتابانہ خبرداریوں کا افسوس کر رہا تھا۔ جب اس نے اپنی شکایات کا سلسلہ ختم کیا تو منجم نے کچھ تھوڑی دیر سوچکر جواب دیا۔ اے بادشاہ! جان اور آگاہ ہو کہ جب میں مصر میں تھا تو میں نے ایک عجیب طلسم دیکھا جس کو زمانہ قدیم کی ایک بت پرست قسیسہ نے بنایا تھا۔ شہر بوسل کے قریب ایک پہاڑ پر جہاں سے وادی نیل پر نظر پڑتی ہے ایک مینڈھے کی مورت بنی ہوئی تھی اور اس کے اوپر ایک مرغ بنا ہوا تھا اور یہ دونوں پیتل کے ڈھلے ہوئے تھے اور ایک محور پر گھوم سکتے تھے جس وقت کوئی غنیم اس ملک پر چڑھائی کرتا تو مینڈھے کا منہ اسی طرف پھر جاتا اور ساتھ ہی مرغ بھی بانگ دیتا تھا جس سے وہاں کی خلقت کو آنے والی آفت کی خبر ہو جاتی تھی اور اس کے رخ سے بھی مطلع ہو جاتے تھے اور اس کے دفعیہ کا بروقت انتظام کر لیتے تھے۔

بادشاہ نے کہا "اللہ و اکبر! ایسا مینڈھا جو میرے شہر کے اطراف کے پہاڑوں پر نظر رکھے اور ایسا مرغ جو آنے والی آفت کے متعلق خبر کر دے ایک نعمت غیر مترقبہ ہے۔ اللہ اللہ جب ایسے ہوشیار محافظ اور دیدبان میرے لئے مقرر ہوں تو میں کیسی میٹھی نیند سوؤنگا"۔

ابراہیم منجم تھوڑی دیر ٹھہرا رہا تاکہ بادشاہ کی خوشی کا جوش فرو ہو جائے پھر اس نے کہنا شروع کیا کہ جب عمرؓ نے مصر کو پوری طرح فتح کر لیا تو میں نے وہاں کے قسیسوں کے ساتھ رہنا شروع کیا۔ اور ان کی بت پرستی کے اصول اور رسوم سیکھنے لگا۔ اور جن علوم و فنون مخفیہ میں وہ مشہور ہیں ان کی تلاش و تحصیل میں مصروف ہوا۔ ایک دن میں دریائے نیل کے کنارے پر بیٹھا ہوا ایک بوڑھے قسیس سے باتیں کر رہا تھا کہ اس نے ان اہرام مصر کی طرف اشارہ کیا جو صحرا میں پہاڑوں کی طرف تھے اور کہنے لگا۔ ہم سے جو کچھ تو سیکھے گا وہ ان علوم کے آگے ہیچ ہے جو ان اہرام میں محفوظ کئے گئے ہیں۔ اس وسطی ہرم میں ایک دخمہ ہے جس میں اس بڑے قسیس کی مومیائی کی ہوئی لاش مدفون ہے جس نے ان اہرام کی تیاری میں مدد دی تھی اور اس کے ساتھ ایک عجیب کتاب مدفون ہے جس میں سحر اور مخفی علوم و فنون کے راز درج ہیں۔ یہ کتاب حضرت آدم کو ان کے ہبوط کے بعد دی گئی اور نسلاً بعد نسلٍ ان سے حضرت سلیمان کو پہونچی جس کی مدد سے بیت المقدس کی عمارت کو انہوں نے تیار کرایا۔ وہ کتاب اس قسیس کے ہاتھ کیسے لگی اس کا علم خدا کو ہے جو سب علوم کا دانا ہے۔

جب میں نے اس سے یہ بات سنی تو میرے دل میں اس کے حاصل کرنے کے شوق کا شعلہ بھڑک اٹھا میں اس وقت عرب کی فاتح فوج اور بہت سے سپاہیوں نیز مصری لوگوں سے مدد لے سکتا تھا میں نے ان کی اعانت سے اس کام کو شروع کیا اور اس بڑے ہرم کو سرنگ لگائی اور آخر بڑی محنت سے اس کی ایک پوشیدہ جگہ تک پہونچا اور زیر زمین سرنگ میں داخل ہو کر بڑھا یہاں تک کہ اس حرم کے وسط میں داخل ہوا اور اس دخمہ تک پہنچا جہاں اس قسیس کی لاش صدہا سال سے رکھی ہوئی تھی۔ میں نے اس مومیائی دار بیرونی غلاف کو توڑ کر اس کے کفنوں اور بندشوں کو کھول کر آخرکار اس نایاب اور قیمتی کتاب کو پایا جو اس کے سینہ پر دھری ہوئی تھی۔ میں نے اس کتاب کو اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے لیا اور اس حرم سے جیسا گیا تھا باہر آیا اور اس مومیائی دار لاش کو اسی اندھیرے اور خاموش دخمہ میں چھوڑ آیا جہاں وہ قیامت کے دن تک آرام سے رہیگی۔

بادشاہ نے کہا اے ابن ابوایوب! تو بڑا سیاح ہے اور دنیا کے

بہت سے عجائبات تو نے دیکھے ہیں لیکن اس حرم کے راز سے مجھے فائدہ
اور حضرت سلیمان کی اس علوم کی کتاب سے مجھے کیا نفع ؟

منجم نے کہا فائدہ یہ ہے کہ اس کتاب کے پڑھنے سے مجھے جملہ سحریات
سے اطلاع ہے اور اپنے منصوبوں کی تعمیل میں تمام جنات سے کمک لے
سکتا ہوں۔ تیرے اس طلسم کے راز سے بھی واقف ہوں اور ویسا ہی طلسم تیار
کر سکتا ہوں بلکہ ایک ایسا طلسم بنا سکتا ہوں جو اس سے بھی زیادہ محکم ہو

بادشاہ نے [illegible] کہا [illegible] ابن ابو ایوب! اگر ایک طلسم
پہاڑوں کی چوٹیوں پر [illegible] دیدبانوں کے برجوں سے [illegible]
[illegible] تو میرے لئے ایک [illegible] طلسم بنا دے۔ اپنا سارا
خزانہ تیرے اختیار میں دے دوں گا۔

[illegible] نجومی نے بادشاہ کی خواہش پوری کرنے کے لئے فوراً کام شروع
اس نے بادشاہ کے محل کے اوپر ایک بہت بڑے برج کے بنانے کا حکم دیا جو
البائیسن پہاڑ کی چوٹی پر بنا ہوا تھا۔ یہ برج ان پتھروں سے بنایا گیا جو مصر
سے منگائے گئے تھے اور مشہور ہے کہ اہرام مصر کے کسی خاص حرم کے پتھر تھے
اور برج کے اوپر کے حصہ میں ایک مدور کمرہ بنایا جس میں قطب نما کے ہر نقطہ
کی سمت میں ایک ایک دریچہ رکھا گیا اور ہر دریچہ کے سامنے ایک میز رکھی گئی
جن پر مثل عرصہ شطرنج کے مصنوعی سوار و پیدل پرے جمائے کھڑے تھے اور
اس بادشاہ کی مورت بھی اوپر رکھی گئی تھی جو اس سمت میں حکومت کرتا تھا
یہ سب مورتیں لکڑی سے تراشی ہوئی تھیں ہر ایک ایسی میز کے لئے ایک چھوٹا
سا نیزہ مقرر تھا جو ایک سوفار سے بڑا تھا اور ان میزوں پر بعض حروف
و نقوش کلدانی زبان میں کندہ تھے۔ اس کمرہ کا جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا
تھا جس پر ایک فولادی قفل لگا ہوا تھا جس کی کنجی بادشاہ کے پاس رہتی تھی۔

برج کے اوپر ایک عرب سوار کی مورت لگی ہوئی تھی جو ایک محور پر
گردش کرتی تھی اور جس کے شانہ پر سپر پڑی ہوئی تھی اور ہاتھ میں ایک نیزہ
عمودی حالت میں اٹھا ہوا تھا۔ اس سوار کا رخ شہر کی جانب تھا۔ اس طرح
پہ کہ گویا وہ شہر کا پہرہ دے رہا ہو اور جس وقت کسی غنیم یا دشمن کی آمد معلوم

ہوتی تھی یہ سوار اسی جانب اپنا منہ پھیر دیتا تھا اور نیزہ کو نیچا کر دیتا۔ جیسے کہ وہ لڑائی کے لئے مستعد ہے۔

جب یہ طلسم تیار ہو گیا جو بادشاہ کی کمال درجہ تمنا تھی تو بس قدر آگے اس کو آرام و آسائش کی فکر رہتی تھی اب نہایت اضطراب کے ساتھ کسی دشمن کے حملہ کا منتظر تھا۔ جلد اس کی مراد جلد بر آئی۔ ایک دن صبح کے وقت اس برج کا محافظ آیا اور خبر دی کہ اس سوار کی مورت کا رخ ابو ہریرہ کے پہاڑوں کی طرف پھر گیا ہے اور اس کا نیزہ لوپ کی گھاٹی کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

بادشاہ نے سنتے ہی حکم دیا کہ طبل اور کرنا بجائے جائیں اور تمام غرناطہ کے لوگ لڑائی کے لئے مستعد ہو جائیں۔ منجم نے کہا۔ اے بادشاہ اپنے شہر کو اضطراب میں نہ ڈال اور اپنے سپاہیوں کو ہتھیار باندھنے کی زحمت دے کیونکہ ہم کو ان دشمنوں سے نجات پانے کے لئے فوج کی مطلق ضرورت نہیں ہے اپنے درباریوں کو رخصت کر دے تاکہ ہم دونوں اس طلسمی برج کے کمرہ میں جائیں

بوڑھا بادشاہ ابراہیم ابن ابو ایوب کے شانے پر ہاتھ رکھے ہوئے اس برج کی سیڑھیاں چڑھنے لگا۔ اوپر پہونچکر اس طلسمی کمرے کے دروازے کو کھول کر اس میں داخل ہوا تو دیکھا کہ لوپ کی گھاٹی کی طرف کا دروازہ کھلا ہوا ہے منجم نے کہا کہ دشمن اسی جانب کو ہے اے بادشاہ اب اس میز کے اسرار کو ملاحظہ کر۔ بادشاہ اس شطرنج نما میز کے قریب آیا جس پر چھوٹی چھوٹی لکڑی کی مورتیں سپاہیوں کی شکل میں رکھی ہوئی تھیں تو دیکھتا کیا ہے کہ وہ سب کی سب متحرک ہیں۔ گھوڑے کود رہے ہیں اور ناچ رہے ہیں اور سپاہی اپنے ہتھیار ہلا رہے ہیں۔ طبل اور نقارے بجنے ہتھیاروں کی چکا چاک اور گھوڑوں کے ہنہنانے کی دھیمی سی آواز آ رہی ہے اور یہ آواز ایسی دھیمی ہے کہ جیسے مکھی کے بھنبھنانے کی آواز کسی ایسے شخص کے کان میں پڑے جو گرمیوں کی دوپہر میں کسی سایہ دار جگہ میں سو رہا ہو۔

منجم نے کہا دیکھ اے بادشاہ کیا ثبوت ہے کہ تیرے دشمن اس وقت میدان میں موجود ہیں۔ اب وہ غالباً اس پہاڑ کے درہ میں آ رہے ہیں جو لوپ کی گھاٹی کے قریب ہے۔ اگر تیری مرضی ہو کہ ان میں پریشانی اور خوف پیدا ہو جائے اور بغیر کسی کی جان جانے کے وہ واپس چلے جائیں تو ان مورتوں کو اس طلسمی نیزہ کے کند سرے سے مار اور اگر تیری خواہش کشت و خون کی ہو تو نیزہ کی نوک سے ان کو مار۔ اس بات کے سنتے ہی بادشاہ کے چہرہ پر زردی نمودار ہوئی۔ اس نیزہ کو کانپتے ہوئے بڑے شوق سے ہاتھ میں لیا اور ڈگمگاتی ہوئی چال سے اس میز کی طرف بڑھا۔ اس کی سفید داڑھی خوشی کے مارے ہل رہی تھی تب اس نے پکار کر کہا "اے ابن ابو ایوب! میرے خیال میں تھوڑا سا خون بہایا جائے تو لطف ہے۔ اس نے بعض کو اس طلسمی نیزہ کی نوک سے چبھو دیا۔ اور بعض کو اس کے کند سرے سے چبھو دیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلا فریق تو فوراً مر کر میز پر گر پڑا اور باقی اپنے آپس میں لڑنے لگے منجم نے بڑی مشکل سے اس ظاہری صلح پسند اور باطنی خونخوار بادشاہ کا ہاتھ روکا جس کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے دشمنوں کا بالکل قلع قمع کر دے۔ بڑی مشکل سے اس نے بادشاہ کو اس برج سے اتارا اور مخبروں کو لوپ کی گھاٹی میں خبر لانے کے لئے بھیجا۔ مخبروں نے تھوڑی دیر میں یہ خبر پہونچائی کہ ایک بڑی عیسائی فوج سیرا کے وسط سے آگے بڑھ کر غرناطہ کے قریب آ پہونچی ہے اور وہاں آپس میں ان کا فساد ہوا اور ہتھیار کھینچکر ایک دوسرے پر گر پڑے اور بہت خونریزی کے بعد سرحد کے پار واپس گئے۔ بادشاہ یہ سن کر مارے خوشی کے اپنے میں نہیں سماتا تھا کیونکہ اس کو اس طلسم کی تاثیر کا پورا ثبوت مل گیا اور کہنے لگا "اب میں آرام کی زندگی بسر کر سکونگا اور اپنے دشمنوں کو قبضہ میں کر لونگا۔ اے دانشمند ابو ایوب اس نعمت کے صلے میں میں تم کو کیا دے سکتا ہوں"۔

منجم نے جواب دیا "اے بادشاہ ایک بوڑھے حکیم کی ضرورتیں بہت کم اور بالکل سادی ہوتی ہیں اگر تو مجھے صرف اس قدر عطا فرمائے کہ میں اپنے غار کو ایک زاہد کے گوشہ انزوا کی طرح آراستہ کر سکوں تو میں قناعت کروں گا"۔

بادشاہ اس کی مختصر درخواست سن کر دل میں بہت خوش ہوا اور کہنے لگا کہ جو لوگ حقیقی حکیم ہوتے ہیں ان کی ضرورتیں کس قدر مختصر ہوتی ہیں اور ان کی قناعت کس قدر قابل قدر ہوتی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اپنے خزانچی کو حکم دیا کہ ابراہیم کو جس قدر ضرورت اس کے غار کی تکمیل اور سجانے میں ہو بلا تامل خزانہ شاہی سے ادا کیا جائے۔

اب اس منجم نے حکم دیا کہ متعدد کمرے اس پہاڑ میں کھود دئے جائیں جو اس کے رسد خانے سے ملے ہوئے ہوں۔ اس میں اس نے اعلیٰ درجہ کے صوفے

۱۔ تخت بچھوائے اور دیواروں سے دمشق کے نہایت قیمتی ریشمی پردے لٹکانے کا حکم دیا اور کہنے لگا میں ضعیف اور بوڑھا ہوں اب مجھ سے پتھر کے تخت اور فرش پر سویا نہیں جاتا اور ان سرد اور مرطوب دیواروں کے لئے پردے ضروری ہیں۔ اس نے پھر کئی حمام بنوائے جن میں ہر قسم کے عطریات اور خوشبودار تیل مہیا کئے گئے تھے اس کا قول تھا کہ پیری کی سختی کے دفعیہ کیلئے اور جسم کو چست و چالاک بنانے کے لئے حمام ایک لازمی چیز ہے اور میرا جسم ضعیف العمری کی تکلیفوں کو اس سے زیادہ برداشت نہیں کر سکتا ہے۔

ان کمروں میں اس نے متعدد بلوری اور چاندی کے چراغ چھت سے لٹکائے جن میں خوشبودار تیل جلتا تھا جو اس نسخہ کے مطابق تیار کیا گیا تھا جو اس کو مصر کے اہرام میں ملا تھا۔ یہ تیل دوامی تھا یعنی جلنے سے کم نہیں ہوتا تھا۔ جس کی روشنی دن کی پھیکی ہوئی روشنی کے مانند تھی۔ وہ کہتا تھا کہ آفتاب کی روشنی بوڑھے اشخاص کی آنکھوں کے لئے نہایت تیز اور مضر ہے اور حکمت کے مطالعہ کے لئے ان چراغوں کی روشنی زیادہ تر مناسب ہے۔ بادشاہ کے خزانچی نے اس منجم کی آئے دن کی فرمائشوں سے تنگ آکر بادشاہ تک شکایت پہنچائی۔ بادشاہ نے اپنے وعدہ کا پاس رکھا اور اس کی شکایت کا کچھ خیال نہیں کیا اور فرمایا ہم کو صبر کرنا چاہئیے۔ اس شخص نے ان بکار کے صومعہ اور زاویہ کے خیالات کو مصر کے اہرام سے حاصل کیا ہے اور چونکہ ہر چیز کی انتہا ہوتی ہے اس غار کی آرائش بھی وقت پر ختم ہو کر رہیگی۔ بادشاہ کا یہ خیال بہت درست تھا اور چند روز میں وہ سب حجرے آرائش کے سامان سے ہر طرح سے سج گئے۔ وہ حجرے کیا تھے کہ ایک زیرزمینی محل تھا۔ اس منجم نے اب انکی آرائش دیکھ کر اپنا اطمینان ظاہر کیا اور تین روز کامل ان میں بند رہا اور اپنے علوم کی تحقیقات میں مصروف رہا تین روز کے بعد پھر خزانچی کے پاس پہنچا اور کہنے لگا کہ اب صرف ایک چیز کی ضرورت ہے اور وہ ایک چھوٹی سی چیز ہے جو ذہنی زحمات کے درمیان دل کو آرام دینے کے لئے لازم ہے۔

خزانچی نے کہا۔ اے حکیم مجھے حکم ہے کہ تیری تنہائی کے رفع کرنے کے لئے جس شے کی ضرورت ہو مہیا کر دوں تو بتا کہ اب کیا چیز تجھے درکار ہے منجم نے کہا میں چند ناچنے والی عورتیں چاہتا ہوں۔ خزانچی نے تعجب سے پوچھا ناچنے والی عورتیں؟ تو منجم نے جواب دیا ہاں ناچنے والی عورتیں گروہ خوبصورت حسین اور جوان بھی ہوں کیونکہ نوجوانی و حسن کا دیکھنا فرحت بخش ہے۔ چند عورتیں کافی ہیں کیونکہ میں حکیم ہوں اور میری خواہشیں سادہ اور سہل الحصول ہیں۔ یہاں تو ابراہیم ابن ابوایوب حکیمانہ وضع پر اپنا وقت صومعہ میں گذارتا تھا اور وہاں وہ ظاہری صلح پسند بادشاہ برج میں بیٹھے ہوئے اپنے دشمنوں کے ساتھ خونخوار لڑائیاں لڑ رہا تھا اور ایک بوڑھے اور دھیمے بادشاہ کے لئے یہ کام نہایت ہی مناسب واقع ہوا۔ کیونکہ لڑائی کا مسئلہ اس کے لئے اس آسانی کے ساتھ طے ہو گیا تھا کہ اپنے کمرے میں بیٹھا ہوا ہزاروں فوجوں کی جان بے خطر لے سکتا تھا گویا کہ وہ کھیل تھیں ایک مدت تک تو وہ اپنی دلی خواہشوں کو اس طرح پورا کرتا رہا اور اپنے ہمسایہ بادشاہوں کو طعنہ دیتا اور ان کی توہین کرتا تھا۔ آخرکار وہ اس کے ظلم سے تنگ آگئے اور کسی کو جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس پر چڑھائی کرے وہ پھر اس طلسمی سوار کئی مہینوں تک صلح کی حالت میں رہا اور اپنا نیزہ سیدھا کئے ہوئے کھڑا تھا۔ بوڑھے بادشاہ کو بسبب نہ ہونے کسی مشغلے کے ایک قسم کی بے چینی پیدا ہوئی اور خونریزی کے اشتیاق میں بیتابی کے ساتھ انتظار رہتا تھا ایک روز اس طلسمی سوار نے اپنے محور پر گھومنا شروع کیا اور اپنے بھالے کو نیچا کیا اور گادکش کے پہاڑوں کی طرف اشارہ کرنے لگا۔ بادشاہ یہ معلوم ہوتے ہی فوراً اس برج پر گیا لیکن اس میز پر کی طلسمی مورتوں کو دیکھا تو خاموش تھیں اور مطلق حرکت نہیں کرتی تھیں اس سے اس کو سخت تعجب اور تشویش ہوئی اور فوراً اتر کر ایک دستہ سواروں کا پہاڑوں کی طرف روانہ کیا۔ وہ لوگ تین روز کے بعد واپس آئے اور ان کے افسر نے کہا کہ ہم نے ہر گھاٹی کو دیکھا وہاں کسی کا پتہ نہ پایا اور ہماری تلاش میں ایک عیسائی نہایت حسین لڑکی ملی جو ایک چشمے کے پاس دوپہر کو سو رہی تھی۔ ہم اس کو مقید کر کے اپنے ہمراہ لائے ہیں۔

بادشاہ نے نہایت اشتیاق و بیتابی کے ساتھ پوچھا "نہایت حسین لڑکی؟ وہ کہاں ہے، اس کو میرے حضور میں لے آؤ" اس فرمان کے ساتھ ہی وہ لڑکی حضور میں پیش کی گئی۔ اس کے جسم پر ایبیرین کے وہ سب قیمتی زیور تھے جو عربوں کی فتوحات کے زمانہ میں عیسائی عورتیں پہنا کرتی تھی۔ اس کے بالوں میں سنہری چمکتے ہوئے موتی پروئے ہوئے تھے

انگلش آرٹ کا ایک نمونہ

[illegible] پھل اور پھول دیکھنے والی حسینہ

اور اس کی پیشانی پر ایک ٹیکہ آویزاں تھا جس کا ہیرا اس کی آنکھوں کی چمک کے ساتھ ہمچشمی کر رہا تھا۔ اس کے گلے میں ایک سونے کی زنجیر تھی۔ جس سے ایک چھوٹا سا چاندی کا ستارہ لٹکتا ہوا تھا۔ اس کی سیاہ درخشندہ آنکھوں سے روشنی نکلتی تھی۔ بادشاہ کے پژمردہ اور کملائے ہوئے مگر پھڑکنے والے دل پر بجلی کا کام کر رہی تھی۔ اُس کی متوالی چال سے بادشاہ کی حالت بالکل ردی ہوئی جاتی تھی۔ اُس نے اسکو دیکھ کر خوشی سے پکارا۔

"اے عورتوں کی سرتاج تو کون ہے۔ اور کیا ہے"؟

لڑکی نے جواب دیا "اے بادشاہ میں ایک گاتھ شہزادے کی بیٹی ہوں، جو تھوڑے دنوں آگے تک اس ملک میں ریاست کرتا تھا میرے باپ کی ساری فوج اسی پہاڑ میں ایسی ماری گئی جیسا کہ جادو سے انکو مار گیا ہو۔ میرا باپ غربت میں آوارہ پھر رہا ہے اور میں اُس کی بیٹی اس وقت تیری قید میں ہوں"!

ابراہیم ابن ابوایوب جو اس وقت دربار میں حاضر تھا کہنے لگا۔

"اے بادشاہ! ہوشیار رہنا۔ شاید یہ اُن شمالی جادوگرنیوں میں سے ہو۔ جنکا ذکر ہم نے سنا ہے۔ جو مختلف شکلیں اختیار کر کے ناآزمودہ لوگوں کو دھوکا دیجاتی ہے میں اُس کی آنکھوں میں جادو دیکھتا ہوں اور اُس کی ہر حرکت سے سحر ٹپکتا ہے۔ غالباً یہ وہی دشمن ہے جس کیطرف وہ طلسمی سوار اشارہ کر رہا تھا"۔

بادشاہ نے کہا۔ میں جانتا ہوں کہ تو ایک دانشمند بلکہ ایک زبردست جادوگر ہے لیکن تو عورتوں کی راہ سے واقف نہیں۔ اس خاص امر میں تو میں کسی سے کم نہیں۔ اور اگرچہ سلیمان کی بہت ساری بیبیاں تھیں میں انکو بھی اس بات میں ترجیح نہیں دوں گا۔ اور اس لڑکی کے بارے میں تو مجھے مطلق خوف نہیں۔ اس کی صورت دلربا ہے۔ اور میری نظر میں کھب رہی ہے"۔

منجم نے کہا "سن اے بادشاہ! تجھے میرے طلسمات کے زور سے بہت فتحیں نصیب ہوئیں لیکن میں نے کسی فتح کی غنیمت میں حصہ نہیں پایا۔ پس اس قیدی کو میرے حوالہ کر دے تاکہ میری تنہائی میں وہ اپنے چاندی کے ستارے سے مجھے تسکین بخشے۔ اگر وہ ساحرہ بھی ہو۔ تو میرے پاس بھی اس سے بڑے سحر ہیں۔ جن سے میں اس کے سحر کو باطل کر سکتا ہوں"۔

بادشاہ نے پکار کر کہا۔ "کیا تجھے اور بھی عورتیں چاہئیں؟ کیا تیرے پاس اس وقت ناچنے والی عورتیں تیرے دل بہلانے کے لئے کافی نہیں ہیں جو اور بھی چاہتا ہے"؟

اُس نے کہا "ہاں یہ سچ ہے کہ ناچنے والی عورتیں میرے پاس ہیں لیکن مجھے موسیقی سننے کی خواہش ہے تاکہ میرے دل کو مطالعہ کی تکلیف سے تازہ کرے"!

بادشاہ نے بیتاب ہو کر کہا "تیری زاہدانہ خواہشوں کو سلام ہے۔ میں نے اس لڑکی کو خاص اپنے لئے تجویز کیا ہے میں اپنی آسائش اس کی صحبت میں پاتا ہوں۔ جیسا کہ مجنوں کو لیلی کی صحبت سے اور فرہاد کو شیریں کی ملاقات سے حاصل ہوتی تھی"۔

منجم کے اصرار پر بادشاہ کو اور ضد ہوئی۔ یہاں تک کہ دونوں میں رخصت ہونے وقت پوری ناچاقی ہوگئی تھی۔ منجم تو اپنے صومعہ میں جاکر خلق سے کنارہ کش اور منزوی ہوگیا اور اپنے رنج پر افسوس کرنے لگا۔ لیکن جانے کے قبل بادشاہ کو نصیحت کرتا گیا کہ اس قیدی لڑکی سے ہوشیار رہے لیکن دنیا میں ایسا بوڑھا عاشق کہاں ہے جو کسی کی نصیحت پر عمل کرے بادشاہ کا دل اُس کی نفسانی خواہشوں کا شکار بنگیا تھا۔ اور اس کی رات دن کی فکر یہی تھی کہ اس گاتھ معشوقہ کی نظر میں جس طرح سے ہو سکے محبوب واقع ہو۔ یہ سچ ہے کہ وہ جوان نہیں تھا لیکن دولت رکھتا تھا۔ اور جبکہ عاشق بوڑھا ہو۔ تو نہایت فیاض بھی ہوتا ہے غرناطہ کی منڈیوں میں ممالک مشرق کا جو مالِ تجارت تھا سب کو چھان کر عمدہ سے عمدہ انبار طلب کی گئیں۔ ریشمی کپڑے۔ جواہرات۔ زیور۔ عمدہ عطریات غرض جو کچھ کہ ایشیا یا افریقہ میں قیمتی و نایاب شے ہوتی تھی وہ اس معشوقہ کے لئے مہیا کیگئی اور ہر قسم کے تماشے اور خوشی کی مجلسیں اس کے خوش کرنے کیلئے ترتیب دیگئیں۔ راگ ناگ۔ ناچ۔ سپاہگری کے کرتب کے جلسے۔ سانڈوں کی لڑائی یہ سب یکے بعد دیگرے ہر روز ہوا کرتے تھے۔ سارا غرناطہ

ایک مدت تک وہ اسی عیدمنانے میں مصروف تھا۔ اور شہزادی تھی کہ ان سب باتوں کو معمولی طور پر دیکھا کرتی تھی گویا کہ ہمیشہ ایسی چیزوں کے دیکھنے کی عادی ہے وہ ان سب تماشوں کو اپنی منزلت اور مرتبہ کا خراج سمجھتی تھی بلکہ وہ بادشاہ کو اسراف و فضول خرچی میں مصروف کر کے اس کی سرفانہ فیاضی کو ایک معمولی بات خیال کرتی تھی اس فیاضی اور دلجوئی پر بھی اس کے سخت دل پر اس شیدائے ہوئے عاشق کی طرف سے مطلق اثر نہ ہوتا تھا یہ سچ ہے کہ وہ ہرگز چیں بجبیں نہیں ہوتی تھی مگر تبسم سے بھی کبھی بادشاہ کے دل کو خوش نہیں کرتی تھی۔ اور جب کبھی وہ اپنی دلی آرزو کا اظہار کرتا تو وہ اپنا چاندیکا ستار لے کر بجانا شروع کرتی جس کی آواز میں گویا سحر بھرا تھا کیونکہ تھوڑی دیر میں بادشاہ پر غنودگی سی طاری ہو جاتی اور وہ اونگھتے اونگھتے سو جاتا اور جب جاگ اٹھتا تو اس کی طبیعت نہایت فرحناک رہتی لیکن اس کا جوش عشق فرو ہو جاتا تھا۔ اس کے معشوق کے لئے یہ بات ناموافق تھی۔ اس نیند کی حالت میں مزے کے خواب بھی دیکھتا تھا اس کے ہوش و حواس غارت ہو جاتے تھے۔ وہ تو اسی طرح سے خواب میں رہنے لگا۔ اور سارا غرناطہ اس کی فریفتگی پر ہنستا تھا۔ اور خزانہ پر افسوس کرتا تھا جو ایک راگ کے لئے بادشاہ کے ساتھ لٹا رہا [illegible] اس کی سلطنت [illegible] پر زلزل ہو ہی گئی جس کی آمد سے اس کے طلسم نے اس کو مطلق خبر نہیں دی یعنی اس کے پایۂ تخت میں بلوا اور بغاوت برپا ہو گئی۔ اور اس کے محل کو باغیوں نے گھیر لیا۔ اور اس کی اور اس کی معشوقہ کی جان کا قصد کیا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینہ میں اس کی قدیم جرأت اور سپاہگری کی آگ بھڑک اٹھی۔ اور چند کار آزمودہ سپاہیوں کو لے کر وہ باہر نکل پڑا اور باغیوں کو مار کر بھگا دیا۔ اور بغاوت کے شعلہ کو فرو کر کے شہر میں پھر امن قائم کیا

جب شہر میں امن قائم ہوا۔ تو وہ منجم کے پاس گیا۔ جو اپنے صومعہ میں دروازہ بند کئے ہوئے افسوس کرتا اور غم کھاتا ہوا بیٹھا تھا۔

بادشاہ نے اس سے صلح آمیز طور پر مخاطب ہو کر کہا۔

"اے ابن ابوایوب! تو نے فی الحقیقت سچ کہا تھا۔ کہ اس قیدی عورت سے مجھ کو خطرہ ہے۔ تو جو آنے والی مصیبتوں کو قبل از وقت دیکھ سکتا ہے اب مجھ کو بتا کہ اس کے دفیعہ کے لئے کیا تدبیر کرنی چاہیئے"؟

حکیم نے جواب دیا۔ "اس کافر لڑکی کو اپنے سے دور کر دے کیونکہ وہی اس کا باعث ہے"۔

بادشاہ نے کہا۔ "یہ تو ممکن نہیں۔ میری سلطنت جائے مگر میں اس کو دور نہیں کر سکتا ہوں"۔

منجم نے کہا۔ "خوف اس کا ہے کہ دونوں ہی نہ رہیں"۔

بادشاہ "اے حکیم! خفا مت ہو۔ اور ایسی سختی کا اظہار بھی نہ کر ایک بادشاہ اور عاشق کے دوہرے غم کا خیال کر اور کوئی تدبیر ایسی بتلا جو مجھے ایسی مصیبتوں سے محفوظ رکھے جو اس وقت مجھ کو گھیرے ہوئے ہیں۔ مجھے عظمت کی پرواہ نہیں نہ اقتدار کی پرواہ ہے صرف آرام و آسائش کا طالب ہوں۔ کاش مجھے کوئی آرام کی جائے پناہ مل جاتی جہاں میں دنیا سے آسودہ ہو کر رہتا اور اس کے افکارات و نمائشوں اور جھگڑوں سے فارغ البالی بسر کرتا اور اپنی بقیہ عمر کو آرام سے گذار دیتا"۔

منجم نے اس کی طرف اپنے گوشۂ چشم سے تھوڑی دیر تک دیکھ کر کہا۔ "اگر میں تیرے لئے ایسی جائے مہیا کر دوں۔ تو تو مجھے اس کا صلہ دیگا؟"

بادشاہ "اے حکیم! تو خود اس کا انعام مقرر کر دے۔ جو کچھ ہوا اگر وہ میرے قبضہ اور اقتدار میں ہوگا۔ تو میں اپنی عمر اور جان کی قسم کھاتا ہوں کہ اس کے دینے میں دریغ نہ کرونگا"۔

منجم "اے بادشاہ! تو نے باغ ارم کا ذکر تو ضرور سنا ہوگا۔ جو ملک عرب میں تھا"۔

بادشاہ "ہاں میں نے اس باغ کا ذکر سنا ہے اور قرآن مجید کے سورۂ فجر میں بھی مذکور ہے اس کے علاوہ میں نے روایات عجیبہ و حکایات غریبہ اس کے متعلق کعبہ کے زائرین سے بھی سنی ہیں لیکن میں ان سب کو افسانہ خیال کرتا تھا جیسا کہ سیاح اور سفر کردہ لوگ کہا کرتے ہیں"۔

منجم "اے بادشاہ! سیاحوں کی باتوں کو جھوٹ مت سمجھ کیونکہ ان کے پاس اکثر بہت قیمتی اور نایاب معلومات کا ذخیرہ رہتا ہے جو دنیا کے کنارے سے وہ اپنے ہمراہ لاتے ہیں۔ لیکن باغ ارم کے متعلق جو کچھ تو

نے سُنا ہے وہ بالکل سچ ہے میں نے اسکو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ اب میرا قصہ سن جو تیرے مطلب سے تعلق رکھتا ہے میرے بچپن کے زمانہ کا ذکر ہے میں ایک بدوی عرب کا لڑکا تھا اپنے باپ کے اونٹوں کو چرایا کرتا تھا عدن کے صحرا میں ایک اونٹ سب سے جدا ہو کر کھو گیا میں نے چند روز تک اُس کی تلاش کی لیکن بے سود۔ اس کا پتہ ملا اور میں تھک کر ضعف کی حالت میں ایک دن دوپہر کے وقت ایک چھوٹے کنوئیں کے خرما کے درخت کے تلے سو رہا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میں ایک شہر کے دروازے کے پاس تھا میں اس میں داخل ہوا تو وہاں وسیع راستہ اور میدان اور بازار دیکھے لیکن اس میں کوئی متنفس نظر نہ آیا۔ سارا شہر سنسان تھا۔ ایسے ہی ٹہلتے ہوئے میں ایک عالیشان عمارت کے قریب نکلا جس کے نزدیک ایک عمدہ خوشنما باغ تھا جس میں حوض۔ فوارہ اور تالاب تھے اور اشجار و میوہ جات کثرت سے تھے لیکن کوئی ان کا دیکھنے والا یا پہرہ دار نہ تھا۔ اس سنسان حالت کو دیکھ کر میری طبیعت گھبرا گئی اور شہر کے باہر نکلا جب پھر کر دیکھا تو نہ شہر کا نشان تھا نہ باغ کا پتہ اور وہی صحرائے لق و دق مجھے دور تک نظر آنے لگا۔

اس حوالی میں مجھے ایک بوڑھا درویش ملا جو اس خطہ کے حالات و روایات اور اسرار سے واقف تھا میں نے اس سے وہ واقعہ بیان کیا۔ تو اس نے کہا کہ ۔۔

"یہ وہی مشہور باغ ارم ہے جو اس صحرا کے عجائبات سے سمجھا جاتا ہے یہ باغ کبھی کبھی کسی آوارہ اور گم کردہ راہ کو نظر آجاتا ہے جیسا کہ تو نے دیکھا جس کے دیکھنے سے اس کی طبیعت خوش ہو جاتی ہے۔ اور وہ باغات و اشجار و میوہ جات و عمارات عالیہ اس کو محو کر دیتی ہیں اور بعدہٗ دفعتہً نظر سے غائب ہو جاتی ہیں اور سوائے صحرا کے کچھ نظر نہیں آتا۔

اس کی حکایت اس طور پر ہے۔ زمانہ قدیم میں اس ملک میں قوم عاد آباد تھی۔ اور شداد ابن عاد حضرت نوح کا پڑپوتا یہاں کا بادشاہ تھا اُس نے اس شہر کی بنیاد ڈالی اور جب تیار ہو چکا اور اس نے اس کی آرائش دیکھی۔ تو اُس کے دل میں غرور اور تکبر نے جگہ لی اور اس نے ارادہ کیا کہ اس میں ویسے باغ ہوں۔ اور ویسے ہی قصر تیار کئے جائیں جو اس بہشت و قصور کے نظیر ہوں (جنکا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے) لیکن غرور کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے۔ اُس غرور نے اُس پر خدا کا قہر و غضب نازل کرایا اور وہ اس کی رعایا سب صفحۂ دنیا سے نابود کر دیئے گئے اور اس کا شہر اور باغ ہمیشہ کے لئے انسان کی نظروں سے پوشیدہ ہو گئے مگر کبھی کبھی کسی کو نظر آجاتے ہیں۔ تاکہ اس کے غرور و گناہ کو مخلوق کے دل میں ہمیشہ تازہ رکھیں"۔

"اے بادشاہ! یہ حکایت اور جو عجائبات میں نے وہاں دیکھے تھے ہمیشہ میرے خیال میں موجود رہتے تھے۔ سالہا سال کے بعد جب میں مصر میں تھا۔ اور حضرت سلیمان کی کتاب میرے ہاتھ لگی تو میں نے ارادہ کیا کہ پھر جا کر اس باغ ارم کو دیکھوں۔ بہر حال گیا اور اُس کو بخوبی اپنے علم کے زور سے دیکھا۔ اور شداد کے محل میں چند روز تک میں نے قیام بھی کیا۔ اور اس کے بہشت کے مزے بھی لوٹے۔ جو جنات اُس قصر و باغ کے محافظ تھے وہ میرے سحر کے مطیع تھے اور انہوں نے مجھے اس طلسم سے واقف کیا جس کے اثر سے وہ باغ بنایا گیا تھا۔ اور جس کی وجہ سے وہ نظروں سے غائب ہو جاتا تھا۔

اے بادشاہ! میں تیرے لئے ویسا ہی باغ اور ویسا ہی قصر تیار کر سکتا ہوں۔ اور اسی شہر غرناطہ کے قریب کے پہاڑ پر اس کو بنا دونگا کیا میں ان جملہ مخفی اسرار سحروں سے واقف نہیں ہوں اور کیا میرے پاس حضرت سلیمان کی وہ کتاب نہیں"؟

بادشاہ خوشی کے مارے کانپ رہا تھا اور کہا "اے ابن ابو ایوب! بیشک تو بڑا جہاندیدہ شخص ہے اور بہت سی عجیب و غریب باتیں تو نے سیکھی ہیں۔ میرے لئے ایک ایسا بہشت بنا دے اور اپنی آدھی سلطنت میں تیری نذر کرتا ہوں"۔

منجم "آہ! اے بادشاہ تو جانتا ہے کہ میں بوڑھا شخص اور حکیم ہوں۔ اور بہت تھوڑے پر قانع ہوں۔ میں صرف یہی چاہتا ہوں کہ جب وہ جادو کا محل تیار ہو جائے تو پہلا باربرداری کا جانور جو اس کے دروازے میں داخل ہو مع اسکے بار کے جو اس پر ہو مجھے بخشدے یہی صلہ میرے لئے کافی ہوگا"۔

بادشاہ نے اس کی ایسی مختصر درخواست کو بخوشی منظور کرلیا اور منجم نے اپنا کام شروع کردیا اور پہاڑ کی چوٹی پر جو اس کے زیر زمینی صومعہ کے برابر اوپر تھا اس نے ایک بڑا دروازہ بنانے کا حکم دیا۔ جو ایک مستحکم برج میں کھلتا تھا اس کے باہر ایک پیش بام تھا جس کے طاق نہایت بلند تھے اور اس کے اندر کی جانب نہایت مضبوط دروازے لگے ہوئے تھے۔ اس طاق کی چوٹی کے پتھر پر اس منجم نے ایک بڑی کنجی کی شکل اپنے ہاتھ سے بنائی اور باہر کے طاق پر جو پہلے طاق سے بڑا تھا ایک ہاتھ کی تصویر کھینچی۔ یہ بہت ہی زبردست طلسم تھا جس پر اس نے کسی نامعلوم زبان میں کچھ الفاظ پڑھ کر دم کئے جب یہ دروازہ تیار ہوگیا تو وہ دو روز تک اپنے صومعہ میں تنہا بند رہا اور بعض اوراد کے پڑھنے میں مصروف ہوا تیسرے دن وہ اس پہاڑ پر چڑھا اور تمام دن اس کی چوٹی پر گزارا۔ بہت رات گئے وہ اتر کر سیدھا بادشاہ کے محل پر پہونچا اور بادشاہ کے حضور میں عرض کیا۔ اے بادشاہ شکر ہے کہ میرا کام ختم ہوا۔ پہاڑ کی چوٹی پر ایک نہایت عمدہ اور دلکش قصر تیار کیا گیا ہے جس کا نظیر کبھی انسان کے ہاتھوں نے بنایا نہیں اس میں عمدہ سجے ہوئے اور آراستہ ایوان۔ غلام گردش، خوش قطع باغات، حوض اور فوارے اور معطر حمام موجود ہیں مختصر کلام یہ کہ میں نے اس سارے پہاڑ کو بہشت بنا دیا ہے اور مثل باغ ارم اس کو ایک طلسم سے محفوظ کر رکھا ہے جس کی وجہ سے وہ انسان کی آنکھوں سے پوشیدہ ہے وہی لوگ اس کو دیکھ سکتے ہیں جو اس طلسم کے راز سے واقف ہیں۔"

بادشاہ نے خوش ہوکر کہا۔" بس کل صبح نور کے تڑکے ہم اس پہاڑ پر چڑھینگے اور اس قصر پر اپنا قبضہ کریں گے۔"

رات بھر بادشاہ کو مارے خوشی کے نیند نہیں آئی۔ علی الصباح آفتاب کی کرنیں ابھی سیرآ ندواڈا کی برف اندوز چوٹیوں پر پڑنے نہیں پائی تھیں کہ وہ گھوڑے پر سوار ہوا اور چند خاص ہمراہیوں کو ساتھ لئے ہوئے ایک تنگ راستہ سے جو پہاڑ پر جاتا تھا روانہ ہوا۔ وہ گاتھ شہزادی بھی ایک سفید خوبصورت یابو پر سوار اس کے بازو پر جارہی تھی اس کا لباس جواہرات سے چمک رہا تھا۔ اس کے گلے سے وہی چاندی کا تعو

لٹکا ہوا تھا۔ منجم بادشاہ کی دوسری جانب پا پیادہ جارہا تھا اور اپنے طلسمی عصا کے سہارے سے چل رہا تھا۔ کیونکہ وہ ہرگز کسی قسم کے جانور پر سوار نہیں ہوتا تھا۔ بادشاہ ادھر ادھر اس موعود قصر کے درخشندہ برجوں اور کنگروں اور اس کے اطراف کے باغات کی تلاش میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتا تھا لیکن اس وقت تک کوئی چیز اس کو نظر نہیں آتی تھی۔

منجم نے کہا کہ اس مقام کے محفوظ رکھنے کا یہی راز ہے۔ کوئی چیز اس کو نظر نہیں آئے گی۔ جب تک کہ تو اس طلسمی دروازے کے اندر داخل نہیں ہوگا اور اس جگہ کا قبضہ تجھکو نہیں دیا جائیگا۔"

جب وہ سب دروازے کے قریب پہونچے تو منجم نے بادشاہ کی توجہ اس طلسمی ہاتھ اور کنجی کی طرف پھیری جو اس طاق کے اوپر کندہ تھی اور کہا۔" یہ وہ طلسم ہیں جو اس بہشت کے دروازے کی حفاظت کرتے ہیں۔ جب تک وہ ہاتھ نیچے آکر اس کنجی کو نہ لیوے نہ تو کوئی انسانی طاقت نہ کسی قسم کا سحر اس پہاڑ کے مالک پر غالب آسکے گا۔"

بادشاہ تو حیرت اور سکتہ کے عالم میں ان طلسمات کو دیکھ رہا تھا کہ یکایک شہزادی کا یابو آگے بڑھا اور شہزادی کو لیکر دروازہ میں داخل ہوگیا۔ بلکہ اس برج کے وسط میں پہونچا دیا۔ منجم نے پکار کر کہا۔" دیکھئے بادشاہ یہی میرا موعودہ انعام اور صلہ ہے اور یہی پہلا جانور ہے جو اپنے بوجھ کے ساتھ اس طلسمی دروازہ میں داخل ہوا ہے۔"

بادشاہ نے اس بات کو حکیم کا لطیفہ خیال کرکے تبسم کیا لیکن جب اس کو معلوم ہوا کہ حکیم کو اپنا صلہ لینے پر اصرار ہے تو اس کی سفید داڑھی مارے طیش کے ہلنے لگی۔

اس نے خفگی کے ساتھ کہا۔" اے ابن ابوایوب یہ کیا بات ہے تو میرے وعدہ کے معنی کو خوب جانتا ہے کہ پہلا بار برداری کا جانور جو اس دروازہ میں داخل ہو مع اس کے بار کے تیرا ہے۔ میرے اصطبل میں جا اور قوی ترین خچر کو انتخاب کرکے میرے خزانہ میں سے سب سے زیادہ بیش بہا جواہرات اس پر لاد دے۔ مع اس کے بار کے میں اسے تجھے بخش دونگا۔ لیکن اپنے خیال کو اس معشوقہ کی طرف رجوع مت کر اور اس ارادہ سے باز آیا کہ یہ میرے دل کا چین ہے۔"

منجم نے نہایت حقارت آمیز طور سے کہا "مجھے دولت کی کیا ضرورت ہے کیا حضرت سلیمان کی کتاب میرے پاس نہیں جس کے ذریعہ سے میں تمام دنیا کے پوشیدہ خزائن کو اپنے قبضہ میں لاسکتا ہوں یہ شہزادی اب میرا حق ہے اور تو نے شاہی قول ہارا ہے اس لئے اس کو تجھ سے اپنے حق کے طور پر طلب کرتا ہوں"۔

شہزادی اپنے بالو پر بیٹھے ہوئے ایک حقارت آمیز نظر سے ان کو دیکھنے لگی اور ان دونوں بوڑھوں کے جھگڑے پر جو حسن و جوانی پر قبضہ کرنے کے لئے برپا ہوا تھا مسکراتی تھی۔ بادشاہ کے غضب کا شعلہ بھڑک اٹھا اور اس کا دل بے قابو ہو گیا۔ اور طیش میں اس نے کہا "اے کمینہ وحشی زادہ! تیرے پاس بہت سحر و علم ہوگا۔ لیکن خیال رکھ کہ میں تیرا آقا ہوں اور اپنے بادشاہ کے ساتھ بے ادبی نہ کر"۔

منجم پر بھی غضب مستولی ہو گیا اور اس نے کہا "میرا بادشاہ؟ تو ایسے شخص کا بادشاہ کیونکر ہو سکتا ہے جس کے قبضہ میں حضرت سلیمان کی طلسمات ہوں۔ خدا حافظ! اے بادشاہ! تو اپنی چھوٹی سی ریاست پہ حکمرانی کر کے احمقوں کے بہشت میں مغرور رہ اور میں اپنے حکیمانہ صومعہ میں تجھ پر ہنستا رہوں گا"۔

یہ کہہ کر اس نے شہزادی کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور اپنے عصا کو زمین پر مارا اور شہزادی کے ساتھ اس برج کے وسط میں زمین کے اندر سما گیا۔ اور زمین نے ان دونوں کو ڈھانپ لیا اور جس جگہ پر وہ زمین میں دھنس گئے وہاں کسی قسم کی دراز یا کشادگی کا اثر نظر نہیں آتا تھا۔

بادشاہ تھوڑی دیر تک حیرت میں محو اور گونگا سا ہو گیا۔ بعد ہوش میں آکر حکم دیا کہ ایک ہزار مزدور اس جگہ کو کھودیں جہاں وہ منجم معہ اس معشوقہ کے دھنس گئے تھے۔ مزدور اگرچہ بہت دیر تک زمین کھودتے رہے مگر ان کے ہتھیاروں کا کوئی اثر اس سخت پتھر پر نہیں ہوا۔ اگر کہیں کھودتے تھے تو وہ مٹی پھر اسی طرح بھر جاتی۔

بادشاہ یہاں سے مایوس ہو کر اس غار کے دروازے پر گیا جہاں سے منجم کے زیر زمین صومعہ و محل کا راستہ تھا مگر اس کا بھی پتہ نہ ملا۔ جہاں غار کا دروازہ تھا وہاں ایک سخت پتھر کی چٹان نظر آئی۔ ابراہیم ابن ابوایوب کے غائب ہونے کے ساتھ اس طلسم کا اثر بھی جاتا رہا جو اس نے بادشاہ کے لئے تیار کیا تھا۔ وہ پیتل سوار اپنی جگہ پر ساکن کھڑا تھا اور اس کا نیزہ اس طرف اشارہ کر رہا تھا جہاں وہ منجم پہاڑ میں سما گیا تھا ——— جس کے معنی یہ تھے کہ بادشاہ کا سب سے زیادہ قوی دشمن اب وہاں موجود ہے۔

اس پہاڑ سے کبھی کبھی موسیقی کی آواز آتی اور ایک عورت کا گانا سنائی دیتا ہے ایک دن ایک دہقانی نے بادشاہ کو یہ خبر لادی کہ شب گذشتہ کو اس کو اس پہاڑ میں ایک دراز نظر آئی اور وہ اس میں چلا گیا وہاں سے اس کو وہ زیر زمین مکان نظر آیا جہاں اس نے اس منجم کو دیکھا ایک شاندار تخت پر بیٹھے ہوئے شہزادی کے ستار بجانے پر سر ہلاتا تھا۔ جس سے اس کی فریفتگی ظاہر ہوتی تھی۔

بادشاہ اس مقام پر پہونچا لیکن وہ دراز بند ہو گئی تھی اور بہتیری کوشش کی کہ اس کا پتہ لگے۔ مگر کچھ بھی ہاتھ نہ آیا۔ وہ طلسم ہاتھ اور کنجی کا ایسا مستحکم تھا کہ انسانی طاقت اس پر غالب نہیں آسکتی تھی اور پہاڑ کی چوٹی پر جہاں وہ موعودہ بہشت اور قصر تھا سوائے خشک پتھر کے کچھ بھی وہاں دکھائی نہیں دیتا ہے۔ یا تو وہ بہشت فی الحقیقت جادو کے اثر سے نظروں سے غایب ہو گیا ہے یا یہ کہ اس منجم کا نظر بند کامل تھا۔ اور اس کا من گھڑت افسانہ تھا۔ بہرحال لوگ اس کو اپنی خوش عقیدتی

سے منجم کا افسانہ خیال کرتے ہیں۔ بعضوں نے اس جگہ کو بادشاہ کی حماقت اور بعضوں نے احمقوں کے بہشت سے موسوم کیا ہے۔

بادشاہ کا غم و غصہ اس سے اور بھی زیادہ ہوا کہ اس کے ہمسایوں کو جن کو اس نے طعنے دیئے تھے اور ستار کھا تھا اور اس طلسمی سوار کا مالک ہونے سے فرصت کے ساتھ ان کی فوجوں کو نیست و نابود کرتا تھا طلسم کے ٹوٹ جانے کی خبر ہو گئی اور انھوں نے چاروں طرف سے اس کے ملک کو تسخیر کرنا شروع کر دیا یہاں تک کہ اس کی بقیہ عمر کو بالکل تلخ کر دیا۔

اس غم سے آخر اس کو تمام کیا اور جب وہ مر گیا تو اسی پہاڑ کے دامن میں دفن کر دیا گیا۔ اس واقعے کو گذرے صدہا سال ہو چکے ہیں اور اسی پہاڑ پر اندلس کا مشہور قصر الحمرا، بنایا گیا جو فی الحقیقت اس باغ ارم کا نمونہ تھا۔ وہ دروازہ طلسمی اب تک موجود ہے جو اس ہاتھ اور کنجی کے طلسم کی وجہ سے محفوظ ہے اور قلعہ کا بڑا دروازہ ہے جو باب العدل کے نام سے مشہور ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بوڑھا منجم اس دروازے کے نیچے اپنے زیرزمینی محل میں مقیم ہے اور اپنے تخت پر بیٹھا ہوا اس شہزادی کا ستار بجانا سنا کرتا ہے جو سنتری اس دروازے کا پہرہ دیتے ہیں بعض اوقات گرمیوں کی راتوں میں۔ گانے اور بجانے کی آواز سنتے ہیں جس کے اثر سے ان پر نیند طاری ہو جاتی ہے اور وہ پہرہ دیتے دیتے سو جاتے ہیں

وہاں کی ہوا میں بھی کچھ ایسی خواب آور تاثیر ہے کہ جو لوگ دن کو بھی وہاں جاتے ہیں ان پر بھی وہی غنودگی کا اثر طاری ہو جاتا ہے۔

قدیم روایات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حالت وہاں ہمیشہ کیلئے قائم رہیگی۔ اور وہ شہزادی اس منجم کی قید میں ہمیشہ رہے گی اور وہ منجم بھی شہزادی کے جادو اثر ستار کی آواز سے ہمیشہ مست رہے گا اور یہ حالت قیامت تک قائم رہے گی۔ الّا یہ کہ وہ طلسمی ہاتھ اس کنجی کو پکڑلے اور اس سحور پہاڑ کا طلسم ٹوٹ جائے۔

ترجمہ از عربی۔

غزل

از:-
مولٰنا بیباکؔ مرحوم شاہجہانپوری تلمیذ حضرت داغؔ

رہرو راہِ محبت طالبِ راحت نہیں،
جس میں منزل ہو وہ اپنی وادیٔ الفت نہیں

کیسی کیسی آرزوئیں مٹ گئیں ہیں دل کے ساتھ
اک دفینہ حسرتوں کا ہے مری تربت نہیں

ہیں عجب ساغر مری آنکھیں کہ جو سکتہ میں ہیں
طرفہ آئینہ ہی رخ تیرا جسے حیرت نہیں

اور کیا ہوتا یہاں تک نو رسائی ہو گئی
اب مجھے تم سے گلہ ہے شکوۂ قسمت نہیں

میں تو ہوں آوارۂ الفت تجھے کیا ہو گیا
چین تجھکو بھی تو اے ناصح کسی ساعت نہیں

یہ تو مانا تم نہایت دلشکن، پیماں شکن
ٹوٹ جائے وہ ہمارا رشتۂ الفت نہیں

ہر سخن میں اک لگاوٹ، ہر نگہ میں اک فریب
صبر اُس کو دیکھکر انسان کی طاقت نہیں

او وفا دشمن ستم ایجاد، یہ کیا کر دیا
ایک میں آفت کا مارا قابلِ رحمت نہیں

وائے قسمت ہجر میں آئی تو کب آئی اجل
جب ہجوم غم سے مرنے کی مجھے فرصت نہیں

چہچہوں میں قہقہوں میں دن گذرتے تھے کبھی
اب خوشی کیسی کہ وہ "سرمایۂ راحت" نہیں

وہ دمِ آخر عبث بیٹھے ہیں منہ پھیرے ہوئے
اک نگاہِ یاس کی بھی دل میں اب طاقت نہیں

رات تھوڑی دل مرا مشتاق یارب کیا کروں
وہ حیا سے چپ ہیں، مجھ میں اس قدر جرأت نہیں

اک زمانہ سے ہمارا طرزِ الفت ہے جدا
ہم وہ غم کھاتے ہیں جس میں غیر کی شرکت نہیں

وہ کوئی معشوق ہے جس میں نہ ہو بوئے وفا
"پھول" کا کچھ لطف اے بیباکؔ بے نکہت نہیں!

مریخ کیساتھ گفتگو

(از جناب محمد مقتدیٰ خاں صاحب)

(۱) کب ہوگی؟ (۲) کس زبان میں ہوگی؟ (۳) کیسے ہوگی؟

علمائے فلکیات نے اجرام سماویہ میں سب سے زیادہ مریخ کے مطالعہ پر جو ہمت صرف کی ہے اس کے کئی وجوہ ہیں۔ بالکل ابتدائی وجہ تو یہ ہے کہ مریخ ہر دو سال بعد زمین کے مقابل ہوتا ہے۔ جس سے اس کے بخوبی مطالعہ کرسکنے کا موقع زیادہ ملتا ہے۔ یہ وجہ تو ہمیشہ سے چلی آتی ہے۔ لیکن ۱۸۷۷ء میں ملان کے مشہور اور محنتی پروفیسر شیاپارلی نے یہ دریافت کرکے دنیا کو مریخ کی جانب اور بھی زیادہ متوجہ کردیا۔ کہ مریخ کی سطح پر جو باریک باریک متوازی و متقاطع خطوط نظر آتے ہیں وہ درحقیقت نہریں ہیں جن کی تعمیر صرف ذی شعور ہاتھ سے ممکن ہے۔ بعد کی معلومات نے پروفیسر شیاپارلی کے اس خیال کو یقین کے درجے تک پہونچا دیا۔

بیسویں صدی عیسوی نے آنکھ کھولی ہی تھی کہ ایک اور نامور پروفیسر ڈگلس نے آمریکہ کی رصدگاہ کا ایک سے اعلان کیا کہ مریخ کی سطح سے زمین کی طرف کچھ روشنی کے خطوط آتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں جو اس امر کا بیّن ثبوت ہیں کہ سیارۂ مریخ آباد ہے۔ اور اس کے باشندے ان نورانی خطوط کے ذریعہ سے زمین کے باشندوں سے گفتگو کرنی چاہتے ہیں۔ یہ قیاس ایک دلچسپ اور حیرت انگیز انکشاف ہے اور اس کے شائع ہوتے ہی علما "مریخیوں" سے نامہ و پیام کرنے کے ذرائع بہم پہونچانے کے درپے ہوگئے اور اگرچہ ابتدا میں یہ کام سخت مشکل معلوم ہوتا تھا لیکن برقیات کی ترقی نے اسے اتنا نہیں رہنے دیا۔ چنانچہ سائنس والوں نے اب اس مسئلہ پر بحث کرنا ہی چھوڑ دیا ہے کہ "ہم مریخ سے باتیں کرسکتے ہیں یا نہیں؟" بلکہ وہ ان سوالات پر غور کررہے ہیں جنہیں میں نے اپنے اس مضمون کے عنوان کے ذیل میں لکھا ہے۔

اس برقی تلاطم کا جو مریخ کی ہوا میں وقتاً فوقتاً پیدا ہوتا ہے امریکہ کے کامیاب عالم برقیات نکولا ٹسلا الملقب "بہ معجزۂ نمائے امریکہ" نے بھی برسوں مطالعہ کیا ہے۔ ابتدا میں تو اسے محض موسمی اثر قرار دیا گیا تھا۔ لیکن اب خود ٹسلا کہتا ہے کہ "کامل غور اور مشاہدے کے بعد میں بھی اسی یقینی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ یہ تلاطم خود باشندگانِ مریخ کا پیدا کیا ہوا ہے۔ جس سے اُن کی غرض یہ ہے کہ ہم ساکنانِ ارض اُسے سمجھیں اور اس کا جواب دیں"۔

اس بنا پر ٹسلا ۱۹۰۹ء سے باشندگان مریخ سے گفتگو کرنے کی کوشش شروع کرنے والا ہے۔ اُسے اپنی کامیابی پر پورا بھروسہ ہے ہر پندرہ سال بعد مریخ زمین اور آفتاب دونوں سے قریب ترین موقع پر آتا ہے۔ اس طرح گویا آخر اگست ۱۹۰۹ء میں مریخ کا قرب زمین سے صرف ساڑھے تین کروڑ میل ہوگا۔ حالانکہ بالاوسط زمین اور مریخ کے مابین چھ کروڑ دس لاکھ میل کا بُعد رہتا ہے۔ پس اس قرب سے فائدہ اٹھانے کے لئے پروفیسر ٹسلا آخر اگست ۱۹۰۹ء میں زمین کی طرف سے مریخ کو پہلا پیغام بھیجیں گے۔ لہذا امید کی جاتی ہے کہ آئندہ سال ۱۹۱۰ء میں مریخ کے ساتھ گفتگو کا آغاز ہوجائے گا۔

زبان کا مرحلہ درحقیقت سخت پیچیدہ ہے۔ مگر علماء سائنس ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ باشندگان مریخ فہم و فراست میں ہم سے بہت آگے ہیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ انہوں نے اپنے پیغام ہم تک پہنچانے

(باقی صفحہ ۲۳۵ پر)

شروع کردیئے ہیں جنکا جواب دینا تو درکنار ہم ابتک انہیں کماحقہ سمجھ بھی نہیں سکے۔ پس وہ اپنے اعلیٰ تر علم کے ذریعہ سے ہمارے پیغام کو فوراً سمجھ لیں گے۔ اور ہمارے ضعیف سے ضعیف اشارات کا مطلب نکال لیں گے۔ بلکہ اپنے ساتھ باتیں کرنا ہمیں خود سکھا لیں گے۔

ایک عربی مثل ہے "الحدیث ذو شجون" یعنی بات میں سے بات پیدا ہوتی ہے۔ جب مریخ کے ساتھ نامہ و پیام کا سلسلہ جاری ہوگیا تو پھر تو ہمکلامی کے لئے بہت سے موضوع نکل آئیں گے۔ لیکن اس وقت ایک سوال یہ بھی ہے کہ "ہمارے پہلے پیغام کا مضمون کیا ہوگا؟" اس کا فیصلہ ٹسلا نے یہ کیا ہے کہ "سب سے پہلا پیغام جو میں بے تار کی خبررسانی کے ذریعے سے بھیجونگا یہ ہوگا کہ ہم آپ سے یہ دریافت کرنے کی کہ آپ کا مزاج کیسا ہے۔ تقریباً دس ہزار سال سے کوشش کررہے ہیں"؟

جب سے مریخ کے ساتھ گفتگو کرنے کا خیال پیدا ہوا ہے اس وقت سے تیسرے اور آخری سوال کے حل کرنے کے لئے کہ "گفتگو کیسے ہوگی؟" بہت سی تجاویز پیش کی جا چکی ہیں اور ان پر وقتاً فوقتاً گرم مباحثے ہوچکے ہیں۔ ایک تجویز یہ تھی کہ ایک عریض و طویل جھنڈا بلند کرکے اپنے دوست سیارہ مریخ کے پیغاموں کا خیرمقدم کیا جائے۔ یہ بھی بتادیا گیا تھا کہ آئرلینڈ کے رقبہ کے برابر (۶۰۵۲۳ مربع میل) ایک جھنڈا اس مقصد کو اچھی طرح پورا کرسکے گا۔ ایک دوسری تجویز یہ بھی تھی کہ ہم اپنی زمین پر کہ ہم اپنی زمین پر بڑی بڑی نہریں کھودیں۔ جب باشندگانِ مریخ ہماری زمین کی شکل میں ایسی نمایاں تبدیلی دیکھیں گے تو ضرور اس کی کنہ تک پہنچ جائینگے اور اس کے جواب میں وہ شاید کوئی فلک فرسا پہاڑ بنائیں گے۔ جس کے مقابلے میں کم از کم ہمارا کوہِ ایلپس جس کا ارتفاع ۱۵۷۸۴ فٹ ہے۔ بالکل بے حقیقت ہوگا۔ لیکن فنانی المریخ ٹسلا ان تجاویز میں سے کسی سے بھی متفق نہیں ہے۔ بلکہ مشہور میکسم توپ کے موجد سر ہائرم میکسم کے خیال پر کاربند ہوکر آبشار نیگرا سے برقی قوت حاصل کرکے باشندگانِ مریخ کی جانب پیغام بھیجنا چاہتا ہے۔ اس نے اعلان کردیا ہے کہ آبشار نیگرا سے برقی قوت پیدا کرنیوالی جتنی کمپنیاں ہیں ان سب نے مجھے نیگرا کے ذریعے سے مریخ تک پیغام پہنچانے میں مدد دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ٹسلا نے ایک ایسا طریقہ دریافت کرلیا ہے۔ جس سے بذریعہ مارکونی گراف (بے تار برقی خبررسانی) چار کروڑ سے دس کروڑ میل تک پیغام بھیجا جاسکتا ہے۔ آبشار نیگرا سے اگرچہ ایک ارب گھوڑوں کی طاقت پیدا ہوسکتی ہے۔ مگر جو خلیج مریخ اور زمین کے درمیان حائل ہے۔ اس کے پار بے تار برقی پیغام بھیجنے کے لئے اتنی قوت کی مطلق ضرورت نہیں ہے۔ ٹسلا کے بے تار برقی آلات بمقام وارڈن کلف (لونگ آئی لینڈ) قائم ہوچکے ہیں۔ جن سے اسی کروڑ گھوڑوں کی طاقت حاصل ہوسکتی ہے۔ لیکن ٹسلا کے مقاصد کے لئے اتنی قوت بھی بہت زیادہ ہے۔ ٹسلا نے بتایا ہے کہ اس ذریعے سے مریخ کے ساتھ آسانی سے گفتگو ہوسکیگی اور یہ کہ اگر مریخ والے بھی یہی طریقہ استعمال کریں تو انہیں ہم تک پیغام پہنچانے کے لئے نسبتاً بہت کم قوت درکار ہوگی۔ کیونکہ جو قوت زمین سے مریخ تک پہنچ سکتی ہے۔ اس کا صرف سولھواں حصہ مریخ سے زمین تک سہولت کے ساتھ پہنچ سکتا ہے۔ غرض یہ ترکیب مریخ کے ساتھ گفتگو کی نکالی گئی ہے ؎

اس تمام جدوجہد کے نتائج پر اس وقت بمشکل کوئی قیاس قائم کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اس قدر یقینی ہے کہ ان لوگوں کی نسبت (جن کی ترقی ہماری دنیا کے کوئی شکل اختیار کرنے سے پہلے ہی شروع ہوگئی تھی) یکایک علم حاصل ہوجانے سے ہمارے سائنس دانوں اور فلاسفروں کے آدھے نظریئے غالباً الٹ جائینگے اور ہماری زندگی اور شاید ہمارے عقائد کا رنگ بالکل بدل جائے گا ؎

دیدہ باید کہ چہ از پردہ بروں می آید

ضروری اطلاع

صاحبان۔ نہ میں اشتہاری حکیم ہوں نہ ڈاکٹر بلکہ ایک معمولی آدمی ہوں بدقسمتی سے مجھے اپنے ہاتھوں اپنی جوانی کا ستیاناس کرنیوالی عادت پڑ گئی تھی جس کے نتیجہ بد سے میں بالکل بے خبر تھا یا چانک ڈیڑھ دو سال کے بعد مجھے نامردی کا مبارک عارضہ لاحق ہو گیا۔ سرعت۔ جریان احتلام وغیرہ کی بے انتہا شکایتوں کے سبب میرا چہرہ دن بدن لاغر ہوتا جاتا تھا۔ درد دل ہر وقت دھڑکتا چکر آنا۔ آنکھوں کے آگے اندھیرا آجانا۔ گھبراہٹ سستی۔ اور اداسی چھائی رہتی تھی۔ دوست احباب میری پژمردگی کا سبب پوچھتے مگر میں کسی کو اپنی حالت سے آگاہ کرنا مناسب نہ سمجھتا تھا۔ مگر در پردہ مشہور بہ مشہور شہروں کے بڑے بڑے ڈاکٹروں اور حکیموں سے جن کے لمبے چوڑے اشتہاروں کی کوئی حد نہ تھی ادویات منگوا کر استعمال کر مارا لیکن مجھے کچھ فائدہ نہ ہوا بلکہ علاوہ خرچ کے کئی تکلیفوں کا سامنا کر کے بھی مایوس ہی رہنا پڑا۔ اس مایوسی کی حالت میں زندہ درگور ہونے کو ترجیح دیتا تھا۔ اتفاقاً خوش قسمتی سے مجھے ایک ملازمت میں پشاور جانا پڑا جس جگہ پر میں جا کر ٹھہرا۔ ایک فقیر خضر صورت جو کہ پہلے سے وہاں مقیم تھے۔ مجھ سے پوچھنے لگے کہ تم اداس اور نہاری صورت مریضوں کی سی کیوں ہے میرے پر درد دل اپنے اس خضر صورت اور کامل سنیاسی سے اپنا سارا دکھ درد کہہ ڈالنے کی ہدایت کی چنانچہ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ میں اب زندگی سے تنگ آکر خودکشی کرنے پر آمادہ ہوں۔ اس فقیر صاحب کمال نے ازراہ شفقت میرے حال زار پر رحم فرما کر ایک نسخہ کھانے کے لئے مقوی گولیوں کا اور دوسرا نسخہ رگوں اور پٹھوں کی سستی دور کرنے کے لئے بتلایا چنانچہ میں نے حسب ارشاد صاحب کمال لاتعداد جنگلی جڑی بوٹیاں اور کئی ادویات بازار سے خرید کر ہر دو جو کیمیا کو روبرو اس صاحب کمال کے تیار کر کے استعمال کرنا شروع کیا۔ ناظرین میں خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ ساتویں ہی روز میری تمام شکایتیں جو کہ ایک مریض کو لاحق ہو سکتی ہیں رفع ہونی شروع ہو گئیں اور میں اپنے آپ کو قابل فخر مرد کہنے کا مستحق ہو گیا مگر بموجب ارشاد اپنے محسن خضر صورت کامل سنیاسی کے اکیس روز تک با پرہیز علاج جاری رکھنا پڑا ایسی سیر دو تین ساڑھے سیر دودھ بآسانی ہضم کر لیتا تھا میرا چہرہ بارونق بدن مضبوط بینائی طاقتور ہو گئی وا آگر یا ثنا نہ دوائی کا نامردی کے مایوس مریضوں پر تجربہ کیا۔ تو ہر قسم کی نامردی۔ سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت وغیرہ کے لئے اکسیر سے بڑھ کر پایا۔ پھر کئی ایک دور اندیش احباب کے اصرار پر اور عوام کے فائدہ کو مدنظر رکھ کر یہ اشتہار بغرض رفاہ عام دیا جاتا ہے کہ جو اصحاب اس شرمناک قبیحہ عادت کے شکار بن کر حظوظ انسانی سے محروم ہو بیٹھے ہوں اور سینکڑوں روپیہ علاج معالجہ پر صرف کر کے بھی مایوس ہو چکے ہوں۔ وہ اس قلیل القیمت اور سریع الاثر دوائی کو استعمال کر کے شفایاب ہو جائیں اور خدا کے فضل سے گئی گزری گائیں قیمت صرف لاگت ادویات اور خرچ اشتہارات پر بمشکل اکتفا کرتی ہے فائدہ بہت کچھ ملحوظ ہے قیمت مقوی گولیاں جس میں اکیس روز کی خوراک موجود ہے۔ صرف دو روپیہ قیمت روغن مالش جس میں اکیس روز تک روغن رگوں اور پٹھوں کے لئے کافی ہے۔ فی شیشی دو روپے آٹھ آنہ ۸۔۲ جریان کے یہ گولیاں از حد مفید ہیں۔ روغن مالش سے کسی قسم کی پھنسی یا آبلہ ہرگز نمودار نہ ہوگا۔ اس دوائی میں کسی کشتہ وغیرہ کی آمیزش نہیں ہے یہی وجہ ہے کہ ہر بچہ بوڑھا اور جوان یا ساری بغیر لحاظ موسم کے ان گولیوں کا استعمال کر سکتا ہے اور لطف یہ کہ اس دوائی کے استعمال کے بعد دوبارہ کسی دوائی کی ضرورت نہ ہوگی آخر میں یہ بھی ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اشتہار کے نکالنے سے میری کوئی ذاتی غرض نہیں ہے۔ اور نہ ہی میرا یہ مطلب اشتہار شائع کر کے پبلک سے روپیہ کمانے کا ہے۔ بلکہ ہر خاص و عام کے فائدہ کو مدنظر رکھ کر اور احباب کے اصرار پر یہ اشتہار شائع کیا جاتا ہے تندرست آدمی بھی فائدہ اٹھا سکتے ہیں کیونکہ اس کے استعمال سے سستی سے حرکت اور حسیت سے طاقتور بن جاتا ہے تو ان گولیوں اور مالش کا استعمال کریں۔ ان کے استعمال سے بدن میں خون صالح پیدا ہوتا ہے الغرض حسب تمام جرخہ ڈھیلا ہو گیا ہو تو ان کا استعمال کریں فائدہ اٹھائیں مخفی دکھوں کا تمام دنیا کی دواؤں سے عجیب و غریب علاج ہے نیز عورتوں کی جوانی قائم رکھنے کے لئے جو عورتیں مردوں کی طرح جریان الرحم یا اخراج رطوبت یعنی لیکوریا جیسے خطرناک امراض میں مبتلا ہوں ان کے لئے مقوی گولیاں از حد مفید ہیں۔ ضرورت مند اصحاب تجربہ کریں مکمل پرچہ ترکیب ہمراہ ہوگا محصولڈاک آٹھ آنہ علاوہ ہوگا۔ تمام خط و کتابت پوشیدہ رکھی جاتی ہے۔

خاص نوٹ: وہ اصحاب ہم سے دوائی منگوائیں۔ جو استعمال کریں۔ اور اخبار کا حوالہ ضرور دیں کئی اصحاب نے پیشہ اختیار کر رکھا ہے کہ ہم سے دوائی منگوا کر زیادہ قیمت پر فروخت کر دیتے ہیں۔ لہذا فقیر خضر صورت سنیاسی کے قول کے مطابق اس کی کمائی کھانا گناہ ہے۔

نوٹ: کوئی صاحب مجھے اور دوائی کے لئے تحریر نہ کریں۔

شرطیہ علاج اور شرطیہ وعدہ

ہندو کو دھرم اور مسلمان کو ایمان کی قسم ہے کہ اگر میری دوائی کے استعمال سے حسب دلخواہ فائدہ نہ ہو تو حلفی تحریر بھیج کر قیمت واپس منگوا لیں عدم صحت کی صورت میں کسی کا پیسہ رکھنا گناہ سمجھتا ہوں اگر کوئی صاحب اس دوائی سے اب بھی فائدہ نہ اٹھائیں۔ تو انکی "زد قسمت"

ضروری اطلاع

یہ یاد رہے کہ میری دوائی صرف نامردی۔ سستی۔ جریان۔ احتلام۔ سرعت اور کمزوری اور لاغری اور جریان الرحم یا لیکوریا سب کے لئے مخصوص ہے یہ امراض خواہ کسی سبب سے ہوں۔ سب کے لئے اس کا استعمال کرنا طاقت کا بیمہ کرانا ہے۔

خط و کتابت و دوائی ملنے کا پتہ — **مینیجر دار الشفاء گولیاں بٹالہ ضلع گورداسپور (پنجاب)**

خاص رعایت۔ اس سال ہماری کمپنی نے بڑی بھاری رعایت کر دی ہے اس لیے سب چیزیں ایک دم سے منگوا لیجئے۔ آپ فائدہ میں رہیں گے

دل روز
ہمدرد
کل جلدی امراض
قیمت فی شیشی
طاہر الدین اینڈ سنز دلروز ویلا

اپنے لمحات فرصت کی قدر کرنا سیکھیں

موسم سرما آرہا ہے ان طویل راتوں میں

سونے سے پہلے مندرجہ ذیل علمی جواہر پاروں کے مطالعہ سے اپنی اسلامی ادبی تاریخی معلومات بڑھایئے

علامہ سر اقبال کا پیام مسلمانان عالم کے نام

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
تجھے اس قوم نے پالا ہے آغوش محبت میں کچل ڈالا تھا جس نے پاؤں سے تاج سر دارا

چودہ سو سال کی مستند اسلامی تاریخ

مطالعہ فرمایئے جس پر تمام اسلامی مقتدر جرائد نے شاندار ریویو کئے ہیں۔

تاریخ اسلام مکمل پانچوں حصے میں مجلد سنہری جس میں زمانہ اسلام سے قبل ایک سو سال کے زمانہ جاہلیت کے حالات اسلام کی مقدس تعلیم ہادی اسلام صلعم کی ... سوانح حیات خلفاء راشدین خلفاء بنا امیہ خلفاء عباسیہ خلفاء عثمانیہ ترکان ... کی مفصل تاریخ کے علاوہ تبلیغ و اسلامی طریق تمدن و طرز معاشرت پر مفید بحث کی گئی ہے

قیمت مجلد سنہری صرف تین روپے (سے ر)

اسلام کے مایۂ ناز مجاہد معظم سپہ سالار اعظم حضرت خالد رضی اللہ عنہ کی سوانح حیات اور انکی سربکف مجاہدانہ جانثاریوں کے نقرا دینے والے واقعات۔

سیرۃ خالد بن ولید رض

ملاحظہ فرمایئے جن کی شمشیر خارا شگاف کے آگے بڑے بڑے جابر بادشاہ باوجود دیکھو لشکر جرار ... کے لرزہ براندام رہتے تھے۔ یہ تقریباً ۵۰ صفحات کی ایسی تاریخ ہے جس میں ہر ایک واقعہ کے متعلق مستند تاریخی کتب کے حوالے بھی دئے گئے ہیں۔ قیمت صرف ایک روپیہ (عہ)

ادیب شہیر ایم اسلم کے دو شعبد ید شاہکار!

تفسیر جذبات

(چالیس افسانوں کا مجموعہ)

جن اصحاب نے ایم اسلم صاحب کے افسانے پڑھے ہیں۔ انکو معلوم ہے کہ ایم اسلم صاحب ایسے ... واقعات میں جو انسان کی نگاہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتے ایسا رنگ بھرتے ہیں کہ پڑھنے والے کی سو بار پڑھ کر بھی طبیعت سیر نہیں ہوتی ہے کہ ایک افسانہ ... معلوم ہوتا ہے۔ لہذا تفسیر جذبات قابل مصنف کے ایسے ... اور ... چالیس افسانوں کا مجموعہ ہے۔ جس کا حجم تقریباً ساڑھے سات ... اور نہایت خوشخط گلیز ڈ کاغذ پر طبع ہوا ہے۔

... والی خوبصورت جلد قیمت صرف دو روپے آٹھ آنے (عہ ر)

آشوب زمانہ

یہ بھی ایم اسلم صاحب کی بہترین تصنیف ہے جس میں قابل مصنف نے اپنی وسعت ... بعمق نظری معلومات نفسیات انسانی کے مطابق نہ صرف مرد و عورت کے ربط و ضوابط جذبات محبت کا فلسفہ بیان کیا ہے بلکہ اخلاق ادب تمدن معاشرت پر بھی بحث تحیص کی ہے۔ آخری صفحات ... سے ... مصنف نے ایک امیدوار محبت کا ایسا مایوس کن ... جس کو پڑھ کر پتھر دل انسان بھی آنسو بہائے نہیں رہ سکتا۔

قیمت صرف ایک روپیہ (عہ ر)

دنیائے سائنس }

گراموفون ریکارڈوں کی کتنی عمر ہوتی ہے

پندرہ سو مرتبہ بجنے کے بعد گراموفون ریکارڈ گھس جاتے ہیں۔ اور انکی عمر ختم ہو جاتی ہے لیکن سائنسدانوں نے حال ہی میں ایک ایسا مصالحہ دریافت کیا ہے جو ریکارڈوں کے اجزائے ترکیبی کو نرم کر دیتا ہے جس کے باعث ریکارڈ کی گھسی ہوئی لکیریں گہری ہو جاتی ہیں۔ آواز تیز ہو جاتی ہے اور وہ دلکش نغمے جو ریکارڈ گھسنے اور پرانے ہونیکے باعث ماند پڑ گئے ہوں پھر عود کر آتے ہیں اور اتنی ہی تیزی سے سنائی دینے لگتے ہیں جتنے نئی حالت میں سامعہ نواز ہوتے ہیں

نئے ریکارڈ اور پرانے ریکارڈ

یہ مصالحہ نئے ریکارڈ اور پرانے ریکارڈ دونوں پر یکساں کارآمد ثابت ہوا ہے نئے ریکارڈوں پر لگانے سے لکیریں چونکہ گہری ہو جاتی ہیں اس لئے ان کی عمر بڑھ جاتی ہے اور وہ بجائے پندرہ سو کے بجائے چار ہزار مرتبہ بخوبی بج سکتے ہیں۔ اور پرانے ریکارڈوں پر لگانے سے ان میں نئی زندگی آجاتی ہے۔ کھڑکھڑاہٹ بالکل مٹ جاتی ہے۔ اور آواز بالکل نئی ہو جاتی ہے۔ اس مصالحہ کا نام "زیڈ" ہے جو سائنسدانوں کو بعض اجزاء کے کیمیاوی اثرات کا تجربہ کرتے ہوئے اتفاق سے معلوم ہوا ہے۔ اگر آپ کے پاس نئے یا پرانے ریکارڈ ہوں تو ان پر ضرور "زیڈ" لگائیے

ایک شیشی زیڈ کی قیمت دو روپے (جس سے چالیس ریکارڈ درست ہوتے ہیں) محصولڈاک گیارہ آنے علاوہ

ZED

Rs. 2/-

میسرز گرین فیلڈز (انڈیا) پنڈری سی پی

حیرت انگیز نقوش

(۱) نقش محبت اس مجرب بے بہا تعویذ کی برکت سے مطلوب ہمیشہ کیلئے مسخر و مطیع ہو جاتا ہے زود اثر اتنا کہ ادھر بازو پر باندھا ادھر کامیابی سہل اتنا کہ ہر قسم کی عملیات پڑھنے پرہیز کرنے یا مطلوب کو کچھ کھلانے پلانے کی ضرورت ہی نہیں اس پر لطف یہ کہ اگر سو فیصدی کامیابی نہ ہو تو حلفیہ طور پر دام واپس شرعی ضرورت کیلئے منگا کر تجربہ کیجئے فرمائش کے وقت حلفیہ اقرار کیجئے کہ اپنی ذات کے سوا کسی اور کو نہ بتائینگے میاں اور بیوی میں بھی اسکے ذریعہ شکر رنجی دور ہو کر محبت و اتفاق ہو سکتا ہے جواب طلب امور کیلئے ٹکٹ یا جوابی خط ہدیہ بذریعہ منی آرڈر دو روپے پانچ آنے (عہ / ۲ ر) (وی پی للعہ ر) اپنے فائدے اور اثر کے لحاظ سے یہ چیز دس روپے میں بھی سستی ہے نوٹ: نازل اول سے بچئے رسالہ کا حوالہ ضرور دیں

اسکے علاوہ اور بھی ہر قسم کے تعویذ مل سکتے ہیں۔

صوفی اشفاق احمد
سعادت بلڈنگ
بیرون موچی دروازہ لاہور

لائبریری والوں کے لئے تحفہ

میں انوکھی ہوں مجھے ضرور پڑھو

عام صاحبان کی خدمت میں التماس ہے کہ آپ خود جانتے ہی ہو۔ جو لفظ فارسی میں لکھے جاتے ہیں وہ تمام بغیر نقطہ نہیں ہوتے۔ یہ کتاب "دل کسر ملہ" الف سے ے بغیر نقطہ کے بانظم بے نظیر اور نایاب ہے۔ پتہ ذیل سے آج ہی منگوائیے

قیمت اس جواہرات سے زیادہ قیمتی کتاب کی رعائتی صرف بلا محصول ڈاک ایک روپیہ ہے

ملنے کا پتہ: **منیجر ترلوچن سنگھ جیون سنگھ بردوکان مستاد رزی شاہ آباد ضلع کرنال۔**

Regd. L. No. 1691